خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

ستمبر 2020ء

بانی

معراج رسول

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

صفحات 290

قیمت 100 روپے

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیراعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسنین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

انشائیہ 07
جون ایلیا
اجڑے شہروں کی ویرانی پر ایک صاحب نظر کا المیہ

آپ کے خط 08
مدیراعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

بے منزل مسافر 14
زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

دھمکی 47
تنویر ریاض
مخالف سمت میں بھٹکتے مسافروں کی لاحاصل تھکن کا احوال

نگہبان 57
طاہر جاوید مغل
پچھتاوے کی آگ میں جل جل کر جینے والی ایک عورت کی روداد

شہ زور 66
اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

بے درد مسیحا 97
ڈاکٹر شیر شاہ سید
مایوس کن لمحات میں بے درد مسیحاؤں کے بے وقت چلن کا قصہ

زنجیر 103
غلام قادر
زندانوں کی زنجیروں کو توڑنے والی ایک برباد حسینہ کا قصہ...

بھوبل 106
مرزا امجد بیگ
بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک اور عبرت اثر واقعے کی تفصیل......

جلد 49 • شمارہ 09 ستمبر 2020 • زرسالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

دستک 139
آصفہ ضیا احمد
بند دروازوں کے پیچھے قید لمحوں کی
ایک پردرد کہانی کے کردار......

محفلِ شعر و سخن 156
قارئین
آپ کے شاعروں کی ایک انجمن آپ تک
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

بیس سال 159
انجم فاروق ساحلی
انصاف کے دو پلڑوں کے مابین توازن کھو
دینے والے ایک قابل انسان کا انجام......

ساشا 164
عمر عبداللہ
طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے
والے ایک شاعر کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

سزائے موت 191
ایم الیاس
لندن کے ایک عدالتی فیصلے
کی دلچسپ کارروائی اور اس کا انجام

خدا اور امید
ناہید سلطانہ اختر
کروفر اور گھمنڈ میں ڈوبے
انسانوں کی بے وقعتی کا اظہار

قوم سبا
رضوانہ ساجد
اللہ کا پیغام پہنچانے والے
انبیا اور قوموں کا احوال

کاروبار 233
شاہ زین رضوان
انتقامی کارروائیوں کا کاروبار کرنے والی
ایک دلکش دوشیزہ کا عزم

فیصلے دل کے 244
نشور ہادی
تصورات سے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے والے ایک
عاشق کی تلخ حقائق سے دلچسپ معرکہ آرائی

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے مرصع ماہِ ستمبر 2020ء کا دلکش شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

افشاں آفریدی و **نایاب جیلانی** کے سلسلے وار ناول دلچسپ دوراہے پر

سعدیہ رئیس کا شاہکار..... پڑھیے منی ناول **میں انمول** کی صورت

مدیحہ شاہد کا سحر انگیز مکمل ناول **پریوں کا دیس**

عورت کہانی میں **فرحین اظفر** لائی ہیں ایک اور شاہکار داستان......

شمع ہدایت میں

اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ

رضا ......توفیق الٰہی

کے عنوان سے

انداز نو میں

ملیں ایف ایم کے خوش گفتار آر جے

اسد علی چوہدری سے

اس کے علاوہ

ہما بیگ، ناہید سلطانہ اختر، طیبہ عنصر مغل،

سعدیہ قریشی، افشین نعیم و دیگر لکھاریوں کی لاجواب تحریریں

رنگا رنگ مستقل سلسلے، پُرمزاح تراشے اور دل کش شاعری

سب کچھ آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے

انشائیہ

جون ایلیا

حکمتِ عملی

شام ہے اور ایک حالتِ استفہام ہے۔ میں اور میرا ہمزاد بیٹھے سوچ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ یہ عمل وقفے وقفے سے جاری ہے۔ جو لفظ ہماری زبان پر بار بار آرہا ہے وہ "سیاست" ہے۔ ہے یوں کہ جہاں سماج ہے وہاں سیاست ہے اور جہاں سیاست ہے وہاں سماج۔

دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک ایسے سماج کے خواب دیکھتا ہے جہاں کوئی سیاسی نظام یعنی حکومت یا ریاست نہ پائی جاتی ہو۔ اس گروہ کو اردو میں نراجی اور عربی میں فوضوی (Anarchist) کہتے ہیں۔ ایسا ہی سماج میرا اور میرے ہمزاد کا خواب رہا ہے۔ یہ خواب کب اور کتنی نسلیں گزرنے کے بعد پورا ہوگا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن گمان یہ ہے کہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جسے ہمیشہ مضحکہ خیز سمجھا گیا ہے۔ اس پر انیسویں صدی میں بھی بری طرح ہنسا گیا اور اس صدی میں بھی اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی ذہن کے سب سے خوب صورت خوابوں کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے؟ جو خیالات انسانی ذہن کا سرمایہ ہیں، بیش قیمت ترین سرمایہ انہیں دیوانگی کی پیداوار کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جو خیالات دیوانگی کی پیداوار سمجھے گئے انہی نے تاریخ میں انقلابی کردار ادا کیا۔ وہ فکر و خیال کے دیوانے ہی تھے جنہوں نے فرزانگی کی پرورش اور پرداخت کی۔ تہذیب کی تاریخ دراصل دیوانوں ہی کی کارگزاری کی سرگزشت ہے۔

اکثر تھا، یاست کا۔ سیاست کو ایک ایسا عمل سمجھا جاتا ہے جو چالاکی، عیاری، سازش، فریب دہی اور دروغ گوئی سے تعلق رکھتا ہو۔ ایسا سمجھنا" یا "... کے بالکل ہے حد افسوس ناک ناانصافی ہے۔ یہاں میں جس امر کو واضح کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست یا ملک داری (حکومت) حکمت سے تعلق رکھتی ہے اور حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمتِ نظری اور دوسری حکمتِ عملی۔ حکمتِ نظری، منطق، ریاضیات، طب، علم ہیئت (Astronomy)، طبیعات اور دوسرے علوم سے تعلق رکھتی ہے۔

اب رہی حکمتِ عملی، حکمتِ عملی کی تین قسمیں ہیں اور وہ ہیں تہذیبِ اخلاق، تدبیر منزل یعنی امور خانہ داری کی تنظیم اور سیاست (یعنی حکومت یا ملک داری) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست حکمتِ عملی کی سب سے برتر قسم ہے۔

اگر میری یہ بات صحیح ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح ہے اس لیے کہ یہ بات میرے ذہن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مہذب معاشروں کی تسلیم شدہ بات ہے تو مجھے بتایا جائے کہ سیاست دانوں یا حکمرانوں کی اکثریت جس طرزِ سیاست پر عمل پیرا ہے کیا اس کا حکمت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہے......؟

میری اس بات کے پیشِ نظر سیاست یا ملک داری کا کام چلانے والے لوگوں کا معاشرے کے حکیم ترین یا دانش مند ترین لوگوں کے حلقے سے تعلق ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے یا نہیں...... اگر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ہونا چاہیے تو کیا ہم بہت رعایت دینے کے بعد بھی سیاست دانوں یا حکمرانوں کو حکیم ترین اور دانشمند ترین نہ سہی، بہت ادنیٰ مفہوم کے اعتبار سے حکیم یا دانش مند قرار دے سکتے ہیں؟ یہاں چند لمحوں کے لیے رک کر ذرا ہنس لیجیے... سیاست داں یا حکمراں اور حکیم سیاست داں یا حکمراں اور دانش مند! توبہ توبہ...... یہ تو نیم حکیم بھی نہیں ہیں...... ہاں خطرۂ جاں ضرور ہیں۔

میں دنیا کے سیاست دانوں یا ملک داروں کی ایک بڑی تعداد سے سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے عوام نے قومی معاملوں میں بھی قوم کو مایوس کیا......؟ ان میں سے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مایوس کیا۔ ہرگز مایوس نہیں کیا۔ پھر تم کیسی بد بلا ہو جو اپنی قوم کو لگاتار مایوس کرتے چلے آرہے ہو، تمہارے عوام نے ہمیشہ تم پر اعتبار کیا، پر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمہارے پیش رو اور تم ہمیشہ ناقابلِ اعتبار ٹھہرے۔ انہوں نے ہمیشہ تم سے اپنی عزیز ترین امیدیں وابستہ کیں پر تم نے انہیں بڑے برے اور بھونڈے انداز کے ساتھ ناامید کیا۔ تمہارا ٹولا تو بس بڑبولے پن کا ماہر مند اور آنکھوں میں دھول جھونکنے پر کار بند رہا ہے۔

آخر تم لوگ کس غرے میں ہو۔ کیا تم روشنی کے جنے ہو۔ کیا تم رنگ و خوشبو کے بیٹے ہو، کیا تم سلیقے اور شائستگی کے لے پالک ہو......؟ نہیں جانا جاتا کہ آخر تم کون ہو؟ جنہوں نے تم سے شروع شروع میں آس لگائی، ان کی بھویں بھی سفید ہو چکی ہیں اور جو ان کے بعد آئے وہ...... اور جو ان کے بعد آئے وہ اس عذاب میں مبتلا ہیں جسے ہونے کے احساس کی جان کنی کہتے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسانوں کے حقیقی مسئلوں کو نہ تو سائنس دان حل کر سکتے ہیں، نہ فلسفی، نہ شاعر اور نہ ادیب۔ یہ فرض تو صرف سیاست داں اور حکمراں ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے کہ عوام ان ہی کی بات سنتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کی طاقت صرف سیاست دانوں یا حکمرانوں ہی کو حاصل ہے۔ آج انسانوں کے مسئلے پہلے سے کہیں زیادہ الجھے ہوئے ہیں اور یہ الجھے ہوئے مسئلے کسی ایک ملک یا ایک علاقے کے عوام کو متاثر نہیں کر رہے بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ کیا دنیا کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کا گروہ اس صورتِ حال کو حکمت پسندی، دانش مندی اور انسان دوستی کے ساتھ پیشِ نظر رکھے گا یا نہیں؟

عزیزانِ من
السلام علیکم!

نئے اسلامی سال کا آغاز محرم الحرام سے ہو چکا ہے..... عظیم المرتبت حضرت امام حسینؓ کی عظیم الشان قربانی تا قیامت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سال تمام امتِ مسلمہ کے لیے امن و آشتی کا پیغام لے کر آئے۔ لیجیے جناب ستمبر 2020ء بھی دھیرے دھیرے سر پر آن پہنچا اور سسپنس اپنی آب و تاب کے ساتھ آپ کے پاس، آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کورونا کی چیخ و پکار اگرچہ اپنا شور کم کر گئی ہے مگر اس کے نشانات اور آیندہ کے خطرات ابھی باقی ہیں..... اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس موذی وبا سے ہم سب کو نجات دلائے (الٰہی آمین) شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے اور کہیں سے صدا آئی کہ 15 ستمبر سے تعلیمی اداروں پر بندش اور قفل کو توڑ دیا جائے گا..... لاکھ آن لائن تعلیمی سلسلہ جاری رہنے کا دعویٰ کیا گیا مگر کیا تعلیم کا معیار بھی برقرار رکھا گیا..... نہیں..... اس کے علاوہ کیا بجلی کے محکمے کو بھی کلاسز کے اوقات کے لیے بجلی جاری رکھنے کا پابند کیا گیا..... نہیں..... کیونکہ بجلی کا محکمہ تو وہ بے مہار ہاتھی ہے جو کسی کے قابو میں آ ہی نہیں سکتا..... بجلی کے نام پر اوور بلنگ نے حقیقی معنوں میں لوگوں کی چیخیں نکال دی ہیں..... گھر کو روشن کرنے کی خاطر گھر کے راشن کی مد میں اٹھنے والی تمام رقم ان بلوں کی نذر ہو جاتی ہے..... اب تو ماشاء اللہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ بھی رنگ پکڑنے کے مصداق گیس کی تعطلی اور بلوں میں بے تحاشا اضافے نے حیران کر ڈالا ہے..... کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ سب سے بڑی جنگ ہمارے طالب علموں نے لڑی ہے..... ان نامساعد حالات میں بھی جیسے تیسے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور والدین بھی امتحانات سے گزرتے رہے..... نہایت صبر و استقامت اور اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام دنیا نے جس طرح اس وبا کا مقابلہ کیا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ امید ہے کہ اب جلد از جلد ہمارے تعلیمی ادارے آباد ہو جائیں گے جہاں ہماری نئی نسل کو حقیقی معنوں میں معیاری اور سستی تعلیم حاصل ہو سکے اور رونقیں پھر سے بحال ہو جائیں گی۔ (کاش سستی اور معیاری تعلیم کا خواب بھی پورا ہو جائے)..... بہرحال روتے، ہنستے دن گزر ہی گئے اور ستمبر آن پہنچا..... بات ہو ستمبر کی تو یومِ دفاع اور یومِ فضائیہ کو نظر انداز کر دینا مشکل ہوتا ہے..... کیونکہ 6 اور 7 ستمبر ہماری تاریخ میں شجاعت اور عزم و ہمت کے حوالے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکے ہیں..... اگرچہ آج کل بھی ہم مودی کی موذی حرکتوں اور زہریلی سوچوں کی زد میں ہیں..... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان شیاطین کی شاطرانہ چالوں اور حملوں سے ہمیں محفوظ رکھے، انشاء اللہ (آمین) گزشتہ دنوں مون سون کی تیز بارشوں نے بااختیار طبقے کے دعوؤں کی قلعی کھول دی..... مگر اربابِ اختیار کے رویّے بہ زبانِ خاموشی کہتے رہے ''سانوں کی'' ان کے رویّوں پر حیرت نہیں ہوئی مگر دکھ ضرور ہوا..... ان کی بے حسی پر نہیں بلکہ عوام کی، بے بسی پر..... برساتی پانی نے نالوں سے ابلتے ہوئے پکی، کچی آبادیوں میں کوئی تمیز نہ رکھی اور کسی جنونی ہاتھی کے مانند ہر چیز کو روندتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں گھس آیا..... ایسے میں بادلوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے آنسو بھی جاری تھے مگر کسی کو رحم نہ آیا..... انتظامیہ کی بدانتظامی نے باہمت لوگوں کے بھی حوصلے توڑ ڈالے مگر ایک دوسرے پر الزامات کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ان لوگوں نے بھری برسات میں بھی انسانوں کو پینے کے صاف پانی کی بوند بوند سے بھی ترسا دیا..... صد افسوس..... اللہ سے اچھی امیدوں کے ساتھ ساتھ اب ذرا کچھ خبر لیتے ہیں اپنی محفل کی

✠ ناہید یوسف کی سچی باتیں اسلام آباد سے۔ ''جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ وہ لفظوں کے کھلاڑی اور سوچ کو نئی سمت عطا کرتے تھے۔ آنے والے دنوں کا تجزیہ اتنے پرفیکٹ انداز میں کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ واقعی ''بے دولتی'' میں انتہائی تلخ سچ اور صحیح صورت دکھائی گئی ہے۔ ہمارے ہنرمند اور ذہین لوگوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا گیا۔ واقعی بیرونِ ملک سے ہمارے محنت کشوں کی بھیجی گئی دولت اس ملک کی ''بے دولتی'' ہی ہے مگر افسوس..... ان باتوں کو سمجھنے کے لیے عقل کی نہیں..... انتہائی حساس دل اور اپنے ملک اور اس میں بسنے والے عوام سے ہمدردی کی ضرورت ہے جو شاید ہمارے کسی بھی سیاست دان اور حکمرانوں میں نہیں۔ ہر شخص یہاں سے بس ''خزانہ'' لوٹنے کے چکر میں ہے۔ امیر، امیر تر ہونے کی دوڑ میں شامل ہے اور اس کے لیے اسے چاہے کسی کو اپنے پیروں تلے روندنا ہی کیوں نہ پڑے..... وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ غریب بے چارہ دو وقت کی روٹی کے لیے دربدر ہے، نہ اسے یہاں ٹھیک سے روٹی نصیب ہو پا رہی ہے نہ ہی اس کی دادرسی کرنے والا کوئی ہے۔ اب بھی وقت ہے..... اگر ہم نے اپنی یہ روش نہ بدلی تو ہم شاید بہت بڑا

نقصان اٹھائیں گے۔ اپنے لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو شخص جیسے بھی، جہاں بھی جو حصہ ڈال سکتا ہے...... یہ اس کا فرض ہے اور اسے ہر شخص کو پوری ایمانداری سے ادا کرنا چاہیے کیونکہ ہم سب کو چاہے اس دنیا میں کسی کو جواب نہ دینا پڑے لیکن بارگاہِ الٰہی میں ضرور جوابدہ ہونا ہے اس لیے ہمیں اپنی سوچ، اپنی عادت، اپنی بےحسی، اپنی لالچ، اپنی خودغرضی، اپنی بے ایمانی، اپنی سفاکیوں کو پسِ پشت ڈال کر...... اس ملک میں بسنے والے غریب لوگوں اور اس ملک کے لیے جو ہم کر سکتے ہیں، کرنا ہوگا۔ اسی میں ہماری کامیابی اور ہمارا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ تمام قارئین کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ فہرست پر نگاہ دوڑائی۔ ظاہر ہے پہلے ”بدلتے راستے“ از طاہر جاوید مغل کا ہی انتخاب کرنا تھا، سو پہلے اسی کا مطالعہ کیا۔ سنبل نے واقعی بہت قربانیاں دیں اور عدیل بے چارہ بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ تاہم عدیل نے ہمت دکھائی اور فریال اور اس کے باپ افتخار کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ زبردست اسٹوری تھی۔ دوسری کہانی شہ زور پڑھی۔ اسما قادری نے اس بار تو کمال کر دیا ہے۔ کہانی کا ٹیمپو کافی تیز ہے، پڑھ کر کسی بھی موقع پر بوریت نہیں ہو رہی۔ یہی کمال ہوتا ہے اچھے رائٹر کا۔ ویسے اسما قادری بہت اچھی رائٹر ہیں تاہم ان کی کہانیاں جو پہلے پڑھیں، اس کا ٹیمپو کچھ سست ہوتا تھا مگر اب تو کہانی طوفانی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ ویلڈن اسما جی۔ اب دیکھیں معاذ دشمن کی قید سے کس طرح نکل پاتا ہے۔ بشریٰ کا کیریکٹر بھی اچھا ہے۔ خدا اور امید...... کیا کہنے ناہید سلطانہ جی کے۔ کیا منظر کشی کی موجودہ حالات کی، ویلڈن...... غلام قادر کی طوائف زادی بالکل بھی پسند نہ آئی۔ البتہ نجمہ مودی کی پارٹ ٹائم نے فل ٹائم مزہ دیا۔ شرجیل نے گن خریدی تو کسی اور مصرف کے لیے تھی مگر اس کے مابعد اثرات دیکھ کر اس نے اپنی نیت بدل دی، زبردست۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تدبیر بنی تقدیر کافی مشکل لگی۔ تنویر ریاض کی حسن کارکردگی بھی شاندار کہانی تھی۔ نعمان اسحاق کی لاٹری بھی بہتر کہانی تھی۔ ملک صفدر حیات کی لیلۃ [illegible] کہانی لگی۔ کہانی میں [illegible] خاص نظر نہیں آیا (معذرت کے ساتھ)۔ فہمی فردوس کی وبا بھی بس ایسی ہی تھی۔ شاہ زین [illegible] اچھی کہانی تھی۔ [illegible] کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، کسی کو نہ پتا چل سکا اور بس قیاس آرائیاں ہی گردش کرتی رہیں۔ سید افتخار حسین کی اسمگلر پسند نہ آئی۔ عمر عبداللہ کی ساشا ابھی وہ رنگ جمانے میں ناکام ہے جو شہ زور جما چکی ہے۔ امید ہے کہانی آگے چل کر اپنا رنگ جمالے گی۔ رضوانہ ساجد نے حضرت بری امام سرکارؒ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی۔ جزاک اللہ۔ امجد اقبال کی روزگار ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہتر رہا۔“

✠ شاہانہ سلطان کا گلشن ظہور کراچی سے قلمی تعاون۔ ”دلوں کے جذبات و احساسات کو لفظوں کا خوبصورت پیراہن پہنانے والے بے تاج بادشاہ طاہر جاوید مغل نے اس بار بھی ہر بار کی طرح کمال کر ڈالا۔ بدلتے راستے کا دوسرا حصہ بھی کیا خوب لکھا اور جم کے لکھا، ویلڈن۔ انسان حسد کی آگ میں مبتلا ہو کر کس قدر ذہنی پستی کا شکار ہو جاتا ہے اور فریال نے ثابت کر دیا کہ دولت کی چمک سے تھوڑی دیر تو دل [illegible] جا سکتا ہے مگر خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں اور نہ ہی کسی کا دل...... بہت خوب اندازِ بیاں رہا، مزہ آ گیا...... (اچھی [illegible] یہ کہانی)۔ امجد اقبال کی روزگار بھی بس مناسب ہی تھی مگر کوئی خاص لطف نہ دے سکی البتہ رضوانہ ساجد کی حضرت بری امام [illegible] بھی بہت خوبصورتی سے لکھا گیا۔ کچھ بھی ہو، ویسے تو بہت سی کتابیں ہیں معلومات کے لیے مگر سسپنس میں جو اندازِ بیاں اختیار کیا جاتا ہے، اس کی اثر پذیری بھی ذرا مختلف ہوتی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کے قلم کا جادو بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کورونا کے حوالے سے انسانی احساسات اور دنیاوی معاملات کا احاطہ بہت گہرائی اور غور و فکر لیے ہوئے ہے۔ انسان کو دوسروں کی خبر لینے کے بجائے صرف اپنی خبر رکھنا چاہیے۔ گویا اپنے اعمال و افعال کی نگرانی کس قدر ضروری ہے...... ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ صبح سے شام تک جانے کتنے لوگوں کا دل دکھا جاتے ہیں، کتنی ناانصافیاں سرزد ہو جاتی ہیں، ہمیں ادراک تک نہیں ہو پاتا اور بھول جاتے ہیں جس طرح ہم یہ سوچتے ہیں کہ قطرہ قطرہ کر کے سمندر بن جاتا ہے، اسی طرح اللہ کے پاس بھی تو ہمارے گناہوں کا انبار جمع ہو جاتا ہے اور پھر اسے ایک دن جوش آ ہی جاتا ہے۔ بے شک ہم ہی نادانی اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا رحم کرے۔ اس بار تو دونوں سلسلوں کی اقساط بہت جاندار اور شاندار رہیں۔ ساشا ذرا منفرد مزاج اور انداز کی ہے۔ کہیں کہیں تاریخ کا ساتھ آ جاتا ہے مگر اس میں رومانس اور دلیری و شجاعت بہت دلچسپی کا باعث ہیں۔ ایک سنسنی خیزی سی ہے۔ ایکشن اور رومانس ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ بالکل ایسا ہی شہ زور کا رنگ بھی ہے۔ بشریٰ کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ ایک ذرا سے سچ کو دکھانے کا اتنا بُرا انجام ہو تو کون سچ بولے گا اور کون غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہے گا۔ بہرحال دل پر بہت اثر ہوا یہ قسط پڑھ کر۔ پتا ہی نہیں چلا کب شروع کی اور کب ختم ہو گئی۔ منشیات کی تباہ کاری اور منشیات کی تباہی پر مشتمل کہانی اسمگلر سید افتخار حسین جعفری نے بھی خوب مکمل کی۔ مجرم چاہے کتنا ہی شاطر ہو، کہیں نہ کہیں کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔ بالآخر منشیات کے یہ بیوپاری بھی قانون کے شکنجے میں کس ہی گئے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی محفل شعر و سخن میں سخن آرائیاں خوب رہیں۔ جنید احمد ملک کراچی نے کیا خوب شاعری بھیجی ہے۔ بہت خوبصورت۔ نوید ممتاز، ذیشان احمد کے اشعار بھی دل کو لگے۔ شاہ زین رضوان بھی کیا خوب لکھتے ہیں۔ بہت دلچسپ مغربی تحریریں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اس بار بھی وہ رات لے کر آئے

اور سسپنس کا لطف بڑھا گئے۔ ملک صفدر حیات کی لیلۃ الحساب نے تو کمال کر دیا۔ بے شک انسان چاہے کتنی لمبی زندگی پالے اور ظالم کی رسّی کو چاہے کتنی ہی ڈھیل دے دے، بالآخر ایک دن تو حساب کا آ ہی جاتا ہے۔ یہ اور بات یہاں اس کے حصے میں حساب کے لیے رات مقرر ہو۔ بھئی واہ، بہت خوب، ویلڈن ملک جی۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

✠ ریاض بٹ حسن ابدال سے تشریف لا رہے ہیں۔ ''ماہ اگست 2020ء کا حسین سرورق سے سجا شمارہ اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے۔ جون ایلیا کی سدا بہار اور ذہنوں و ضمیروں کو جھنجوڑنے والی تحریروں کی تعریف و توصیف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے..... وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں کیونکہ اپنی تحریروں کی وجہ سے وہ ہمارے دلوں میں زندہ و جاوید ہیں۔ اب بڑھتے ہیں اپنی محفل کی طرف۔ مدیر اعلیٰ صاحبہ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں کہ آٹے کا بحران پیدا کر کے غریب کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہے۔ انجم فاروق ساحلی کیسے ہو۔ تبصرہ مختصر ہے لیکن خوب ہے۔ قدیر رانا آپ کی شاعری میں، مختلف رسائل میں پڑھتا رہا ہوں۔ محفل میں خوش آمدید۔ پھر بھی آتے رہیے گا..... چودھری محمد رفیق مہر کا خط مدلل ہے۔ کہانی حضرت امام بری سرکار میں جس تشنگی کا آپ کو احساس ہوا، اس کا جواب تو مصنفہ صاحبہ ہی دے سکتی ہیں۔ بابر عباس، فضل عباس ہم تو پریشان ہو گئے تھے کہ آپ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ شکر ہے محفل میں آئے تو۔ میں تو ہر ماہ حاضر ہوتا ہوں۔ صرف ایک شمارے میں میرا خط نہیں تھا۔ ہمارے دل تو بڑے ہیں۔ شاہانہ سلطان آپ کی حاضری بھی خوب ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی..... اس بار تاریخ کے اوراق کشید کر کے ڈاکٹر ساجد امجد تاریخی کہانی تدبیر بنی تقدیر پر لے کر آئے اور خوب لے کر آئے..... یہ تاریخ بھی خوب ہے۔ اپنے اندر ہزار داستانیں لیے ہوئے ہے۔ کہیں ریشہ دوانیاں ہیں، کہیں قتل و غارت گری ہے، خون خرابا ہے..... سازشیں ہیں بہرحال ڈاکٹر صاحب کا اندازِ تحریر بھی قابلِ توصیف و تعریف ہے۔ اب بات ہو جائے ملک صفدر حیات صاحب کی تفتیشی کہانی لیلۃ الحساب کی۔ کہانی پر تبصرہ کرنے سے پہلے ایک بات کرنا چاہوں گا کہ خاکہ اس پر مرزا امجد بیگ صاحب والا ہے، خیر..... کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اس بار کی کہانی بالکل مختلف انداز کی ہے۔ حیدر علی نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنی زمینوں پر ہل چلوا دیا تھا تاکہ اس کی بیوی اور بچوں کے لیے روٹی اور پانی کا بندوبست ہو سکے۔ پھر اس نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق مالکے کا قتل کیا تھا، اس لیے بھی قدرت نے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا..... کیونکہ اس پر ہمارا ایمان ہے کہ مجبوروں اور دکھی لوگوں کی آہیں عرش تک ہلا دیتی ہیں۔ بہرحال ایسی منفرد اور سبق آموز کہانی ہم تک پہنچانے کا شکریہ۔ اس ماہ فہمی فردوس نے کمال کی کہانی لکھی ہے بلکہ حقیقت لکھی ہے۔ آج کل کورونا کی صورت میں جو وبا ہمارے ملک میں آئی ہوئی ہے اس میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے اور احتیاطی تدابیر سے ہی اسے شکست دی جا سکتی ہے..... کچھ لوگوں بلکہ شاعروں کو اپنا کلام سنانے کے لیے ایک سامع چاہیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ معاوضہ لے کر سنے۔ یہی بات امجد اقبال نے اپنی کہانی روزگار میں بتانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ایسی ہلکی پھلکی تحریریں بوجھل لمحوں میں اکسیر کا کام دیتی ہیں۔ غلام قادر کی طوائف زادی ایک دلوں کو جھنجوڑنے والی روداد ہے۔ اس روداد کا آخری فقرہ قابلِ غور ہے کہ طوائف زادیاں سمجھوتا نہیں کیا کرتیں۔ اس بار حضرت بری امام سرکارؒ کے متعلق معلومات کا ذخیرہ لیے رضوانہ ساجد کی تحریر اختتام پذیر ہوئی۔ ویل ڈن..... اتنی روح پرور معلومات ہیں کہ میرے خیال میں کوئی تشنگی برقرار نہیں رہی۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی بدلتے راستے ایک لاجواب کہانی ہے۔ جذبے صادق ہوں تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ اچھی کہانی کو اچھا کہنا چاہیے۔''

✠ محمد آذین رضوان بہت عرصے بعد کورنگی کراچی سے تشریف لا رہے ہیں۔ (ارے جناب پہلے تو یہ بتائیے کہ اتنے لمبے وقفے کے بعد حاضری ہو رہی ہے، کہاں غائب تھے آپ؟) اگست کا سسپنس ملا اور ٹائٹل پر حسینہ سے آنکھیں چار ہوئیں، دل کو بہت اچھا لگا (اللہ خیر کرے)۔ جانے کس کی سوچوں میں گم ہیں محترمہ۔ ہاتھوں پر مہندی کچھ خاص ہیں لگی۔ آج کل تو کتنے اچھے اچھے ڈیزائن لگائے جاتے ہیں مہندی کے (شاید یہی گم لگ رہا ہے ہمیں بھی)۔ فہرست دیکھی اور مصنفین کے نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر ساجد امجد سے شکوہ کہ تاریخی صفحات پر آپ کی بادشاہت ہوا کرتی تھی، اب جانے کہاں گم ہوتے جا رہے ہیں آپ۔ اس بار بھی تدبیر بنی تقدیر لے کر آئے مگر کافی تھکے تھکے اور الجھے الجھے سے لگے..... کیونکہ کہانی میں بھی وہ فلو نظر نہیں آیا جو آپ کی تحریروں کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ پہلے کی طرح فارم میں آ جائیں اور اپنے خوبصورت انداز میں دلکش کہانیوں سے نوازیں۔ تنویر ریاض کی حسنِ کارکردگی نے بھی اس بار کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا حالانکہ ہم منتظر رہتے ہیں مغربی انداز میں لکھی گئی ان کی تحریروں کے..... بہت خوبصورت کہانیاں دیتے ہیں مگر بہرحال کبھی کبھی رائٹر کا موڈ بھی تو ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ تنویر ریاض کی کہانیاں بہت شاندار ہوتی ہیں۔ نجمہ مودی کی تحریر پارٹ ٹائم نے بہت لطف دیا، کمال کر دیا۔ اچھا بھلا انسان کس طرح پل بھر میں اپنی چال بدل دیتا ہے۔ سیدھی راہ پر چلتے چلتے شرجیل نے اچانک اپنی سمت بدل دی۔ واقعی لالچ میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اور اندھے کو کیا خبر اس کا راستہ کس منزل پر نکلتا ہے۔ ارے ارے اسما قادری صاحبہ نے ایسی دھانسو قسط لکھی اس بار تو شہ زور کی کہ ہمیں بہت زور سے پسند آئی۔ واہ واہ۔ بس یہی ٹیمپو،

کی تیز رفتاری چاہتے ہیں آیندہ اقساط میں بھی امابی۔ ٹیکی رہیے۔ ویسے آپس کی بات ہے معاذ اور بشریٰ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ظلم نہیں ہو رہا؟ اور جناب طوائف زادی کو لے کر جب غلام قادر کا نام دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ ارے غلام قادر صاحب آپ کی تحریروں کا طرّہ تو کچھ اور ہی ہوا کرتا تھا، یہ آپ کس طرف نکل آئے...... کہانی کہیں کہیں کمزور سی لگی...... بہرحال دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے ہم نے کہانی کو مکمل پڑھا۔ آخر میں بچے اور اس کی ماں پر بہت افسوس ہوا کہ ہمارے معاشرے کے طاقتور لوگ کس طرح اختیارات کا استعمال کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، جیسے کورونا کی وبا وغیرہ...... حسام بٹ کے قلم سے ملک صفدر حیات کی کورونا کے حوالے سے لیلۃ الحساب پڑھی۔ واقعی ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ تو ہم ہی نادان ہیں جو اللہ کی مصلحتوں اور حکمتوں کو نہیں سمجھ پاتے۔ کہانی بہت خوب اور جاندار تھی۔ ناہید سلطانہ کی تحریر خدا اور امید پڑھی۔ ابھی تو پہلا حصہ ہے، آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ کورونا کے حوالے سے انسانی اعمال و افکار و افعال کا جائزہ اور آغاز و انجام کے حوالے سے بہت مکمل اور دل کو چھو لینے والی تحریر ہے۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کے بدلتے راستے تمام ہوئے۔ بُرے کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ ایک بہترین کھلاڑی کی زندگی محض اتفاقی غلطی کی سزا میں تباہ کردی گئی۔ اگر چاہا جاتا تو اس غلطی کو تنبیہ کے بعد نظرانداز کردیا جاتا مگر وہ بھول گیا کہ تباہی کا بدلہ تو تباہی نکلتا ہے۔ اس آفیسر نے کسی کے بیٹے کا مستقبل تباہ کیا، قدرت نے اس کی بیٹی کو تباہ کر ڈالا۔ واہ، بہت خوب۔''

✠ محمد عثمان ذوالفقار ساہیوال سے۔ ''بندہ ناچیز پُرتقصیر آپ کا بے حد شکرگزار ہے کہ آپ نے اپریل کے شمارے میں میرا خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس لیے یہ بندہ ناچیز اسی امید پر دوبارہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہے کہ آپ اس بار بھی حوصلہ افزائی کریں گے۔ (جی ضرور)۔ خلوص کی محفل میں آئے تو ریاض بٹ صاحب کو کرسی صدارت پر پایا۔ اس بار تبصرے کم تھے اس لیے جلدی جلدی سارے پڑھ لیے کہانیوں میں سب سے پہلے ''ماشا'' کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس بار کی قسط اچھی تھی مگر مصنف نے ابھی تک سارہ کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی۔ میرے خیال میں اس کا امیر ارغل کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے اور جس خزانے کو امیر ارغل تلاش کرنے کے لیے نکلا ہے وہ سارہ نکال چکی ہے۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ''شہ زور'' پڑھی۔ معاذ نے فرار ہونے کے لیے کیا حیرت انگیز ترکیب لڑائی مگر تقدیر نے گھما پھرا کر ان کے حوالے کر دیا۔ ''بدلتے راستے'' کا دوسرا حصہ پڑھا جو کہ کافی دلچسپ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا اختتام بھی پس پردہ کی طرح ہوگا مگر ایسا نہ ہوا۔ طاہر صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے مگر کوئی استاد میسر نہیں ہے۔ (کوشش جاری رکھیے کامیابی ضرور مل جائے گی۔) ویسے اگر ساہیوال یا فیصل آباد میں کوئی اچھا مصنف ہے تو برائے مہربانی بتا دیجیے۔ ''حسنِ کارکردگی'' اور ''پارٹ ٹائم'' اچھی تھیں۔ ''لاٹری'' پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ کیا مغرب میں بھی ایسے خیالات اور روایات پائی جاتی ہیں؟ غلام قادر صاحب ہمیشہ کی طرح ایک بیسٹ کہانی لے کر آئے۔ ان کی ''طوائف زادی'' مختصر کہانیوں میں نمبرون ثابت ہوئی۔ ''لیلۃ الحساب'' واقعی ایک حیرت انگیز کیس ثابت ہوا۔ ''وبا'' اور ''وہ ... '' ''انجانا نصیب''، ''انگلی'' میں مجرم نے چالاکی سے کام لیا مگر ہمیشہ کی طرح آخرکار قانون کے ہاتھ آگیا۔ ''بری امام سرکار'' پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ میری خواہش ہے کہ میں فقہ کے چاروں اماموں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے بارے میں تفصیلی جانوں۔ ان میں سے امام احمد بن حنبل کے تفصیلی حالات تو بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ باقی تینوں اماموں کے بھی تفصیلی حالات ... یا سرگزشت کی زینت بنائیں۔ (انشاء اللہ ضرور) ''روزگار'' نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ''خدا اور امید'' ٹھیک تھی۔ میں سمجھتا ہو کہ کورونا اللہ کی طرف سے عذاب کا ایک تازیانہ اور وارننگ ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جب بے حیائی، عریانی و فحاشی عام ہوگی تو اللہ عذاب بھیجے گا۔ اب یہ وائرس انسان کا بنایا ہوا ہو یا قدرت کا۔ نہ یہ ضروری ہے اور نہ ہی اللہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ ہر بار پتھر برسا کر یا زمین میں دھنسا کر ہی عذاب دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں بھی عذاب دیتا ہے۔ بہرحال ہمیں ہر حال میں اس سے معافی مانگنی چاہیے اور اس کا فضل مانگنا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو معاف فرمائے۔ آمین۔''

✠ رانا کلیم کی واپسی لیہ سے۔ ''سرورق کی حسینہ کسی اداس اور گہری سوچ میں ڈوبی نظر آئی جو شاید کسی آزاد نگر کا سوچ رہی تھی۔ مہندی کا ڈیزائن اگرچہ سادہ سا ہے تاہم اچھا لگا۔ کانوں میں بالیاں اگرچہ پرانے اسٹائل کی تھیں مگر اچھی لگ رہی تھیں۔ جون ایلیا کی سدا بہار تحریروں کی تعریف و توصیف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اداریہ کو آپ نے وقت اور حالات کی مناسبت سے اچھے پیرائے میں ڈھالا تھا۔ ریاض احمد بٹ وننگ پوائنٹ پر موجود تھے۔ بہت ہی طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر سسپنس کی بزم میں حاضر ہوا ہوں امید ہے دوست احباب اس غیر حاضری کو معاف اور درگزر فرمائیں گے۔ (اگرچہ مشکل ہے مگر چلیں...... نظرانداز کردیتے ہیں)۔ اسکول؍کالج لائف میں جب میں باقاعدگی سے سسپنس پڑھتا تھا تو الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیاں، محی الدین نواب کی آخری صفحات کی کہانیاں اور دیوتا کا سلسلہ آج بھی بہت یاد آتا ہے۔ کیا حسین دور تھا جب فرہاد علی تیمور کا سلسلہ ٹیلی پیتھی پر شاہکار عروج پر

عالی ملازمت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلتا رہا مگر وقت کی کمی اور دیگر مصروفیات کے باعث یہ سلسلہ ترک ہوتا چلا گیا۔ انجم فاروق ساحلی کیسے ہو؟ تبصرہ مختصر ہے مگر خوب ہے، محفل میں خوش آمدید۔ تحریر حضرت امام بری سرکارؒ کو مصنفہ صاحبہ نے کمال مہارت کے ساتھ تحریر کیا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی...... اس بار تاریخ کے اوراق کشید کر کے ڈاکٹر ساجد امجد تاریخی کہانی ''تدبیر بنی تقدیر'' لائے ...... یہ تاریخ بھی کیا خوب ہے۔ اب بات ہو جائے ملک صفدر حیات صاحب کی تفتیشی کہانی ''لیلۃ الحساب'' کی، ایک اچھی کہانی تھی مگر مجھے ایسا لگا جیسا میرے اردگرد ہی کہیں یہ واقعہ رونما ہوا ہے جسے ملک صاحب نے اپنے قلم سے بہترین پیرائے میں سمویا ہے۔ نُہی فردوس کی کہانی بھی اچھی تھی اگر یہ کہا جائے کہ حقیقت لکھی ہے تو اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوگی۔ ملک میں کورونا کی صورت میں جو وبا آئی ہے اس میں جوش سے زیادہ ہوش اور احتیاطی تدابیر سے ہی اسے شکست دی جاسکتی ہے ...... غلام قادر کی طوائف زادی ایک دلوں کو چھو لینے والی روداد ہے۔ طاہر جاوید مغل کو سسپنس کے آخری صفحات پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانی اور انداز ہمیشہ کی طرح اچھا ہے۔ (اور اچھے تبصرے کو بھی اچھا کہنا چاہیے...... بہت شکریہ جناب)۔''

⁂ مہتاب احمد کا خط حیدر آباد سے۔ ''اگست کا شمارہ ملتے ہی بے چینی سے طاہر جاوید مغل کی کہانی کا رخ کیا۔ طاہر جی کیا خوب لکھتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیاں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بدلتے راستے میں سنبل کا کردار بہت اچھا تھا۔ عدیل نے جرأت دکھائی اور فریال اور اس کے باپ کو سبق سکھایا۔ ویسے ہماری پولیس سے ایسی توقع......؟ خیر اچھے بُرے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ کہانی پڑھنے کے بعد فہرست دیکھی اور پہنچ گئے اسما قادری صاحبہ کی شہ زور پر۔ شہ زور بہت اچھی جا رہی ہے۔ کہانی کی روانی بتا رہی ہے کہ آگے چل کر اسٹوری اور ایکشن والی اور مضبوط ہونے والی ہے۔ معاذ بے چارہ مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔ اچھا خاصا قید سے نکل گیا تھا مگر معظم شاہ اور اس کی بیوی کو بھگانے کے چکر میں دوبارہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ویسے کہانی لگتا ہے اور دلچسپ ہوگی کیونکہ ستاروں کا علم اور فیفو کی دی گئی سوغات کافی حیرت انگیز ہیں۔ ادھر بشریٰ باذل کو مزہ چکھانے کے لیے بے تاب ہے۔ آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ناہید سلطانہ کی غدا اور امید بھی اچھی رہی۔ کورونا کی صحیح صورتِ حال پیش کی۔ اندازِ بیاں بہت اچھا جا رہا ہے۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ ملک صفدر حیات کی لیلۃ الحساب بھی اچھی رہی۔ کافی دلچسپ رہی۔ کھیتوں کی کھدائی اور پھر نا کامی اور اس کے بعد اختتام کافی بہترین رہا۔ عمر عبداللہ کی ساشا بھی بہترین جا رہی ہے۔ جس طرح ساشا نے کم وقت میں اپنی صلاحیتیں منوائی ہیں، لگتا ہے وہ کسی سازش کا شکار ضرور ہوگا۔ سب سے بڑھ کر امیر ارغل کی بیٹی اس کی دشمن ہے۔ لوئیس کی ہلاکت میں ساشا کا کردار تھا لہٰذا وہ اسے معاف نہیں کرے گی۔ ادھر داؤد نے بروقت پہنچ کر سارہ کو بچا لیا ورنہ وہ مذہب کے نام پر درندوں کا شکار بن جاتی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تدبیر بنی تقدیر کافی پیچیدہ کہانی تھی۔ بہرحال اچھی رہی۔ نجمہ مودی کی پارٹ ٹائم، تنویر ریاض کی حسنِ کارکردگی، شاہ زین رضوان کی وہ رات، نعمان اسحاق کی لاٹری، نُہی فردوس کی وبا اچھی کہانیاں رہیں۔ غلام قادر کی طوائف زادی، روزگار امجد اقبال، افتخار حسین کی اسمگلر بس ٹھیک رہیں۔ حضرت بری امام سرکارؒ کے بارے میں پڑھ کر دل ایمان کی روشنی سے منور ہو گیا۔ ویلڈن رضوانہ ساجد جی۔ انشائیہ بھی غور و فکر کے در وا کر رہا تھا۔ اگست کا شمارہ سسپنس بہترین رہا۔''

⁂ محمد زبیر ساگر کا گوجرہ سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ۔ ''عرض یہ ہے کہ جون جولائی کا سسپنس ملا تو دل خوش ہو گیا۔ جب سسپنس دیر سے ملتا ہے تو دل اداس ہو جاتا ہے۔ سسپنس ملتے ہی ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایک خوبصورت سی حسینہ اداس سی لگی۔ ٹائٹل بہت ہی پیارا لگا۔ جب سسپنس کھولا تو پہلے نمبر پر اپنا خط دیکھ کر دل خوشی سے جھوم گیا۔ بہت بہت زیادہ خوشی ہوئی مگر (ارے رے بھائی! زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی کہانی کمزور ہے۔ آپ دوسری تحریر بھیجیے ضرور جگہ ملے گی)۔ سبھی دوستوں کے تبصرے اچھے لگے مگر پرانے دوست ایک دم غائب ہو گئے۔ ریاض بٹ، عبدالجبار رومی صاحب، چلبلی ہیر صاحبہ۔ کہانیوں میں پہلی کہانی آوارہ گردی بیسٹ کہانی تھی۔ آخری حصہ بہت ہی زبردست تھا۔ چھوٹی کہانیوں فرار، مستقبل شناس، مسبب الاسباب، ہوش مند، ملی بھگت، پراسرار مسافر، خارِ زیست، انعام، عجوبہ، حضرت امام بری سرکار، سودا، اونچی اڑان، بدلتے راستے، سلسلے وار کہانیوں میں شہ زور، ساشا زبردست سلسلے ہیں۔ شہ زور بہت زبردست اسٹوری ہے اسما قادری میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ساشا عمر عبداللہ، بہت اچھی کہانی لکھ رہے ہیں۔ چھوٹی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ جون جولائی کا سسپنس بہت ہی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سسپنس ڈائجسٹ کو عروج کی بلندیوں پر لے جائے۔ یہ دعا ہر وقت دل سے نکلتی ہے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ریحانہ خان، پشاور۔ میمونہ عزیز، اسلام آباد۔ پرویز علی، گجرات۔ خالدہ نواز، کراچی۔ اسما علی، لیہ۔ محمد ذاکر، حیدر آباد۔ شاہینہ مشتاق، کوٹلی۔ اویس مظفر، بنوں۔

ایجنٹ وقارئین متوجہ ہوں

تمام ایجنٹ حضرات/قارئین کرام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اب مندرجہ ذیل تاریخوں میں ڈائجسٹ جاری کیے جائیں گے۔

نئے شمارے اکتوبر 2020ء سے ان تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ہر ماہ کی 20 تاریخ تک	ماہنامہ پاکیزہ کراچی ہر ماہ کی 25 تاریخ تک
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ہر ماہ کی 30 تاریخ تک	ماہنامہ سرگزشت کراچی ہر ماہ کی 03 تاریخ تک

نوٹ: تمام ایجنٹ حضرات جاسوسی اور پاکیزہ کے آرڈر 10 تاریخ تک بتادیں۔
سسپنس اور سرگزشت کے آرڈر 15 تاریخ تک بتادیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-(021) , 35895313-(021)

مقناطیسی کشش کے باوجود کچھ لوگ مخالف سمت میں چلنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر یہ کشش گاہے بگاہے اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے... اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب کسی کو تمام ان دیکھی زنجیریں ... توڑتے ہوئے اپنے مقصدِ حیات کے لیے اپنی مخصوص راہوں پر گامزن رہنا پڑتا ہے اور ایسی ہی آزمائش انہیں ثابت قدم ثابت کرتی ہے... وہ جو مشرق کا شہزادہ تھا جانے کیسے مغربی حسینہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا لیکن... بروقت آگاہی اور آزادی کی چاہ نے اس کے تمام مہکتے جذبوں کو کچل کر رکھ دیا... اپنی جاگیروں میں بسنے والے لوگوں کی فلاح کی خاطر اس نے اپنے دل کی جاگیر کو تباہ کر ڈالا کیونکہ... اس کے فرض کی پکار اور وطن دوستی کا تقاضا بھی یہی تھا... وہ جو پتھروں کی چٹانوں پر ایک خوب صورت ساز کی دھنوں سے کھیلتا رہتا تھا اب اس کے ہاتھوں میں تلوار نے جگہ لے لی تھی اور بالآخر مشرق و مغرب کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت نے کسی خوب صورت لمحے کی تلاش میں اپنی اپنی سمتوں کا سفر اختیار کر لیا...

ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

بے منزل مسافر

زویا اعجاز

اس بچے کی چمکدار نظریں دور فاصلے پر دھول اڑاتے ایک گھڑسوار پر گڑی تھیں۔ منظر کچھ مزید واضح ہوا تو دل میں یکا یک ہی خوشی سے شادیانے بجنے لگے۔

''باباجان آگئے۔ میرے باباجان آگئے۔'' وہ مسرت و جوش سے اچھل پڑا۔ ہاتھ میں مخصوص علاقائی ساز تھامے وہ ایک آبشار کے پاس پتھر پر بیٹھا تھا۔ اس گاؤں میں بچوں، بڑوں، جوانوں، بوڑھوں کو بندوق چلانے کے علاوہ دلربا ساز بجانے میں کمال ملکہ حاصل تھا۔ ہتھیار

اور سازان کی دیرینہ محبتیں تھیں۔

"کیسا ہے میرا شیر؟" گھڑسوار نے اسے دیکھتے ہی گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ کندھے سے لٹکتی بندوق اور پیٹ پر بندھی گولیوں کی چرمی بیلٹ سے اس کا شخصی تاثر مزید بارعب لگتا۔ ابتدائی کسر تو اس کا سرخ وسفید وجیہہ چہرہ، گھنی ڈاڑھی، قدرے لمبے بال اور گہری چمکدار آنکھیں ہی پوری کر دیتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت ایک آگ سی روشن دکھائی دیتی تھی جس کے باعث کوئی بھی اس سے نظر ملا کر بات ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حسن خاں تھا۔ شجاعت، ہمت، جرأت اور بغاوت کا ایک مجسم پیکر۔ وہ اس گاؤں کا سردار بھی تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا! آپ کو پتا ہے کہ میں نے اپنا نشانہ اور پکا کر لیا ہے۔" حسن خاں کے اکلوتے بیٹے پالے خاں نے فخر سے اپنی کارکردگی بتائی۔

"شاباش میرا بیٹا! اس دلربا سے محبت ضرور کرنا۔ روح کو غذا دینے کے لیے اس کی موسیقی سے لطف اندوز بھی ہونا لیکن یہ کبھی نہ بھولنا کہ ہم پٹھان ہیں۔ اسلحہ ہماری شان ہے۔ اس اسلحے کو ہی ہمیشہ اپنا مان اور عزت سمجھنا۔" حسن نے اس کا سر تھپکا۔

"میں ایسا ہی کروں گا بابا!" پالے خاں نے اپنے باپ کو یقین دلایا۔ حسن نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

"آپ میرے نشانے کا کمال نہیں دیکھیں گے بابا؟" پالے خاں نے پوچھا۔

"ضرور دیکھوں گا لیکن ابھی مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔" حسن نے اسے تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا۔

پالے خوشی سے نہال ہو گیا۔ والد کی آمد اور ان کے سامنے نشانہ بازی کا تصور ہی اس کے دل میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔ حسن خاں باوقار قدموں سے چلتا ہوا تھوڑی دور پن چکی کے پاس رک گیا۔ یہ پن چکی گل محمد کی ملکیت تھی۔ حسن کے اس سے بہت اچھے مراسم تھے۔ تعلقات کی یہ نوعیت صرف ذاتی حد تک ہی محدود نہ تھی۔ گل محمد کی اہلیہ کی وفات کے بعد پالے کی والدہ "راجا بی" نے زلیخا کو ماں جیسی محبت اور شفقت ہی دے رکھی تھی۔

پالے کی نظریں حسن خاں کی پشت پر گڑی تھیں۔ گل محمد سے چند لمحوں تک گفتگو کرنے کے بعد حسن آگے بڑھ گیا۔ اب وہ گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ اس کا رخ اپنے گھر کے بجائے عزیز از جان دوست شہباز خاں کی رہائش گاہ کی جانب تھا۔ شہباز خاں گاؤں کی مسجد کا پیش امام، مؤذن اور نگران تھا۔ اس کا مختصر سا گھر مسجد کے ساتھ ہی متصل تھا۔ والد کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی پالے نے اپنا ساز اٹھایا اور پتھر پر بیٹھ کر بجانا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں بڑی مہارت سے فضا میں خوشگوار سُر بکھیر رہی تھیں۔ سُروں کی برکھا نے اسے اس قدر بھگویا کہ وہ گردوپیش سے بالکل ہی بیگانہ ہو گیا۔ اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب زلیخا اس کے عقب میں چلی آئی۔ زلیخا کی بھوری آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ کشادہ پیشانی اور پہاڑی سیبوں سے بھی سرخ رخسار، تیکھی ناک اور سرخ رسیلے ہونٹوں کے عقب سے سفید موتیوں کی لڑی جیسے دانت اس پر نظر ٹھہرنے ہی نہیں دیتے تھے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا سا ہیجان کسی نئی شرارت کی آمد کا اشارہ دے رہا تھا۔ زلیخا کمر پر ہاتھ رکھ کر کچھ لمحوں کے لیے ساکت کھڑی رہی۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ پالے کی کمر سے آگے کرتے ہوئے گدگدی کی اور دائیں کان کے پاس اپنا چہرہ لے جا کر ایک خوفناک آواز سے اسے ڈرا دیا [illegible] اس کی دانستہ طور پر نکالی گئی بھاری بھرکم آواز [illegible] گیا تھا کہ یہ حرکت زلیخا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے زلیخا؟ تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ اس طرح اوچھی حرکتیں نہ کیا کرو۔" وہ اس کی مداخلت پر سخت کوفت زدہ ہوا تھا۔

"کتنے جھوٹے ہو تم پالے......" زلیخا نے آنکھیں پھیلائیں۔ "ایک سو نو مرتبہ کہی گئی بات کو سیدھا سیدھا ایک ہزار بتا دیا۔ توبہ ہے بھئی!"

"پھر وہی بچپنا!" پالے مزید جھنجلایا۔ "پتا نہیں کب بڑی ہو گی تم؟"

"ہائے اللہ! میں جانتی ہوں کہ تمہیں بھی میرے بڑے ہونے کا بہت انتظار ہے۔ میں تو خود اس وقت کے لیے کب سے گھڑیاں گن رہی ہوں۔" اس نے شرماتے ہوئے چہرہ چھپا لیا۔ آواز اب کسی مدھم سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔

"بدتمیز تو تم ہو ہی۔ اب لگتا ہے کہ باؤلی بھی ہو گئی ہو۔" پالے کو اس کے یہ انداز سمجھ ہی نہیں آ رہے تھے۔

"ہاں! باؤلی تو میں ہو گئی ہوں...... بہت باؤلی۔ دل چاہتا ہے کہ پنکھ لگا کر آسمان پر پرندے کے مانند اڑنے لگوں۔" زلیخا نے ایڑی کے بل جھومتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی ہر ایک حرکت پالے کی ناپسندیدگی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اسے فرحت و سرشاری میں جھومتی زلیخا کی اصل "خوشی" کا سبب معلوم ہی نہ تھا جبکہ دوسری جانب

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

زلیخا کی سماعت میں تھوڑی ہی دیر قبل پالے کی والدہ راجابی کے ادا کردہ چند الفاظ رس گھول کر اسے تتلی کی طرح رقصاں رہنے پر مجبور کررہے تھے۔ راجابی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''تیری ماں کی وفات کے بعد مجھے تیری اس قدر عادت ہوگئی ہے کہ ایسا لگتا ہے تیرے بغیر کوئی زندگی ہوگی ہی نہیں۔ بس آلیں خاں صاحب! میں ان سے بات کرکے بھائی گل محمد سے تیرا ہاتھ مانگ لوں گی۔''

زلیخا اسی ایک پل کی قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ پالے اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ راجابی کی ممتا کا بھی کوئی مول نہ تھا۔ عمر بھر اسی چھاؤں میں رہنے کا خیال ہی اسے ہواؤں کا ہم نوا بننے پر اکسا رہا تھا۔ زلیخا کے دلی جذبات اور والدہ کی خواہش سے بے خبر پالے نے ایک ناگوار نظر اس پر ڈالی اور قدرے فاصلے پر موجود دوسری چٹان پر دلربا لیے بیٹھ گیا۔ زلیخا اس کا برہم مزاج دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔ پالے نے ایک بار پھر فضا میں موسیقی کے سر بکھیرنے شروع کر دیے۔ زلیخا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر راجابی کی بات یاد کرکے مسکراہٹ در آتی۔

جذبوں کی یہ آنکھ مچولی کھیلتے اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ گلباز کس وقت وہاں چلا آیا۔ وہ انہی کا ہم عمر تھا۔ اس کا چہرہ استخوانی تھا۔ چھوٹی آنکھوں میں ایک مخصوص شاطرانہ چمک لہراتی دکھائی دیتی جو مقابل کو ایک عجیب کوفت نما کیفیت میں مبتلا کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت گلباز کے پاس ایک بندوق تھی جسے اس نے بڑے انداز سے اپنے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ زلیخا اور پالے خاں کو دیکھ کر اس کی نظروں میں ایک تپش پیدا ہوگئی۔

''کیا زمانہ آگیا ہے بھئی؟ اب پٹھانوں کے بچے میراثیوں جیسے کام کرکے اپنی قوم کی ناک کٹوایا کریں گے۔'' اس کے طنز پر پالے نے اسے نظر انداز ہی کیے رکھا۔ وہ اس وقت مکمل طور پر دلربا کے سحر میں گرفتار تھا۔ گلباز کی دال نہ گلی تو اس نے اپنی بندوق کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہا۔

''پٹھان بچوں کے کھلونے یہ سارنگی طبلے نہیں بلکہ ہتھیار ہوا کرتے ہیں۔''

گلباز کی یہ ہرزہ سرائی زلیخا سے برداشت نہ ہوسکی۔ وہ تنتناتی ہوئی اس کی طرف چلی آئی۔

''کیا زمانہ آگیا ہے بھئی! امام صاحب کا بیٹا دوسروں سے حسد بھی کرے گا۔''

شرمندہ

پہلا۔ ''وہ بدصورت عورت کون ہے؟''

دوسرا۔ ''وہ میری بیوی ہے۔''

پہلا۔ ''اوہ! معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔''

دوسرے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔''

مرسلہ: سمیرا ضیا..... کراچی

''میں تجھ سے بات نہیں کررہا زلیخا!'' وہ اس کا وار برداشت نہ کرسکا۔

''بڑا مان ہے نا تجھے اپنے مقابلے پر؟ چل مجھ سے مقابلہ کرکے دکھا۔'' زلیخا نے پھر تن کر کہا۔

''میں لڑکیوں سے مقابلہ نہیں کیا کرتا۔ وہ تو پہلے ہی نازک اور قابل رحم ہوتی ہیں۔ ہاں! اگر کوئی مرد کا بچہ ہے تو آئے میدان میں۔'' گلباز نے ترچھی نظروں سے پالے کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے! تو پھر اس پتھر پر نشانہ لگا کر دکھا۔ دیکھ لیتے ہیں کتنا بڑا بندوقچی ہے تو۔'' زلیخا نے اپنے ایک جانب پڑے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔

''اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' گلباز نے اکڑتے ہوئے کہا اور..... بندوق سے نشانہ باندھ لیا۔ نشانہ خطا ہوگیا۔ زلیخا ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگی پھر وہ پالے کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اب تم اپنا کمال دکھاؤ نا پالے!'' اس کے لہجے کی ملاحت پر گلباز جز بز ہوکر رہ گیا۔ پالے نے ایک سنجیدہ نظر اس پتھر پر ڈالی اور بے نیازی سے چہرہ موڑ کر بندوق اٹھاتے ہوئے بولا۔

''اس اتنے بڑے پتھر پر تو میں آنکھیں بند کرکے بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔'' پالے نے بندوق کی نال کندھے سے پچھلی جانب کی اور نہایت اعتماد سے لبلبی دبا دی۔ اس کا چھرا بالکل ٹھیک نشانے پر لگا۔ زلیخا کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔ وہ تالیاں بجا کر اچھلتی ہوئی گلباز کو مزید چڑانے لگی۔

''آیا ہا بڑا تیس مار خان! تم پالے کا مقابلہ کبھی بھی نہیں کرسکتے۔''

گلباز مزید طیش میں مبتلا ہوگیا

''کبھی کوئی چڑیا بھی ماری ہے اس بندوق سے یا صرف اٹھائے پھرنے کا ہی شوق ہے۔'' زلیخا نے طنز کا ایک اور وار کیا۔

"تیرا یہ غرور خاک میں نہ ملایا تو میرا نام بھی گلباز نہیں۔ ابھی یہاں چڑیوں کا ڈھیر لگا دوں گا۔" اس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور نشیب کی جانب چل دیا۔ زلیخا کی تمسخرانہ نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔

پالے بھی اب دلربا کے اس کھیل سے اکتا گیا تھا۔ اس نے گھر واپسی کا ارادہ کرلیا۔ زلیخا کے قہقہے بھی یکدم رک گئے۔ اس کی نظر دور دکھائی دینے والی پہاڑیوں کے دامن پر تھی۔

"پالے! وہ دیکھو ذرا۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ اڑتی ہوئی دھول دیکھ کر لگتا ہے کہ فرنگیوں کا قافلہ ادھر ہی چلا آرہا ہے۔"

"فرنگی...... اس وقت یہاں؟" پالے گھبرا گیا۔ دل و دماغ کو یکدم کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا۔ "یہ کسی کی مخبری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ......" وہ شدید پریشان ہو چکا تھا۔ وحشت زدہ نظریں انگریزی سرحد سے اس گاؤں کی طرف آنے والی کچی سڑک پر تھیں۔ انگریز افسر کی کمان میں فوج کا پورا دستہ اسی جانب گامزن تھا۔

"کیسی مخبری؟ اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟" زلیخا سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"تمہیں ان باتوں کی سمجھ نہیں آئے گی۔" وہ عجلت میں کہتا نیچے اتر گیا۔ زلیخا سخت تذبذب میں کچھ دیر تو وہیں کھڑی رہی۔ اس کے بعد کسی انجانی قوت کے پیشِ نظر اس کے قدم بھی اپنے گھر کی جانب مڑ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی حیرت کا ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ انگریزی دستے کا کپتان اس کی دہلیز پر گل محمد کے ساتھ کھڑا تھا۔ حیرت و خوف کے یہ لمحات اس قدر شدید تھے کہ اسے اپنے مکان کی آڑ میں کھڑا گلباز بھی نظر نہ آسکا۔ وہ یک ٹک اس انگریز افسر کی جانب دیکھتی رہی۔

"آپ بہترین وقت پر یہاں آئے ہیں کپتان صاحب!" گل محمد کی خوشامدانہ آواز زلیخا کی سماعت میں پڑی۔

"ٹم نے بولایا تھا، ہام کیسے نہ آتا؟" کیپٹن والٹر نے دانت نکوستے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہا۔

"آپ کا نمک حلال ہوں حضور!" گل محمد نے عاجزی سے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ......" اس نے گالی دیتے ہوئے پوچھا۔

"امام صاحب کے گھر میں گاؤں والوں کو لے کر بیٹھا ہے۔ آپ کے خلاف بھڑکا ہی رہا ہوگا انہیں۔"

"ہونہہ! آج کے بعد ایسا نا ہیں کڑ سا کے گا۔" والٹر نے تنفر سے کہا اور گل محمد کی جانب ایک نوٹ بڑھا دیا۔

"بہت شکریہ کپتان صاحب! بہت مہربانی مائی باپ!" والد کا یہ خوشامدانہ رویہ زلیخا کے دل پر آریاں چلا رہا تھا۔ وہ بے اختیار چلتی اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"ابا! یہ سب......" وہ بدقت اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ گل محمد نے درشتی سے اسے ٹوک دیا۔

"تو باہر کہاں مٹرگشت کرتی پھر رہی ہے؟ اندر چل فوراً!" اس کے انداز میں کافی عجلت تھی۔ زلیخا اس کی ہڑبڑاہٹ سے جان ہی نہ پائی کہ اس نے مکان کی آڑ میں کھڑے گلباز کو دیکھ لیا ہے۔

گلباز کے چہرے پر ہیجانی تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اس ماجرے سے مکمل آگاہ بھی ہو گیا ہے۔ اس نے کینہ توز نظروں سے گل محمد کو دیکھا اور واپس گاؤں کی جانب دوڑ لگا دی جہاں حسن خاں نے اہلِ علاقہ کو جمع کر رکھا تھا۔

☆☆☆

"حالات بہت خراب ہو گئے ہیں حسن خاں! فرنگیوں کا ظلم حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔" گاؤں کے ایک معمر شخص نے اس خصوصی ملاقات میں اپنی رائے دی۔

"یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ فرنگیوں کی آمد پر ہی ان کا راستہ روک دیا گیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنے کی نوبت ہی نہ آتی لیکن خیر! یہ باتیں اب ماضی کا حصہ ہیں۔ سانپ نکل چکا ہے۔ لکیر پیٹنے کا اب کوئی فائدہ ہی نہیں۔ اگر مگر اور کاش کے اس پھیر سے نکل کر ہمیں مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" وہ مدلل انداز میں اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہا تھا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے حسن خاں! فرنگی ہماری جڑوں میں گھس چکے ہیں۔ وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔" ایک ساتھی نے مایوسی سے کہا۔

"وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہو سکتے ہیں لیکن ایمان اور جذبے کی دولت سے بالکل محروم ہیں۔ طاقتور شخص بہت بزدل ہوتا ہے۔ اسے اپنی طاقت اور اقتدار کھو جانے کا خوف چین نہیں لینے دے سکتا۔ فرنگی بھی بزدل ہے۔ وہ ہم سے خوفزدہ ہے لیکن الٹا ہم اس سے مرعوب ہو کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔"

"ان کے پاس بکتر بند گاڑیاں، مشین گنیں اور بارودی ہتھیار ہیں۔" اسی معمر شخص نے جواب دیا۔

"ہمارے پاس شہادت کی تمنا، دشمن کو نابود کرنے کا حوصلہ اور جہاد کی قوت ہے۔ یاد کرو! آج سے کئی صدیاں

یہاں بھی حق و باطل کے ایسے معرکے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی دشمن تعداد میں غالب تھا۔ ہمیں تب بھی توکل اور قوتِ ایمانی نے ہی بچایا تھا۔'' حسن خاں کی زبان سے نکلتا ہر ایک لفظ وہاں بیٹھے افراد کے دلوں پر دستک دے رہا تھا۔ وہ اپنا [illegible] کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس وقت ہمیں صرف اتحاد کی ضرورت ہے۔ ہمارے گاؤں کی یہ جغرافیائی حالت فرنگیوں کو یہاں مشین گنیں، بکتر بند گاڑیاں لانے ہی نہیں دے سکتی۔ ایک طرف پہاڑ ہیں، دوسری جانب ٹیڑھے میڑھے راستے۔ وہ ہمیں بھی زیر نہیں کرسکیں گے۔ ہمارا اتحاد اور جذبہ کسی سیلاب کی طرح انہیں بہالے جائے گا۔ ہمیں آزادی یا موت کے سوا کوئی رستہ منظور نہیں ہے۔ ہم پہاڑوں کے بیٹے ہیں اور پہاڑوں ہی کی طرح [illegible] تان کر ہر فرنگی چال کا مقابلہ کریں گے۔'' حسن خاں کی [illegible] بیانی نے جرگے پر [illegible] طاری کردیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو حسن! ہم مرجائیں گے لیکن غلامی اور ذلت بھری زندگی برداشت نہیں کریں گے۔'' کئی ساتھیوں نے یک زبان ہوکر جواب دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب پالے خاں بھاگتا ہوا شہباز خاں کے گھر آیا تھا۔ تیز رفتاری کے باعث اس کا سانس غیر متوازن ہوچکا تھا۔

''کیا بات ہے پالے؟ تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' حسن خاں اس کی یہ حالت دیکھ کر چونک گیا۔

''میں نے گاؤں کی طرف فرنگیوں کو آتے ہوئے دیکھا ہے بابا! ان کے ساتھ ایک بڑی فوج ہے۔'' پالے نے ہانپتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ اس کے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہ تھے۔ اہل علاقہ کے چہرے جوش اور غضب سے تمتمانے لگے جبکہ کچھ کی حالت سراسیمہ بھی تھی۔

''فرنگیوں کی یہ آمد بے مطلب نہیں ہوسکتی۔ انہیں [illegible] نے میرے آنے کی اطلاع دی ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ سب اپنے گھروں میں لوٹ جائیں۔'' حسن نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''واہ حسن خاں! یہ بھی تم نے خوب کہی۔ ہمیں اتنا بزدل سمجھ رکھا ہے کہ ہم تمہاری حفاظت بھی نہیں کرسکتے۔ اگر فرنگیوں کی نیت تمہیں گرفتار کرنے کی بھی ہے تو ہم ایسا ہرگز ہونے نہیں دیں گے۔ ہم سب تمہارے سامنے فولاد کی دیوار بن کر کھڑے رہیں گے۔'' شہباز خاں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں آپ کے جذبے اور محبت کی قدر کرتا ہوں شہباز بھائی! لیکن حقیقت سے نظریں چرانا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے گاؤں کے یہ افراد محض چند سو ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں فرنگیوں کی آگ اگلتی بندوقیں ایسی تباہی برپا کرسکتی ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں اپنی وجہ سے آپ میں سے کسی کو یہ خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔''

''تو کیا ہم بے غیرتوں کی طرح تمہیں ان کے حوالے کردیں؟ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔'' گاؤں کے ایک غیر مسلم رہائشی رام ناتھ نے جواب دیا۔

''میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں بھائیو! لیکن میری ایک جان کے بدلے میں تم سب کی زندگیاں خطرے میں ڈالنا بھی تو حماقت ہے نا! وہ مجھے زیادہ عرصے تک اپنی حراست میں نہیں رکھ سکیں گے۔ تم لوگوں کو آج مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اپنا دفاع مضبوط کرلو! گاؤں کا ہر ایک گھر اسلحہ خانے میں تبدیل ہوجانا چاہیے۔'' حسن اب بھی اپنے حواس پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

''انشاء اللہ ہم ایسا ہی کریں گے لیکن تمہیں فرنگیوں کے قبضے میں جانے بھی نہیں دیں گے۔ میں تمہیں یہاں سے فرار کروادوں گا۔'' شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا مکان کی عقبی جانب لے گیا۔ اسی لمحے بھاری قدموں کی آوازیں سماعت پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔ کیپٹن والٹر اپنے دستے کے ساتھ مکان کے احاطے میں گھس آیا تھا۔

''اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہام اسے بھون ڈالے گا۔ بتاؤ حسن خاں کون ہے؟'' وہ کڑے تیوروں سے بولا۔

''میں ہوں حسن خاں!''

''حسن خاں میں ہوں!''

''میرا نام حسن خاں ہے۔''

مجمعے سے مختلف افراد یک زبان کہتے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ والٹر کا ذہن الٹ گیا۔ وہ انہیں مغلظات بکنے لگا۔ اسی اثنا میں شہباز خاں بھی اسی طرف چلا آیا۔ والٹر نے اس کی ریش، پیشانی پر محراب اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو گہری نظروں سے دیکھا اور معنی خیزی سے کہنے لگا۔

''توم ہام کو ان لوگوں کا ہولی مین لگتا ہے۔ ہام کو پتا ہے توم جھوٹ نا ہیں بولے گا۔ توم بتاؤ حسن خاں کدھر ہے؟''

''حسن خاں یہاں رہتا ہے۔'' شہباز خاں نے اپنے سینے کے بائیں جانب ہاتھ رکھا۔

''نان سینس! توم لوگوں کو پتا نا ہیں کہ ہام کیا حشر کرے گا؟'' وہ غصے سے پھنکارا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں کپتان صاحب! یہاں کسی بھی

پٹھان کا سینہ چاک کر کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو حسن خاں ہی نظر آئے گا۔'' شہباز نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تو تم ایسا نا ہیں سمجھے گا۔'' والٹر غصے میں آیا اور شہباز کو ریش سے گھسیٹ کر فرش پر گرا دیا۔

''کپتان صاحب! ہمارے امام کو ہاتھ بھی لگایا تو خدا کی قسم یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔'' سلیم خاں نے چلا کر کہا۔ والٹر نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا اور شہباز کو گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ جرگے کے افراد میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی آستینیں تانے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ والٹر ان کی یکدم پیش قدمی سے بوکھلا گیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے وہاں موجود افراد کو اپنی بندوقوں کے کندوں اور بھاری جوتوں کی ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔

''ہام ٹین تک کاؤنٹ کرے گا۔ حسن خاں کا پتا نہ بتایا تو ہام سب کو اڑا دے گا۔'' وہ چیخ کر بولا اور ہیجانی انداز میں گنتی کا آغاز کر دیا۔ چھت کے روشن دان سے اوپر موجود حسن خاں کے لیے اب یہ صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ اپنی ذات کی وجہ سے کسی بھی ساتھی کو آنے والی معمولی سی خراش بھی اسے گوارا نہ تھی۔ اس نے بلا تامل ایک فیصلہ کیا اور روشن دان سے کود کر نیچے چلا آیا۔

''یہ لیجیے کپتان صاحب! میں یہاں موجود ہوں۔ واللہ! مجھے تو علم ہی نہیں تھا انگریز سرکار مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ میرے لیے استقبال کے لیے اتنی بڑی برات لے آؤ گے۔'' اس کی بات نے کیپٹن والٹر کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ کر دیا۔

''اس کی باتوں کا یقین نہ کیجیے گا کپتان صاحب! یہ پتا نہیں کون ہے۔ ہم نہیں جانتے اسے۔'' شہباز نے بوکھلا کر کہا۔

''نہیں میرے دوست! میں تمہاری محبت کا مقروض رہوں گا لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور فکر کیوں کرتے ہو؟ یہ علاقہ بہت غیور اور زرخیز ہے۔ یہاں ایک حسن خاں کے نہ ہونے سے ہزاروں حسن اور پیدا ہوں گے۔ تم اپنا وعدہ یاد رکھنا بس۔''

''اریسٹ کرو اسے ابھی۔'' والٹر اس کی باتیں سن کر پیچ و تاب کھانے لگا تھا۔ حسن کا چوڑا سینہ جوش اور ہیجان سے پھولنے اور پچکنے لگا۔ اس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور بلند آواز سے بولا۔

''غلامی کی لعنت کسی صورت قبول نہ کرنا۔ ہم آزاد ہیں.... آزاد ہی مریں گے۔ ان فرنگیوں کو کبھی ان کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دینا۔ یہ قبائلی علاقے ان کے غرور اور فرعونیت کا قبرستان بنا دینا۔'' حسن کی آواز میں ایک گرج' لپک اور شعلہ تھا جس نے وہاں موجود ہر ایک شخص کے دل میں چنگاری پیدا کر دی۔ ایک دھیمی آنچ میں سلگتے جذبوں کو نئی حدت مل رہی تھی۔

''انقلاب.....'' حسن خاں بلند آواز میں چلایا۔

''زندہ باد'' بیسیوں جوابی آوازیں بلند ہوئیں۔

کیپٹن والٹر کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ سلگتی نظروں سے حسن خاں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ حسن کے ہاتھوں میں بندھی رسی اس کے گھوڑے کی عقبی ٹانگوں سے باندھ دیں۔ سپاہیوں نے فوراً ہی طور پر حکم کی تعمیل کر دی۔ والٹر گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے چابک رسید کرتے ہوئے ایڑ لگا دی۔ گھوڑے سے لگنے والا جھٹکا حسن خاں کو زمین بوس کر گیا۔ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو فرنگی پاہی بندوق کے کندوں سے زخمی کرنے لگے۔ پالے بھی ایسی ہی کسی بندوق کی زد میں آ کر نیچے جا گرا۔ اہلِ علاقہ کی چیخ و پکار' جدوجہد سب رائگاں گئی۔ والٹر اپنا گھوڑا آگے بھگا لے گیا۔ حسن خاں کی حالت مخدوش تھی۔ اس کا وجود چٹانوں اور پتھروں سے ٹکرا کر زخموں سے چُور ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے علاوہ مزید جانے کتنی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز گھوڑے کی ٹاپوں میں دب کر رہ گئی۔ سر کسی تربوز کے مانند پھٹ گیا اور جسم پر لاتعداد زخم اپنے پیچھے لہو کی طویل قطار بنا رہے تھے۔ والٹر کی انا کو تسکین ملی تو اس نے گھوڑا روک کر سپاہیوں کو رسی کھولنے کا حکم دے دیا۔

''فیوچر میں کوئی بھی حسن خاں بننے سے پہلے ہام کا نام ضرور یاد کر لے۔'' والٹر نے تنبیہہ کی اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ شہباز خاں نے جاں بہ لب دوست کا کٹا پھٹا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ پالے کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے جسم سے روح کا تانوں پر گھسیٹ لایا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور والد کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کوشش سے حسن کی کلائی اور بازو جھول کر رہ گئے۔ درد کی ایک تیز لہر نے اسے نڈھال کر دیا لیکن اس کے باوجود وہ ضبط کی مثال بنا رہا۔

''پالے! انہیں میرے بچے..... رونا نہیں..... رلانا ہے..... تم نے..... فرنگی کو..... رلانا ہے۔'' حسن کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ پالے کو اپنے آنسوؤں میں آتشیں جلن محسوس ہونے لگی۔ حسن کا سانس

تیزی سے اکھڑ رہا تھا۔

''امام صاحب! یہ سب کیسے ہو گیا؟ سردار کی آمد کا فرنگیوں کو علم کیسے ہوا؟ وہ پہلے بھی تو چھپ چھپا کر آتے تھے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' سلیم خاں کے یہ الفاظ اہلِ علاقہ کے دلی جذبات کی ترجمانی تھے۔

''یہ کسی اپنے کی مخبری کا نتیجہ ہے۔ ہم کسی کے دھوکے اور لالچ کا شکار ہوئے ہیں۔'' شہباز دہرے صدمے میں مبتلا تھا۔ قریبی دوست اور علاقے کے سردار سے محرومی کے بعد یہ دکھ بھی وبالِ جان بن رہا تھا کہ حسن خاں کو اس کے گھر اور احاطے سے گرفتار کیا گیا ہے۔

''ایسی رذیل حرکت آخر کس نے کی ہوگی؟'' رام ناتھ... نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں [illegible] حرکت [illegible] کی ہے'' گلباز نے [illegible]

الفاظ [illegible]

[illegible] ایک [illegible] اس وقت یہاں موجود ہی نہیں'' گلباز کے اس انکشاف پر حسن کی آنکھوں میں زندگی کی جوت مزید بجھ گئی۔

''گل محمد...... وہ کہاں ہے؟'' شہباز نے فوری طور پر نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں۔

''فرنگی نے اسے بہت زیادہ پیسا دیا ہے۔ وہی سنبھال رہا ہوگا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' گلباز کا ہر ایک لفظ پالے کی روح کو زخمی کر رہا تھا۔

''زندہ نہیں چھوڑوں گا میں اسے۔'' وہ بے قابو ہو کر گل محمد کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں بھی کئی افراد موجود تھے۔ وہ گل محمد کی اس حرکت پر اسے نازیبا کلمات سے نوازتے ہوئے اس کے لیے مذموم عزائم کا اظہار کر رہے تھے۔ پالے کو ان کی آوازیں شہد کی مکھیوں جیسی تیز بھنبھناہٹ سے زیادہ محسوس نہ ہو رہی تھیں۔ اس کی سماعت، بصارت ہر حواس پر حسن خاں کا کٹا پھٹا وجود طاری تھا۔ گل محمد کے گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ پالے کسی بگولے کے مانند اندر داخل ہوا تو ایک غیر معمولی احساس نے اسے چونکا دیا۔ گھر میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے افراد نے ہر ایک کونا چھان مارا لیکن گل محمد اور زلیخا کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔

''ضرور فرار ہو گیا ہے مردود!'' سلیم نے دانت کچکچائے۔

''پہلے تو بیٹی کو بھی بھابی خانم کے گھر گھسائے رکھتا تھا بہانہ یہ تھا کہ اکیلا اس کی پرورش نہیں کر سکتا۔ اب اسے بھی ساتھ ہی لے گیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی ان کے گھر مخبری ہی کرتی ہوگی۔ اب کیا پرورش ہو جائے گی اس کی اکیلے گل محمد سے؟'' ہجوم سے ابھرنے والی یہ سرگوشی پالے کے وجود میں ہیجان برپا کر گئی۔ اسے زلیخا کے لیے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

''آج تو بھاگ گیا ہے لیکن کبھی نہ کبھی یہ ضرور لوٹے گا۔ بابا کہتے ہیں کہ مجرم ایک بار اپنے جرم کی خلش میں اس جگہ کا رخ لازمی کیا کرتا ہے۔'' پالے کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ بابا کا خیال آتے ہی حسن خاں کا شکستہ وجود ذہن کو بری طرح جھنجھوڑ گیا اور وہ اسی شدت سے واپس پلٹ گیا۔ شہباز خاں کے گھر میں کہرام سا برپا ہو چکا تھا۔ آوازیں، غصہ، تاسف، للکارے اور ان سب کے درمیان ماتم کرتی ایک دلدوز صدا۔ پالے کے قدم منوں بھاری ہونے لگے۔ اپنی والدہ کے توقع سامنا ہرگز آسان نہیں تھا۔ آسان تو بہرحال والد کی لاش کا نظارہ بھی نہ تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے بیٹے کی نشانہ بازی دیکھنے کا عہد کیا تھا اور ابھی تھوڑے ہی وقت پہلے تو وہ اپنے ساتھیوں میں آزادی کی ایک نئی روح پھونک رہا تھا۔ اور اب اس لمحے وہ بے جان ہو چکا تھا۔ پالے کا دل کسی نے زور سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں راجا بی کی جانب مرکوز تھیں۔ اس کی خوبصورتی، شباب اور وقار بے مثال تھے اور اب اس حسن کو بیوگی کا گرہن لگ گیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اپنے زیور نوچ کر پھینک رہی تھی۔ پالے خاں کے دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ علاقہ نے حسن کی میت کو غسل دیا اور تدفین کے مراحل بھی مکمل کر دیے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ پالے پر بظاہر سکتہ طاری تھا لیکن کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں کیسا ہیجان برپا ہے۔

وہ رات اس علاقے کے تین مکینوں پر ان چاہی تبدیلی کا آسیب بن کر آئی تھی۔ اپنی والدہ کے ساتھ لیٹا پالے خاں آتشِ انتقام میں جھلس چکا تھا۔ اس نے اپنی ذات سے ایک عہد لیا تھا کہ وہ والد کی وصیت کے مطابق انگریزوں کو آٹھ آٹھ آنسو رونے پر مجبور کرے گا۔ ان کے لیے سراپا قہر بن جائے گا۔

ایک بگھی میں بیٹھی زلیخا سیاہ آسمان کے آنچل میں اٹکے تاروں کو افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔ کیپٹن والٹر کے پیسے تھمانے کے بعد گل محمد وحشت ناک انداز میں اسے گھسیٹتا ہوا اس سواری تک لایا تھا اور اس کے بار بار پوچھنے کے باوجود ابھی تک منزل کا نشان نہ بتایا تھا۔ زلیخا پر تو ایک

قیامت بیت گئی تھی۔ والد کا یہ گھناؤنا کردار، حسن خاں کا متوقع انجام، پالے اور راجا بی سے اچانک دوری سے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جینے کا مقصد ہی ختم ہوگیا ہو۔ اس جذباتی کشمکش میں زلیخا نے خود سے عہد کیا کہ وہ یہاں لوٹ کر ضرور آئے گی۔ راجا بی اور پالے کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا کر گل محمد کی جانب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے گی۔ اس وقت کی طوالت کا تو اسے اندازہ نہ تھا لیکن انتظار ابھی سے بوجھل کیفیات طاری کررہا تھا۔

تیسری جانب گلباز کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ زلیخا کے ہاتھوں محسوس ہونے والی تذلیل کی جلن اپنی جگہ سہی لیکن اس وقت وہ فرنگی طاقت کے مظاہرے پر حیران تھا۔ لمحے سرکنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ حیرت حسرت اور پھر جوش میں تبدیل ہونے لگی۔ گلباز کے دل میں طاقتور بننے کی تمنا مچلنے لگی۔ فرنگی کے پاس دولت، اختیار، عزت سب کچھ تھا۔ ہر کوئی ان کے سامنے سر جھکاتا تھا، ڈرتا تھا، دبے رہنے پر مجبور تھا۔ اسے بھی ایسا ہی منصب درکار تھا۔ اس لمحے گلباز نے بھی خود سے عہد کیا کہ وہ فرنگیوں کی طرح ہی طاقتور بنے گا۔ موقع ملا تو ان سے بھی زیادہ۔

رات کا سفر دھیرے دھیرے طے ہورہا تھا۔ تین مختلف افراد کے یہ عہد اور متضاد کیفیات مستقبل قریب میں ایک تصادم بننے والے تھے اور یہی تصادم ایک تاریخ رقم کرنے والا تھا۔

☆☆☆

راجا بی نے بیوگی کی چادر اوڑھ کر پالے کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیا۔ پالے خاں ہر لمحے اپنے عہد کی آتش میں جھلسا کرتا۔ اس نے اپنے لیے ایک راہ متعین کرلی تھی اور اسی مقصد کے لیے اسلحے کے استعمال کے بعد جسمانی تربیت پر بھی توجہ دینی شروع کردی۔ حسن کے عسکری ساتھی اسے اپنے ہمراہ لے گئے۔ آزمائش اور تربیت کی بھٹی سے گزار کر وجود کو فولاد اور ارادے مزید پختہ بنانے لگے۔ پالے کا جنون بھی رنگ لانے لگا۔ عہدِ شباب تک قدم رکھتے ہی وہ فرنگیوں سے نفرت اور عسکری مہارت میں اپنے جوبن پر تھا۔

کچھ وقت اور گزرا تو اس نے اپنے پاؤں پھیلانے کا آغاز کیا۔ انگریزی راج کے علاقوں میں نکل کر منتخب شدہ فرنگیوں کو سزا دیتا تو دوسری جانب اپنے علاقے کی جانب آنے والی ٹیڑھی میڑھی سڑک، نالوں اور ژوب ندی کی ایسی کڑی حفاظت کرتا کہ حکومتِ برطانیہ کی جانب سے متعین

کردہ پولیٹیکل ایجنٹس اپنے منصوبوں کی ناکامی اور اس کے ہاتھوں اٹھائے جانے والے نقصانات پر بے بسی سے سر پیٹ کر رہ جاتے۔

اس گزرے وقت میں وہ اونچی نیچی ناقابلِ عبور پہاڑیوں سے گزرتی تنگ کچی سڑک، طوفانی ندیوں اور غیور پٹھانوں کو تسخیر ہی نہیں کرپائے تھے۔ آزاد قبائلی علاقوں سے آزادی کی روح کچل کر انہیں اپنے قدموں میں جھکانا ان کا دیرینہ خواب تھا جو ہندوستان پر قبضے کے اتنے برس بعد بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں آزادی کے شعلے جوبن پر تھے۔ انگریز افسران کی مشکلات کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ میجر بارنس بھی ایسا ہی ایک پولیٹیکل ایجنٹ تھا جو حال میں ہی وزارتِ خارجہ میں اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کے بعد ہندوستان تعینات کیا گیا تھا۔

بریگیڈ کے انٹیلی جنس افسر نے اسے تقرری کے پہلے ہی روز دفتر بلوا کر گزشتہ ڈیڑھ درجن سے زائد پولیٹیکل ایجنٹس کی ناکامی اور علاقے میں پالے خاں کے اثر رسوخ کے متعلق بتادیا۔ میجر بارنس کی فراست نے فوری طور پر یہ بھانپ لیا کہ پالے خاں کا کانٹا ہٹائے بغیر برطانوی حکومت اس علاقے میں اپنی مخصوص حکمتِ عملی کے تحت ترقیاتی منصوبوں کی آڑ میں پاؤں نہیں پھیلا سکتی۔ ملاقات کے اختتام پر وہ سوچ میں گم اپنی رہائش گاہ پر چلا آیا۔ خوبصورت باغیچے میں ایک چھتری تلے دو کرسیاں اور میز پڑی تھی۔ میجر بارنس تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھا اور دور نظر آتی پہاڑیوں پر نظریں جمائے اپنے ممکنہ اہداف کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کے سامنے دو راہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو اہلِ علاقہ پر اپنا اعتماد قائم کرنا بہت ضروری تھا۔ اس کے بغیر تو پالے خاں کو کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس طرح مقامی افراد مزید مشتعل ہوجاتے اور ایک پالے خاں کے بعد بیسیوں ایسے جنگجو مزید پیدا ہوجاتے۔ میجر بارنس ہندوستانی ثقافت اور روایات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ ''تقسیم کرواور راج کرو'' کے علاوہ یہاں کوئی حکمتِ عملی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تشدد اور جبر کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہندوستانی.... سرزمین جنگجوؤں کے لحاظ سے بہت زرخیز تھی۔ ابھی سوچوں میں مگن میجر بارنس اردلی کی آمد سے چونکا۔ وہ چائے کے برتن بڑی نفاست اور سلیقے سے اس کے سامنے میز پر رکھ رہا تھا۔ اردلی مخصوص سفید سرکاری وردی میں ملبوس تھا۔ کمر پر

سیاہ رنگ کی چوڑی پٹی بندھی تھی۔ مجموعی طور پر وہ متاثر کن شخصیت کا باادب اور معاملہ فہم شخص معلوم ہوتا تھا۔

''تمہارا نام وزیر علی ہے نا؟'' بارنس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاحب! ناچیز کو وزیر علی خاں کہتے ہیں۔'' مؤدبانہ جواب ملا۔

''یہاں کب سے ہو؟''

''کئی سالوں سے صاحب! میرا ریکارڈ یہاں بہت اچھا ہے۔ میں نے بہت سے صاحب لوگوں کی خدمت کر رکھی ہے۔'' اس کا ہر ایک انداز شائستہ تھا۔

''ہوں..... میں نے پہلے پولیٹیکل ایجنٹس سے تمہارے بارے میں کافی اچھی رائے سنی ہے۔''

''یہ تو صاحب لوگوں کا بڑا پن ہے۔ میں تو بس اپنی ذمے داریاں مکمل ایمانداری سے نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''گڈ! ایماندار اور وفادار لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔'' بارنس ہلکا سا مسکرایا۔

''ایک بات پوچھوں صاحب جی؟'' وزیر علی نے اپنی ایک الجھن کو زبان دی۔

''یہی پوچھو گے نا کہ میری زبان دوسرے آفیسرز کی نسبت اتنی صاف کیسے ہے؟'' بارنس نے اس کی الجھن بھانپ لی تھی۔

''جی ہاں! کیونکہ آپ پہلے افسر ہیں جن سے مجھے انگریزی میں بات نہیں کرنی پڑی۔'' وزیر علی جھینپ گیا۔

''میں کسی بھی علاقے میں جانے سے پہلے وہاں کی زبان اور کلچر سب سے پہلے سیکھتا ہوں۔ ہندوستانی زبان تو ایک عرصے سے سیکھ رکھی ہے۔ مجھے یہ علاقہ پسند ہی بہت ہے۔ یہ کبھی کبھی ایک محبوبہ کی طرح لگتا ہے۔ خود تک رسائی کے لیے کبھی آسان رستے نہیں دیتا۔ اسے پا کر بھی مکمل پا لینے کا اطمینان ہی نہیں ہوتا۔'' میجر بارنس کے اس کھوئے کھوئے انداز پر وزیر علی چونک گیا۔ اسے اپنا یہ نیا صاحب کافی مختلف محسوس ہوا تھا۔ اس سے قبل افسران اتنے رومان پسند یا مثبت سوچ کے حامل نہیں تھے۔ وہ ہندوستان' اس کے عوام اور انقلاب پسندوں کو برا بھلا کہنے میں مغلظات کی حدود بھی پار کر جاتے۔

''کیا سوچنے لگے وزیر علی؟'' بارنس نے اس کی کیفیت ایک بار پھر بھانپ لی تھی۔

''سوچ رہا ہوں صاحب کہ آپ جیسا افسر اس علاقے میں پہلے کیوں نہیں آیا؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''کوئی بات نہیں! اب جو آ گیا ہوں۔'' میجر بارنس مسکرایا۔ اسے اردلی سے بات کر کے بہت لطف آ رہا تھا۔

''میری دعا ہے کہ آپ کو یہاں بہت سی کامیابیاں ملیں صاحب!'' وزیر علی نے خلوص سے کہا۔

''پالے خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی جو سب جانتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر تو اسے کبھی نہیں ملا البتہ سنا یہی ہے کہ انگریزوں سے سخت دشمنی رکھتا ہے۔''

''ہاں! آج میں نے بھی یہی کچھ سنا۔ افسروں نے تو یہاں تک رائے دی کہ اس گاؤں کو بمباری کر کے تباہ ہی کر دیا جائے۔'' بارنس نے چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے بتایا۔

''اوہ..... اور آپ کا کیا خیال ہے؟'' وزیر علی اپنی تشویش بہ مشکل پوشیدہ رکھ پایا۔

''میں اس فیصلے کے حق میں نہیں۔ ایسا کرنے کی غلطی کی تو علاقے کا ہر پٹھان ہمارا دشمن اور ان پہاڑوں کا ہر ایک پتھر پالے خاں بن جائے گا۔'' بارنس کے مضبوط اور دوٹوک انداز پر وزیر علی کی آنکھوں میں ستائش کی چمک ابھری۔

''میں تو کم علم' نادان سا آدمی ہوں صاحب! سیاست اور ملٹری کے ان معاملات کی مجھے بھلا کیا سمجھ؟ مجھے تو صرف اتنا ہی علم ہے کہ آگ سے آگ کبھی نہیں بجھائی جا سکتی۔'' وہ سادگی سے بولا۔ یک لخت اسے احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا ہے۔ اس لیے خاموشی سے چائے کے برتن سمیٹے اور تعظیم دیتا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے روانہ ہوتے ہی میجر بارنس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اسے یہ اردلی کافی باشعور اور غیر جانبدار محسوس ہوا تھا۔ بارنس عموماً کسی ملازم سے ایسی بے تکلفی کا قائل نہیں تھا لیکن وہ دور اندیش انسان تھا۔ اسے علم تھا کہ انگریز افسران کے ملازمین کہیں نہ کہیں ان کا ''کیریکٹر سرٹیفکیٹ'' ثابت ہوا کرتے ہیں۔ ان کی رائے اور تجزیہ اہل علاقہ میں مستند سمجھے جاتے ہیں۔ یہ نچلا طبقہ ہی افسران کی نرم دلی یا سخت گیری کے قصے مشہور کرتا ہے۔ بارنس کو امید تھی کہ اس کے یہ ملازمین بھی کٹھ پتلی کی طرح اس کے دوستانہ مزاج اور مفاہمت پسندی کی نمائش ضرور کریں گے۔ اس علاقے میں آنے سے قبل وہ مکینوں کی فطرت و عادات کے متعلق بھی مکمل معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ لوگ غیور اور بہادر ہیں۔ ان کی سب

سے بڑی کمزوری سادہ دلی تھی اور بارنس نے اسی کمزوری کا فائدہ اٹھانا تھا۔ میجر بارنس کے ذہن میں منصوبوں کی ایک مکمل کھیپ تھی۔ وہ اپنے پیش روؤں کے برعکس جبر یا ظلم وزیادتی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ سیاست کے استعمال سے کام نکلوا کر اپنی طاقت کو محفوظ اور توانا رکھنا بھی اسے آتا تھا۔ اس علاقے میں اسے ایک نئے کھیل کا آغاز کرنا تھا۔

ان سوچوں میں غلطاں وہ تاحدِ نظر دکھائی دینے والی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ ان بلند پہاڑیوں میں برفیلی ہوا شور مچاتی پھر رہی تھی۔ پہاڑیوں کے دامن میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں۔ اسے سب سے زیادہ تحفظات قلعہ نما مکانات سے تھے۔ ان مکانات کے چاروں کونوں پر مینار بنے ہوئے تھے۔ انہی میناروں پر بیٹھ کر مقامی لوگ رات کو بھی گاؤں کی حفاظت کے لیے پہرا دیتے تھے۔ کچھ دیر اسی مشغلے میں الجھے رہنے کے بعد اس نے سوچوں کی مہار اپنی لاڈلی بیٹی ایلن کی طرف موڑ دی۔ ایلن نے بذریعہ ٹرین یہاں پہنچنا تھا۔ بارنس علاقے کی صورتِ حال کے پیشِ نظر اسے تنہا سفر کرنے کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے ماتحت کپتان کو بلا بھیجا۔ وہ ایک مقامی شخص تھا اور اپنی وفاداری و لگن سے بہت کم وقت میں برطانوی حکومت کے دل میں گھر کر گیا تھا۔

''سلیمان خیل پر ریڈ کیسی رہی کیپٹن؟'' میجر بارنس نے نپے تلے انداز میں پوچھا۔

''ریڈ تو اتنی کامیاب نہیں رہی سر! ہمارے کافی سپاہی کام آگئے ہیں۔ اچھی خبر بہرحال یہ ہے کہ ہم نے ان کا ایک ساتھی گرفتار کرلیا ہے۔ امید ہے کہ وہ جلد ہی باقی ساتھیوں کا پتا ٹھکانا بھی بتادے گا۔''

''گڈ! مجھے ہر حال میں رزلٹ چاہیے۔'' میجر کی اس بات پر کیپٹن نے تعظیمی انداز میں سر جھکایا اور واپس پلٹ گیا۔

''اس آدمی کی آنکھوں میں بے حسی لالچ اور خودغرضی کی ایک چمک دکھائی دے رہی ہے۔ بہت کام کا شخص ثابت ہوگا یہ۔'' بارنس کے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در یچہ کھل گیا۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہوچکی تھی۔ ہر سو اندھیرا اور سرد ہوا کی شائیں شائیں تھی۔ پہاڑوں کے وسیع دامن میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔ ایک سیاہ پوش وجود اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہورہا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت کے علاوہ ہوشیاری اور چستی بھی نمایاں تھی۔ وہ کسی پیچیدہ راستے سے اس ڈھلان پر آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ماہرانہ انداز میں ڈھلان سے اترا اور گھوڑے کا رخ قبرستان کی جانب موڑ دیا۔ آسمان پر پورے چاند کی روشنی قبرستان کو بھی منور کیے ہوئے تھی۔ سیاہ پوش احتیاط سے قبروں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے ایک مخصوص قبر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دودھیا چاندنی کتبے پر چمک رہی تھی۔ سیاہ پوش نے بڑی محبت سے کتبے پر نظر آتے الفاظ 'حسن خاں' پر ہاتھ پھیرا اور ایک جانب سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگالی۔ دودھیا چاندنی میں اس کی طویل قامت' سرخ وسفید رنگت' مضبوط جسامت' چٹانی آنکھیں اور سیاہ ڈاڑھی شخصیت کو نہایت جاذبِ نظر بنا رہی تھی۔ وہ حسن خاں کا اکلوتا بیٹا پالے خاں تھا جو ہر جمعرات کو اپنی والدہ سے ملنے سے قبل والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے ضرور آتا۔ اس کے کندھے پر بندوق اور کمر پر گولیوں سے لیس بیلٹ بندھی تھی۔ مٹی آنکھوں سے لگانے کے بعد اس نے بڑی عقیدت سے فاتحہ پڑھی اور واپس ہولیا۔ اب اس کا رخ گاؤں کی جانب تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان جانے پہچانے راستوں سے گزرتا ایک چوبی دروازے تک پہنچ گیا۔ گھوڑے سے اتر کر اسے احاطے میں باندھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ راجابی ہانپتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا نور اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''آج اتنی دیر لگادی میرے بچے! کب سے تیری راہ تک رہی تھی۔'' اس نے بیٹے کو اپنی بانہوں میں بھر کر پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیا۔

''ہاں! آج کچھ دیر ہوگئی۔'' وہ افسردگی سے مسکرایا۔

''اچھا! ہاتھ منہ دھولے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ تیرے انتظار میں ابھی تک میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔''

''کتنی بار کہا ہے اماں کہ میرے انتظار میں بھوکی نہ رہا کریں۔'' اس نے پیار سے ناراضگی جتائی۔

''ہفتہ بھر میں ایک ہی تو دن ہوتا ہے جب اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا نصیب ہوتا ہے۔ تو کون ہوتا ہے مجھے انتظار سے روکنے والا۔'' راجابی نے بھی خفگی سے کہا اور دانستہ طور پر منہ موڑے کھانا نکالنے چل دیں۔ پالے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ ماں بیٹے کے یہ مکالمے اور خفگی بھرا اظہار ہر ہفتے کا ہی معمول تھا۔ پالے جلد ہی تازہ دم ہوکر دسترخوان پر پہنچ گیا جہاں اس کا پسندیدہ پلاؤ موجود تھا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ راجابی نہارتی نظروں سے بیٹے کی

طرف دیکھتی رہیں۔ انہیں پالے خاں میں مرحوم شوہر کا... ہوبہو عکس دکھائی دیتا تھا۔ اس کا قد بت' چال ڈھال' اندازِ گفتگو اور نظریات بالکل والد جیسے ہی تھے۔

''کیا بات ہے بیٹا...... کسی پریشانی کا شکار ہو کیا؟ آج دیر بھی اتنی ہوگئی۔ سب خیر تو ہے نا؟'' وہ اس کی خاموشی سے مضطرب ہونے لگی تھیں۔

''ہاں! آج فرنگیوں سے جھڑپ ہوگئی تھی۔ ہم نے انہیں کافی نقصان پہنچایا۔ سات مارے گئے۔ کئی بندوقیں اور بارود بھی قبضے میں لیا لیکن اپنے ساتھی عبدل کو ان کی حراست میں جانے سے نہ بچا سکے۔'' اس نے پلاؤ کے لقمے بڑی رغبت سے نگلتے ہوئے جواب دیا۔ راجابی بھی افسردہ ہوگئیں۔ انہیں علم تھا کہ حسن خاں کی طرح پالے بھی اپنے ہر ایک ساتھی کے لیے بہت حساس تھا۔

''فکر نہ کرو بیٹا! تم لوگ آزادی کی راہ میں نکلنے والے مجاہد ہو۔ اللہ پاک تم پر خصوصی کرم فرمائے گا۔ کفر اور باطل کبھی کامیاب نہیں ہو پائے گا۔'' انہوں نے بڑے خلوص سے تسلی دی اور کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے قہوے کی تیاری شروع کر دی۔

''ابھی میں نے صحن کی کھڑکی سے گل محمد کے گھر میں روشنی دیکھی تھی۔ ادھر کوئی رہنے آیا ہے کیا؟'' پالے نے اپنی ایک اور الجھن کو گویائی دی۔

''ہاں! کچھ روز پہلے زلیخا یہاں آئی ہے۔ اب ادھر ہی رہے گی۔'' والدہ کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی پالے طیش زدہ ہوگیا۔

''وہ کیوں آئی ہے؟ ایک غدار باپ کی غدار بیٹی۔ اب کون سی تباہی برپا کرنی ہے اسے یہاں؟''

''آرام سے بیٹا! اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اور تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ غلطی اس کے باپ کی تھی زلیخا کی نہیں۔'' راجابی نے اسے تحمل سے سمجھایا۔

''باپ...... وہ ملعون ساتھ نہیں آیا کیا؟ میں اسے اگلا سانس بھی نہیں لینے دوں گا۔'' پالے نے اپنی بندوق اٹھائی۔

''تو بھول رہا ہے پالے کہ پروردگار حاکم الحاکمین عظیم اور سب سے عادل ہے۔ وہ حسن خاں سے ناانصافی بھلا کیسے ہونے دیتا؟ اس کی بے آواز لاٹھی نے گل محمد کو کوڑھ کا مریض بنا کر قبر کا مکین بنا دیا ہے۔'' والدہ کے اس انکشاف پر پالے کی روح سرشار ہوگئی۔

''باقی رہی بات زلیخا کی... تو دنیا کے کسی بھی قانون [illegible] والد کے جرم کی سزا اولاد کو نہیں دی جاسکتی۔ زلیخا کل بھی بے گناہ تھی اور آج بھی اسے اپنے آبائی مکان میں آکر رہنے کا پورا حق ہے۔ اس معاملے میں تم میری بیٹی سے بالکل نہیں الجھو گے۔''

''اوہ...... بیٹی...... تو آتے ہی اس نے وہی کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔'' پالے نے نفرت سے سر جھٹکا۔

''ہاں! میری بیٹی ہی ہے وہ۔ میری ہر ضرورت اور آرام کا خیال رکھتی ہے۔ میرے دکھ سکھ سنتی ہے' تنہائی بانٹتی ہے۔ وہ ہر وہی کام کرتی ہے جو دراصل میرے بیٹے کا فرض ہے۔'' راجابی نے اسے بے نقط سنائیں۔ پالے کی پیشانی کے بل مزید گہرے ہوگئے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پردۂ تصور پر بچپن کے وہ انمٹ نقوش ایک بار پھر اجاگر ہوگئے تھے۔ حسن خاں کی کٹی پھٹی لاش' فرنگیوں کا غرور اور گل محمد کا کردار اس کی زندگی کا ناسور بن چکا تھا جو کسی بھی پل چین لینے ہی نہ دیتا۔ اس سرزمین پر آخری انگریز کے رہنے تک بھی اسے قرار نہ مل سکتا تھا۔ اپنے خیالات اور خدشات سے الجھتے اس کی نظر دلربا پر پڑی۔ وقت کی دھول نے اسے بھی گرد آلود اور قدرے خستہ حال کر دیا تھا۔ حسن خاں سے پہاڑ کے دامن میں آخری ملاقات کا منظر بڑی شدت سے اجاگر ہوا۔ والد کو نشانہ بازی کا کمال دکھانے کی حسرت آج بھی ایک خلش بن کر دل میں موجود تھی۔ اس کی انگلیاں ساز سے ہم آہنگ ہونے کے لیے مچل اٹھیں لیکن پالے نے یہ خواہش بھرپور قوت ارادی سے کچل دی۔ ان الجھنوں میں فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ پالے کی سماعت میں شہباز خاں کی پرسوز آواز آئی تو اس نے والد کے جاں نثار دوست سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ روزمرہ زندگی میں وہ نماز' روزہ کا بالکل پابند نہیں رہا تھا۔ راجابی کی بارہا تاکید کے باوجود نماز کی ادائیگی پر مائل ہی نہ ہو پاتا۔ وہ اپنا قبلہ وکعبہ ماں کو ہی کہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی فوری طور پر شہباز خاں سے ملاقات کا مقصد یہی تھا کہ بعدازاں وہ جمعے کے خطبے اور نماز کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔

مسجد سے نمازیوں کی روانگی کے بعد وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت علاقے کے بچے سیپارہ پڑھنے کی غرض سے وہاں جمع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ سفید ٹوپیاں سر پر جمائے' ہاتھوں میں رحل سیپارہ تھامے ان بچوں میں بھی پالے کو بچپن کی کئی سہانی یادیں زندہ و جاوید دکھائی دینے لگیں۔

''السلام علیکم چچا جان! کیسے ہیں آپ؟'' وہ ان کے

سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''وعلیکم اسلام پالے! آج میری آنکھوں کو ٹھنڈک مل گئی تجھے دیکھ کر۔'' وہ اسے دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور چند ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس کی انقلابی سرگرمیوں کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ پالے نے انہیں نئی مڈبھیڑ اور عبدل کی گرفتاری کے متعلق بلاکم وکاست بتا دیا۔

''وہ تمہارا بھروسا مند ساتھی تو ہے نا؟ ایسا نہ ہو کہ خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم کر دے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا چاچا جی! میرا ہر جوان پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔'' وہ پُراعتماد تھا۔ اسی اثنا میں شہباز خاں کی نظروں نے دو بچوں کی شرارتیں گرفت میں لیں جو انہیں اپنے مہمان سے گفتگو میں مصروف پا کر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

''اپنی ان حرکتوں سے سزا پاؤ گے گلباز!'' شہباز نے ایک لڑکے کو گھرکا۔ پالے خاں بے اختیار چونکا۔

''اپنا گلباز کدھر رہ گیا ہے چاچا جی! کوئٹہ میں اس کی پڑھائی تو مکمل ہو گئی ہوگی نا اب تک؟'' اسے اپنے بچپن کے ساتھی کا خیال آ گیا۔ اس کے بارے میں ملنے والی خبروں سے وقتاً فوقتاً اتنا علم ہوتا رہتا تھا کہ وہ کوئٹہ کے کسی بہت اچھے تعلیمی ادارے میں پڑھائی کر رہا ہے۔

''اس مردود کا نام بھی نہ لو میرے سامنے!'' شہباز نے غصے سے جواب دیا۔

''ایسا کیا ہو گیا ہے چاچا جی؟'' پالے خاں نے حیرت سے پوچھا۔

''فرنگی ملازم بن گیا ہے وہ۔ اسے فرنگیوں کا رہن سہن اور طور طریقے پسند آ گئے ہیں۔ اپنے علاقے، یہاں کے لوگوں اور ہمارے مسائل کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ فرنگیوں کی ہی زبان بولتا ہے۔ کپتان بن گیا ہے وہ مردود۔'' شہباز کا لہجہ دکھ سے چُور تھا۔ پالے بھی صدمے سے ساکت رہ گیا۔

''ناراض نہ ہوں چاچا جی! نادان تو وہ شروع سے ہی ہے۔ بہک گیا ہوگا۔ میں سمجھاؤں گا اسے۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہوگی۔ سب جتن کر چکا ہوں لیکن اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی ہے۔ کسی کی سنتا ہی نہیں۔'' وہ شکستگی سے بولے۔ پالے خاموش ہو گیا۔ اس بار گاؤں کا یہ دورہ بہت اعصابی انتشار کا سبب بنا تھا۔ گزشتہ رات زلیخا کی آمد اور اب گلباز کی نوکری کے متعلق جان کر اسے شدید جذباتی دھچکا پہنچا تھا تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''سلیمان خیل کی جس جھڑپ کے متعلق تم نے مجھے بتایا ہے، اس طرف فرنگیوں کی آمد بھی گلباز کی وجہ سے ہی ہوئی ہوگی۔ فرنگیوں کو ایک عرصے سے اس علاقے کا کوئی بھیدی درکار تھا جو اس قلعہ نما جگہ میں سیندھ لگا دے اور میری بدقسمتی دیکھو کہ میرا بیٹا ہی آستین کا سانپ ثابت ہو رہا ہے۔'' شہباز کے اس نئے انکشاف نے پالے کو کئی لمحوں کے لیے ساکت کر دیا۔ یہ صورتِ حال یقیناً بہت تشویشناک تھی۔

''میں سمجھاؤں گا اسے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بچپن کی، دوستی کا بھرم ضرور رکھے گا۔'' پالے کے دل میں ایک نئی امید نے جنم لیا۔

''وہ سمجھنے سمجھانے کی حدود سے بہت آگے جا چکا ہے پالے! فرنگیوں کی ناک کا بال بن گیا ہے اور اس سطح پر آنے کے لیے اخلاقیات، رشتوں ناتوں کے بھرم سب سے پہلے چاک کیے جاتے ہیں۔ خیر! میں تمہیں اس کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا۔ البتہ اسے سمجھانا نہیں بلکہ ایک پیغام پہنچانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے چاچا جی..... جو آپ کا حکم! میں آپ کا پیغام اسے پہنچا دوں گا۔'' پالے نے سر جھکایا۔ شہباز خاں اسے دھیرے دھیرے کچھ بتانے لگا۔

☆☆☆

کیپٹن گلباز خاں اس وقت 'فورٹ سینڈیمن' جیل میں ایک تفتیشی کمرے کے باہر موجود تھا۔ اندرونی جانب سے عبدل پر تشدد کی آوازیں اور جوابی طور پر اس کی کراہیں اسے بہت محظوظ کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تفتیشی اہلکار ہانپتے ہوئے باہر آ گئے۔ اس کے چند لمحوں بعد گلباز اندر چلا گیا۔ عبدل کی حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر دکھ اور تاسف کی آبشار پوری روانی سے بہہ رہی تھی۔

''یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا؟'' وہ اس کے برہنہ جسم پر زخموں کے جال بڑی نرمی سے چھوتے ہوئے بولا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔'' عبدل نے تنفر سے اسے دیکھا۔ گلباز نے اس کی باچھوں سے رستا خون صاف کیا اور ایک کونے میں رکھے پیالے میں پانی ڈال کر اسے پلانے لگا۔

''میں تو ابھی ابھی یہاں آیا ہوں اور علم ہوا کہ تمہیں گرفتار کر کے پالے خاں کے اڈوں کا پوچھا جا رہا ہے۔ تمہاری تکلیف کا سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آخر میرے ہی

علاقے سے تعلق رکھتے ہو۔اس لیے یہاں چلا آیا۔'' گلباز کی اداکاری جاری رہی۔

''یہ لوگ میرے جسم کی ہر ایک بوٹی بھی نوچ لیں تو پالے خاں کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں کر سکتے۔'' عبدل کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

''ایسی بے وقوفی نہ کرنا۔ پالے کا ساتھ دے کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔کل سے یہاں موجود ہو۔اس نے تمہاری رہائی کے لیے آخر کیا ہی کیا ہے؟ انگریزوں کا ساتھ دو گے تو ہر طرح سے فائدے میں رہو گے۔'' گلباز نے بڑی ہمدردی سے سمجھایا۔عبدل کے وجود میں طیش کی چنگاریاں دہکنے لگیں۔اس نے اپنا رخ موڑا اور گلباز کے چہرے پر تھوک دیا۔

''یہ رہا میرا جواب! اور اگر تجھ میں ہمت ہے نا تو یہی جواب اپنے آقاؤں کے منہ پر دے کر آنا پھر مانوں گا کہ تو واقعی میرا ہمدرد ہے۔''

عبدل کی اس حرکت نے گلباز کو ششدر کر دیا۔اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور عبدل کے زخمی وجود کو اپنی ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔

''لے جاؤ اس......کو یہاں سے۔'' گلباز نے گالیوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے جیل کے داروغہ کو حکم دیا اور اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے میجر بارنس سے ملنے اس کے دفتر روانہ ہو گیا۔بارنس نے اپنے مخصوص پُر رعونت رویے سے اس کا استقبال کیا۔

''میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوا ہوں کیپٹن! پالے خاں کے گروہ پر اپنی شناخت خفیہ رکھتے ہوئے حملہ اور اس کے ساتھی سے تفتیش تمہاری ذہانت کا ثبوت ہے۔آج سے تم میرے محافظوں کے دستے میں شامل رہو گے۔اس دستے کی کمان تم ہی سنبھالو گے۔''

''اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں سر!'' گلباز کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک مزید گہری ہوئی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے حفاظتی دستے میں شامل ہونے کا مطلب لامحدود اختیارات کا ایک نیا پروانہ تھا اور اپنے دیرینہ خواب کے اس پڑاؤ میں گلباز کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

''گڈ! اب تمہیں فوری طور پر دو کام کرنے ہیں۔ مجھے علم ہوا ہے کہ تمہارے والد کی اپنے گاؤں میں بہت عزت و مقام ہے۔تم انہیں اپنے حق میں نرم کرو تا کہ وہ گاؤں والوں کے ذہن بھی تبدیل کر سکیں۔''

''میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی کئی بار ایسا کرنے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ سمجھتے ہی نہیں بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔انہیں آج بھی اپنے دوست کی موت کا غم نہیں بھولا۔'' گلباز کے حلق میں تلخی سی گھلی۔

''کوئی بات نہیں! مزید وقت لے لو۔انہیں عہدے اور دولت کا کوئی لالچ دو۔میں اس کام کے بدلے میں انہیں خان بہادر کا ٹائٹل دلوا دوں گا۔دولت کے ساتھ جاگیر بھی ملے گی۔'' بارنس کی اس تجویز نے گلباز کو چونکا دیا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بار فرنگی کوئی نیا منصوبہ لے کر آئے ہیں۔

''ٹھیک ہے سر! اور دوسری خدمت کیا کر سکتا ہوں میں؟''

''وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔اس میں پوری جان لڑانی ہوگی تمہیں۔'' میجر بارنس اسے ایلن کی آمد اور ریل گاڑی کے ممکنہ اوقات کار کی تفصیل بتانے لگا۔

میجر سے ملاقات کے بعد گلباز جیل خانے کی فصیل سے ملحقہ رہائش گاہ کی طرف چل دیا۔شام کے سائے کافی گہرے ہو چلے تھے۔صدر دروازے کے باہر کھڑے ایک سنتری نے اسے لالٹین کی پیشکش کی لیکن گلباز نے سرد مہری سے منع کر دیا۔اس کے دل و دماغ پر نئے اختیارات کا خمار چھایا ہوا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں آتے ہی اس نے میز پر رکھی ماچس اٹھائی اور وہیں پر رکھا لیمپ روشن کر دیا۔دفعتاً اسے کمرے سے باہر ایک ہیولے کی موجودگی کا احساس ہوا۔گلباز چونک گیا۔اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیل خانے کا وہ سنتری اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک چلا آیا ہے۔گلباز کا خون کھول کر رہ گیا۔وہ سنتری سے اس حکم عدولی پر جواب پرسی کرنا چاہتا تھا لیکن ایک غیر معمولی احساس نے اسے ساکت کر دیا۔سنتری کی بے خوف اور شرر بار آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں۔یہ آنکھیں بہت مانوس تھیں۔ بچپن میں گاؤں کی گلیوں میں کھیلتے کودتے' نشانہ بازی کی مشق کرتے' مسجد میں ہلکی پھلکی شرارتیں کرتے ہمیشہ ہی بہت قریب رہی تھیں۔

''پالے خاں؟'' اس کی زبان سے بے ساختہ برآمد ہوا۔

''ارے! بہت جلدی پہچان لیا مجھے تم نے؟'' پالے چند قدم آگے بڑھا۔

''کیسے ہو میرے دوست؟'' گلباز حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔

''دوست......یہ مقدس لفظ تمہاری زبان سے مناسب نہیں لگتا گلباز خاں! اگر تم ہمارے دوست ہوتے تو فرنگیوں کے ساتھ مل کر میرے ساتھیوں پر حملہ نہ کرتے۔ عبدل کو گرفتار کرنے کے بجائے اسے کسی بھی طرح رہائی

دلواتے۔''

''وہ صرف ایک پیشہ ورانہ مجبوری تھی پالے۔''

''ہاں! یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ غلام ہمیشہ مجبور ہی تو ہوتا ہے اور تم بھی ایک غلام ہو۔''

''غلط نہ سوچو۔ میں اپنے گاؤں اور اس کے رہائشیوں کی بھلائی ہی چاہتا ہوں۔ فرنگیوں سے الجھنے اور لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں کوئی بہتر درمیانی راستہ نکالنا چاہیے۔'' گلباز بڑے جوش اور لگن سے کہتا یکدم خاموش ہو گیا۔ پالے کے سرد تاثرات اس کا اعتماد ڈگمگا رہے تھے۔

''اوہو! میں بھی یہ کیا باتیں لے بیٹھا ہوں۔ تمہیں کچھ کھانے پینے کا بھی نہ پوچھا۔''

''تم نے تو ابھی تک اپنے سگے باپ کے متعلق بھی کوئی سوال نہیں کیا گلباز!'' پالے نے طنز کیا۔

''ہاں! وہی تو پوچھنے لگا تھا۔ کیسے ہیں ابا؟ ہو سکتا ہے وہ کچھ عرصے تک میرے ساتھ ہی رہنے کے لیے چلے آئیں۔'' گلباز نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے ایک اور جھوٹ بولا۔

''ٹھیک ہیں وہ۔ انہوں نے ہی مجھے یہاں ایک پیغام دے کر بھیجا ہے۔'' پالے کے اس انکشاف نے گلباز کو اپنی حماقت کا احساس دلایا۔ وہ پالے کی موجودگی اور سرد تاثرات سے یکدم ہی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ تربیت اور اعتماد بھی اسے کہیں خوابیدہ محسوس ہونے لگے تھے۔

''اچھا! کیا پیغام ہے ان کا؟''

''عبدل کو رہا کر دو..... ورنہ سارا گاؤں تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ یہ پنچایت کا فیصلہ ہے جس کے پنچ شہباز چاچا ہیں۔''

گلباز اس مطالبے پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! میرا تحریری جواب بھی لیتے جاؤ پھر۔'' اس نے سامنے موجود میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور قلم تلاش کرتا ہوا الماری کا کواڑ کھول دیا۔ پالے کو اس سے ایسی ہی ہوشیاری کی توقع تھی۔ اس نے گلباز کے کواڑ کی آڑ سے نکلتے ہی پستول بردار ہاتھ پر گولی چلا دی۔ یہ پستول گلباز نے اپنے لباس سے نکالا تھا۔ زخمی ہتھیلی سے خون بہہ کر فرش رنگین کرنے لگا۔ پالے نے پھرتی سے وہ ہتھیار اٹھا کر گولیاں نکال لیں۔

''غلامی یونہی کم ظرفی سکھایا کرتی ہے۔ مجھے تم سے یہی توقع تھی۔'' پالے نے سرد مہری سے کہا۔ اسی لمحے بیرونی زینوں پر بھاری قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔

''لو آ گئے تم جیسے مزید غلام..... یہی پوچھنے آئے ہوں گے کہ یہ گولی کی آواز کیسی تھی۔'' پالے نے کہا اور اسے اپنے پستول کے نشانے پر رکھتا ہوا اندھیرے غسل خانے میں جا چھپا۔ سپاہی اوپر آ چکے تھے

''سب خیریت تو ہے سر؟''

''ہاں! پستول چیک کرتے ہوئے پتا نہیں کیسے گولی چل گئی۔'' گلباز نے ہاتھ دباتے ہوئے آنکھ کی خفیف جنبش سے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ماتحت اس کا یہ اشارہ بھانپ گئے۔ وہ تیزی سے غسل خانے کی جانب لپکے لیکن پالے خاں روشندان سے کود کر فرار ہو چکا تھا۔ اس نے یہاں آنے سے قبل ہر ایک کو تاکید کھنگالا تھا۔ جیل خانے کے عقب میں موجود ایک گھاٹی سے پاس پالے کا گھوڑا پہلے سے ہی موجود تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ کسی بگولے کے مانند وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں ریل گاڑی کا وہ سفر بہت سست رفتار تھا۔

اس ریل گاڑی میں میجر بارنس کی اکلوتی بیٹی ایلن کی شاہی سواری آٹھ سال بعد انگلستان سے تشریف لا رہی تھی۔ ایلن کی پڑھائی حال ہی میں مکمل ہوئی تھی اور اسے ہندوستان سے وابستہ مختلف داستانیں سننے کے بعد اس جادوئی سرزمین کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایلن ایک غیر معمولی ذہین اور خطرناک حد تک مہم جو لڑکی تھی۔ میجر بارنس کی طرح اسے بھی مختلف ممالک کی زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ ہندوستان آمد سے پہلے اس نے یہاں کی زبان پر بھی کافی عبور حاصل کر لیا تھا۔ سفر کے آغاز میں وہ خاصی پُرجوش تھی۔ قدرتی مناظر بھی کافی بھلے محسوس ہو رہے تھے لیکن اب یکسانیت اور ریل کی سست رفتاری نے اسے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ گلباز خاں نامی وہ محافظ کچھ دیر بعد دوبارہ اس کے پاس چلا آیا۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے مس صاحبہ؟'' وہ تعظیمی انداز میں پوچھنے لگا۔

''یہ سوال تم کوئی پچاس مرتبہ تو کر چکے ہو گے کیپٹن! میرے انکار کے باوجود کسی خاندانی غلام کی طرح انگور، گولڈن سیب، خشک میوے اور پتا نہیں کیا کیا ڈھیر لگا رہے ہو۔ اس کے بعد کسی رٹو طوطے کی طرح مجھے یہ بھی بتانے لگو گے کہ اس ڈبے کے اگلے اور پچھلے ڈبے میں میرے پاپا نے فوجی بٹھا رکھے ہیں۔ ان کی بندوقوں کا رخ کھڑکیوں سے باہر ہے۔ وہ میری حفاظت کے لیے بیٹھے

ہیں۔ مجھے کسی ڈاکو سے خطرہ ہوسکتا ہے۔اس لیے پاپا نے نے مجھے موٹر کار کے بجائے ریل گاڑی میں بلوایا ہے۔یہ سب باتیں سن کر اور تمہاری شکل دیکھ کر میں تنگ آ گئی ہوں۔ کچھ نیا ہو تو بتاؤ ورنہ گیٹ لاسٹ۔'' ایلن نے جھنجلا کر کہا۔گلباز اس کے اہانت آمیز رویے پر سر جھکائے رکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔اختیارات حاصل کرنے کی اس خواہش میں اس نے اپنی عزت نفس اور ذاتی وقار بہت عرصہ قبل ہی انگریز سرکار کے پاس فروخت کردی تھی اور اب تو وہ ان الفاظ کے جچے تک بھولنے لگا تھا۔

''مس صاحبہ! وہ ڈاکو واقعی بہت خطرناک ہے۔'' گلباز نے اسے بتایا۔وہ مزید تفصیل بتانا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک ادھیڑ عمر بیرا برتن لیے اندر چلے آیا۔

''تم کون ہو؟ سلیمان کہاں ہے؟'' گلباز نے اس کی سرمئی ڈاڑھی اور آنکھوں کے گرد گہری سوزش کو بغور دیکھا۔

''وہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھا اسی لیے چائے دے کر مجھے بھیج دیا۔'' بیرے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔وہ برتن ایک جانب رکھ کر چائے کی تیاری کرنے لگا۔

''ہاں تو تم کسی خطرناک ڈاکو کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' ایلن نے گلباز سے پوچھا۔اسے ہندوستان کی یہی پراسراریت اور مہم جوئی اس طرف کھینچ کر لائی تھی اور فی الوقت وہ ... مقامی افراد کے خوشامدانہ بلکہ کسی حد تک غلامانہ رویے سے بہت مایوس ہوئی تھی۔

''جی مس صاحبہ! اس کا نام پالے خاں ہے۔آپ کے اسی سے بچاؤ کے لیے ٹرین میں یہ سارا بندوبست کیا گیا ہے۔نہایت بزدل آدمی ہے۔'' گلباز نے جواب دیا۔

''جی ہاں! اس قدر بزدل ہے کہ اس نے سیکڑوں انگریز قتل کر رکھے ہیں۔پچھلے چند سالوں میں اس کے نام سے ہی انگریزوں کو بخار چڑھ جایا کرتا ہے۔'' بیرے نے سر جھکائے دوسری پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

''اپنی زبان بند رکھو بڈھے! میں تمہیں اس دروغ گوئی پر گرفتار بھی کرسکتا ہوں۔'' گلباز کو طیش آیا۔اسی لمحے ریل گاڑی کی لمبی سیٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔گلباز نے فوراً کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گاڑی ایک پل پر رک چکی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے آگے؟'' اس نے پل کے پہرے پر مامور ایک سپاہی سے پوچھا۔

''کسی نے پل کے آگے پتھر رکھ دیے ہیں۔انہیں ہٹائے بغیر یہاں سے جانا ممکن نہیں ہے۔'' سپاہی نے سیلیوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ اسی بزدل کا کام ہوگا۔وہ آگے کہیں گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔تم یہیں رکو! میں چند سپاہیوں کو لے کر پتھر ہٹواتا ہوں۔'' گلباز نے کھڑکی سے صدا دی اور عجلت میں ڈبے سے باہر نکل گیا۔اس کے ذہن میں پالے کی ممکنہ گرفتاری کا تصور ہی بہت سرشار تھا۔گلباز کے نکلتے ہی ایلن کی گورنس کی رنگت زرد ہونے لگی۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے میری؟'' ایلن نے بیزاری سے پوچھا۔وہ اس سارے ماحول اور پل پل بدلتی صورت حال سے جھنجلا رہی تھی۔ہندوستان کا جو رومانوی اور پراسرار تاثر اس مہم جو لڑکی نے تراش رکھا تھا، یہاں آنے کے بعد ویسا کچھ بھی نظر نہ آیا تھا۔لوگ شرمناک حد تک خوشامد پسند اور بزدل تھے۔انگریزوں کی خوشنودی کے لیے وہ اخلاق کی کسی بھی سطح تک گرنے کے لیے تیار رہتے۔

''وہ ڈاکو اگر واقعی یہاں آ گیا تو؟'' میری نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

''ہٹاؤ بھئی میری! مجھے تو یہاں سب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ بزدل، احمق اور ڈرپوک۔خدا جانے ڈیڈی ان لوگوں کے بارے میں اتنا عجیب کیوں سوچتے ہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایسے ہی چند بزدلوں کا ٹولا اگر ہمارے ہی ہتھیار اٹھائے باغی ہوگیا ہے تو اب تک ان کی بغاوت پر قابو کیوں نہیں پایا جاسکا؟'' ایلن کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ان کی اس گفتگو پر بیرے کے لب مسکرانے لگے تھے۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ کے یہ خیالات جان کر لیکن ہندوستانیوں اور ان کے جذبۂ آزادی کو کبھی بھی ہلکا لینے کی غلطی نہ کرنا۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز اب صاف، گمبھیر اور غراہٹ میں تبدیل ہوگئی تھی۔

''کون ہو تم؟'' ایلن کو اس کی آنکھوں کے بدلتے رنگ حیران کر گئے۔

''ناچیز کو پالے خاں کہتے ہیں۔ہندوستان کا وہ بزدل انقلابی جو تمہیں ان بیسیوں سپاہیوں کے درمیان سے اغوا کرنے آیا ہے۔'' پالے کے ان الفاظ نے اس کی رنگت سرسوں بنادی۔میری یہ صدمہ برداشت نہ کر پائی۔اس کے حواس بے قابو ہو کر بے ہوشی کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ ایلن کا حال بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔پالے نے اسے کسی ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح کندھے پر لادا اور دروازے سے

باہر نکل کر مخصوص انداز میں سیٹی بجادی۔ اس کا گھوڑا سیٹی کی آواز سنتے ہی پل کے نیچے سے نکل کر ایک مخصوص مقام پر آ کھڑا ہوا۔ پالے نے ماہرانہ انداز میں ایلن کو تھامے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وفادار گھوڑا اپنے مالک کا رمز شناس تھا۔ اپنی پیٹھ پر اس کا بوجھ محسوس کرتے ہی اس نے سرپٹ دوڑ لگا دی۔ یہ منظر گلباز خاں اور اس کے ماتحت سپاہیوں کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے انگریز آقا کی نور چشم برطانوی مقامی حکومت کے مطلوب ترین شخص کے قبضے میں جا چکی تھی۔ گلباز نے اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں لیکن پالے اپنا رخ پہاڑیوں میں بلندی کی جانب سے تبدیل کر کے چند لمحوں میں ہی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

گلباز کی حالت دیدنی تھی۔ میجر بارنس کے سونپے گئے اس پہلے ہی کام میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے حوصلہ مجتمع کر کے قریبی پولیس چوکی سے فون کر کے بارنس کو یہ اطلاع پہنچا دی۔ غصے سے مغلوب ہو کر بارنس نے اسے جی بھر کر صلواتیں سنائیں۔ گلباز کے پاس یہ ذلت خاموشی سے سہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''کیپٹن گلباز! اگر اس وحشی نے میری بیٹی کی عزت میلی کی تو وہ دن تمہاری زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یاد رکھنا میری یہ بات۔'' میجر بارنس نے غراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ گلباز کی حقیقی معنوں میں سٹی گم ہو گئی تھی۔

دوسری جانب میجر بارنس کا غم و غصے کی شدت سے برا حال تھا۔ اسے اپنی تمام تر مفاہمت پسندی، تحمل مزاجی اور سیاسی چالیں ہوا ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا بس ہی نہ چل رہا تھا کہ ایلن کی بازیابی کے لیے زمین و آسمان ایک کر دے۔ کچھ ہی دیر میں اس نے فوج کے مقامی افسران کا اجلاس طلب کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ عسکری مداخلت کے بغیر ایلن کی رہائی ممکن ہی نہ تھی۔

''ہمیں تھوڑا انتظار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے پالے خاں کی جانب سے کوئی مطالبہ سامنے آ جائے۔'' ایک افسر نے تجویز دی۔

''اس انتظار میں میری بیٹی کی عزت و سلامتی برقرار رہ پائے گی کیا؟'' بارنس اپنے بال نوچنے کے درپے تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ کسی رقم، ہتھیار یا قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر دے۔'' ایک اور افسر نے جواب دیا۔

''ان پہاڑیوں کو گولہ بارود سے اڑا دیا جائے تو ہمیں ان باغیوں کے خفیہ ٹھکانوں کا علم ہو سکتا ہے۔'' اس کی ذہنی کیفیت ایک ہی نکتے پر اٹک چکی تھی۔

''نہیں میجر! یہ سراسر بے وقوفی ہوگی۔'' کرنل بارلے نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''پہاڑیوں پر گولہ بارود آزمانے کا مطلب ہے کہ ان باغیوں کی پہاڑیاں بھی تباہ ہو جائیں گی۔ اور یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ایلن بھی ایسی ہی کسی گپھا میں ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ اس قدم کے بعد اس کی لاش بھی نہ پا سکو۔'' کرنل کے حقیقت پسندانہ تجزیے پر بارنس لرز کر رہ گیا۔ اسے ایلن کسی بھی قیمت پر زندہ درکار تھی۔

''اپنے مخبروں کو اس کام پر لگوا دیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سراغ نکال لیں گے۔'' کرنل نے ایک نئی راہ سجھائی۔ ''اور ایک بات اپنے ذہن میں واضح کر لیں۔ میں نے ہندوستان میں آدھی عمر گزاردی ہے۔ ان باغیوں کا خواتین سے رویہ بہت حیران کن ہوتا ہے۔ وہ دشمن کی عورتوں کا بھی اتنا ہی خیال رکھتے ہیں۔ انگریز خواتین کے لیے منفی رویہ بہت کم سننے اور دیکھنے میں آیا ہے۔ اس لیے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھو۔'' کرنل کے اس تجزیے پر بارنس کا منتشر ذہن پُرسکون ہونے لگا۔ اس نے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

جمعرات کے اس روز سرِ شام شروع ہونے والی بارش رات تک جاری رہی۔ موسم بے حد سرد ہو چکا تھا۔ راجا بی کی طبیعت بے حد ناساز تھی۔ وہ شدید بخار میں مبتلا تھیں۔

''یہ لیجیے خالہ خانم! قہوہ پی لیجیے۔'' زلیخا نے انہیں ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بستر پر بٹھایا اور قہوے کی پیالی تھما دی۔

''جیتی رہ میری بچی! تُو نہ ہوتی تو جانے میرا کیا ہوتا؟'' وہ نقاہت سے بولیں۔

''میں کیوں نہ ہوتی خالہ خانم؟ آپ کو بھلا کیا علم کہ میں نے اتنے سال کس مشکل سے گزارے ہیں۔ وہاں زندگی کی ہر آسائش ہونے کے باوجود گاؤں کی کچی گلیاں، یہ کچے پکے مکان، پہاڑ اور آپ سب ہمیشہ یاد آتے تھے۔ میں یہاں آنے کے لیے مچلتی تھی۔'' زلیخا نے محبت سے کہا۔

''مجھے تھوڑے ہی دنوں میں تمہاری بہت عادت ہو گئی ہے زلیخا! سوچتی ہوں کہ اگر تم چلی گئیں تو میرا کیا ہوگا؟ میں تو ایک بار پھر تنہائی کی قبر میں درگور ہو جاؤں گی۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں خالہ خانم! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ کہیں بھی نہیں۔'' زلیخا اب بھی

بچپن کے ایک ان کہے وعدے کی زنجیر میں جکڑی تھی۔ اسے اس گھر میں آکر کام کاج کرنا بہت سکون دیتا تھا۔ آج بھی صبح سے وہ یہیں موجود تھی۔ صفائی ستھرائی، کپڑوں کی دھلائی اور کھانے کی تیاری کے بعد وہ کتنی ہی دیر پالے کے کمرے میں موجود رہی۔ اس کمرے کے ایک ایک گوشے سے پالے کی خوشبو محسوس ہوتی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے زیر استعمال ہر ایک شے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ گرد وغبار سے اٹے دلربا کو دیکھ کر اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ آخری ملاقات اور اس سے وابستہ یادیں بڑی شدت سے حملہ آور ہوئی تھیں۔ زلیخا نے کمرے کی صفائی کے بعد دلربا کو بھی جھاڑ پونچھ کر رکھ دیا۔ راجا بی سے علم ہوا تھا کہ پالے خاں ہر جمعرات کو گھر لازمی آیا کرتا ہے۔ اسے شدت سے اسی کا انتظار تھا۔ راجا بی سے گزرے سالوں کی ان کہی باتیں کرتے اس کا وجود سراپا انتظار بن چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ انہیں بیرونی جانب ہنہناہٹ کی مخصوص آواز سنائی دی۔

''یہ پالے کے گھوڑے کی آواز ہے۔ میرا بیٹا آگیا ہے۔'' راجا بی خوشی سے نہال ہوگئیں۔ زلیخا کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوگئیں۔

''میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں خالہ خانم! مجھے دیکھ کر وہ کڑوی کسیلی باتیں شروع کردے گا۔'' اس کی حقیقت پسندی پر راجا بی تاسف سے گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔ چند لمحوں بعد پالے اندر آیا اور اپنے کندھے پر لدا وجود فرش پر بچھی چٹائی پر ڈال دیا۔ دودھیا گلابی رنگت، سنہری زلفوں اور ہوشربا سراپا کی مالک لڑکی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔

''یہ کون ہے پالے؟ کس کو اٹھا لایا ہے؟''

''یہ ہمارے عبدل کی آزادی کا پروانہ ہے۔ اس کا باپ اب خود اسے رہا کرے گا۔''

''یہ کیا بے ہودہ حرکت ہے؟ مجھے تم سے ایسی امید بالکل نہیں تھی۔'' وہ دکھ سے بولیں۔

''یہ فرنگی ہے ماں! اور آپ کیوں بھول رہی ہیں کہ انہی فرنگیوں کی وجہ سے میں یتیم اور آپ بیوہ ہوئی تھیں۔'' پالے تلخ ہوا۔

''اگر تم واقعی ایسا سوچتے ہو تو مجھے سخت افسوس ہے۔ جنگ و آزادی میں تمہاری یہ شرکت بھی صرف ذاتی انتقام ہے۔ چھوڑ دو ان راہوں کو۔''

''آپ کو علم نہیں ہے کہ فرنگی ہمارے ساتھیوں کے

ادھر ادھر سے

☆ ویسے تو شادی ایک آرٹ ہے مگر ہمارے ہاں یہ مارشل آرٹ ہے۔

☆ روسی کہاوت ہے کہ بیوی خاوند کی دریافت ہوتی ہے اور خاوند بیوی کی ایجاد۔ پرتگالی کہتے ہیں کوئی بندہ اپنی بیوی کا ہیرو نہیں ہوتا اور کوئی عورت اپنے ہیرو کی بیوی نہیں ہوتی۔

☆ امریکی سیانوں کا خیال ہے کہ بوڑھے کا شادی کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی اَن پڑھ اخبار خریدنا شروع کردے۔

☆ اٹلی والوں کی رائے ہے کہ جس مرد کی جرابیں پھٹی یا بٹن ٹوٹے ہوئے ہوں تو اسے دو میں سے ایک کام فوراً کر لینا چاہیے یا تو شادی کرلے یا پھر طلاق دے دے۔

☆ عطاالحق قاسمی کہتے ہیں، بیوی سے محبت کرنا وہاں خارش کرنے جیسا ہے جہاں خارش نہ ہو رہی ہو۔

☆ جب آدمی شادی کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اصل خوشی کیا ہے مگر تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

برجستہ جواب

ایک شرارتی شاگرد نے ریاضی کے استاد سے کہا۔

''سر! انگریزی کے استاد ہم سے انگریزی میں بات کرتے ہیں، اردو کے استاد اردو میں جبکہ فارسی کے استاد فارسی میں لیکن آپ نے کبھی ریاضی میں بات نہیں کی۔''

استاد بولے۔ ''زیادہ تین پانچ مت کرو اور یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔''

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

ساتھ کس قدر ظلم وستم کرتے ہیں۔''

''تو کیا اس کا بدلہ تم ان کی عورتوں سے لوگے؟ کیا یہی سکھایا تھا تمہارے باپ نے تمہیں؟ اس لڑکی کو فوری طور پر اس کے گھر پہنچا آؤ پالے!'' وہ سختی سے بولیں۔

''آپ جذباتی ہو کر سوچ رہی ہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔'' پالے نے توجیہہ دی۔

''مجھے اپنے بیٹے کی جواں مردی اور بہادری پر بڑا مان تھا۔ آج ایک نہتی عورت کو اس جنگ میں گھسیٹ کر تم نے مجھے دکھی کر دیا ہے پالے! اس لڑکی کو واپس چھوڑ آؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔'' ماں کے اس دوٹوک مؤقف پر پالے بھنا کر رہ گیا اور غصے سے تنتناتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرا صاف ستھری حالت میں تھا۔ وہ بستر پر لیٹا گہری سانسیں لینے لگا۔ کچھ فاصلے پر موجود دلربا دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اسے کمرے میں جاتے دیکھ کر زلیخا چپکے سے باورچی خانے سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں قہوے کی پیالی اور خشک کپڑا تھا۔ راجا بی کے کمرے میں جاتے ہی اس نے ایلن کے بال اور جسم خشک کیا، اسے ہوش میں لائی اور گرم قہوہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایلن اس صورتِ حال سے سخت سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔

''وہ..... ڈاکو..... مار..... دے گا.....'' اس کا ہر ایک انداز خوفزدہ تھا۔

''کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر مارنا یا نقصان پہنچانا ہوتا تو تمہیں اپنے گھر نہ لے کر آتا۔'' اس بوڑھی عورت کی گمبھیر آواز نے ایلن کو چونکا دیا۔ اس نے پہلی بار اپنے قرب وجوار پر دھیان دیا۔

''گھبراؤ نہیں! پالے تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' زلیخا نے اسے ایک کمبل سے ڈھانپتے ہوئے تسلی دی۔ ایلن سوچتی ہوئی نظروں سے ان دونوں کا جائزہ لینے لگی۔ اسی لمحے دلربا کی موسیقیت نے ان تینوں خواتین کو چونکا دیا۔

''تو آج میرے بیٹے نے یہ خود ساختہ قسم بھی توڑ ہی دی۔'' راجا بی افسردگی سے بولیں۔ زلیخا کے چہرے پر بھی ایک شدید تڑپ دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ کیسی آواز ہے؟'' ایلن حیران ہوئی۔

''یہ میرے بیٹے کا عشق ہے۔ اسے بندوق اور دلربا کے سوا کسی بھی چیز کی چاہت ہی نہیں۔''

''کیا اسے اپنی بیوی سے بھی محبت نہیں؟'' ایلن نے زلیخا کی طرف اشارہ کیا جو اس کی بات ان سنی کر کے بے اختیار کمرے سے باہر چل دی تھی۔ اس نے باورچی خانے سے ایک پیالی میں قہوہ لیا اور پالے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دلربا میں مگن تھا۔ زلیخا آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے اونچے لمبے وجود کو دیکھتی رہی۔ اس لمحے اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ پھول کی پتیوں کی طرح بکھر جائے۔ موسیقیت کا یہ فسوں اس کے لبوں سے نکلنے والی سسکاری نے توڑا۔ پالے نے ایک جھٹکے سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ساکت رہ گیا۔

''کون ہو تم؟'' وہ درشتی سے بولا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم بھول گئے ہو گے سب کچھ۔ نفرت کا جذبہ کیا اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے کہ بچپن کا بے ریا اور خالص رشتہ ایک پل میں ہی ختم کر دے۔'' زلیخا کی آواز بھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

''تم..... غدار..... کیوں آئی ہو یہاں؟'' وہ طیش سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگنے۔ میرے باپ کے اس گناہ میں میرا کیا قصور تھا پالے؟ مجھے اتنے سالوں سے کانٹوں پر کیوں گھسیٹ رکھا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''قصور تم باپ بیٹی کا ہی ہے۔ تم لوگوں کی وجہ سے میرے باپ نے ایسی اذیت ناک اور بے وقت موت جھیلی۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم لوگ انسانی جان کے ہی نہیں بلکہ اعتبار اور اقدار کے قاتل بھی ہو۔ اگر تمہاری جگہ گل محمد کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں یہیں کھڑے کھڑے اس کی سانسیں چھین لیتا۔'' پالے کی آنکھوں میں نفرت کا دہکتا الاؤ زلیخا کا وجود بھسم کر گیا۔ اس کی ذات کا مان اور اعتماد ایک ہی پل میں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ عمر بھر معذرت اور تلافی کے لیے جو الفاظ سوچے تھے، پالے کی وحشت اور بیگانگی کے سامنے ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ گل محمد کا وہ گناہ ہر ایک عمل اور پُرخلوص کوشش سے کہیں بڑا تھا۔ قہوہ تھمانے کے لیے آگے بڑھا ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا تھا۔ پالے نے ایک جھٹکے سے وہ پیالی فرش پر گرا دی۔

''میرے سامنے مت آیا کرو غدار باپ کی بیٹی! ورنہ میں ہر اخلاقی اصول بھول جاؤں گا۔'' فرش پر گرنے والی پیالی اور دل کے ہونے والے ٹکڑے دونوں ہی ناقابلِ شمار تھے۔ وہ ٹوٹی ہوئی کرچیاں اٹھا کر آنسو بہاتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد پالے روانگی کے

لیے تیار تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور ملال تو تھا لیکن کہیں نہ کہیں یہ اطمینان بھی قائم تھا کہ وہ والدہ کی حکم عدولی نہیں کر رہا۔ زلیخا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ رات کی تلخی نے اس کا دل بہت بری طرح دکھایا تھا۔ اس پر مستزاد پالے کی ایلن کی جانب ہلکی سی توجہ بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ایلن کا حسن زہد شکن تھا۔ راجا بی کے حکم کے بعد پالے یقیناً اس سے درشتی کے بجائے نرمی اور ذمے داری کا مظاہرہ بھی کرتا۔ واپسی کے اس سفر میں وہ دونوں تنہا ہوتے۔ ان اذیت ناک سوچوں میں مبتلا زلیخا ایک بار پھر انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس پل اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی کچھ نہ کر پائی تو اپنی عزیز ترین متاع کو اپنے ہی ہاتھوں سے گنوا دے گی۔ کشمکش شدید تر ہوئی تو وہ بے اختیار راجا بی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''مجھے لگتا ہے ایلن پالے سے خوفزدہ ہے۔ یہ اس کے گھوڑے پر سفر نہیں کر سکے گی۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ ایلن میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جائے گی۔''

''بات تو تیری ٹھیک ہی ہے۔'' راجا بی نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''میرے ساتھ کوئی جائے گا اور نہ ہی کسی کو ٹوہ لینے کی ضرورت ہے۔'' پالے اپنے سر پر مخصوص پگڑی باندھے باہر چلا آیا۔

''کیوں؟ میں تو تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔'' زلیخا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تمہاری یا تمہارے خاندان کی یہ بھلائی میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے مزید کسی احسان اور شر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے باپ نے ایسی ہی دوستی اور ہمدردی کی آڑ میں میرے باپ کو دھوکا دیا تھا۔ تم بھی آخر اسی کا خون ہو۔ تمہارا کیا بھروسا کہ اپنے پیچھے فرنگیوں کو لگا لاؤ۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ تمہاری اس پیشکش کے پیچھے بھی کوئی مفاد ہی ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے ساتھ فرنگیوں کو بھی میری گرفتاری کے لیے لیتی آؤ۔''

زلیخا اس الزام پر ششدر رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

''بس کر دو پالے! خاموش ہو جاؤ۔'' راجا بی نے غصے سے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماں! اسے اپنے گھر میں گھسا کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ماضی میں اس کے باپ نے آپ کو بیوہ کر دیا۔ اب ایسا نہ ہو کہ مستقبل میں یہ ناگن آپ کو بے اولاد کر دے۔'' پالے کا ہر ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ زلیخا کو روح کے ریشے تک ادھڑتے محسوس ہونے لگے۔

''یہ میری بیٹی ہے پالے! اور ایک ماں کا دل اولاد کے متعلق کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''آپ بہت سادہ دل ہو ماں! آپ کو فرنگیوں کی چالوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کو اپنے بیٹے کی سلامتی عزیز ہے تو اسے ابھی یہاں سے جانے نہ دیجیے گا۔'' اس نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چلا کر زلیخا کا وجود گھائل کیا اور ایلن کو گھوڑے پر بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی زلیخا کے ساکت وجود میں پہلی ہلچل ہوئی اور آنسو کسی ندی میں باڑ کی طرح بہنے لگے۔

''فکر کیوں کرتی ہے میری بچی! وہ جذباتی ہو کر سوچتا ہے۔ دل کا برا نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا جلد ہی۔'' راجا بی نے اسے تسلی دی لیکن اس وقت کوئی لفظ اور دلاسا اس اذیت کا مداوا نہیں کر پا رہا تھا۔

''میں کچھ دیر نہیں رہوں گی خالہ خانم! لیکن مجھے یہ بھی پتا ہے کہ وہ میرے باپ کا گناہ اور میرا قصور کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کوئی اور الزام لگا کر غداری کا یہ ناسور ہمیشہ رستا ہی رکھے گا۔'' وہ کرب سے کہتی ہوئی اندر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

پالے کے الفاظ اور نفرت نے زلیخا کے وجود کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ وہ بڑے یقین اور اعتماد سے یہاں ایک نئے سفر کی ابتدا کرنے آئی تھی لیکن آغاز میں ہی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔ خالی الذہنی اور شکستگی کے عالم میں اپنے گھر آئی تو نیم وا دروازہ بھی اسے اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہاں کرسی پر گلباز خاں بیٹھا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ جھلائی۔ اسے یہ شخص بچپن سے ہی سخت ناپسند تھا۔

''تمہارا انتظار کر رہا ہوں بھئی۔ تم شہر سے گاؤں چلی آئیں اور کسی کو بتایا بھی نہیں۔ مجھے جیسے ہی علم ہوا میں فوراً تم سے ملنے چلا آیا ہوں۔'' گلباز کی نظریں اس کے سراپا پر گڑی تھیں۔

''کبھی اپنے والد کا بھی اتنا خیال کر لیا کرو۔'' زلیخا نے طنز کیا۔

''جہاں چاہ وہاں راہ..... وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی

بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم دونوں نے ایک ہی قسمت پائی ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی غدار، باغی اور جانے کیا کیا سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' گلباز نے لہجے میں شیرینی سموئی۔

''تمہارے متعلق میں ایسی کوئی حتمی بات نہیں کر سکتی۔ البتہ میں غدار نہیں ہوں..... نہیں ہوں میں غدار..... سمجھے تم؟'' وہ پھٹ پڑی۔ گلباز اس کی یہ کیفیت بغور دیکھتا فوری نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

''لگتا ہے گاؤں میں سے کسی نے تمہاری حیثیت یاد کروادی ہے۔ اگر کسی نے ایسا کچھ کہا ہے تو مجھے بتاؤ میں ایک ایک کو سیدھا کر دوں گا۔''

''کیوں بتاؤں تمہیں؟ تمہارا مجھ سے واسطہ ہی کیا ہے آخر؟'' زلیخا چیخی۔

''لو بھلا! تم بھی کیسی نادان ہو۔ ایک تم ہی میری سب سے زیادہ اپنی ہو۔ بھول گئیں نا تمہارے والد کی آخری خواہش تھی کہ میں تم سے شادی کرلوں۔'' گلباز نے معنی خیز مسکراہٹ اچھالی۔

''مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ میں نے انکار کر دیا تھا۔'' وہ سرد مہری سے بولی۔

''ہاں! یہاں بھی وہ کم بخت پالے خاں درمیان میں آ گیا تھا۔''

''یہاں بھی؟'' زلیخا نے اس کے الفاظ پکڑے۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہیں کسی اور مقام پر بھی نقصان پہنچا چکا ہے۔''

''اس نے ایک بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے زلیخا! اس فرنگی لڑکی ایلن کے اغوا سے اس نے اپنے لیے بہت سے مسائل پیدا کر لیے ہیں۔ وہ تو بھول چکا ہے کہ ہم اس کے بچپن کے ساتھی ہیں۔ کبھی اس کا برا نہیں چاہیں گے۔''

''ہاں! وہ واقعی یہ سب بھول چکا ہے۔'' زلیخا کے زخم ہرے ہوئے۔ گلباز کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ زلیخا نے یہاں آتے ہی پالے یا اس کی والدہ سے مراسم دوبارہ استوار کر لیے تھے۔

''یہ فرنگی لڑکی اس کے گلے کا طوق بن جائے گی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہے کہ ملٹری والوں نے پالے کے ہر ممکنہ پہاڑی اڈے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ سارے آزاد علاقے میں اشتہار پھینکے جا رہے ہیں کہ پالے کو زندہ یا مردہ گرفتار کروانے والے کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔'' گلباز کی اس بات پر زلیخا کی رنگت فق ہوگئی۔ ایلن کے متعلق اس کے خدشات اب ثابت ہوتے نظر آنے لگے۔

''مجھے تو اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ انعام کے لالچ میں کہیں کوئی ہمارے دوست کا نقصان نہ کر بیٹھے۔'' گلباز نے ایک اور داؤ کھیلا۔ ''اس تو یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی اسے سمجھا کر ایلن کو آزاد کروادے تو پالے بھی نقصان سے بچ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے انگریز سرکار خوش ہو کر جاگیر بھی تحفے میں دے ڈالے۔''

گلباز کی اس بات نے زلیخا کو گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ اس کی خاموشی سے گلباز کو مزید شہ ملی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زلیخا دام میں آ گئی ہے اور وہ اسے پالے کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر ضرور دے گی۔

''پالے کو سیدھے راستے پر لانے والے کا احسان انگریز سرکار بھی نہیں بھولے گی۔'' اس نے موقع پا کر ایک اور چوٹ کی لیکن یہی الفاظ اس کے لیے گلے کا پھندا ثابت ہو گئے۔ زلیخا یکدم جھرجھرا گئی تھی۔ اسے گل محمد کے لیے ادا کیے جانے والے غدار اور دغاباز کے القابات یاد آ گئے تھے۔

''مجھے ایلن یا پالے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ یہ کام تو ملٹری والوں اور تم جیسوں کا ہے۔ میں کم عقل، گنوار ان باتوں کو کیا جانوں؟ جاؤ! گاؤں بھر میں یہ منادی کروا کے دیکھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور کو بھی انگریزوں کا ''پٹھو'' بننے کا شوق چرا جائے۔'' زلیخا نے حتی الامکان ٹھنڈے انداز میں جواب دیا۔ گلباز بھی ناسمجھ نہیں تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ زلیخا نے یہ چوٹ اسی پر کی ہے لیکن اس وقت خاموش رہنے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے وہاں سے روانگی میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کے جاتے ہی زلیخا کے آنسو ایک بار پھر پوری شدت سے بہنے لگے۔ پالے کی وہ بے رخی اور رکھائی اس کے اندازوں سے بڑھ کر سخت ثابت ہو رہی تھی۔ وہ شدت سے دعا کرنے لگی کہ پالے کسی کے بھی لالچ کا شکار ہوئے بغیر ایلن کو بحفاظت اس کے ٹھکانے پر پہنچا دے۔

☆☆☆

پالے خاں کا سفر نہایت محتاط انداز میں جاری تھا۔ انگریزوں کے ممکنہ اقدامات کے تحت اس نے ایسے رستوں کا انتخاب کیا تھا جو ان کے تصورات سے بھی زیادہ دشوار گزار تھے۔ ایلن ان راستوں کی کٹھنائی سے کافی غیر آرام دہ تھی لیکن فی الوقت اس نے کسی قسم کی چیخ و پکار اور نخرے دکھانے سے گریز ہی کیا تھا۔ پالے کو یہ ہمت اور طبیعت کا ٹھہراؤ کافی حیران کن محسوس ہوا لیکن اس نے کوئی بھی ردعمل

دینے سے گریز ہی کیا۔ اس وقت بھی پالے نے سیدھا راستہ چھوڑ کر گھوڑے کا رخ گھنے جنگل میں سے گزرتی پگڈنڈی پر موڑ دیا۔

''اس جنگل میں کیوں لے جا رہے ہو خان؟'' ایلن نے پہلی بار اس سے سوال کیا۔

''کیونکہ مجھے تمہارے ہم وطنوں پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔ انہوں نے رستے میں جگہ جگہ ہمارے لیے جال بچھائے ہوں گے۔'' پالے کے اس جواب پر وہ خاموش ہوگئی۔

''اس جانب سے راستہ مختصر ہے۔ ہم جلدی پہنچ جائیں گے۔'' پالے نے مزید وضاحت کی۔

''یہ تمہارا علاقہ ہے خان۔ تمہیں زیادہ پتا ہوگا لیکن میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جب انسان کسی چیز میں شارٹ کٹ ڈھونڈتا ہے تو وہ معاملہ صبر سے زیادہ لٹک سا جاتا ہے۔'' ایلن نے سادہ سے انداز میں زندگی کی ایک حقیقت بیان کردی۔ اس دفعہ خاموش ہونے کی باری پالے خاں کی تھی۔ اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کردی۔ کچھ ہی دور جا کر گھوڑا رک گیا۔ اس کے نتھنوں سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ پالے نے باگ کو کئی بار جھٹکا دیا لیکن گھوڑا ہلنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ پالے کے ذہن میں ایک خدشہ سرسرایا تاہم اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل ایلن بول اٹھی۔

''مجھے لگتا ہے اس نے کوئی خطرہ محسوس کیا ہے۔''

''میں بھی وہی خطرہ ڈھونڈ رہا ہوں۔'' اس نے گہری نظروں سے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ جلد ہی اس نے جھاڑیوں میں ایک سرسراہٹ بھانپ لی۔ وہاں ایک بھیڑیا موجود تھا جو انہیں اپنی جانب متوجہ پا کر غراتے ہوئے حملہ کرنے پر تل گیا۔ پالے نے پھرتی سے بندوق کندھے سے اتاری اور نشانہ باندھ کر بھیڑیے کا کام تمام کر دیا۔ ایلن سانس روکے اس کا تڑپتا ہوا جسم دیکھنے لگی۔

''راستہ بدل دو خان! یہاں تو جنگلی جانور بھی ہیں۔''

''فکر نہ کرو! یہ جنگلی جانور ان لوگوں سے زیادہ خطرناک نہیں ہیں جو ہندوستان کے آقا بنے بیٹھے ہیں۔'' پالے نے تلخی سے کہا۔ ''میرا ان سے دن رات واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔'' ایلن کے پاس اس بات کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔ وہ کھلے دل ودماغ کی ایک روشن خیال اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اسے اپنی قوم کی زیادتیوں اور استحصال کا پالے سے بھی زیادہ وسیع اندازہ تھا لیکن ابھی وہ ایسا کوئی بھی اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ ستمبر 2020ء کی جھلکیاں

ارض، فرض، قرض
ایک جری جواں کی داستان

ترانے کا سفر
ملی نغموں پر ایک پُرمغز تحریر

قیدی شہنشاہ
مغلیہ سلطنت کی بے کسی کا بیان

ایک تھی حسینہ
ایک معصوم سی مظلوم دوشیزہ کی سچ بیانی

ان کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ''سفر پہلا پہلا''
فلم نگری کی روداد ''کراچی سینما''
اور بھی بہت سی سچ بیانیاں،
سچے واقعات، دلچسپ روداد،
ایسی تحریریں جو سرگزشت کا خاصہ ہیں۔

ہر صاحب علم کے لیے تحفہ،
سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ

جنگل میں بھیڑیوں کی موجودگی کے احساس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے پالے کی کمر کا سہارا لے لیا۔ ایلن کے نرم ہاتھوں کا لمس پالے کے پہاڑ جیسے وجود کو لمحے بھر کے لیے ساکت کر گیا۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے گھوڑے کی رفتار مزید بڑھا دی۔ تھوڑی ہی دور جانے کے بعد ان کے سامنے ایک ایسی ندی موجود تھی جہاں پانی کی روانی کافی حد تک ہولناک تھی۔

''یہاں کیوں رک گئے ہو؟'' ایلن نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔ اسے اردگرد کوئی پل یا کشتی جیسی سہولت نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ہمیں یہ پہاڑی ندی عبور کرنی ہے۔'' پالے نے سادگی سے بتایا۔

''واٹ؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو؟'' وہ تھرا گئی اور سراسیمہ نظروں سے اس ندی کو دیکھنے لگی جس کا بہاؤ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ گزشتہ رات ہونے والی بارش نے شدید طغیانی برپا کر رکھی تھی۔ پہاڑوں کے کئی پتھر اور جھاڑیاں بھی ندی کا حصہ بن چکی تھیں۔ ایلن کے لیے ندی کی یہ سیلاب نما کیفیت ایک انوکھی اور ہولناک شے تھی۔ اس کی حالت سے بے نیاز پالے کناروں کے اطراف سے دوسری جانب جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن بہاؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے آگے جانا ممکن نہ ہو پا رہا تھا۔

''یہ تو بہت مشکل میں پڑ گئے ہیں ہم۔ اب کیا کریں گے؟'' ایلن گھبرا گئی۔

''اسے تیر کر پار کریں گے اور کیا کریں گے۔'' پالے نے سادگی سے کہا۔ ایلن ناقابلِ یقین تاثرات لیے اسے دیکھتی رہی۔ پالے نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنا تمام اسباب گھوڑے پر اچھی طرح باندھ دیا۔

''مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھنا مجھے۔'' وہ دل کڑا کر کے بولا۔ ایلن جھجک سی گئی۔ اس کے ردعمل پر پالے کی حیرانی فطری تھی لیکن یہ وقت ایسی باتوں پر زیادہ گہرائی میں سوچنے کے لیے مناسب بھی نہ تھا۔

پالے نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر کے اسے پانی میں اتار دیا۔ گھوڑا سست رفتاری سے پانی کی تندی کا مقابلہ کرنے لگا۔ ایلن کی بہادری اب گھبراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ پالے کے گرد اس کی گرفت مضبوط تر ہونے لگی۔ گھوڑا ندی کے وسط میں پہنچا تو پانی کا بہاؤ اس قدر بڑھا کہ اس کی پیٹھ کے اوپر سے بہنے لگا۔ دو سواروں اور سامان کے بوجھ سمیت اس وفادار جانور نے پانی کی طغیانی کا مقابلہ کرنے کی بہت ہمت کی لیکن بے سود۔ گھوڑے کی ہمت کم سے کمتر ہوتی جا رہی تھی۔ اسی دوران ایلن کی نظر ایک جانب اٹھی۔ اس کا سانس خشک ہو گیا۔ ایک مضبوط اور بھاری بھرکم پیڑ کسی گولی کی رفتار سے ان کی جانب آ رہا تھا۔ ایلن نے چیخ کر پالے کو بھی اس جانب متوجہ کر دیا۔ پالے گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کا رخ موڑنے کی بھرپور کوشش کی لیکن پیڑ کی طوفانی رفتار بھیانک تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے ان کا تصادم یقینی ہے۔ ایلن نے خوف اور دہشت کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنی موت بالکل قریب نظر آ رہی تھی۔ اس موقع پر گھوڑے کی جبلت نے اس کی راہنمائی کی اور وہ خودکار انداز میں پانی میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ پیڑ اس کے بالکل متوازی طوفانی رفتار سے آگے گزر گیا۔ ایلن گھوڑے کے اس جھٹکے پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پھسلتی ہوئی اس ندی میں جا گری۔ پالے نے جب یہ منظر دیکھا تو اسے بچانے کے لیے چھلانگ لگا کر ندی میں کودا اور برق رفتار تیراکی سے اس کے پاس جا پہنچا۔

''میں مرنا نہیں چاہتی پالے! مجھے بچا لو..... پلیز مجھے بچا لو۔'' ایلن اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔

''ہوش کرو..... اگر تم اسی طرح مجھ سے لپٹی رہیں تو اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گی۔'' وہ سختی سے بولا اور... بہ مشکل خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا کے کندھے پر لاد لیا۔ پانی کا تیز بہاؤ چیرتے ہوئے کنارے کی طرف روانگی بہت کٹھن تھی۔ گھوڑا اس سے پہلے ہی وہاں بے چینی سے اپنے مالک کی واپسی کا منتظر اگلی ٹاپوں سے زمین کھودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پالے کو کنارے کے قریب آتے دیکھ کر اس نے گردن کے جھٹکے سے اپنی لگام اچھال کر پانی میں پھینک دی۔ پالے نے لگام مضبوطی سے پکڑی اور اس وفادار چوپایہ نے انہیں کھینچ کر ندی سے باہر نکال لیا۔ ایلن نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا تنفس مدھم ہونے لگا تھا۔ پالے نے اسے ایک بڑی چٹان پر لٹایا اور اپنے بھیگے کپڑوں سے پانی نچوڑنے لگا۔ اس کا لباس بھیگ کر جسم کا حصہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس مختصر سے لمحے میں ہی وہ اس کے لمس اور قربت کا ناقابلِ یقین حد تک عادی ہو گیا تھا۔ اس کی جانب اٹھنے والی ہر نظر دل میں نرم گرم جذبے اجاگر کرنے لگی۔ پالے اپنی کیفیات پر خود بھی حیران تھا۔ اس نے اپنی توجہ بٹانے کے لیے گھوڑے کی مالش کا آغاز کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سماعت میں ایلن کی نحیف آواز پڑی۔

''ہمیں یہاں کتنی دیر لگے گی خان؟''

''ندی کی باڑھ کم ہونے تک دس بارہ گھنٹے یہیں رہنا ہوگا۔''

''اوہ مائی گاڈ! اتنی دیر۔'' ایلن مضطرب ہوئی۔

''پہاڑی ندیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جب تک کل رات والی بارش کا پانی بہہ نہیں جائے گا یہ بہاؤ بھی کم نہ ہوگا۔'' پالے کے اس جواب پر ایلن متانت سے خاموش ہوگئی۔

ندی کے پانی کا تیز بہاؤ ایک گونج بن کر جنگل میں بازگشت پیدا کررہا تھا۔ ایلن کے پردۂ تصور پر کچھ دیر پہلے کے لمحات اجاگر ہوگئے جب اسے دو دفعہ موت بالکل اپنے سر پر منڈلاتی محسوس ہورہی تھی۔ ایک دفعہ پالے کے گھوڑے اور دوسری مرتبہ خود پالے خاں کی نڈر تیراکی نے اس کی جان بچالی تھی۔ ایلن کے دل میں ایک عجیب سی گدگداہٹ محسوس ہونے لگی۔ پالے کی بانہوں کا گھیرا اور کندھوں کا سہارا یاد آتے ہی دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ وہ کن انکھیوں سے بار بار اسے دیکھنے لگی لیکن ایلن کی کیفیات سے بے خبر پالے خاں اس کی نیم بے ہوشی کے دوران گھوڑے کی پیٹھ سے اتارا گیا سامان اب کھول کر ایک قریبی غار میں رکھنے لگا۔ یہ غار بھی اس نے کچھ دیر پہلے ہی دریافت کیا تھا۔ شام کے سائے تیزی سے ڈھلنے لگے۔ غار میں منتقلی کے بعد پالے نے لکڑیاں اکٹھی کرکے آگ جلائی اور ایلن کو کپڑے سکھانے کی تجویز دے کر بندوق تھامے باہر نکل گیا۔ اسے کھانے کے لیے اب کسی حلال جانور یا پرندے کی تلاش تھی۔

اس کے روانہ ہوتے ہی ایلن نے اپنے تن کو گیلے کپڑوں کی قید سے آزاد کیا اور غار میں رکھے پالے کے پٹھانی صافے سے خود کو لپیٹ لیا۔ صافہ طول وعرض میں قدرے کم تھا اس لیے کوشش کے باوجود بدن مکمل طور پر ڈھکا نہ جاسکا۔ ہلکی سی جنبش اسے کسی نہ کسی طور نیم برہنہ کر دیتی۔ کپڑے سکھانے کا مرحلہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ پالے رات کے کھانے میں شکار کیے چند تیتر لیے چلا آیا۔ اندھیرا ہوجانے سے قبل یہ شکار مل جانا غنیمت تھا۔ ایلن اسے اپنے سامنے دیکھ کر ہڑبڑا گئی۔ اس کے نیم برہنہ بدن کی جھلک نے پالے کو بھی جھینپنے پر مجبور کردیا تاہم وہ رخ موڑ کر دہکتی آگ پر تیتر بھوننے لگا۔

''جنگل سے کوئی جانور ادھر آنکلا تو کیا کریں گے ہم؟'' ایلن نے بلا ارادہ اسے مخاطب کیا۔

''جنگلی جانور آگ سے ڈرتے ہیں۔ وہ اندر نہیں آئیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہارے ہم وطن افراد ہمارے اس آزاد علاقے میں اس وقت تک نہیں آسکیں گے جب تک ہمارے دلوں میں آزادی کا الاؤ دہک رہا ہے۔'' پالے نے اپنی کیفیات سے فرار کے لیے اسے حقیقت سے آشنا کروانا ضروری سمجھا۔

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم بھی آگ سے ڈرتے ہو۔'' ایلن نے کچھ لمحات قبل اس کی خفت پر چوٹ کی۔

''ڈرنا ہی چاہیے ورنہ اس کی تپش جسم ہی نہیں بلکہ عزم، خواب اور ارادے بھی جلا دیتی ہے۔'' پالے نے بھی برجستہ کہا اور بھنے ہوئے تیتر سے کچھ گوشت اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کھالو اسے! اگلا کھانا پتا نہیں کب نصیب ہوگا جنگل میں۔''

ایلن نے خاموشی سے اپنے حصے کا گوشت تھاما اور کھانا شروع کردیا۔ رات اپنے پر مکمل طور پر پھیلا چکی تھی۔ ایلن کا اضطراب انگڑائیاں لیتا بیدار ہونے لگا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش بیدار ہورہی تھی کہ پالے اس کی طرف متوجہ ہوکر کوئی بات چیت کرے۔ وہ اس کی آواز سنتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھلکتے نرمی وسختی کے رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کیفیات نے جب اسے زیادہ بے چین کیا تو وہ بے اختیار اٹھی اور غار میں رکھے سامان سے دلربا اٹھالیا۔ پالے خاں آتے ہوئے اسے بھی سامان میں رکھ لایا تھا۔ ایلن کے اناڑی ہاتھوں کا لمس پاکر ساز کی نازک تاروں نے پوری شدت سے صدائے احتجاج بلند کردی۔

''یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ چھوڑ دو اسے!'' پالے نے گوشت کترتے ہوئے طنز کیا۔

''تو تم سکھا دو مجھے۔'' ایلن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پالے نے سر جھکا اور اپنے ہاتھ میں گوشت کے آخری پارچے سے انصاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا! مت سکھاؤ لیکن کوئی نغمہ ہی سکھا دو۔ میں نے تو سنا ہے کہ تم پٹھان لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہو۔ کیا اپنے مہمان کی اتنی سی فرمائش بھی پوری نہیں کرسکتے؟'' ایلن نے معصومیت سے کہا۔ پالے نے کسی انجان جذبے کے تحت دلربا تھام لیا۔ اس کی انگلیوں کا شناسا لمس پاتے ہی مدھر موسیقی کی تان غار کی محدود فضا میں بکھر گئی۔ پالے دیوار کی پشت سے کمر لگائے بیٹھا تھا۔ موسیقی کے ترنم میں اس نے آنکھیں بند کیں اور مقامی زبان میں گنگنانے لگا۔

''میں پربتوں کا شہزادہ ہوں۔
یہ زمرد کی محلیں وادیاں اور عظیم پہاڑ میری سلطنت ہیں۔

اس سلطنت کا ہر ایک گوشہ میری روح میں بستا ہے۔
آزادی میری دلہن اور روح کی ساتھی ہے۔
اے بے خبر! تم کیا جانو؟ روح میں بسنے والوں سے جدائی موت ہے۔
میں اپنی سلطنت سے بیش قیمت موت کے بعد بھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔''
ایلن اس زبان سے ناواقف تھی لیکن اس کے باوجود درد اور کسک کے طاقتور جذبے اسے اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ اس مسحور کن کیفیت کا خاتمہ بھی پالے کی آواز نے ہی کیا۔
''رات کافی ہوگئی ہے۔ سو جاؤ اب!''
''تم کہاں سوؤ گے؟'' ایلن نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔
''باہر اپنے گھوڑے کے پاس۔'' پالے نے لکڑیوں کی آگ تیز کی اور اپنی پوستین اٹھا کر باہر چلا گیا۔ ایلن کے وجود سے نظریں چرانا اور اس کی موجودگی مزید نظر انداز کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات سوئی جاگی کیفیت میں بیت گئی۔
ایلن اور پالے کے درمیان حائل الاؤ پالے کے دل میں اپنی حدت شدید سے شدید تر کر رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی اس نے گلہ رشکر ادا کیا کہ اس کٹھن اور صبر آزما وقت کا بالآخر اختتام ہوگیا ہے۔ اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر سفر کا آغاز کیا اور دس بجے کے قریب اس آزاد علاقے کی سرحد تک آ گیا۔ برٹش چوکی اب سامنے ہی موجود تھی جس پر سورج سنہری کرنوں میں چمکتا یونین جیک کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ایلن کو نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی بار اس جھنڈے کو دیکھ کر افسردگی محسوس ہوئی تھی۔
''میں نے اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ نبھا کر تمہیں منزل تک پہنچا دیا ہے۔'' پالے نے کہا۔
''اب یہاں تک پہنچا ہی دیا ہے تو تھوڑا سفر اور بھی طے کرلو۔'' ایلن نے چوکی کی طرف اشارہ کیا۔
''وہ دشمن کا علاقہ ہے۔ میں وہاں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔
''کیا تم اب بھی ہمیں دشمن سمجھتے ہو؟'' ایلن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جذبوں کی ایک تند رو پالے کے وجود میں ہیجان بن کر منتقل ہوگئی۔
''میں برطانوی راج کے اصولوں کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔
''فرض کرو کہ ہم اپنے یہ اصول تبدیل کر دیں تو بھی ہماری جانب قدم نہیں بڑھاؤ گے؟'' ایلن اس کے مزید قریب ہوئی۔
''تم ناممکن باتیں کر رہی ہو۔ ہمیں غلامی سے نفرت ہے اور تمہارے ہم وطن ہماری آزادی کے مخالف ہیں۔'' وہ اس کی قربت کی حدت سے پگھل رہا تھا۔
''دوست تو بن ہی سکتے ہیں نا؟''
''سوچ لو! بعض اوقات دوستی کی بھی قیمت چکانی پڑتی ہے۔'' پالے اس کی آنکھوں کے بھنور میں کھوتا جا رہا تھا۔
''میں تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پاپا کو بھی سمجھاؤں گی کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دیں۔''
ایلن نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''میں نے فرنگیوں کی بات پر کبھی اعتبار نہیں کیا لیکن تم پر اعتبار کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔''
''دل کی بات ٹالا نہیں کرتے۔ دل کی گواہی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔'' ایلن بھی اس کی آنکھوں میں ڈوب سی گئی۔ انہی کیفیات سے مغلوب ہو کر پالے نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔
''ہماری دوستی کی نشانی سنبھال کر رکھنا۔''
''اپنی جان سے بھی زیادہ حفاظت کروں گی میں اس کی۔'' ایلن نے رومال لے کر گلے میں باندھ لیا۔ پالے نے اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا دیا۔ اب وہ ایلن کو چھونے میں بالکل متامل نہیں تھا بلکہ وہ ایک شدید نوعیت کا استحقاق محسوس کرنے لگا تھا۔
''اپنا گھوڑا کس طرح واپس لو گے؟''
''چوکی پر پہنچ کر اسے چھوڑ دینا۔ یہ واپسی کا راستہ جانتا ہے۔ خود ہی لوٹ آئے گا۔'' پالے نے الوداعی نظروں سے اسے دیکھا۔ ایلن کے مزید کوئی بات کرنے سے قبل ہی فضا گولی کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ پالے خاں بری طرح بدک گیا۔ اس نے فوری طور پر بندوق اپنے کندھے سے اتار لی۔ اس کا یہی گمان تھا کہ یہ گولی انگریزوں کی طرف سے ہی چلائی گئی ہے لیکن درختوں کے ایک کنج سے حسن، قاسم، عبداللہ اور جمال کو نکلتے دیکھ کر وہ مطمئن ہوگیا۔
''یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو پالے!'' حسن نے کہا۔
''یہ لڑکی ہمارے ساتھی عبدل کی رہائی کا پروانہ ہے اور تم اسے آزاد کر رہے ہو؟''
''ہاں! کیونکہ میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس لڑائی میں عورتوں کو اپنا ہتھیار نہیں بنائیں گے۔''

''یہ وعدہ تم نے کیا ہوگا۔ ہم نے تو نہیں کیا۔ اس فرنگن کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم خود ہی اس کے عوض عبدل کو رہا کروا لیں گے۔'' حسن کے تیور اکھڑ تھے۔

''میں تمہارا سردار ہوں اور سردار کا وعدہ اس کے ہر ساتھی پر لاگو ہوتا ہے۔'' پالے کے دوٹوک انداز پر وہ تلملا گیا۔

''اگر کل کلاں کو تمہاری والدہ نے اپنے ہی ساتھیوں کو چھوڑ کر ہتھیار ڈال دینے کو کہا تو کیا وہ بات بھی مان لوگے؟'' جمال خاں نے تلخی سے کہا۔ پالے یہ بدتمیزی برداشت نہ کرسکا۔ اس نے جمال کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹا اور پھنکارتے ہوئے بولا۔

''تم میرے قریبی ساتھی نہ ہوتے تو اس زمین پر پڑے تڑپ رہے ہوتے۔''

ایلن اس ساری صورتِ حال میں کافی خوفزدہ ہوچکی تھی۔ اسے پالے خاں کی قید تو منظور تھی لیکن اس کے ساتھیوں کے پاس رہنے کا تصور ہی بہت وحشت ناک تھا۔

''تم واپس جاؤ ایلن!'' پالے نے اسے حکم دیا۔ حسن اور قاسم نے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔ حسن نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی۔''

''اسے سرحد پار کرنے دو حسن! یہ میرا حکم ہے اور تم میرا حکم ماننے کے پابند ہو۔''

''ہم نے سردار کا حکم ماننے کا عہد کیا تھا، کسی غدار کا نہیں... اور تم اس.....'' حسن خاں کا جملہ ابھی ادھورا ہی تھا کہ پالے نے ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا۔ حسن کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں طیش وغضب کی چنگاریاں تھیں جن سے مغلوب ہوکر اس نے پیٹی سے خنجر نکالا اور پالے پر ٹوٹ پڑا۔ پالے نے پھرتی سے جھکائی دی اور حسن کا خنجر بردار ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے حسن کے سر پر مخصوص مقام پر چند ضربیں لگائیں اور اسے مکمل بے بس کردیا۔ اس توہین نے پالے کے ہوش وحواس بھی سلب کرلیے تھے۔ وہ خنجر چھین کر حسن کے سینے میں گھونپنے کے لیے پل پڑا لیکن عبداللہ اور قاسم آڑے آگئے۔

''کیا کررہے ہو پالے خاں؟ وہ نادان ہے مگر تم تو سمجھداری سے کام لو۔'' پالے کا ہاتھ وہیں تھم گیا۔ اس کے دل میں بھی اپنے اس عمل پر ندامت کا احساس پیدا ہوا تھا۔ اس طرح تو وہ اپنے لیے غدار کا لقب مزید پختہ کرلیتا۔ اس نے غصے اور جھنجلاہٹ میں خنجر پوری قوت سے جنگل کی طرف اچھال دیا۔ ایلن اس کی یہ حالت دیکھ کر سراسیمگی کی انتہا پر تھی۔ پالے کے ساتھیوں کا ردعمل اسے ممکنہ قید کا احساس دلا رہا تھا لیکن پھر پالے اور حسن کی اس لڑائی نے اس کے دل میں احساسِ تفاخر پیدا کردیا۔ پالے خاں اس کی رہائی کے لیے اپنے ساتھیوں سے جھگڑا مول لے رہا تھا۔ ایلن کو اپنا وجود بادلوں سے بھی اوپر محوِ پرواز محسوس ہونے لگا۔

''تم ابھی تک یہیں کیوں کھڑی ہو؟ جاؤ اس طرف۔ دیکھتا ہوں تمہیں کون روکتا ہے۔'' وہ گرجتے ہوئے بولا۔

''اچھا پالے! گڈ بائے! اپنا خیال رکھنا۔'' وہ دلربائی سے مسکراتے ہوئے چوکی کی طرف بڑھ گئی اور وہاں پہنچتے ہی اپنے والد کو فون ملانے کا حکم دیا۔ میجر بارنس بیٹی کی آواز سنتے ہی جذبات سے بے قابو ہوگیا۔

''تم..... میری بچی..... ٹھیک تو ہو نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں پاپا! آپ کیسے ہیں؟'' وہ پگھل رہی تھی۔

''تم یہاں تک چوکی میں کیسے پہنچ گئیں؟ اس وحشی درندے کی قید سے فرار کیسے ہوئیں؟ رستے کا علم تھا تمہیں کیا؟'' میجر نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کردیے۔

''آپ جسے وحشی درندہ کہہ رہے ہیں پاپا! وہ مجھے خود یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ اس نے کل ایک بار نہیں دو مرتبہ میری جان بچائی ہے۔'' ایلن جذباتیت سے بولی۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا۔ اس نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟'' بارنس کو بیٹی کی عصمت دری کا خدشہ تھا۔

''آپ خود آکر کیوں نہیں دیکھ لیتے پاپا؟ اگر میری زبان کا اعتبار نہیں ہے تو اپنی آنکھوں پر ہی یقین کرلیجیے گا۔'' اس نے جھنجلا کر فون بند کردیا۔ میجر کی آمد سے قبل اس نے گھوڑے کو گھاس کھلا کر آزاد سرحدی علاقے کی طرف روانہ کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میجر بارنس کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ گلباز کو دیکھ کر ایلن خاصی بدمزہ ہوئی تھی۔ بارنس فوراً آگے بڑھ کر بیٹی سے بغلگیر ہوگیا۔ اسے اپنی بصارت پر بھی یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ ایلن بحفاظت اس کے سامنے موجود ہے۔

''پالے خاں کی انگریزوں سے دشمنی دیکھ کر یقین نہیں آرہا کہ مس صاحبہ ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔'' گلباز نے طنز کیا۔ وہ بالواسطہ طور پر یہی جتانا چاہتا تھا کہ ایلن نے اپنی آزادی کی کوئی نہ کوئی ''قیمت'' چکائی ہوگی۔

''تم جیسے بزدلوں کو یقین آبھی کیسے سکتا ہے؟ یہ معاملات

تمہاری سمجھ سے بہت اوپر ہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''ایسے کیا معاملات ہیں بھلا مس صاحبہ؟'' گلباز نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''یہ شرافت اور انسانیت کی بہادرانہ باتیں ہیں کیپٹن گلباز خاں! اور انہیں کوئی بزدل بھلا کیسے سمجھ سکتا ہے؟'' ایلن نے دوبدو جواب دیا۔

''بزدلی اور بہادری تو اس وقت واضح ہو جائیں گی جب میں پالے خاں کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے لاؤں گا۔'' گلباز نے منہ بنایا۔

''پہلے ایسے خواب دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں میں اتنی وسعت تو پیدا کرلو۔ پالے خاں کی گرفتاری تم جیسوں کے بس کا روگ ہی نہیں۔ تمہاری بہادری تو میں نے اسی روز دیکھ لی تھی جب وہ سب کے سامنے مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اگر وہ دلیر نہ ہوتا تو کوئی مجھے رہائی نہ دلوا پاتا۔''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں بے بی!'' میجر بارنس نے مداخلت کی۔ ''اس نے تمہیں رہا کیسے کر دیا؟''

''اور یہی تو میں بتا رہی ہوں پاپا کہ پالے خاں ایک بہادر اور نڈر انسان ہے۔ بہادر اخلاقی ضوابط کے پابند ہوتے ہیں۔ انہیں ظرف اور حوصلہ اس مقام پر لایا کرتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے ایک حکم پر مجھے چھوڑ دیا کیونکہ ''مدر میری'' جیسی اس ماں کا کہنا تھا کہ جنگ میں عورتوں کو گھسیٹ لانا بزدلوں اور کم ظرفوں کی نشانی ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان ماں بیٹے کے کردار سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔'' ایلن کی اس عقیدت نے میجر بارنس کی تیوریوں پر بل ڈال دیے۔

''تم شاید ہوش میں نہیں ہو ایلن! تم بھول رہی ہو کہ وہ شخص ہمارا دشمن ہے۔''

''نہیں پاپا! وہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی آزادی کی حفاظت کر رہا ہے اور آزاد رہنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔''

''وہ ہمیں کتنا نقصان پہنچا چکا ہے اس بات کا اندازہ بھی ہے تمہیں؟'' بارنس تلملایا۔

''آئندہ نقصان سے بچنے کے لیے ایک مشورہ دے سکتی ہوں میں۔ اسے گرفتار کرنے کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ وہ کسی سبک ہوا کی طرح ہے۔ کبھی زیر نہیں ہوگا۔ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایئے۔ اس کے علاقے کے لوگوں کو پیدائشی حق سے محروم نہ کیجیے۔ وہ آپ کو جوابی طور پر کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''یہ سبق آپ کو اسی نے پڑھا کر بھیجا ہوگا مس صاحبہ! ہے نا؟'' گلباز نے مداخلت کی۔

''شٹ اپ! میں اپنے باپ سے بات کر رہی ہوں۔ تمہیں درمیان میں بولنے کا حق کس نے دیا ہے؟'' ایلن نے گرج کر کہا۔ گلباز خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''مجھے ہندوستان آپ نے بلوایا ہے پاپا! میرا اغوا بھی آپ کی برٹش ایمپائر کی وجہ سے ہی ہوا۔ میں نے تو اس سفر اور قید میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ خوشامدی دوست سے زیادہ غیرت مند اور بااصول دشمن کہیں بہتر ہوتا ہے۔'' وہ متانت سے کہتی ہوئی گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ سفر کے اختتام تک گاڑی میں خاموشی رہی۔ ایلن کے مکان میں جاتے ہی بارنس گلباز سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''بے بی کی بات کا برا نہ ماننا کیپٹن! وہ ابھی بچی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں سر! وہ پالے خاں کے جال میں پھنس گئی ہیں۔'' گلباز نے خوشامد سے جواب دیا۔

''ویسے بے بی کی تجویز میں دم تو ہے۔'' بارنس کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ گلباز سٹپٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ میجر کو یاد دہانی کروائے کہ ابھی ایک لمحے قبل تو وہ اسے ناسمجھ بچی کہہ چکا ہے اور اب اس کی ناسمجھی پر غور و فکر بھی کر رہا ہے۔ عہدے کا بھرم اور نوکری کی یہ مجبوریاں بہت سی باتیں کہنے ہی نہ دیتیں۔ گردن کے گرد پھندا محسوس ہونے لگتا تھا۔

''سر! وہ ابھی تو یہاں آئی ہیں۔ انہیں ہندوستان اور برٹش ایمپائر کے معاملات کا کچھ علم نہیں۔ پالے خاں نے انہیں ورغلایا ہے۔ یہ پالے کی چال ہے۔ اسے علم ہے کہ آج نہیں تو کل اس علاقے پر برٹش ایمپائر کا قبضہ ہو ہی جائے گا۔ وہ صرف اپنی جان بچا رہا ہے۔'' گلباز نے حتی الامکان نرم الفاظ اختیار کیے۔

''اس نے اپنی چال چل لی لیکن اسے یہ علم نہیں کہ وہ ہماری چالبازی کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''لگتا ہے آپ نے اپنے ذہن میں کوئی حکمت عملی بنائی ہے۔'' گلباز جز بز ہوا۔

''ہاں! عبدل کو رہا کر دو۔'' بارنس مسکرایا۔

''ایسا غضب کیوں کر رہے ہیں سر؟'' وہ گھبرا گیا۔

''ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں، یہ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا حکم ہے اور اسے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔'' بارنس نے درشتی سے جواب دیا۔

''لیکن اس رہائی سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا سر؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''وقت آنے پر سب کچھ جان لوگے۔'' بارنس معنی خیزی سے بولا۔ ''اب تم جاسکتے ہو!''

گلباز خاموشی اور بے دلی سے سیلیوٹ جھاڑ کر واپس مڑا تو اس کے دل میں پالے سے نفرت اور اپنی بے بسی کا احساس مزید گہرا ہوگیا تھا۔ فرنگی ملازمت سے حاصل ہونے والی یہ طاقت اور اختیارات اسے عجیب تشنہ لبی میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ وہ آزاد ہوکر بھی اسیر تھا۔ حاکم ہوکر بھی محکوم اور صیاد ہوکر بھی مقید تھا۔

☆☆☆

ایلن اور بارنس کی ملاقات اگلے روز ناشتے پر ممکن ہوئی۔ ایلن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی غسل کرکے تازہ دم ہوئی تھی۔ سفر کی تھکاوٹ اور نیند کا خمار اترتے ہی وہ بے حد تازہ دم ہوچکی تھی۔ بارنس کی گہری نظریں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ وہ اپنی تجربہ کاری سے اتنا تو بھانپ گیا تھا کہ پالے یا اس کے کسی بھی ساتھی نے ایلن کی عزت کو میلی نظر سے نہیں دیکھا ہے تاہم بیٹی کے مزاج میں آنے والی تبدیلی بھی اسے مضطرب کیے ہوئے تھی۔ وہ پالے خاں سے متاثر بھی نظر آتی تھی اور بارنس اسی تاثر کی گہرائی کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔

''گڈ مارننگ پاپا!'' ایلن نے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی باپ کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''گڈ مارننگ ڈیئر!'' بارنس نے ایلن کا سر تھپتھپایا۔ ایلن اس کے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''رات کو نیند تو ٹھیک سے آگئی نا؟''

''کیسے نہ آتی؟ اتنی خوبصورت جگہ ہے یہ۔'' ایلن کافی سرشار تھی۔

''یہاں آکر مجھے تمہاری ممی بہت یاد آنے لگی ہے۔ اسے ایسی پُرسکون جگہیں بہت پسند ہوا کرتی تھیں۔'' بارنس نے خانساماں کا لایا ہوا ناشتا اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پالے خاں کے متعلق کچھ سوچا ہے یا نہیں؟'' ایلن کے اس اچانک سوال پر اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہی نہیں تھی۔

''ہاں! سوچنا کیسا؟ میں کسی کا قرضدار نہیں رہنا چاہتا۔ پالے نے تمہیں رہا کرکے جو احسان کیا ہے میں اس کے بدلے میں عبدل کو آزاد کردوں گا۔''

''اوہ پاپا..... سچ..... یہ تو بہت اچھا کام کیا ہے آپ نے۔'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ بارنس اس کی ہر ایک حرکت کا بغور معائنہ کررہا تھا۔

''اب پالے کو یقین ہوجائے گا کہ ہم بھی اصول پسند قوم ہیں۔'' وہ اترا کر بولی۔

''آج مسلمانوں کی عید کا تہوار ہے۔ اس کے بعد یہاں بہت بڑا جرگہ ہوگا۔'' میجر نے سرسری انداز میں کہا۔

''اس جرگے میں کیا ہوتا ہے پاپا؟'' ایلن چونکی۔

''اس جرگے میں ہر سال تمام قبیلے جمع ہوتے ہیں۔ نوجوان کھیل تماشوں میں حصہ لیتے ہیں۔ پھر انہیں انعام تقسیم کیے جاتے ہیں۔''

''کیا اس جرگے میں پالے خاں بھی آئے گا؟'' ایلن کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔

''میں نے اس بارے میں معلومات لی تھیں۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ وہ یا اس کے قبیلے میں سے کوئی بھی فرد وہاں نہیں آیا کرتا۔'' بارنس نے تاسف جتایا۔

''لیکن ایسا کیوں پاپا؟ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔'' ایلن نے منہ بنایا۔

''اب برطانوی راج سے اتنی نفرت کا عملی اظہار کرنے سے یہ سب تو ہوگا ہی۔'' بارنس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''آپ نے کبھی پالے خاں سے ملاقات کی ہے پاپا؟''

''نہیں! آج تک تو ایسا موقع نہیں مل سکا اور اگر مستقبل میں ملاقات ہو تو میں اسے اپنے راستے پر لانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' بارنس کی اس حکمتِ عملی نے ایلن کو جھومنے پر مجبور کردیا۔ عالم جوش میں اس کا ہاتھ کافی کے پیالے پر جالگا۔ چھینٹے کپڑوں پر گرے تو وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ابھی آتی ہوں پاپا!'' وہ کپڑوں کو جھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میری کافی کے دھبے صاف کروانے کے لیے لیک کراس کے پاس چلی آئی۔ ایلن اسی موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھانے لگی۔ میری سراسیمگی سے انکار میں سر ہلاتی رہی لیکن انجام کار اسے ایلن کی بات تسلیم کرتے ہی بنی۔

☆☆☆

عید کے اس روز پالے خاں کے خفیہ پہاڑی مقام پر دعوت کا سماں تھا۔ قاسم اور جمال مسلم دنبے کے پیٹ میں چاول اور مسالے بھر کر پلاؤ کی تیاری میں مگن تھے۔ عبداللہ

کے ذمے الاؤ کی تیاری کا کام تھا۔ حسن خاں البتہ ان سب سے قدرے دور آگ جلائے قہوہ بنا رہا تھا۔ آگ کی تپش نے سردی کا احساس کم کر رکھا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیتے بظاہر مطمئن اور خوش باش دکھائی دے رہے تھے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ ان کے دل افسردگی کی دبیز دھند میں لپٹے تھے۔ عبدل کی کمی اور ایلن کی رہائی کے وقت ہونے والا ناخوشگوار واقعہ انہیں کوئی بھی خوشی محسوس ہونے ہی نہیں دے رہا تھا۔ پالے بھی قدرے فاصلے پر ایک چٹان سے پشت ٹکائے دلربا کے تاروں پر انگلیوں کا ہلکا لمس دیتا کسی گہری سوچ میں مگن تھا۔

''کیا بات ہے خان؟ وہ بات ابھی تک دل پر لگائے بیٹھے ہو کیا؟'' قاسم نے پوچھا۔

''نہیں! یہ سب تو زندگی میں چلتا ہی رہتا ہے۔ اتنی معمولی باتوں کو دل پر کیا لگانا؟'' پالے نے سر جھٹکا۔

''تو پھر کیا لگا یا ہے دل پر؟'' حسن نے بھرپور خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

''کہیں وہ فرنگی لڑکی تو یاد نہیں آ رہی اپنے لالہ کو؟'' قاسم نے بھی چٹکی بھری۔

''ارے قاسم خاناں! یاد تو وہ آتا ہے نا جسے انسان بھولا ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اپنا سردار اس فرنگن کو بھولا ہی نہیں ہے۔'' حسن نے تان لگائی۔

''کیا حسن ٹھیک کہہ رہا ہے سردار؟'' جمال چونکا ہوا۔

''ہاں! کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' پالے نے دانستہ طور پر معنی خیز جواب دیا۔

''دیکھا! آ گیا نا سچ آخر زبان پر۔'' حسن کے قہقہے میں ایک زہریلی سی چبھن واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

''کیا یہ واقعی سچ ہے سردار؟ کیا حسن کی بات درست ہے؟'' جمال کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

''نہیں بھئی! یہ سب تو میں حسن کا دل خوش کرنے کے لیے کہہ رہا تھا ورنہ میرا عشق صرف دلربا اور اپنے وطن کی آزادی ہے۔ میری زندگی میں اور کسی چیز کی گنجائش ہی نہیں۔''

''خدایا! تیرا شکر ہے۔ میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔'' پالے کے مضبوط لہجے پر جمال کی رنگت بڑی تیزی سے بحال ہوئی۔ حسن بھی خفت زدہ دوسری جانب منہ موڑے بیٹھ گیا۔

''اور اگر ایسا واقعی ہو گیا تو؟'' پالے نے کسی خدشے کے تحت پوچھ لیا۔

''تو ہمارا ساتھ وہیں ختم ہو جائے گا۔'' جمال کے الفاظ حسن کے اٹھائے گئے خنجر سے بھی زیادہ اذیت ناک تھے۔ پالے کو پل بھر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اس کے سبھی ساتھیوں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ اسے اپنے سبھی الفاظ اور دلائل گنگ ہوتے محسوس ہونے لگے۔ یہ کیفیات زیادہ دیر تک اس پر غالب نہ رہ سکیں۔ اسے پہاڑوں میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ دیگر کاموں میں مصروف ساتھی بھی چونک کر اپنے ہتھیار سنبھال چکے تھے۔ قاسم نے سامان سے انگریزوں سے ہی چھینی گئی ایک دوربین نکالی اور پالے کو تھما دی۔

''عبدل..... یہ تو اپنا عبدل ہے۔'' پالے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہی حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ سب خوشی اور جوش میں اس خفیہ غار سے باہر نکل آئے۔

''تم فرنگیوں کی قید سے کیسے نکلے؟'' حسن نے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

''نکلا نہیں ہوں..... آزاد کیا گیا ہوں۔'' عبدل انہیں ایلن کی واپسی کے عوض ملنے والی رہائی کے متعلق بتانے لگا۔

''مجھے تو اس میں بھی فرنگیوں کی کوئی چال ہی لگتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک چلے آئیں۔'' قاسم کو نئی تشویش لاحق ہوئی۔

''نہیں! میں نے اس بات کا خصوصی خیال رکھا ہے۔'' عبدل نے انہیں تسلی دی اور پالے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''جیل خانے میں میرے پاس ایک نوکرانی آئی تھی۔ اس نے ایلن کی یہ چٹھی تمہیں پہنچانے کے لیے دی ہے۔'' عبدل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اسے تھمایا۔ حسن خاں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا جمال اور قاسم کی جانب جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا لکھا ہے خط میں؟ ذرا ہمیں بھی تو علم ہو۔'' حسن نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ پالے کی بے تاب نظریں بھی ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ پر پھسل رہی تھیں۔

''ڈیئر پالے! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہم بھی ایک اصول پسند قوم ہیں۔ مجھے رہا کر کے تم میرے پاپا کا اعتماد ضرور جیت لو گے۔ ہماری اس دوستی کا پہلا تحفہ عبدل کی رہائی کی صورت میں بھیج رہی ہوں۔ دوست ایک دوسرے سے فرمائش کرنے کے بھی تو حقدار ہوتے ہیں نا۔ اسی رشتے کے ناتے میں تم سے جرگے میں آمد کی فرمائش کروں تو تم انکار نہیں کرو گے۔ تمہیں جرگے میں آنا ہو گا۔ وہاں ہونے والے مقابلے دیکھنے سے زیادہ مجھے تم سے ملاقات میں

دلچسپی ہے۔ میں شدت سے تمہارا انتظار کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آمد اس رشتے کو ایک نئی سمت اور گہرائی دے گی۔ دل و جان سے منتظر.....ایلن!''

''کچھ نہیں! جرگے میں آمد کی دعوت دی ہے۔'' پالے نے مختصراً بتایا۔

''کیا جواب دینا ہے اس خط کا؟'' قاسم نے دریافت کیا۔

''میں اس جرگے میں شرکت کے لیے جاؤں گا۔ اپنی جرأت اور حوصلہ ظاہر کرنے کا اس سے بہترین موقع کہیں نہیں ملے گا۔''

''تو دلیری کا یہ مظاہرہ صرف تم ہی کیوں کرو۔ ہم سب نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟ ہم بھی ساتھ ہی جائیں گے۔'' جمال نے تجویز دی۔

''بالکل ٹھیک! ایک مدت ہوئی ان کھیل تماشوں کو دیکھے ہوئے۔ کیا زندگی کی ان تفریحات پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے؟'' حسن نے بھی لقمہ دیا۔ پالے ان کی تجویز سے متفق نہیں تھا لیکن وہ ان کی خواہش کے احترام میں مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ سردار کی رضامندی پاتے ہی وہ سب کھل اٹھے۔ عبدل کی واپسی کی خوشی دوبالا ہوگئی تھی۔ ان لمحات میں کسی نے غور ہی نہیں کیا کہ حسن خاں کے مزاج پر ایک سرد مہری خاموشی غالب آچکی ہے۔ وہ ایک غیر ملکی لڑکی کے سامنے اپنی بے عزتی اور اس کا جوابی تفاخر فراموش ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

شہر سے باہر سرسبز کمپنی باغ میں جرگے کی رونق عروج پر تھی۔ سرسبز گھاس کے اس میدان میں شامیانہ سجایا گیا تھا۔ رنگ برنگی پوشاکوں اور روایتی پگڑیوں میں ملبوس افراد ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے۔ اس ہجوم کے مقابل ایک چبوترا سجایا گیا تھا جس پر رکھی کرسیوں پر انگریز مہمان اپنی مستورات کے ہمراہ براجمان تھے۔ چبوترے پر ہی قدرے فاصلے پر دو بلند کرسیاں بھی موجود تھیں۔ جرگے کی باقاعدہ کارروائی کے آغاز سے پہلے میجر بارنس اور ایلن کی آمد ہوئی اور دونوں انہی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ گلبز سائے کی طرح ان کے پیچھے مستعد تھا۔ مقامی افراد کی نشستوں سے ایک ادھیڑ عمر شخص اٹھا اور روایتی انداز میں میجر کا استقبال کرتے ہوئے جرگے کے آغاز کی اجازت طلب کی۔ بارنس نے مسکراتے ہوئے اپنی سرکاری ٹوپی اتار کر دوبارہ سر پر رکھی۔ یہ جرگے کے آغاز کی اجازت تھی۔ اس کے ساتھ ہی فضا ڈھول تاشوں کی بلند آوازوں سے گونج اٹھی۔ مختلف قبیلوں کے نوجوانوں میں باہمی مقابلوں کی ابتدا کا وقت ہو گیا تھا۔ ہجوم کا ولولہ اور نعرے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

تلوار بازی کا مقابلہ سب سے پہلے کروایا جاتا تھا۔ خوبرو نوجوان اپنے روایتی قبائلی لباس پہنے برہنہ تلواروں کے ساتھ میدان میں چلے آئے۔ دھوپ میں چمکتی تلواریں نظریں خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ شمشیر زنی کا یہ مقابلہ کافی خوفناک ثابت ہوا۔ مہارت اور جرأت کی کسی بھی نوجوان میں کمی نہ تھی۔ انہیں شکست سے دوچار کرنے والی واحد شے صرف قسمت تھی۔ کئی نوجوان شدید زخمی ہونے کے بعد بھی اس مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے تاہم قبیلے کے دیگر رضاکاران کے لہولہان جسموں کو کسی طرح گھسیٹ کر باہر لے جاتے۔ کچھ دیر بعد میدان میں صرف ایک ہی نوجوان باقی رہ گیا۔ اس کی خوشی اور جوش کے ساتھ اس کے قبیلے میں بھی مسرت آمیز نعرے فلک شگاف تھے۔ نوجوان کی یہ خوشی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ہجوم سے ایک سرخ پوش نوجوان کودنے کی طرح لپکا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نووارد کی پگڑی کے آدھے چھور نے اس کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

''میرا نام لال خان ہے۔ مجھ سے مقابلہ کرو۔ جیت گئے تو فاتح ورنہ خاموشی سے اس بھیڑ میں گم ہو جانا۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز میں شعلوں کی لپک تھی۔ دوسرے نوجوان نے عزم سے تلوار اٹھائی اور ایک اعصاب شکن مقابلے کا آغاز ہو گیا۔ تلواروں کی لپک اور ٹکراؤ سے اڑنے والی چنگاریوں نے سب کو دم سادھنے پر مجبور کر دیا۔ فاتح نوجوان نے کچھ دیر تو بھرپور مقابلہ کیا لیکن سرخ پوش کی مہارت اور جنون بلاخیز تھا۔ وہ اپنے حریف کو زخمی کر کے اس پہلے مقابلے کا فاتح بن گیا تھا۔ ہجوم میں ہر جانب سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہو رہے تھے لیکن وہ بے نیازی سے چبوترے پر دھری دو بلند کرسیوں اور ان کے عقب میں مامور ''پہریدار'' کو ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میجر بارنس اور ایلن کی نگاہوں میں توصیفی رنگ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

جرگے کا اگلا مقابلہ بندوق سے نشانہ بازی کا تھا۔ اڑھائی سو گز کے فاصلے پر ایک چوبی تختہ نصب کیا گیا۔ اس تختے کے وسط میں بیل کی آنکھ نما دائرہ بنایا گیا تھا۔ مقابلے کے شرکاء کو دائرے کے وسط میں ایک مخصوص نشان کو اپنا نشانہ بنانا تھا۔ بیس نوجوان یکے بعد دیگرے رائفل لیے اپنی

قسمت آزمانے میدان میں اترے۔ دو افراد کے علاوہ کسی کا نشانہ دائرے تک نہ پہنچا۔ مخصوص نشان ہنوز ناقابلِ تسخیر تھا۔ ان بیسیوں نوجوانوں کے بعد لال خان نے بندوق تھامی اور بے نیازی سے گولی چلا کر اس مغرور نشان کی دھجیاں اڑا دیں۔ بارنس ایسی مہارت پر بے ساختہ تالیاں بجانے پر مجبور ہوگیا۔ ایلن بھی بے حد سنسنی محسوس کر رہی تھی۔

تیسرا مرحلہ نیزہ بازی کی مہارت ثابت کرنے کا تھا۔ انتظامیہ کی جانب سے مختلف دنبے ایک قطار میں رکھ دیے گئے۔ مخصوص اشارہ پاتے ہی دس افراد اپنے نیزے سنبھالے برق رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور نیزوں کی انی میں دنبے پروتے آگے بڑھنے لگے۔ یہ مناظر قابلِ دید اور کافی حد تک مضحکہ خیز تھے۔ شرکاء میں سے چند ایک کا نیزہ ٹوٹ گیا تو کئی ایک کا وہ ہتھیار دنبے میں ہی پھنس کر رہ گیا۔ اس دنبے کو اٹھانے کی کوشش میں اپنا وزن سنبھال نہ پانے پر دو نوجوان منہ کے بل گھوڑے سے نیچے آگرے۔ ایک شخص نے اس جانور کو چھید کر نیزے کے بل اٹھا تو لیا لیکن اس کا وزن سہارنے میں ناکام ہوگیا۔ مجمعے میں تاسف اور استہزا کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ لال خان کی آمد اس بار بھی دھماکا خیز ثابت ہوئی۔ اس نے اطمینان سے دنبے کو نیزے سے چھیدا اور سر سے بلند کیے میدان کے چکر کاٹنے لگا۔ انگریز مہمان اس کی مہارت پر اش اش کر اٹھے تھے۔ لال خان گھوڑا دوڑاتے ہوئے چبوترے کے پاس چلا آیا۔ سفید لباس میں سرخ مشہدی رومال گلے میں پہنے ایلن بھی کافی پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ لال خان نے دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھوڑی اور لباس سے ویسا ہی رومال نکال کر ہوا میں لہرانے لگا۔ ایلن کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

''پالے..... مجھے علم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی۔ بارنس اور گلباز کی موجودگی میں وہ غیر ضروری جوش سے پالے کے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ گلباز کی چھیدتی نظریں خصوصی طور پر اسی کا طواف کر رہی ہیں۔ گلباز اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور تربیت کے باوجود جان ہی نہ پایا کہ پالے خاں کا گروہ بھی بھیس بدلے اسی مجمعے کے مختلف قبائل میں روپوش ہے۔ لال خان نامی اس نوجوان کے لیے ان کی توصیف اور اس کا قبیلہ جاننے کے لیے بے چینی ان کے ساتھیوں کو کافی محظوظ کر رہی تھی۔

جرگے کا اگلا مقابلہ ہولناک تھا۔ میدان میں آگ کا ایک بلند الاؤ روشن کر دیا گیا۔ آٹھ تا دس فٹ بلندی کو چھوتے شعلوں کی نارنجی لپک حوصلے کا اصل امتحان تھی۔ بیس شرکاء نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس الاؤ کو عبور کرنا تھا۔ حاضرین دم سادھے بیٹھے تھے۔ پہلے پانچ نوجوان تو آگ کی اس تپش سے اس کے قریب تر ہونے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ اگلے نصف درجن نے مزاحمت کا صرف اتنا حق ادا کیا کہ وہ الاؤ کے قریب پہنچ گئے تاہم عین موقع پر آگ سے کنی کتراتے ایک جانب رخ موڑ لیا۔ چار نوجوان قدرے جوشیلے تھے۔ انہوں نے شعلوں کی بلندی پھلانگ تو لی لیکن اپنے گھوڑوں پر گرفت برقرار نہ رکھ سکے اور الاؤ میں جا گرے۔ انتظامیہ کی جانب سے مامور افراد نے انہیں فوری طور پر وہاں سے باہر نکال لیا۔ بقیہ شرکاء کی آمد بھی سنسنی خیز تھی۔ ان کے گھوڑے تو شعلوں کی وہ دیوار عبور کر گئے لیکن تپش سہارنے میں ناکامی پر گھڑسوار نیچے جا گرے۔ اب میدان میں ایک ہی شخص باقی تھا۔ مجمعے کی سنسنی بے قابو ہونے لگی۔ وہ پلک جھپکنا بھی بھول گئے تھے۔ پالے نے ایک ایسی جست لگائی کہ آگ کے خونخوار شعلے اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کو بھی نہ چھو سکے۔ خاموشی کا وہ شیش محل مختلف صداؤں سے چکنا چور ہوا۔

''لال خان زندہ باد..... لال خان زندہ باد..... ہماری آن ہماری شان..... لال خان۔'' فلک شگاف نعرے لگاتے حاضرین کے حلق میں خراشیں محسوس ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ پالے کے سبھی ساتھی ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر خود بھی میدان میں کودنے کے لیے بے تاب دکھائی دینے لگے۔ چبوترے پر بیٹھے برطانوی مہمانوں کے لیے یہ مہارت بصارت کا واہمہ تھی۔ ایلن اور بارنس کی نگاہوں میں بھی کم و بیش یہی جذبات تھے۔ گلباز کی حالت سب سے سوا تھی۔ وہ اس سرخ پوش کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تابی محسوس کر رہا تھا۔

''ایسا خوفناک تصادم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اف! میری تو سانسیں ہی اٹک گئی تھیں۔'' ایلن نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ تصادم کچھ بھی نہیں تھا بے بی!'' بارنس مسکرایا۔ ''آگ ایک بے جان شے ہے۔ اصل مقابلہ تو اب ہوگا۔ ایک وحشی جاندار وجود اور یہ قبائلی نوجوان ٹکرائیں گے۔ مجھے لگتا ہے لال خان اس مقابلے میں مات

کھا جائے گا۔''

بارنس کے اس دعوے نے ایلن کو افسردہ کر دیا۔ اس کی بے تاب نظریں میدان کا جائزہ لینے لگیں جہاں ڈھولوں کی تھاپ یکدم ہی تیز ہوگئی تھی۔ سرخ آنکھوں والا لحیم شحیم بھینسا اپنے خطرناک وجود سے حاضرین کو سراسیمگی اور جوش کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا کر رہا تھا۔ مجمعے سے چالیس افراد اس وسیع احاطے میں آئے اور مخصوص علاقائی رقص کرتے ہوئے اس بھینسے کو اشتعال دلانے لگے۔ بھینسا اس شور اور رقص سے سخت وحشت زدہ ہو رہا تھا اور اس کی یہی کیفیت شور و غل و سرگرمیوں میں مزید تیزی پیدا کرنے لگی۔ ایلن کی توقع کے مطابق اس مقابلے میں صرف چند افراد ہی شامل تھے۔

پہلا نوجوان بھرپور جوش و جذبے سے آگے بڑھا اور بھینسے کے سینگ تھام لیے۔ اس نے اپنے پاؤں زمین پر بڑی سختی سے جما رکھے تھے۔ ابتدائی لمحات کے بعد وہ اس جانور کی وحشت نہ سہار سکا۔ بھینسا اسے بری طرح رگیدتا چلا گیا۔ نوجوان کی بھی جوابی کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ وحشی جانور اسے پٹخنیاں دے کر بے ہوشی کی سرحد تک پہنچا چکا تھا۔ اس زخمی اور ہوش و حواس سے بیگانہ نوجوان کو بالکل آخری لمحات میں اس بھینسے کی ٹانگوں تلے روندنے سے بچایا جا سکا۔ رقص کرنے والے افراد بہ مشکل اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا پائے تھے۔ اس لمحاتی مہلت میں انتظامیہ کے اہلکار اس نوجوان کو گھسیٹ کر دور لے گئے۔ اپنے شکار کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر بھینسے کا جنون مزید مہمیز ہو گیا۔ اس نے اگلے دو نوجوانوں کو بھی زخموں سے چور کر دیا۔

''اب دیکھتے ہیں لال خان مقابلہ کرتا ہے یا شکست تسلیم کرتا ہے۔'' بارنس اس لڑائی سے بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔ مجمع لال خان کا نام لیے دیوانہ وار نعرہ زن تھا۔ ایلن کی آنکھوں میں ہراس جھلکنے لگا۔ وہ زیر لب اس کی کامیابی اور سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

لال خان اور بھینسے کی لڑائی کا آغاز سنسنی خیز تھا۔ وہ دونوں متوازی طور پر ایک دوسرے کو گھسیٹ رہے تھے۔ کئی لمحات ایسے بھی آئے کہ لال خان مغلوب ہوتا نظر آیا لیکن اس کی ہمت ہی اس کا اصل ہتھیار تھی۔ وہ جھکائی دے کر جانور کے تصادم سے سلامت رہ جاتا۔ اسی جھکائی کے دوران وہ اس کے بدن پر اپنے ہتھیار سے کوئی نہ کوئی وار بھی کر دیتا۔ بھینسے کی وحشت اب مدافعانہ انداز اختیار کر چکی تھی۔ وہ واضح طور پر تھکاوٹ کا شکار نظر آ رہا تھا لیکن ہمت ہارنے کے لیے اب بھی تیار نہ تھا۔ اس نے لال خان پر حملے کی ایک اور کوشش کی۔ لال خان نے جوابی طور پر اس کے سینگ تھامے اور پوری قوت سے اس کے وجود سے لپٹ گیا۔ بھینسا اس آفت کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے اس ناگہاں سوار کو پٹخنے کے لیے بے تابی سے زور لگانے لگا لیکن سوار کی مہارت بہرحال مسلمہ تھی۔ بھینسے کی اچھل پھاند میں معمولی سی کمی محسوس کرتے ہی لال خان نے دونوں سینگ گھماتے ہوئے گردن مروڑنی شروع کر دی۔ مجمع دم بخود تھا۔ اس خاموشی میں گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز ہر ایک کی سماعت میں واضح طور پر محسوس ہوئی تھی۔ وہ وحشی اور طاقتور جانور ایک بلند ڈکراہٹ کے ساتھ زمین بوس ہو چکا تھا۔ مقامی افراد کی خوشی اور جوش سے قطع نظر چبوترے پر بیٹھے وہ برطانوی مہمان اس غیر انسانی طاقت کے مظاہرے پر انگشت بدنداں تھے۔

''ہندوستان واقعی ایک پراسرار سرزمین ہے۔ میں آج تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہ لوگ اس قدر دلیر کیسے بن جاتے ہیں۔'' بارنس کی بڑبڑاہٹ ایلن کی سماعت میں پہنچی تو اس کی آنکھوں میں خوشی اور فخر سے آنسو جھلملانے لگے۔

میدان میں اب رونق اور جشن کا الگ سماں تھا۔ مجمعے سے کچھ افراد نے لال خان کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ''قربان وئی'' کے پسندیدہ ترین نغمے کے راگ الاپنے شروع کر دیے۔ ایلن انعامات کی تقسیم اور پالے سے متوقع ملاقات پر خوشی و سرشاری سے نڈھال تھی۔ بارنس وقت ضائع کیے بغیر اپنی نشست سے اٹھا اور شور و غل ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی متانت سے گویا ہوا۔

''مجھے مقامی افراد کی ثقافت اور روایات پر مشتمل اس جرگے میں شمولیت کی بڑی دیرینہ آرزو تھی۔ ہندوستان کے اسرار جاننے کا اس سے بہتر موقع بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ جرگہ درحقیقت مقامی تعلیم و تربیت کا ایک عکس ہوتا ہے۔ اس میں شرکت سے ہم برطانوی افسران کو آپ کی بہادری سے شناسا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ آج مجھے بھی اندازہ ہوا کہ دلیری اور ہمت میں پٹھان قوم کا کوئی ثانی ہی نہیں۔ میں ایسی باحمیت اور لازوال اوصاف کی مالک قوم سے دوستی سے کم رشتہ استوار نہیں رکھ سکتا۔ برطانوی قوم آپ کی ان خوبیوں

کا سدا احترام کرے گی۔'' وہ بڑے محتاط اور شاطرانہ انداز میں ترغیب اور مکاری کا جال پھینک رہا تھا۔

''آج کا یہ جرگہ میرے علاوہ آپ سب کے لیے بھی ناقابلِ فراموش ہوگا۔ سبھی مقابلوں کا فاتح صرف ایک ہی شخص ہے۔ میں لال خان کو یہاں آکر اپنے قبیلے سے متعارف کروانے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں صرف لال خان ہی نہیں بلکہ اس کے قبیلے کو بھی بہادری کا ایک لازوال لقب دینا چاہتا ہوں۔'' بارنس کے اس اعلان نے ہر جانب جوش وخروش کی نئی لہریں برپا کردیں۔ انتظامیہ کے مقامی افراد بھی بہ آوازِ بلند اس بہادر نوجوان کو چبوترے پر آمد کے لیے پکارنے لگے لیکن وہ سرخ پوش کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی لمحے ہوا کے دوش پر سفر کرتا خنجر بارنس اور گلباز کے درمیانی فاصلے میں جگہ بناتا چبوترے کے ایک کھمبے میں پیوست ہوگیا۔ خنجر کے دستے پر ایک سرخ رومال بندھا تھا۔ حیرت وخوف کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے والے گلباز نے فوری طور پر رومال الگ کرکے کھول لیا۔ اس رومال پر سفید جلی حروف میں وہ نام لکھا تھا جس سے گلباز خاں دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا۔

''پالے خاں..... وہ اسی ہجوم میں کہیں موجود ہے۔ اسے گرفتار کرنے کا بہترین موقع ہے۔'' گلباز نے چیخ کر اپنے ماتحت افراد کو کہا۔

''نہیں کیپٹن! یہ وقت ایسی کم ظرفی کے مظاہرے کا نہیں ہے۔ ایسی کوئی بھی حرکت ان مقامی قبائل میں برطانوی حکومت کو رسوا کردے گی۔ ہوش کے ناخن لو۔'' بارنس سختی سے بولا۔ اس کی سماعت مجمعے کی جانب سے پالے کی حیران کن جرأت مندانہ آمد پر سرگوشیاں اور تبصرے بھی واضح طور پر سن رہی تھی۔ جرگے کی اختتامی کارروائی کے بعد وہ ایلن کے ساتھ گھر روانہ ہوا تو ذہن میں اٹھنے والے بھونچال کے باوجود چہرہ نہایت پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

اس رات کھانے کی میز پر بہت خاموشی تھی۔ ایلن اور بارنس اپنی سوچوں میں گم تھے۔ بارنس کے ذہن میں پنپنے والے خدشات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مضبوط تر ہو رہے تھے۔ اس کی جہاندیدہ نظریں بیٹی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''کیا بات ہے پاپا؟ آج آپ ٹھیک سے کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟'' ایلن کی نظر پہلی بار اس کی پلیٹ پر پڑی۔

''تھکاوٹ ہے کچھ۔ بھوک نہیں لگ رہی۔''

''اتنے مزید مقابلوں کے بعد تھکاوٹ تو نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے تو بہت لطف آیا۔'' وہ ابھی تک سرشار تھی۔

''یہ لطف اس وقت کہاں تھا جب تم خوف کے مارے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی تھیں۔'' بارنس نے پہلا داؤ کھیلا۔

''وہ..... اس وقت تو سنسنی ہی اتنی تھی کہ بس۔'' ایلن گھبرا گئی۔

''میں نے تمہیں جھوٹ بولنے کی تربیت تو نہیں دی ایلن! تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ تم نے پالے خاں کو پہچان لیا تھا۔''

''جی! پہچان تو لیا تھا لیکن کافی دیر بعد۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا؟ کیا ہم سب کی بے وقوفی اور بے بسی کا تماشا دیکھ رہی تھیں؟ وہ ہزاروں افراد میں خنجر پھینک کر ہماری تذلیل کرکے چلا گیا۔'' بارنس کا غصہ عود آیا۔

''ایسا بالکل نہیں ہے پاپا! میں تو آپ کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ پالے خاں جیسا بہادر اور جرأت مند انسان اس پورے علاقے میں کہیں نہیں ہے۔ آج آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا نا۔ اس بہادر انسان کا دل بہت بڑا اور اصول اس سے بھی شاندار ہیں۔ ایسے شخص کی دوستی بہت انمول اور مفید ہوگی پاپا! آپ کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔''

''وہ ہمارا دشمن ہے ایلن! سیکڑوں برطانوی افسران کو قتل کرچکا ہے۔ ایسا شخص ہمارا دوست کبھی نہیں بنے گا۔''

''وہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔ اسے ہمارے اصولوں سے اختلاف ہے۔ مجھے یہ بھی علم ہے پاپا کہ آپ روایتی انداز میں یہاں حکومت نہیں کرنا چاہتے۔ مقامی قبائل کو نرمی سے اپنا اطاعت گزار بنانا چاہتے ہیں۔ پالے سے دوستی کے بعد آپ کا یہ خواب پورا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ بہت مخلص، بااصول اور اعلیٰ ظرف کا مالک ہے اور ایسے افراد بہت وفادار دوست ثابت ہوا کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت نے دشمن تو بہت بنائے ہیں، اب دوست بھی بنا کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو مایوسی بالکل نہیں ہوگی۔'' ایلن کے اعتماد نے بارنس کو ایک نئی سوچ میں مبتلا کردیا۔ اس نے پالے خاں تک ملاقات کا پیغام پہنچانے کی راہ تلاشنا شروع کردی۔ دوسری جانب ایلن نے بھی پالے کو حالِ دل اور اس نئی صورتِ حال سے آگاہی پر ذہنی منصوبہ بندی کا آغاز کردیا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات: پالے خاں از گلشن نندہ

دھمکی

تنویر ریاض

ایک دوسرے کی محبت میں جوش مارنے والے خونی رشتے جب ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھانے کے خواہش مند ہو جائیں تو... بے بس ممتا کی دعائیں آسمان کو بھی ہلا دیتی ہیں... اور اس لمحے بالکل ایسا ہی ہوا جیسے بھڑکتے شعلوں پر برستی پھوار گرنے لگی ہو... اگرچہ مغربی دنیا میں ایسے قصے عنقا ہیں مگر... ان رشتوں کی حقیقت سے انکار بھی تو ممکن نہیں...

مخالف سمت میں بھٹکتے مسافروں کی لاحاصل تھکن کا احوال.....

ولی کوستا، ساؤتھ بیچ کے ایک بار میں بیٹھا اورنج اور لیمن جوس کی کاک ٹیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور بظاہر وہاں موجود خواتین کا بھی جائزہ لے رہا تھا لیکن یہ محض وقت گزاری کا بہانہ تھا۔ وہ یہاں کسی سے میل جول بڑھانے نہیں آیا تھا بلکہ اس کی آمد کا مقصد ایک آوارہ شوہر کا پیچھا کرنا تھا جو قریب کی میز پر ایک جوان عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو یقیناً اس کی بیوی نہیں تھی۔ ولی کو یہ بات اس لیے معلوم تھی کیونکہ وہ اپنی جیب میں اس آدمی اور اس کی اصلی

بیوی کی شادی کی تصویر لیے پھر رہا تھا۔

ولی نے اپنا سیل فون اس طرح اوپر اٹھایا جیسے وہ کوئی پیغام چیک کر رہا ہو اور چوری چھپے اس بے خبر جوڑے کی دو تصویریں کھینچ لیں۔ ان کے عقب میں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں جو تقریباً ولی کی ہم عمر تھیں۔ ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھی اور ولی کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لیے ایک اور ڈرنک کا آرڈر دیا۔

''کیونکہ تم مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے، اس لیے میں نے سوچا کہ تمہارے قریب آجاؤں تاکہ تم مجھے اچھی طرح دیکھ سکو۔'' اس عورت نے کہا۔ اس نے بے باکی سے اپنی آنکھیں گھمائیں اور پھر اپنے ہی مذاق پر ہنس پڑی۔

''کیا یہ قابلِ تعریف بات نہیں ہے؟'' ولی نے اس کے عقب میں بیٹھے ہوئے جوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس طرح کے گمراہ شوہروں کا تعاقب کرنا ولی کو پسند نہیں تھا لیکن یہ اس کی ضرورت تھی۔ اس کام کے عوض جو معاوضہ ملتا، اس سے اس کے یوٹیلٹی بلز ادا ہو جاتے۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والی ایک نفیس عورت تھی لیکن اس کا شوہر اسے دھوکا دے رہا تھا۔ اس وقت بھی جب اس نے اپنی ساتھی عورت کے ساتھ قابلِ اعتراض حرکات شروع کیں تو ولی نے ایک بار پھر اپنا فون اوپر اٹھالیا۔

''اب تم میرے اتنے قریب ہو تو میں چاہوں گا کہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر وہی خوبصورت مسکراہٹ لے آؤ۔''

اس عورت نے فرمائش کی تعمیل کی اور ولی نے دو تصویریں کھینچ لیں۔ اس طرح کہ اس عورت کے عقب میں ہونے والا ڈراما بھی ان تصویروں کا حصہ بن جائے اور اس خدمت کے عوض اس نے اس عورت کی ڈرنک کی قیمت بھی ادا کر دی۔ اسی دوران ولی کے فون پر ایک پیغام آیا جو امیگریشن اٹارنی ایلس آرڈن کی طرف سے تھا۔ ماضی میں اس نے کئی معاملات میں ایلس کی مدد کی تھی اور وہ بھی اس کے لیے وقتاً فوقتاً کام نکالتی رہتی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے، ولی؟''

''خفیہ محبت۔'' ولی نے جوابی پیغام بھیجا۔

''خوش قسمت ہو دوست! کیا تم کل دو بجے میرے دفتر آسکتے ہو؟ تمہارے لیے ایک کام ہے۔''

''ضرور آؤں گا۔''

وہ جانتا تھا کہ ایلس کے ذہن میں اس کے لیے جو کام ہے وہ یقیناً اس موجودہ اسائنمنٹ سے دلچسپ ہوگا۔

اسی وقت وہ جوڑا بھی اپنی میز سے اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ ولی نے بھی جلدی سے بل ادا کیا اور کھڑا ہو گیا۔

''گھر جا رہے ہو..... بیوی کے پاس؟'' اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے پوچھا۔

''میری شادی اپنے کام سے ہو چکی ہے۔'' ولی نے کہا۔

اس نے ولی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ''کیسا رہے گا اگر میں اپنا نام 'مس ورک' رکھ لوں؟''

ولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے دوبارہ یہاں ملنا چاہوں گا۔''

☆☆☆

اگلے روز دوپہر دو بجے وہ ایلس کے دفتر میں موجود تھا۔ وہ اس سے عمر میں چند برس بڑی تھی لیکن ذہانت اور شوخی میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسی لیے ولی کی آنکھیں اسے دیکھنے سے نہیں تھکتی تھیں اور وہ بھی اکثر اسے یاد دلاتی رہتی تھی کہ اس کے پاس ڈیٹ پر جانے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بہت مضبوط تھا اور وہ ایک دوسرے سے مخلص تھے۔

اس وقت ولی نے اس سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی کیونکہ ایلس کے سامنے اس کی نئی کلائنٹ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تقریباً پچھتر برس کی لاطینی عورت تھی لیکن پوری طرح صحت مند اور چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ اس کے بال گھنے اور سفید تھے اور سیاہ گہری آنکھوں میں غم کا تاثر نمایاں تھا۔ اس نے چھوٹی آستینوں والا گھٹنوں تک اونچا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ایلس نے ہسپانوی زبان میں اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''ولی! یہ ازابیل گویوارا ہیں اور ان کا تعلق نکاراگوا سے ہے اور ازابیل! یہ ولی کوستا ہے۔ میں نے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔''

''میں یہیں میامی کے علاقے للل ہوانا کا رہنے والا ہوں۔'' ولی نے اپنا تعارف مکمل کیا اور بولا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں، خاتون؟''

اس عورت نے ایلس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''میں بتاتی ہوں ولی کہ کیا مسئلہ ہے۔ اس خاتون کے دو جڑواں بیٹے ہیں۔ وہ ابھی نوعمر ہی تھے کہ نکاراگوا میں حکومت اور باغیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یہ باغی اپنے آپ کو کونٹراس کہتے تھے۔ اس وقت تم بہت

چھوٹے تھے لیکن تم نے نکاراگوا کے ان باشندوں سے اس بارے میں سنا ہوگا جو جنگ سے بچنے کے لیے میامی آ گئے تھے۔''

ولی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جن دنوں وہ میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا تو اسے نکاراگوا کے کئی باشندوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ مجرموں کے ستائے ہوئے اور کچھ خود مجرم تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی تھی کہ وہ کن حالات میں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس نے ایلس کو بتا دیا کہ اس نے جنگ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''گوئیوارا کی فیملی کا شمالی پہاڑیوں پر اپنا فارم تھا جہاں زیادہ خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ اس علاقے میں کچھ نوجوان حکومت اور کچھ مخالفین کے حامی تھے۔ یہاں تک ہوا کہ ایک ہی گھر کے افراد دونوں گروپوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کی آپس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ گوئیوارا کے خاندان میں بھی یہی ہوا۔''

''یعنی دونوں بھائی آپس میں لڑ پڑے؟''

''بالکل... ان میں سے ایک الفریڈ حکومت کا حامی تھا۔ اس نے سرکاری فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ دوسرا بھائی آسکر، باغیوں سے مل گیا۔ یہ دونوں گروپ شمالی پہاڑیوں میں برسرِ پیکار تھے۔ یہ دونوں بھائی اس علاقے سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہوں نے اسکاؤٹ کے طور پر کام شروع کر دیا جو کہ انتہائی خطرناک ڈیوٹی تھی۔''

گوئیوارا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے آگے رہتے تھے جس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ گھات میں بیٹھے دشمن کے فوجیوں کے نشانے پر نہ آ جائیں۔ ایک بھائی ایک طرف تو دوسرا بھائی دوسری طرف۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جنگ کے دوران مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی ان میں سے ایک یا دونوں کی موت کی خبر آ سکتی ہے۔''

اب ولی کو اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی غیر معمولی لکیروں کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ یہ بیٹوں کے بارے میں اس کے خوف اور پریشانی کا نتیجہ تھا۔

''لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔'' ایلس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بالآخر خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ دونوں بیٹے زندہ بچ گئے۔ انہیں چھوٹے موٹے زخم آئے لیکن کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا۔ اس وقت تک ازابیل جنگ سے بچنے کے لیے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ میامی آ چکی تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال کئی برس پہلے ہو گیا تھا اور وہ کسی مرد کے بغیر فارم پر رہتے ہوئے ڈر رہی تھی۔''

''صرف یہی وجہ نہیں تھی۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''دراصل ان گروپوں کی لڑائی ہمارے فارم کے بہت قریب ہو رہی تھی اور میں نہیں جانتی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک گروپ کب ہمارے فارم پر پہنچ کر اپنا کیمپ قائم کر لے اور دوسرا گروپ ان پر حملہ کر دے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں یا میری بیٹیاں ان کے درمیان ہونے والی فائرنگ کی زد میں آ جائیں لہٰذا ہم نے وہ جگہ چھوڑ دی۔''

''جنگ ختم ہونے کے بعد بھی تم واپس نہیں گئیں؟'' ولی نے پوچھا۔

اس عورت نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اس وقت تک میری دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کے بچے بھی ہو گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس عمر میں فارم پر کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک منیجر رکھ لیا۔''

''اور تمہارے بیٹے؟ وہ جنگ ختم ہونے کے بعد کیا کرتے رہے؟''

''میرا بیٹا الفریڈ فوج میں ہی رہا اور ترقی کرتے ہوئے کیپٹن کے عہدے تک پہنچ گیا۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ دوسری ماؤں کے لیے یہ فخر کی بات ہو لیکن میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ میرا کوئی بیٹا فوج میں جائے اور میں ہمیشہ اس کے بارے میں پریشان رہوں۔''

''اور تمہارا دوسرا بیٹا، آسکر؟''

''وہ واپس فارم پر آ گیا لیکن اس وقت بھی علاقے میں کشیدگی تھی۔ اس خانہ جنگی میں بہت سے لوگ مارے گئے تھے اور ان کے لواحقین یا رشتے دار انتقام کی آگ میں جل رہے تھے اس لیے اس کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بالآخر وہ بھی میامی آ گیا اور ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ اسے یہاں کام مل گیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ان دونوں نے شادی کر لی۔ اب ان کے دو بچے ہیں۔''

ولی اس طرح کی کئی کہانیاں سن چکا تھا۔ لاطینی امریکا کے کئی ملکوں کے باشندے اور ان کے خاندان انتقامی کارروائیوں کے خوف سے فرار ہوکر میامی میں پناہ لے چکے تھے لیکن وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اسے کس لیے بلایا گیا ہے۔

''پھر اب کیا مسئلہ ہے خاتون؟'' اس نے پوچھا۔

اس عورت نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک گہری سانس لینے کے بعد اداسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بجائے ایلس نے جواب دیا۔

''دراصل بات یہ ہے ولی کہ ازابیل کا بیٹا الفریڈ جو نکارا گوا کی فوج میں رہ چکا ہے، وہ یہاں آرہا ہے۔ اس نے اپنی ماں یا بھائی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا بلکہ ان کے ایک اور رشتے دار نے فون پر یہ اطلاع۔ دی اور انہیں وارننگ بھی دے دی۔''

ولی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیسی وارننگ؟''

''الفریڈ نے یہ واضح کردیا ہے کہ وہ اپنے بھائی آسکر سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ اسے باغیوں کا ساتھ دینے پر کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ سے پورے خاندان کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے آسکر پر اپنے دوستوں کی موت کا الزام لگایا جو اس کے ساتھ فوج میں تھے۔ ازابیل کو ڈر ہے کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کرنے کے لیے یہاں آرہا ہے۔''

''اوہ.....!'' ولی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے۔'' ایلس نے کہا۔

بوڑھی عورت خاموشی سے سن رہی تھی لیکن اب وہ پھٹ پڑی۔ ''الفریڈ نے لوگوں کو یہی بتایا ہے کہ وہ باغیوں کا ساتھ دینے پر اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ آسکر جس لڑکی کو ساتھ لے کر آیا ہے، وہ کبھی الفریڈ کی گرل فرینڈ رہ چکی تھی۔ اس کا نام نتالیا ہے اور وہ ہمارے پڑوس کے فارم میں ہی پلی بڑھی ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور الفریڈ شروع سے ہی اسے چاہتا تھا لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد اسے کسی دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ جب آسکر خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد واپس آیا تو اس نے محسوس کیا کہ یہ جگہ اب بھی غیر محفوظ ہے۔ اس نے نتالیا کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرلیا اور پھر انہوں نے شادی کرلی۔ جبکہ الفریڈ غیر شادی شدہ ہے اور اب بھی نتالیا سے محبت کرتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اسی وجہ سے آسکر کو قتل کرنا چاہتا ہے۔''

وہ تینوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے جبکہ ولی صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کررہا تھا۔ الفریڈ کوئی معمولی کھلاڑی نہیں تھا۔ وہ فوج میں رہ چکا تھا اور اسے گوریلا جنگ لڑنے کا تجربہ بھی تھا۔ اگر وہ واقعی اپنے بھائی کو قتل کرنے کے ارادے سے آرہا تھا تو یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہوسکتی تھی۔

''تم یا تمہارے بیٹے نے اس بارے میں پولیس کو بتایا؟'' ولی نے پوچھا۔

اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ روز میں نے ایک پولیس والے سے بات کی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر الفریڈ آئے تو میں نو گیارہ کو فون کردوں لیکن وہ صرف میرے گھر پر پولیس کا پہرا بٹھا سکتے۔ مجھے ڈر ہے کہ جب میں نو گیارہ کو فون کروں گی تو بہت دیر ہوچکی ہوگی۔''

''لہٰذا تم نے مس آرڈن سے رجوع کیا؟''

''ہاں! کیونکہ میں تمہیں نہیں جانتی تھی کہ اس کے علاوہ کہاں جاؤں اور ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔''

''الفریڈ کی آمد کب تک متوقع ہے اور وہ کیسے آرہا ہے؟''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ پانچ روز پہلے نکارا گوا سے میکسیکو کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوچکا ہے جہاں سے انسانی اسمگلر اسے سرحد پار کرادیں گے۔''

ولی جانتا تھا کہ یہ اسمگلر معقول معاوضے کے عوض بہت کم وقت میں ایری زونا یا ٹیکساس کا بارڈر کراس کروادیتے ہیں۔ شاید وہ دستاویزات کے بغیر ہوائی سفر نہ کرسکے لیکن بس کے ذریعے وہ دن میں میامی پہنچ سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے سے میامی میں موجود ہے یا پہنچنے والا ہے۔ اس نے اس خدشے کا اظہار ازابیل سے کردیا۔

''ہاں! میں جانتی ہوں کہ وہ یہاں آچکا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی اس رشتے دار نے مجھے فون کیا تھا۔''

''کیا وہ جانتا ہے کہ تم اور آسکر کہاں رہتے ہیں؟''

''ہم سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ الفریڈ کو ہمارے گھر کا پتا معلوم ہے۔ وہ اسی پتے پر مجھے خط لکھا کرتا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سب لوگوں کو جتنی جلد ممکن ہوسکے، وہاں سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ کیا تمہارے پاس چھپنے کے لیے کوئی اور جگہ ہے؟''

ازابیل نے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلادیا۔ ''ہاں! میری ایک دوست کا تعلق بھی نکارا گوا سے ہے۔ اس کا مکان فورٹ لوڈرڈیل کے قریب ہی ہے۔

الفریڈ اسے نہیں جانتا اور اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ ہم کہاں ہیں۔ میں، نتالیا اور اس کے دونوں بچے وہاں جاسکتے ہیں لیکن اصل مسئلہ آسکر کا ہے۔''

''وہ کیا؟'' ولی نے پوچھا۔

''آسکر کا کہنا ہے کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جائے گا۔ اگر الفریڈ اسے قتل کرنے کے لیے آرہا ہے تو وہ اپنے گھر میں اس کا انتظار کرے گا جہاں اس کے ہتھیار ہیں جن میں صرف ریوالور ہی نہیں بلکہ ایک بڑی گن بھی ہے جس سے کئی فائر ہوسکتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے خودکار ہتھیار؟''

''ہاں، وہ اسے جنگ میں استعمال کرچکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر الفریڈ آیا تو وہ اسے قتل کردے گا یا اپنا دفاع کرتے ہوئے خود بھی جان دے دے گا۔''

اس کی آواز میں جو دکھ تھا، اس نے ولی کو بے چین کردیا۔ اس کا اپنا بھی ایک بھائی تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ قتل کرنا تو درکنار وہ اسے نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن یہ عورت ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھی جس میں اس کے ایک یا دونوں بیٹوں کی جان جانے کا امکان تھا۔

بوڑھی عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان کی پیدائش کے بعد سے ہی مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہوگا۔ وہ شروع سے ہی ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ ایک اگر سفید کہتا تو دوسرا سیاہ، ایک خوش ہوتا تو دوسرا تلخ ہوجاتا۔ جب الفریڈ نے فوج میں شمولیت اختیار کی تو میں جانتی تھی کہ آسکر باغیوں کا ساتھ دے گا۔ یہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کا بہانہ تھا۔ نکاراگوا میں تو انہیں کامیابی نہیں ہوئی لیکن ان کی لڑائی یہاں بھی پہنچ گئی۔''

اس نے اپنے زانو پر رکھے سیاہ بیگ میں سے کئی تصویریں نکالیں۔ ان میں ایک برسوں پرانی تھی جس میں وہ اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک لکڑی کے بنے ہوئے مکان کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جس کے بارے میں ولی نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کا شوہر ہوگا۔ ان کے دائیں بائیں دو لڑکے تھے جن کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی شکل ملتی جلتی تھی لیکن ان میں سے ایک کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جبکہ دوسرا خوفزدہ نظر آرہا تھا۔

دوسری تصویر میں صرف یہ دونوں لڑکے تھے۔ یہ دس بارہ سال بعد کسی اسکول فنکشن میں لی گئی تھی۔ اس میں دونوں نوعمر لڑکوں کے چہرے ایک جیسے تھے اور انہوں نے اسکول یونیفارم یعنی سفید قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس تصویر میں بھی دونوں کے چہروں کے تاثرات مختلف تھے۔ ان میں سے ایک مسکرا رہا تھا اور دوسرا خوفزدہ نظر آرہا تھا جیسے وہ کچھ فاصلے پر گوریلا جنگ دیکھ رہا ہو۔

ولی نے اس تصویر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان میں الفریڈ کون ہے؟''

ازابیل نے دائیں جانب والے لڑکے پر انگلی رکھی۔ ''یہ الفریڈ ہے۔ اس کی آنکھ کے نیچے ایک چھوٹا سا زخم ہے۔''

ولی نے اس زخم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے لگا؟''

''ایک دفعہ ان دونوں میں بڑی شدید لڑائی ہوئی۔ الفریڈ نیچے گرا اور اس کا چہرہ ایک نکیلے پتھر سے ٹکرایا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا لیکن زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، اس لیے جلد ہی بھر گیا۔ ان دونوں کے چہروں میں یہی ایک فرق ہے لیکن بحیثیت انسان یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں کی کوئی اکٹھی تصویر نہیں ہے۔''

اس نے ولی کو ایک تیسری تصویر دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آسکر ہے۔ اس کی یہ تصویر اسی سال میامی والے گھر میں لی گئی تھی۔''

اس تصویر میں وہ اپنے گھر کے عقبی صحن میں باربی کیو گرل کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور نہ ہی وہ ناراض لگ رہا تھا۔

''میرے پاس الفریڈ کی کوئی حالیہ تصویر نہیں ہے۔'' ازابیل نے کہا۔ ''اس نے کبھی کوئی نئی تصویر نہیں بھیجی۔''

ولی نے پوچھا کہ کیا وہ آخری تصویر اپنے پاس رکھ سکتا ہے؟ تو اس عورت نے رضامندی ظاہر کردی۔

''اب ہم تمہارے گھر جائیں گے تاکہ تمہیں، تمہاری بہو اور اس کے بچوں کو وہاں سے نکالا جائے۔'' ولی نے کہا۔ ''اور میں تمہارے بیٹے سے بھی بات کروں گا۔''

پھر اس نے ایلس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے کہ پہلے معاوضے کی بات ہوجائے۔''

''میں پہلے ہی ازابیل کو تمہارے یومیہ معاوضے کے بارے میں بتا چکی ہوں اور وہ کم از کم تین دن کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

اس نے ولی کو ایک چیک دیا۔ گو کہ یہ رقم اس خطرناک مشن کو دیکھتے ہوئے بہت کم تھی جس میں اسے دو سابق گوریلا جنگجوؤں سے نمٹنا تھا لیکن اس سے وہ اپنے

اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کرسکتا تھا۔

اس عورت کا مکان میامی کے مغربی علاقے سویٹ واٹر ٹاؤن میں واقع تھا۔ ولی کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہاں نکارا گوا سے آئے ہوئے تارکین وطن کی بہت بڑی تعداد آباد تھی اور اسی وجہ سے اسے 'لٹل ماناگوا' کہا جاتا تھا۔

اس نے ازابیل کو اپنی کار میں بٹھایا اور وہ سویٹ واٹر ٹاؤن کی جانب روانہ ہوگئے۔ اس علاقے میں زیادہ تر ایک منزلہ مکان تھے۔ اس عورت کا مکان ایک بند سڑک کے آخر میں تھا۔ وہ دوسرے مکانوں کے مقابلے میں بڑا تھا۔ وہ ایک سنسان سڑک تھی جس پر بالکل بھی ٹریفک نہیں تھا اور وہ مکان بھی سب سے الگ تھلگ سڑک کے آخر میں تھا اور الفریڈ کے لیے یہ ایک مناسب جگہ تھی۔ وہاں پر ہونے والے جھگڑے کا کسی کو پتا نہ چلتا اور وہ آسکر کو ہلاک کرکے خاموشی سے چلا جاتا۔

ولی نے دیکھا کہ سامنے والی کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ کوئی وہاں آنے والوں پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ یقیناً یہ آسکر ہی ہوگا۔ وہ جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو دروازہ کھل گیا۔ وہاں آسکر کھڑا تھا۔ وہ جب اندر آگئے تو اس نے دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگادی۔

''یہ مسٹر کوستا ہیں۔'' اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''امیگریشن اٹارنی نے انہی کا نام بتایا تھا۔ یہ میامی پولیس میں رہ چکے ہیں۔ میں نے ان کی خدمات حاصل کرلی ہیں تاکہ یہ ہماری مدد کرسکیں۔''

آسکر نے ولی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ کچھ زیادہ متاثر نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس نے محتاط رہنے کو ترجیح دی۔ ''مجھے یقین ہے کہ مسٹر کوستا بہت باصلاحیت ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس معاملے میں کچھ کرسکتے ہیں۔ الفریڈ مجھے قتل کرنے کے لیے آرہا ہے اور مجھے خود ہی اپنا اور اس گھر کا دفاع کرنا ہے۔''

ولی نے اس بڑے لیونگ روم کا جائزہ لیا۔ اسے بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا اور وہاں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی توقع کی جاسکتی ہے، سوائے اس کے کہ سامنے والی کھڑکی کے نیچے ایک آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ آسکر سابق گوریلا فائٹر ہونے کی وجہ سے خود کار اسلحے کا استعمال جانتا تھا کیونکہ اس کا بھائی بھی سابق فوجی تھا اور یقیناً وہ بھی اسی طرح کے اسلحے سے لیس ہوگا، اس لیے آسکر نے بھی اپنی اور گھر کی حفاظت کے لیے اس رائفل کا انتخاب کیا۔

آسکر نے محسوس کیا کہ ولی بڑے غور سے اس رائفل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا۔

''ہاں! یہ میری رائفل ہے اور میرے پاس اس کا لائسنس ہے۔''

ولی نے اس مرحلے پر آسکر سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے بھائی سے مقابلہ کرنا کوئی عقل مندی نہیں۔ اس کے بجائے اس نے وہ بات کی جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔

''میں نے تمہاری ماں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر اسے یقین ہے کہ تمہارا بھائی جھگڑا کرنے یہاں آرہا ہے تو وہ تمہاری بیوی اور بچوں کو لے کر کسی دوسری جگہ چلی جائے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ تمہیں بھی یہاں سے نکل جانا چاہیے لیکن کم از کم عورتوں اور بچوں کو تو جانے دو۔''

آسکر نے کچھ دیر سوچا پھر گھر کے اندرونی حصے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔

''نتالیا! یہاں آؤ۔''

چند لمحوں بعد ہی اس کی بیوی لیونگ روم میں آگئی۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ اس کا قد لمبا، سیاہ بال اور آنکھیں سبز تھیں۔ اس کے متناسب جسم پر سادہ سا گھریلو لباس تھا۔ ولی اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ دونوں بھائی اسے کیوں چاہتے تھے اور اسے کھونے کے بعد الفریڈ کیوں بھائی کا دشمن ہوگیا تھا۔

ازابیل نے ولی کا تعارف اس سے کروایا۔ ''مسٹر کوستا کا خیال ہے کہ مجھے، تمہیں اور بچوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے کیونکہ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔''

نتالیا پہلے ہی خوفزدہ تھی، یہ سن کر اور پریشان ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ مسٹر کوستا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' آسکر بولا۔ ''تم لوگوں کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔''

نتالیا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اور تم؟ تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟''

آسکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ الفریڈ مجھے مارنے کے لیے آرہا ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلا گیا تو تم لوگ بھی خطرے میں پڑجاؤ گے۔ میں یہاں رک کر اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

نتالیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے پہلے ازابیل بول پڑی۔ ''مجھے یہاں رکنا

چاہیے۔ صرف میں ہی الفریڈ سے بات کر کے اس پاگل پن کو روک سکتی ہوں۔''

آسکر نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے مام۔ اگر تم رک گئیں اور میں چلا گیا تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں تمہیں آگے کر کے خود چھپ رہا ہوں۔ اس طرح اسے مجھ سے نفرت کرنے کا ایک اور بہانہ مل جائے گا اور اس کے بعد بھی ہمارے درمیان تصادم کا خطرہ موجود رہے گا۔ اس لیے میں تمہیں یہاں رکنے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ اس طرح تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب نتالیا اور بچے تمہاری ذمے داری ہیں۔ یہ لڑائی میرے اور الفریڈ کے درمیان ہے اور ہم ہی اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔''

صورتِ حال کی سنگینی نے بوڑھی عورت کو بری طرح متاثر کیا اور وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ آسکر نے نتالیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اپنا سامان باندھو۔ مام اور بچوں کو لے کر کار میں بیٹھو اور جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ گو کہ ازابیل نہیں جانا چاہ رہی تھی لیکن نتالیا اور بچے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ آسکر اور ولی پورچ میں کھڑے ان کی کار کو جاتا ہوا دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''اب تم بھی جاؤ۔'' آسکر نے کہا۔ ''یہاں کوئی نہیں رہ گیا جس کی تمہیں حفاظت کرنی ہو۔''

''تمہاری ماں نے میری خدمات پوری فیملی کی حفاظت کے لیے حاصل کی تھیں اور تم بھی ان میں شامل ہو۔''

آسکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اپنی حفاظت کے لیے تمہاری ضرورت نہیں۔ میں نے خانہ جنگی کے دوران کئی برس پہاڑیوں میں گزارے ہیں جہاں مخالف فوجی ہر روز مجھے مارنے کی کوشش کرتے تھے لیکن دیکھ لو، میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے اپنا دفاع کرنا آتا ہے اس لیے تم جا سکتے ہو۔''

ولی اب بھی اپنی بات پر قائم رہا۔ ''تمہاری ماں نے مجھے اس گھر کی حفاظت کی ذمے داری سونپی ہے اور میں وہی کر رہا ہوں۔''

آسکر نے اسے گھورا اور دیگر امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ وہ پولیس کو بلا کر کہہ سکتا تھا کہ ولی کو اس کے گھر سے جانے کے لیے کہا جائے لیکن ایسی صورت میں ولی بھی پولیس کو وہاں رکنے کی وجہ بتا سکتا تھا۔ اس کے بعد

تکلیف

اسٹیشن ماسٹر مسافر سے مخاطب ہوا اور فخر سے بولا۔ ''اگر ٹرین کی ہر بوگی میں واش روم نہ ہوتے تو تم لوگوں کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی۔''

مسافر۔ ''جی نہیں، ہمیں نہیں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑتی۔ مسافر جنگل دیکھ کے بار بار زنجیر کھینچتے اور ٹرین کئی ہفتوں بعد ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک پہنچتی۔''

گزارش

ٹھیکیدار اپنے دو مزدوروں سے مخاطب ہوا۔ ''سنو۔ ایک..... ایک ہی ہوتا ہے اور..... دو..... گیارہ ہوتے ہیں۔ تم دونوں مل کے گیارہ بن جاؤ۔ سارا کام منٹوں میں نمٹ جائے گا۔''

مزدور۔ ''جناب! اجازت ہو تو ایک گزارش کروں؟''

ٹھیکیدار۔ ''ضرور..... ضرور..... کہو کیا گزارش ہے۔''

مزدور۔ ''جناب! ایک..... ایک ہوتا ہے۔ دو..... گیارہ ہوتے ہیں۔ تین ایک سو گیارہ ہوتے ہیں اور چار ایک ہزار ایک سو گیارہ ہوتے ہیں۔ آپ دو مزدوروں کو ہمارے ساتھ کام پر لگا دیں۔ ہم کل چار مزدور ہو کے ایک ہزار ایک سو گیارہ بن جائیں گے۔ اس طرح سارا کام جلدی ختم ہو جائے گا۔''

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

تعریف وہ جو غیر کریں

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بارے میں مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا کہ یہ حقیقت ہے کہ مسٹر جناح بلاشبہ اعلیٰ اوصاف کے مالک ہیں۔ وہ سیرت و کردار کی ایسی بلندیوں پر ہیں جہاں کوئی لالچ، خوف یا غصہ انہیں اپنی راہ سے ہٹا نہیں سکتا۔ وہ عزم و استقامت کے کوہِ گراں ہیں۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

صرف ولی ہی نہیں بلکہ پولیس بھی کسی ممکنہ ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہاں رک سکتی تھی۔ چنانچہ آسکر نے مزید بحث نہیں کی اور گھر کے اندر چلا گیا۔ ولی بھی اس کے پیچھے تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے تک آسکر آنے والے خطرے سے نمٹنے کی تیاری کرتا رہا۔ اس نے عقبی دروازے کی ناب کے نیچے ایک کرسی پھنسادی، پھر اس نے تمام کھڑکیوں کو اندر سے چٹخنی لگائی، پردے برابر کیے اور لیونگ روم کے ایک لیمپ کے علاوہ گھر کی تمام بتیاں بجھادیں۔ اس نے الماری کھول کر رائفل کے لیے دو مزید راؤنڈ نکالے اور انہیں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا، پھر وہ بیڈ روم میں چلا گیا۔

واپس آیا تو اس کا لباس تبدیل ہو چکا تھا۔ اب اس نے سیاہ جینز اور جنگل کیموفلاج والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی کمر کے ایک طرف پستول اور دوسری جانب چھرا لٹکا ہوا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑا رہا تاکہ ولی اس کا جائزہ لے سکے، پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر وہ گوریلا جنگ کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔“

ولی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ ایک ممکنہ خونی ٹکراؤ میں پھنس گیا تھا۔ وہ اس گوریلا جنگ کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پھول دار قمیص اور سیاہ بلیزر پہن رکھا تھا اور اس کے ہولسٹر میں ایک اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور تھا جو آٹو میٹک رائفل کے مقابلے کے لیے ناکافی تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ اسی وقت وہاں سے چل دیتا لیکن وہ ازابیل سے پیشگی معاوضہ لے چکا تھا اور اسے ہر حال میں اپنی ذمے داری پوری کرنا تھی۔

آسکر نے اپنی رائفل اٹھائی۔ بیرونی دروازہ کھولا اور تاریک پورچ میں چلا گیا۔ درختوں کی وجہ سے سڑک نظر نہیں آرہی تھی اس لیے آسکر سیڑھیاں اتر کر اس چھوٹے سے باغیچے میں چلا گیا۔ ایک بار پھر ولی اس کے پیچھے تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی اور وہ احتیاط کے ساتھ ہر پودے اور درخت کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔

آسکر نے لوہے کے گیٹ پر لگا ہوا تالا بند کر دیا اور سڑک پر نگاہ ڈالی جہاں بالکل سناٹا تھا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ آج رات آئے گا؟“ ولی نے پوچھا۔

”میں جانتا ہوں، وہ ضرور آئے گا۔“

ولی نے سڑک کی طرف دیکھا۔ ”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“

آسکر نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ وہ میرا بھائی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں صبر بالکل نہیں ہے۔ وہ غصیل مزاج شخص ہے اور جتنی جلد ممکن ہوسکا وہ یہاں آئے گا۔“

وہ باغ کے دوسرے حصے کی طرف گیا اور کیلے کے درخت کے پیچھے بیٹھ گیا، پھر اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں اتنا صبر ہے کہ یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرسکوں۔ گوریلا جنگ میں کامیابی کا یہی راز ہے کہ گھنٹوں گھات لگائے خاموش لیٹے رہو اور اپنے دشمن کے آنے کا انتظار کرو اور اسے اپنے نشانے پر لے لو۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔“

”لیکن تمہارا بھائی بے خبر نہیں ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ لڑنے جارہا ہے۔ وہ تمہیں اچانک گھیرنے کی کوشش کرے گا اور تم حیران ہو جاؤ گے۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ یہ معاملہ کتنا خطرناک ہے۔ اگر تم نہیں کرو گے تو میں پولیس کو بلالوں گا۔“

آسکر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ پولیس کو دیکھ کر چلا جائے گا اور ان کے جانے کے بعد دوبارہ آجائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ ایسے وقت آئے جب میری بیوی اور بچے یہاں ہوں اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ تمہاری لڑائی نہیں ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ میری ماں سے تمہارا کیا معاہدہ ہوا تھا۔“

”میں سادہ لباس میں پولیس والوں کا انتظام کرسکتا ہوں۔ ان کے ساتھ کوئی پولیس کار نہیں ہوگی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوگا۔“

آسکر نے ولی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اسے معلوم ہوجائے گا۔ اس نے طویل عرصے تک گوریلا جنگ لڑی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے جال میں پھنسنے والا نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ پولیس والوں کی نہیں، میری لڑائی ہے۔“

وہ مڑا اور اس باڑ کے ساتھ چلتے ہوئے پورے لان کا معائنہ کیا۔ ولی اس کے ساتھ تھا۔ جب وہ دوبارہ مکان کے بیرونی دروازے پر پہنچے تو آسکر نے سیڑھیاں چڑھیں اور وہ مکان کے اندر چلے گئے۔ آسکر نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔

آسکر کھڑکی پر رکھی ہوئی رائفل کے پاس گیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹایا

تاکہ باہر دیکھ سکے۔ وہ متوقع خطرے کے لیے تیار تھا۔ ولی بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ پُرامید تھا کہ الفریڈ شاید نہ آئے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میامی میں موجود نہ ہو یا اس نے اپنے بھائی کو خوفزدہ کرنے کے لیے یہ چال چلی ہو لیکن ولی کو اس کا پوری طرح یقین نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اسے باتھ روم جانے کی حاجت ہوئی تو وہ عقبی کمرے میں چلا گیا۔ جب وہ باتھ روم سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں نیچے کی جانب ایک درز تھی۔ آسکر نے گھر کی تمام کھڑکیاں بند کرکے مقفل کی تھیں لیکن وہ شاید اس کھڑکی کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ ولی نے اسے بند کرکے مقفل کیا اور لیونگ روم میں واپس آگیا۔

وہ خاموشی سے الفریڈ کا انتظار کررہے تھے اور ہر گزرتے منٹ کے ساتھ ولی اپنے آپ سے سوال کرتا کہ وہ یہاں کیا کررہا ہے؟ اگر الفریڈ آگیا تو وہ کیا کرلے گا؟ کیا وہ ان دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرے گا؟ ایسا کرنا سراسر خودکشی ہوگی۔ کیا وہ الفریڈ کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے آسکر کی مدد کرے گا؟ ازابیل نے اسی لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن کیا وہ اپنے ایک بیٹے کی موت پر خوش ہوگی؟

ولی اسی سوچ بچار میں غرق تھا کہ اس نے مکان کے عقب سے ایک چرچراہٹ کی آواز سنی۔ ولی اس جانب مڑا۔ وہ بہت زیادہ تیز آواز نہیں تھی۔ کسی بھی پرانے مکان میں اس طرح کی آوازیں ہوسکتی ہیں۔ آسکر نے بھی اس بارے میں سوچا ہوگا۔ اس نے اس سمت میں دیکھا پھر مڑکر دوبارہ سڑک کی نگرانی کرنے لگا۔

ولی اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی سے چلتا ہوا اس کمرے کی طرف گیا جہاں اس نے کھلی ہوئی کھڑکی دیکھی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکالا اور دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اس نے دو منٹ انتظار کیا اور پھر دوبارہ وہی آواز سنی۔ وہ بیڈروم سے ہی آرہی تھی اور چند لمحوں بعد وہاں سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اندھیرے کے باوجود ولی نے اس کے ہاتھ میں گن دیکھ لی تاہم وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والا کون ہوسکتا ہے۔

وہ جہاں کھڑا تھا، وہاں سے اسے آسکر کی پشت نظر آرہی تھی جو سامنے والی کھڑکی پر کھڑا سڑک کی نگرانی کررہا تھا۔ ولی جانتا تھا کہ اسے ہر قیمت پر الفریڈ کو اس کمرے میں جانے سے روکنا ہے۔ اگر وہ وہاں تک پہنچ گیا تو ان میں سے ایک یا دونوں ایک دوسرے کو گولیوں کا نشانہ بناسکتے ہیں۔ اس نے اس آدمی کے قریب آنے کا انتظار کیا اور پوری قوت سے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ الفریڈ ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا۔ ولی نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر لگاتار زمین پر چار فائر کیے۔ اس طرح کہ الفریڈ کو کوئی گولی نہ لگے۔

اس نے آسکر کے قدموں کی آواز سنی، پھر اچانک ہی راہداری میں روشنی ہوگئی۔ سامنے آسکر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ ولی کی طرف کرلیا، پھر اس کی نظر زمین پر پڑے ہوئے شخص پر گئی۔ الفریڈ نے بھی اس کی طرح کیموفلاج شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ آسکر کو لگا جیسے وہ خود زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس نے ابھی تک رائفل ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ ولی کو ڈر لگا کہ کہیں وہ الفریڈ پر گولی نہ چلادے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

''تم نے اسے مار دیا؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

آسکر حیرت زدہ نظر آرہا تھا، جیسے اسے سمجھ نہ آرہا ہو کہ اتنے سالوں تک لڑائی کے بعد اس کا بھائی مرگیا جبکہ اس نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی رائفل دیوار کے ساتھ لگائی اور اپنے بھائی پر جھک گیا۔ ولی نے آگے بڑھ کر وہ رائفل پکڑ لی۔ آسکر اسے واپس لینے کے لیے اچھلا لیکن ولی نے رائفل کی نوک سینے پر رکھ کر اسے دھکا دیا تو وہ زمین پر گر پڑا اور سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ ولی اسے بتانے ہی والا تھا کہ اس کا بھائی زندہ ہے لیکن اسی وقت الفریڈ کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

آسکر نے منہ بنایا اور غور سے اپنے بھائی کے سر اور جسم کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن ولی نے رائفل کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی حرکت نہ کرنا۔''

الفریڈ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ برابر میں اس کا بھائی ہے۔ وہ جھک کر اپنا ریوالور تلاش کرنے لگا لیکن وہ اسے نہیں ملا۔ تبھی اس نے محسوس کیا کہ

ولی تمام ہتھیاروں سمیت ان دونوں کے سر پر کھڑا ہے۔ اس وقت یوں لگا کہ دونوں اپنی نفرت بھول کر ولی پر غصہ کررہے ہیں۔

''اگر میرے کہنے سے پہلے تم میں سے کسی نے بھی حرکت کی تو میں اس رائفل سے تمہاری ٹانگوں کو نشانہ بناؤں گا۔ اس کے بعد تم ایک دوسرے سے لڑنے کے قابل نہیں رہو گے۔''

ولی مذاق نہیں کررہا تھا اور فرش پر لیٹے ہوئے دونوں بھائی یہ بات سمجھ رہے تھے لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ ممکنہ طور پر ان کے ساتھ کیا کرسکتا ہے۔ ولی نے سوچا کہ اپنے جاننے والے امیگریشن ایجنٹ کو فون کرکے الفریڈ کو گرفتار کروادے۔ وہ اس ملک میں غیر قانونی طور پر آیا تھا اور اسے واپس بھیجا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو واپس آجائے گا پھر اس کا کیا حل ہونا چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ پولیس کو فون کرکے الفریڈ کو غیر قانونی اسلحے سمیت کسی کے گھر میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کروادے اور اسے طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا جائے۔ کیا ازابیل یہی چاہتی تھی؟

اسے اس بارے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑی۔ اس کے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے ازابیل اس کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔

''میں مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔ اس لیے چلی آئی۔''

اس نے زمین پر لیٹے ہوئے اپنے بیٹوں کو دیکھا اور الفریڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''کیا اب تمہارا پاگل پن ختم ہوگیا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر تم نے بھائی کو قتل کیا تو مجھے بھی مار دو گے؟ اگر تم اس پر گولی چلاؤ گے تو میں بھی مرجاؤں گی۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟''

اس سے پہلے کہ ولی کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، وہ تیزی سے اس کے قریب آئی اور اس کی بیلٹ سے ریوالور نکال کر الفریڈ کی جانب پھینک دیا۔ اس نے لپک کر وہ ریوالور پکڑا اور اس کا رخ ازابیل کی طرف کردیا۔ بظاہر وہ خوفزدہ نظر آرہا تھا۔

''آگے بڑھو۔ اپنے بھائی کے بجائے مجھے گولی مار دو تاکہ میں اس تکلیف سے آزاد ہوجاؤں۔''

کافی دیر تک کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی، حالانکہ الفریڈ بہ آسانی آسکر کو گولی مارسکتا تھا اور دونوں یہ بات جانتے تھے۔ آسکر کسی امکانی خطرے کے پیشِ نظر خوفزدہ تھا لیکن ازابیل نے جو کچھ کہا تھا، اس کے بعد شاید الفریڈ اس سے بھی زیادہ خوفزدہ ہوگیا تھا۔

اس نے ریوالور زمین پر رکھا اور اسے ولی کی طرف کھسکا دیا۔ ولی نے جھک کر اسے اٹھایا تبھی ازابیل اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''مسٹر کوستا! میں چاہتی ہوں کہ تم تمام ہتھیار لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے اپنے بیٹوں کے ساتھ یہاں چھوڑ دو۔''

ولی کچھ ہچکچایا لیکن وہ بولی۔ ''چلے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پاگل پن ختم ہوچکا ہے۔ میں ان سے یہ توقع نہیں کرتی کہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے پیش آئیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ میری بقیہ زندگی سکون سے گزرے گی۔''

ولی آہستہ قدموں سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ اسے دونوں بھائیوں کے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ شاید ازابیل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ باہر پورچ میں رک کر کسی ہنگامے کی آواز کا انتظار کرتا رہا، پھر مطمئن ہوکر گھر چلا گیا۔

دوسرے دن اس نے ایلس آرڈن کو فون کرکے تفصیل بتائی تو وہ بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تم نے ازابیل کے گھر میں کیا کیا، تاہم ازابیل نے اپنے لکڑی کے فرش میں گولیوں کے سوراخ کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے بیٹے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ الفریڈ ٹکارا گوا واپس جارہا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ مستقبل قریب میں اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ ازابیل کو امید ہے کہ شاید اس کے دونوں بیٹے آپس میں صلح کرلیں۔ اس نے تمہارا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے۔'' ولی نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم بہت ذہین ہو۔ تم نے ناممکن کو ممکن کردکھایا۔'' ایلس بولی۔

''اس کا کریڈٹ ازابیل کو جاتا ہے۔ اس نے الفریڈ پر نفسیاتی داؤ آزمایا اور اس کی دھمکی کام آگئی۔''

⌘⌘⌘

نگہبان

طاہر جاوید مغل

قدرت نے انسان کی بہ ظاہر دو آنکھیں بنائی ہیں مگر... محبت... محبت کا تو وجود ہی نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی عکس... اس کے باوجود اس نادیدہ جذبے میں اتنی طاقت رکھ دی ہے کہ جس دل میں گھر کرلے وہاں الہام اترنے لگتے ہیں... ان کے درمیان تو دنیا کا حسین ترین تعلق تھا... ایک ایسا رشتہ جس کا نام بھی تھا اور حق بھی لیکن... حسد ایک ایسی آگ ہے جس میں نہ کوئی رشتہ بچتا ہے اور نہ ہی احساس...

پچھتاوے کی آگ میں جل جل کر جینے والی ایک عورت کی روداد.....

بشارت بیگم کی بہو خوب صورت تھی اور جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی تند مزاج اور کینہ پرور بھی تھی۔ اس کی یہ صلاحیتیں آہستہ آہستہ ہی بشارت بیگم پر کھلی تھیں۔ ان صلاحیتوں سے پوری طرح آشکار ہونے میں کم و بیش چھ سال لگ گئے تھے۔ اس وقت تک وہ اور اسد تین بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ بڑی بیٹی دعا تھی، دو بیٹے اسامہ اور عاطس تھے۔ تینوں بچے بڑے پیارے اور دادی کی جان تھے مگر بشارت بیگم کے دل میں ہر وقت کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں

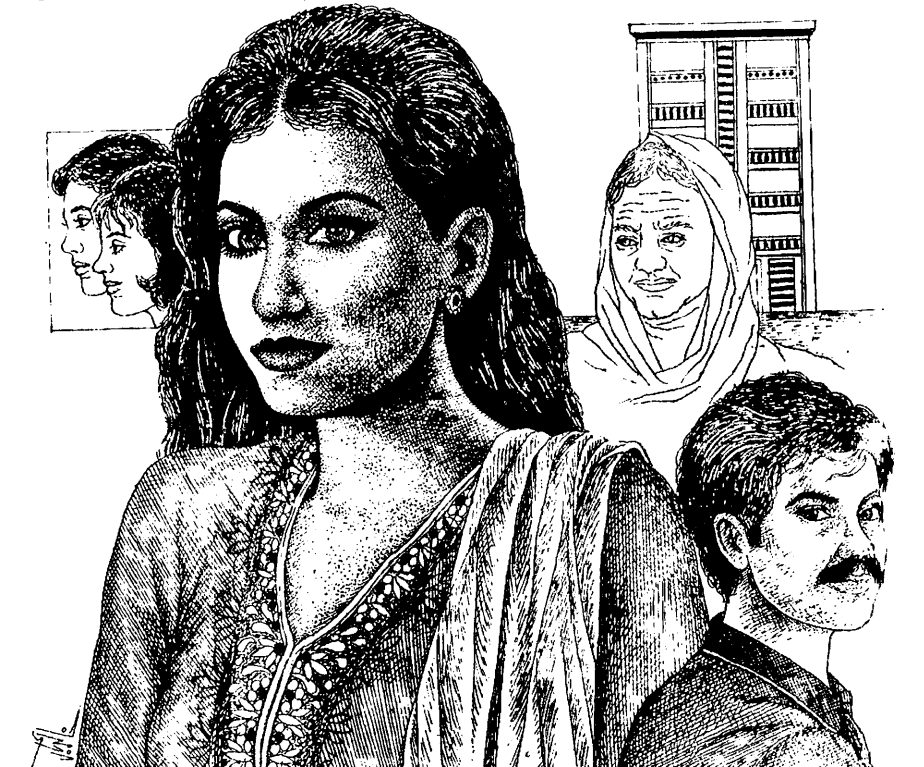

کسی دن فریحہ ان بچوں کو ان سے دور نہ کر دے۔ ان بچوں کے دم قدم سے ہی تو وہ جی رہی تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد یہ اکلوتا بیٹا اسد اور پھر اس کے آنگن میں کھلنے والے یہ تین ننھے منے پھول ہی بشارت بیگم کی زندگی کا محور تھے۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور پھر ایک دن وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ بشارت بیگم کے دل میں کسی کانٹے کی طرح چبھا رہتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بتنگڑ بنے تھے۔ رائی کے پہاڑ بنتے گئے تھے۔ شعلہ صفت فریحہ اور بشارت بیگم میں خلیج دھیرے دھیرے وسیع ہوتی گئی تھی۔ اسد جیسے بتدریج فریحہ کے ٹرانس میں آتا چلا گیا اور ایک دن بشارت بیگم کو پتا چلا تھا کہ اسد کو اپنی جاب کے سلسلے میں انگلینڈ جانا پڑ رہا ہے۔ اسے کم از کم دو ڈھائی سال وہیں گزارنا پڑیں گے۔ فریحہ اور بچے بھی ساتھ جا رہے تھے۔

......اور پھر وہ چلے گئے۔ اتنا بڑا گھر بشارت بیگم کو کاٹنے لگا۔ یہ تو شکر کا مقام تھا کہ دو پرانے ملازم رشید اور ذکیہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھے۔ وہ اب ملازم کم اور گھر کے فرد زیادہ محسوس ہوتے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی بے اولاد تھے۔ ان کا سب کچھ یہ گھر تھا اور بشارت بیگم تھیں۔ بشارت بیگم کے مرحوم شوہر آبائی گاؤں میں کچھ زرعی زمین چھوڑ گئے تھے۔ اس کی آمدن سے گزر بسر... بہ آسانی ہو جاتی تھی۔ مرحوم شوہر کی پنشن اس کے علاوہ تھی۔ بشارت بیگم کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب تھی۔ دو سال پہلے ان پر فالج کا ایک اٹیک ہوا تھا جس کے بعد وہ وہیل چیئر پر آ گئی تھیں۔

وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھیں کہ ملازمہ ذکیہ تیزی سے اندر آئی۔ ''بیگم جی...... چھوٹے صاحب کی کال آ رہی ہے۔''

بشارت بیگم کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ بس کبھی کبھار ہونے والا یہی ٹیلی فونک رابطہ ہی تو تھا جو ان کے لیے زندہ رہنے کا جواز بنا ہوا تھا۔ انہوں نے بڑے اشتیاق سے فون تھاما۔ یہ ویڈیو کال ہی تھی۔ اس مرتبہ پورے تین ہفتے بعد رابطہ ہوا تھا۔ حسب توقع بہو فریحہ چھوٹے عاطس کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اسد نے موقع غنیمت جان کر ماں کو کال کر لی تھی۔

''کیسی ہیں امی جان؟'' اسد نے محبت سے پوچھا۔

''بس جیسی ہوں تمہارے سامنے ہوں بیٹا۔ سانس کا کیا بھروسا ہے، کتنی دیر تک چلتی ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں امی! آپ پہلے سے اچھی لگ رہی ہیں۔''

''اچھی اس لیے لگ رہی ہوں کہ آج تمہاری کال آ گئی ہے۔ تین چار دن سے بہت انتظار کر رہی تھی پھر تمہارے آفس میں ٹرائی کیا۔ اب تو آفس میں بھی تمہارا فون نہیں ملتا۔ کہیں اب آفس میں بھی بات کرنے پر پابندی تو نہیں لگ گئی؟'' بشارت بیگم کے لہجے میں کرب تھا۔ پابندی کے حوالے سے ان کا اشارہ بہو فریحہ کی طرف ہی تھا۔

''آپ کیسی بات کرتی ہیں امی! ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس پچھلے دنوں کام کا لوڈ کچھ زیادہ تھا۔''

بشارت بیگم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ''بیٹا! اب تو آ ہی جاؤ۔ کچھ دن تم لوگوں کے ساتھ بھی گزار لوں۔ کسی وقت تو بہت زیادہ اداس ہو جاتی ہوں۔''

''امی! آپ کو بتایا تھا نا کہ ابھی ایک ڈیڑھ سال تو ہر صورت رکنا ہی پڑے گا۔ نیشنلٹی کے پیپر مکمل ہوتے ہی وہاں سے نکل پڑوں گا۔''

''یہ بات تو تم پچھلے چار سال سے کہہ رہے ہو اور جب یہاں سے گئے تھے تب مجھے صرف ڈیڑھ دو سال کا کہہ کر گئے تھے۔ اس اگست کو پورے پانچ سال ہو جانے ہیں تمہیں۔''

اس سے پہلے کہ اسد جواب میں کچھ کہتا، بشارت بیگم کی پوتی دعا چہکتی ہوئی کیمرے کے فریم میں داخل ہوئی۔

''ہیلو دادو جان! السلام علیکم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بچوں کو دیکھ کر بشارت بیگم کا سینہ محبت سے لبالب بھر جاتا تھا۔ انہوں نے دعا کو دعائیں دیتے ہوئے موبائل فون کی اسکرین چومی۔ جواب میں دعا نے بھی اسکرین چومی۔ پھر اسامہ کی من موہنی شکل نظر آئی۔ دادی کو سلام کرنے کے بعد اس نے بھی اسکرین کو بوسہ دیا اور ہاتھ ہلایا۔ بشارت صدقے واری جا رہی تھی۔ ''آ جاؤ...... میرے بچو آ جاؤ۔ اپنی دادو کو کب تک انتظار کرواؤ گے؟''

''حوصلہ رکھیں امی جان۔'' اسد نے کہا۔ ''ہم بھی آپ کے پاس آنے کے لیے اتنے ہی بے چین ہیں جتنی آپ ہمارے لیے ہیں۔ بس یہی سوچتے ہیں کہ......''

اچانک بولتے بولتے اسد رک گیا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات بشارت بیگم نے صاف دیکھے تھے اور اس کی وجہ بھی وہ جانتی تھیں۔ انہیں سڑک کی طرف سے کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ یہ اسد ہی کی گاڑی تھی۔ یقیناً فریحہ شاپنگ سے واپس آ گئی تھی۔

اسد عجلت میں بولا۔ ''اچھا امی! فریحہ شاید واپس آ گئی ہے۔ سامان وغیرہ اوپر لانا ہوگا۔ انشاء اللہ میں کل

آفس سے بات کروں گا۔''

اس کے لہجے کی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے بشارت کا دل کٹ کر رہ گیا مگر وہ اپنے اندر کی اذیت کو زبان پر لانے والی عورت نہیں تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فریحہ جیسی نفیس اور انا پرست بہو کے ساتھ انہوں نے ابتدائی چھ سات سال گزار لیے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اسد! تم دیکھو اس کو..... پھر بات کریں گے۔''

دعا اور اسامہ نے دادی کو ''ویو'' کیا اور اس کے ساتھ ہی ویڈیو کال ختم ہوگئی۔

☆☆☆

یہ کوئی دو ماہ بعد کی بات ہے۔ بدلتے موسم کے سبب بشارت بیگم کو پھر بائیں ٹانگ میں شدید درد رہنے لگا تھا۔ پہلا ڈاکٹر اب لاہور کے دوسرے کونے پر کلینک کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ مغل پورہ سے ٹاؤن شپ کا فاصلہ کچھ کم نہیں تھا مگر بشارت نے سوچا کہ کم از کم ایک بار تو اس کو دکھا لیا جائے۔ ایک اسٹیشن وین بشارت بیگم نے کہیں آنے جانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ بوقتِ ضرورت اسے ملازم رشید ہی ڈرائیو کر لیتا تھا۔ ڈاکٹر سے سہ پہر کا وقت ملا۔ بشارت بیگم جانے کی تیاری کر ہی رہی تھیں کہ اسد کی آڈیو کال آگئی۔ وہ حسبِ معمول آفس سے ہی بات کر رہا تھا۔ اس کی کال ایسے ہی ہوتی تھی جیسے کوئی مشکل فرض ادا کیا جاتا ہے۔ آج بھی اس نے تقریباً دو ہفتے بعد رابطہ کیا تھا۔ بشارت نے سب سے پہلے بچوں کا حال احوال پوچھا پھر فریحہ کی خیریت دریافت کی۔ اسد نے کہا۔ ''آپ کو کچھ پیسے بھیجے ہیں۔ ایک دو دن میں مل جائیں گے۔''

''بیٹا! پیسوں سے زیادہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پتا نہیں وہ کون سا دن ہوگا جب میں تم سے سنوں گی کہ امی! ہم نے ٹکٹیں لے لی ہیں۔ اب ہم آنے والے ہیں۔''

اسد ہنس دیا پھر ماں کا حال احوال پوچھنے لگا۔ وہ جانتی تھیں کہ سخت مزاج فریحہ کی وجہ سے وہ بے چارہ پہلے ہی بہت پریشان رہتا ہے۔ یہاں کے مسائل کے بارے میں وہ اسے کم سے کم ہی بتایا کرتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے اپنی طبیعت کی خرابی چھپائی اور نہیں بتایا کہ وہ چیک اپ کے لیے جا رہی ہیں۔

گفتگو ختم کر کے وہ وہیل چیئر پر ہی گیراج میں پہنچ گئیں۔ ذکیہ کے سہارے سے وہ قدرے دشواری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں۔ رشید نے وہیل چیئر کو فولڈ کر کے وین کے پچھلے حصے میں رکھ دیا۔ شہر میں رش تھا۔ رشید ویسے بھی بڑی احتیاط سے ڈرائیو کرتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ کلینک پہنچ گئے۔ وہاں باری آنے میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹا مزید لگ گیا۔ چیک اپ کے بعد بشارت بیگم وہیل چیئر پر ہی کلینک کی نشست گاہ میں آگئیں۔ ذکیہ ان کی ساری نشست و برخاست کا خیال رکھ رہی تھی۔ رشید کچھ فاصلے پر ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔ بشارت بیگم کھڑکی کے شیشے سے باہر فٹ پاتھ پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگیں۔ اچانک وہ سرتاپا ہل گئیں۔ انہیں لگا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے ہوا میں معلق ہوگئی ہیں۔ انہیں اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے کچھ فاصلے پر ایک مرد اور عورت کو ایک کراکری اسٹور سے نکل کر ایک سوزوکی کار میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ یہ کوئی اور نہیں اسد اور فریحہ تھے۔

بشارت بیگم کو یوں چونکتے دیکھ کر رشید نے بھی ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور اسد و فریحہ کو پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر بھی دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی۔ اس کے بعد ذکیہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ تینوں یقیناً اسد اور فریحہ کو نظر نہیں آرہے تھے مگر وہ انہیں دیکھ سکتے تھے۔

حیرت کے شدید ترین دھچکے کے بعد بشارت بیگم نے خود کو سنبھالا پھر جیسے اچانک ان کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ انہوں نے مڑ کر پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سوزوکی کار اب ریورس ہو رہی تھی..... مگر عقب میں رش تھا۔

''سنو رشید!'' بشارت بیگم نے تیزی سے کہا۔

''جی بیگم جی!'' وہ جھکتا ہوا ان کے سامنے آیا۔

''..... تم..... ان کے..... پیچھے جاؤ..... دیکھو کہاں جاتے ہیں۔''

''جو حکم بیگم صاحبہ۔'' رشید نے ادب سے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو رشید..... اپنی وین پر نہیں۔ یہ سامنے ٹیکسی کھڑی ہے، اس پر چلے جاؤ۔ انہیں ..... پپ ..... پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''جی بیگم جی۔'' اس نے سر جھکایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

بشارت بیگم کا دل مشین کی طرح چل رہا تھا۔ سر چکرانا شروع ہوگیا تھا۔ انہوں نے کوئی تین گھنٹے پہلے اسد سے انگلینڈ میں بات کی تھی اور اب وہ یہاں فریحہ کے ساتھ ایک سوزوکی کار میں موجود تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو امڈنا شروع ہوگئے۔

☆☆☆

سب کچھ عیاں ہوگیا تھا اور جو کچھ عیاں ہوا تھا وہ بشارت بیگم کے لیے اتنا اندوہناک تھا کہ وہ جیسے نچڑ کر رہ گئی تھیں۔ کئی دن تک تو انہیں کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا۔ بی پی اور شوگر دونوں بری طرح متاثر ہوگئے۔ فیملی ڈاکٹر روزانہ گھر آکر انہیں دیکھ رہا تھا۔ ذکیہ اور رشید ہمہ وقت ان کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ وہ صرف ڈیوٹی انجام نہیں دیتے تھے۔ پچیس تیس سال کی رفاقت نے انہیں حقیقتاً اپنی مہربان مالکن کے بہت قریب کردیا تھا۔ ان کا دکھ انہیں اپنا دکھ محسوس ہوتا تھا۔

رشید نے جو کچھ معلوم کیا تھا، اس کے مطابق فریحہ اور اسد بچوں سمیت قریباً دو برس سے لاہور میں ہی رہائش پذیر تھے۔ وہ ٹاؤن شپ کے علاقے میں اپنا ذاتی دس مرلے کا خوبصورت گھر خرید چکے تھے۔ لاہور بھی کراچی کی طرح اتنا پھیل چکا تھا کہ ایک شہر میں کئی شہر بسے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ مغل پورہ کی اس اسٹریٹ اور ٹاؤن شپ کے اس ایریا میں اتنی ہی دوری تھی جتنی دو شہروں یا قصبوں کے درمیان ہوسکتی ہے۔ اسد کی نقل وحرکت بھی بہت محدود تھی۔ حلقۂ ارباب نہ ہونے کے برابر تھا۔ فریحہ کا بھی ایک والدہ، بہن اور بہنوئی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدہ تین سال پہلے وفات پاگئی تھیں۔ بہن اور بہنوئی ساؤتھ افریقا شفٹ ہوچکے تھے۔ رشید نے بڑی احتیاط سے اسد کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق وہ اپنی انگلش کمپنی کے لیے یہاں پاکستان سے ہی 'ریموٹ جاب' کررہا تھا۔ کام کرکے انٹرنیٹ کے ذریعے وہاں ارسال کررہا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ ان کے پاکستان واپس آنے کی وجہ بڑی ہوتی ہوئی بیٹی دعا تھی۔ وہ اب قریباً گیارہ سال کی تھی اور چھٹی کلاس کی طالبہ تھی۔ فریحہ پاکستان واپسی کے لیے ماننے والی کہاں تھی۔ یقیناً دعا کو مغربی ماحول کے زہریلے اثرات سے بچانے کے خیال نے ہی میاں بیوی کو پاکستان لوٹنے پر مجبور کیا تھا۔

یہاں تک تو جو تھا ٹھیک ہی تھا لیکن اس کے آگے کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا بلکہ بے حد تکلیف دہ اور دل خون کرنے والا تھا۔ ماں ان کی واپسی کے لیے ترس رہی تھی اور اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بیٹا اور بہو دو برس پہلے ہی بچوں سمیت یہاں واپس آچکے ہیں۔ اسی شہر کے ایک گوشے میں رہائش پذیر ہیں۔ عین ممکن تھا کہ موقع میسر آنے پر انہوں نے کسی اور شہر شفٹ ہونے کا پلان بھی بنا رکھا ہو۔

کیا ستم تھا۔ اپنی تند مزاج و بالادست بیوی کے خوف کے سبب اسد ان کے پاس آکر بھی ان سے دور تھا۔ اپنے بچوں کو بھی دور رکھے ہوئے تھا۔ بشارت بیگم جانتی تھیں وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ یہ صرف فریحہ کا حد سے بڑھا ہوا خوف اور اس کا اثر رسوخ تھا جس نے اسے اس حد تک مجبور کردیا تھا۔ اس کی مجبوری کا اس سے بین ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ بیوی کے ساتھ مل کر ماں کو ایک صریح دھوکا دیتا رہا تھا۔ واٹس ایپ وغیرہ کے ذریعے ماں کو لاہور ہی سے ویڈیو کال کی جاتی رہیں اور ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ کالز انگلینڈ سے کی جارہی ہیں۔ چھوٹے بچوں کو بھی کسی طرح اس دھوکے میں شریک کرلیا گیا۔ کئی ہفتوں تک بشارت کے آنسوؤں نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر حسب معمول 'انگلینڈ' سے اسد کی مختصر ویڈیو کال آئی تھی اور اس نے فریحہ کی غیر موجودگی میں دادی کو پوتی پوتوں کی شکل دکھائی تھی۔

ایک روز بشارت بیگم نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اہم تھا اور عجیب بھی۔ وہ اپنے بچوں کے قریب رہنا چاہتی تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ فریحہ کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک درمیانی راستہ منتخب کیا۔ ان کے پاس وسائل موجود تھے۔ وہ اس طرح کی کوشش کرسکتی تھیں۔ انہیں ذکیہ اور رشید پر مکمل بھروسا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرکے ان پر ہر طرح کا اعتماد کرسکتی تھیں۔ انہوں نے رشید کے ذمے ایک کام لگایا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ ٹاؤن شپ میں اسد اور فریحہ کے گھر کے بالکل آس پاس کوئی گھر یا فلیٹ قیمتاً یا کرائے پر ڈھونڈے۔ یہ گھر یا فلیٹ ایسی جگہ ہونا چاہیے جہاں وہ اپنے جگر گوشوں کو آتے جاتے، کھیلتے کودتے دیکھ سکیں۔

انہوں نے کہا۔ ''رشید! یہ کام بہت رازداری سے ہو۔ اسد اور فریحہ تمہیں جانتے ہیں اس لیے کوشش کرو کہ یہ کسی اور کے ذریعے سے ہو۔''

وہ ادب سے جھک کر بولا۔ ''میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ رہا ہوں بیگم جی! آپ بالکل بے فکر رہیں۔''

☆☆☆

ایک ماہ کے اندر اندر رشید نے وہ سب کر دکھایا جو بشارت بیگم نے کہا تھا۔ وہ ایک ایسا فلیٹ قیمتاً حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جو اسد کے گھر کے سامنے واقع تھا۔ یہ عین سامنے تو نہیں تھا مگر زیادہ ہٹ کر بھی نہیں تھا۔ بشارت بیگم جب ایک شب فلیٹ میں پہنچیں تو یہ دیکھ کر سرشار ہوگئیں کہ دوسری منزل پر موجود اس فلیٹ کی کھڑکیوں سے اسد کے گھر کا گیٹ ہی نہیں، اس کے گراسی لان کا کچھ حصہ بھی

صاف دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے لان میں اپنے چھوٹے پوتے عاطی کو ٹرائی سائیکل چلاتے دیکھا اور ان کی نگاہیں آنسوؤں کی نمی سے دھندلا گئیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ گارڈن لائٹ میں اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر ان کا دل چاہا کہ ان کے بازو طویل ہوتے جائیں۔ وہ یہیں کھڑے کھڑے اپنے پوتے کو چھو لیں..... اور وہ ''دادو'' کہہ کر ان کے سینے سے لگ جائے۔

اس فلیٹ میں قدم رکھ کر اور اس کی لوکیشن دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوئیں کہ انہوں نے فوری طور پر رشید کو دس ہزار کا کیش انعام دیا جو وہ بصد اصرار کے بعد لینے پر آمادہ ہوا۔ ذکیہ اور رشید دونوں کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی مالکن کی دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

ایک دو دن میں ہی بشارت نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مستقل طور پر اسی فلیٹ میں رہیں گی تاہم وہ یہ کام پوری رازداری سے کرنا چاہتی تھیں۔ اگر ذکیہ اور رشید ان کے ساتھ رہتے تو اسد اور فریحہ کو پتا چل سکتا تھا۔ لہٰذا ان کی جگہ دو اور ملازموں کا انتظام کرلیا گیا۔ دراصل یہ ذکیہ کی بیوہ بہن نسرین اور اس کا بھائی بالا تھے۔ بشارت بیگم ان دونوں پر بھی اسی طرح اعتبار کرسکتی تھیں جیسے ذکیہ اور رشید پر کرتی تھیں۔ دو چار روز میں بشارت بیگم کا سامان بھی فلیٹ میں پہنچا دیا گیا۔

یہ بشارت بیگم کے لیے بڑے جاں افزا دن تھے۔ وہ جیسے پھر سے جی اٹھی تھیں۔ وہ فلیٹ کے سامنے والے کشادہ کمرے میں دیوار گیر کھڑکی کے سامنے بیٹھی رہتیں۔ کبھی وہیل چیئر پر ہوتیں، کبھی صوفے پر۔ کھڑکی میں گرین مرکری شیشہ تھا۔ وہ باہر دیکھ سکتی تھیں لیکن باہر سے انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسد، فریحہ اور تینوں بچوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھتیں۔ وہ انہیں لان میں گھومتے پھرتے بھی نظر آتے۔ کسی وقت بچے سامنے کی اندرونی سڑک پر بھی کھیل کود رہے ہوتے۔ وہ انہیں اپنی نگاہوں سے چومتیں اور دور ہی سے ان کی بلائیں لیتیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت دعائیں رہتی تھیں۔

ہفتے اور اتوار کا دن خاص طور سے بڑا خوشگوار ہوتا۔ بچوں کی چھٹی ہوتی۔ اسد اور فریحہ بھی ایزی موڈ میں ہوتے۔ وہ کھڑکی کے عقب سے ان کی مصروفیات دیکھتی رہتیں اور لطف اٹھاتیں۔ چھ سات سالہ عاطی میں تو جیسے ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ وہ نٹ کھٹ بھی بہت تھا۔ ہر وقت شرارتیں کرتا اور کسی وقت ماں سے ڈانٹ بھی کھاتا تھا۔

ایک روز فریحہ نے اسے غصے میں دو تھپڑ رسید کردیے۔ وہ ایک ستون سے لگا دیر تک روتا رہا۔ وہ جتنی دیر روتا رہا بشارت بیگم کا دل بھی روتا رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائیں۔ ان کو اسد پر بھی غصہ آرہا تھا جس نے اندر سے نکل کر ابھی تک عاطی کی خبر نہیں لی تھی۔ خدا خدا کر کے اسد باہر آیا۔ عاطی کو چوم چاٹ کر اندر لے گیا اور بشارت بیگم کی جان میں جان آئی۔

پھر بشارت بیگم نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ کھانے کے حوالے سے وہ اسد اور بچوں کی پسند و ناپسند اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ اکثر کوئی مزیدار چیز بنوالیتیں اور پھر ملازمہ نسرین ہی کے ذریعے اردگرد کے پانچ چھ گھروں میں بھجواتیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں اسد کا گھر بھی شامل ہوتا تھا۔ نسرین بھی سب کچھ جانتی تھی۔ اس کے لیے یہ ہدایت تھی کہ وہ یہاں کسی سے بھی اپنی مالکن کے بارے میں کھل کر بات نہیں کرے گی۔ محلے میں بھی سب کو یہی معلوم تھا کہ یہاں ایک اپاہج عورت اپنے دو ملازموں کے ساتھ رہتی ہے اور دوسروں سے ذرا کم ہی ملتی ہے۔ فقط دائیں اور بائیں والے پڑوسی ہی تھے جو ایک دو دفعہ بشارت بیگم سے ملنے آئے تھے۔

ایک یخ بستہ سہ پہر میں بشارت نے دیکھا کہ اسامہ اور عاطی لان میں فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ اسی دوران میں ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ سردی کو خاطر میں لائے بغیر بچے کھیلتے رہے۔ فریحہ غالباً اندر سو رہی تھی۔ دعا اس وقت ہوم ورک کرتی تھی۔ اس نے بھی دھیان نہیں دیا۔ بشارت کو فکر لاحق ہوگئی۔ بچے بیمار پڑ سکتے تھے۔ وہ سخت سردی میں بری طرح بھیگ گئے تھے۔

''نسرین..... نسرین!'' بشارت نے ملازمہ کو آواز دی۔

''جی بیگم جی!'' وہ لپک کر آئی۔

انہوں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھو بچوں کو۔ یہ بیمار ہونے والی بات ہے کہ نہیں؟'' نسرین نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولیں۔ ''جاؤ چادر اوڑھ کر..... ان کی کال بیل دو۔ انہیں بتاؤ کہ اندر جائیں بلکہ ان کی والدہ سے ہی کہو۔''

نسرین بھاگی ہوئی گئی۔ اس کی ڈور بیل پر فریحہ بکتی جھکتی باہر نکلی اور اسے اصل صورتِ حال کا علم ہوا۔ وہ بچوں کو اندر لے گئی تو بشارت بیگم کی جان میں جان آئی۔

..... وہ ہمہ وقت ایک مہربان نگران کی طرح اپنے اس گھرانے پر نگاہ رکھ رہی تھیں۔ بے شک ان سے دور تھیں

مگران کا دل تو شب و روز اپنے بچوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ ان کے لبوں پر اس گھرانے کے لیے ہمہ وقت سلامتی کی دعائیں رہتی تھیں۔ وہ کوشش کر کے چھوٹی چھوٹی خوشیاں ان تک پہنچاتی رہتی تھیں۔ شب برات اور عید کے تہوار آئے تو شیرینی ان کی طرف بھیج دی۔ چودہ اگست آئی تو چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں محلے میں تقسیم کردیں۔ اکثر اپنے پوتی پوتوں کی پسند کی کوئی ڈش بنواتیں اور نسرین کے ذریعے ان تک پہنچا دیتیں۔ انہیں پتا تھا کہ دعا کو پستہ بہت پسند ہے۔ انہوں نے ڈیڑھ دو کلو پستہ منگوایا اور یہ کہہ کر محلے میں تقسیم کرایا کہ پشاور سے سوغات آئی ہے۔

اگلے روز انہوں نے من موہنی دعا کو دھوپ میں ٹہلتے اور ٹھکور ٹھکور کر پستہ کھاتے دیکھا تو ان کا دل باغ باغ ہوگیا۔ چار پانچ دن بعد کی بات ہے، بشارت کو اندازہ ہوا کہ فریحہ کسی بات پر بگڑی ہوئی ہے۔ اس کے بگڑنے کے لیے کسی معقول بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب بھی اس کے اندر کوئی ابال پیدا ہوتا تھا، وہ گھر کا ماحول خراب کردیتی تھی۔ ایک شام انہوں نے لان میں اسے اسد سے باقاعدہ تو تکرار کرتے دیکھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ چھوٹے بیٹے عاطی کے ساتھ گھر سے نکلتی نظر آئی پھر وہ گاڑی لے کر کہیں چلی گئی۔ ایسے موقعوں پر اسد اور بچے سہم جایا کرتے تھے۔ اب بھی وہاں کا ماحول کچھ ایسا ہی نظر آرہا تھا۔ بشارت کا جی چاہا وہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جائے، ان کی دلجوئی کرے۔ میاں بیوی میں صلح کرانے کی کوشش کرے۔ بشارت کا رویہ ہمیشہ سے صلح جوئی والا ہی رہا تھا۔

اسد میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ وہ فریحہ کے ہوتے ہوئے ماں کو کال کرے۔ وہ یہ کام عموماً گھر سے باہر جا کر کرتا تھا اور ظاہر یہ کرتا تھا کہ آفس میں ہے۔ بچوں سے بشارت کی ملاقات تب ہی ہو پاتی تھی جب کسی سبب فریحہ گھر میں نہ ہو۔ آج بھی یہی صورتِ حال تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسد کی کال آگئی۔ بظاہر یہ کال ''انگلینڈ'' سے تھی مگر سامنے والے گھر سے ہی کی جارہی تھی۔ اسد اور بچے، بشارت کی نگاہوں کے سامنے لان میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ حسبِ دستور بچوں سے بات ہوئی۔ بشارت نے ان کی بلائیں لیں۔ موبائل کی اسکرین کو بوسے دیے۔ آج پھر گفتگو کے دوران میں اسد نے پوچھا۔ ''امی! یہ کون سا کمرا ہے؟''

وہ بولیں۔ ''تمہیں بتایا تو تھا اسد، پچھلے صحن والا، جو تمہارے ابو ریڈنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہاں باہر کا شور ذرا کم ہوتا ہے۔ اس کی سیٹنگ وغیرہ بدلی ہے۔''

وہ افسردگی سے بولا۔ ''امی جی! بہت دل چاہتا ہے آپ کے پاس واپس آنے کو۔ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہنے کو۔ ساری پرانی یادیں تازہ کرنے کو لیکن بس مجبوریاں ہیں۔ دعا کریں جلد اس پردیس سے جان چھوٹے۔''

''میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں..... فریحہ کے لیے بھی بہت دعا کرتی ہوں۔ وہ کیسی ہے؟''

''بس ذرا شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی ہے۔ اس کے موڈ کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ کبھی تولہ کبھی ماشہ..... لیکن..... آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی ہے۔'' اسد نے ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دی۔

وہ ہولے سے آہ بھر کر رہ گئیں مگر آہ بھی یوں بھری کہ اس کی آواز اسد کے کانوں تک نہ جائے۔ وہ کبھی اس کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرتی تھیں۔

رہائشی آبادی کی جس اندرونی سڑک پر یہ فلیٹ اور گھر واقع تھے، وہ کافی کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ یہاں ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا مگر ایک دن قریبی مین روڈ کسی وجہ سے بلاک تھی۔ ٹریفک کا سارا ریلا اس اندرونی سڑک کی طرف ہوگیا۔ بشارت کھڑکی میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اسی دوران میں دعا کی اسکول وین بھی اسکول سے چھٹی کے بعد پہنچ گئی۔ وین حسبِ معمول دعا کو اتار کر آگے بڑھ گئی۔ اب یہ چھوٹی سی بچی تذبذب کے عالم میں سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ کبھی قدم آگے بڑھاتی تھی کبھی پیچھے ہٹاتی تھی۔ ایک رکشا اسے تقریباً چھوتا ہوا گزر گیا۔ بشارت بیگم پکاریں۔ ''نسرین! جلدی نیچے جاؤ۔ دیکھو بچی کو۔ اس سے سڑک پار نہیں ہو رہی۔''

نسرین دوڑتی ہوئی نیچے گئی۔ اس نے دعا کا ہاتھ تھام کر اسے بڑی احتیاط سے سڑک پار کرائی۔ جب تک وہ دونوں ٹریفک کے اندر سے گزر کر دوسرے کنارے تک نہ پہنچ گئیں، بشارت کا دم سینے میں اٹکا رہا۔ ان کی دعاؤں نے جیسے ''دعا'' کے گرد ایک حفاظتی حصار سا بنائے رکھا۔ ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات تھے جو آئے دن بشارت بیگم کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے تھے۔ فلیٹ کی کھڑکی کے پیچھے بیٹھیں..... وہ ایک خداداد توجہ اور محبت سے اپنے گھرانے کی نگہبانی کرتی رہتی تھیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ اردگرد کے گھروں کے بچے سڑک پر ہی کرکٹ کھیلنا شروع کردیتے تھے۔ اکثر اسامہ اور عاطس بھی ان میں شامل ہوتے تھے۔ ایک روز عاطی تین چار چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ گیند اس

کھڑکی کے سامنے بالکونی میں آگری جہاں بشارت بیٹھی ہوئی تھیں۔ دو بچے گیند کے لیے ڈور بیل دینے لگے۔ بشارت نے جلدی سے نسرین کو بلایا۔ ''نسرین! یہ بچوں کی گیند سامنے بالکونی میں گری ہے۔ عاطی بیل دے رہا ہے۔ اس کو اندر بلالو..... اور کہو کہ خود ڈھونڈ لے۔''

''جی بیگم جی!'' نسرین ان کی بات سمجھ کر جلدی سے بولی اور واپس مڑی۔ وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ بشارت نے اسے پھر آواز دے کر بلالیا۔ ''بی بیگم!'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔

''نسرین! جب عاطی بالکونی میں آئے تو..... اس سے کہنا، دادی سے پیار لے لو..... اسے کھڑکی کے پاس لانا۔ میں کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اس کے سر پر پیار دے لوں گی۔''

نسرین کی آنکھوں میں دکھ لہرا گیا۔ وہ 'اچھا جی' کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔ بشارت کا دل ان کے ممتا بھرے سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد عاطی اپنی گیند ڈھونڈتا ہوا بالکونی میں پہنچا۔ بشارت مرکزی شیشے کے عقب سے اسے دیکھتی رہیں۔ آنکھوں میں آنسو لرزتے رہے۔ وہ گیند لے کر واپس جانے لگا تو نسرین نے کہا۔ ''دادی جان سے پیار نہیں لوگے؟''

''کون دادی جان؟'' وہ توتلے لہجے میں بولا۔

''وہی جو تمہارے لیے حلوا بھیجا کرتی ہیں، بریانی اور کسٹرڈ بھیجا کرتی ہیں۔''

عاطی الجھا ہوا سا نسرین کی طرف دیکھنے لگا۔ بشارت نے ہولے سے کھڑکی کا ایک پٹ کھولا۔ آہنی گرل کے اندر سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور عاطی کے سر پر پھیرا۔ وہ پہلے تو جھجکا، لیکن پھر شاید حقیقی دادی کا مہربان لمس تھا جس کے اثر نے اسے مطمئن کردیا۔ انہوں نے اوٹ میں رہتے ہوئے ہی اسے پچکارا۔ اس کے نرم گال سہلائے، اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو چھوا پھر ایک مٹھی بھر کر ٹافیاں اس کی جیب میں ڈالیں۔

''دادی کو سلام کرو۔'' نسرین نے کہا۔

''سلام دادی۔'' عاطی نے ہدایت پر عمل کیا۔ وہ اب نکل بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔ بشارت کے ہونٹ اسے پیار کرنے کے لیے بے ساختہ تڑپ گئے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ درمیان میں گرل تھی۔ وہ بھاگتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہوگیا۔

ایسا بھی ہوتا ہے

ایک صاحب کے لیے سات کا ہندسہ بڑا مبارک ثابت ہوتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا ساتواں بچہ تھا۔ ساتویں مہینے میں پیدا ہوا تھا اور اس کی پیدائش کی تاریخ بھی سات تھی۔ سات سال کی عمر میں اس کی لاٹری نکل آئی۔ جوانی میں اس نے کار خریدی تو اس کا نمبر 7777 تھا۔ ایک دن وہ ریس کھیلنے چلا گیا۔ وہاں سات نمبر گھوڑا بھی تھا۔ اس نے سات نمبر کے گھوڑے پر سات ہزار سات سو ستتر (7777) روپے لگا دیے۔ جب ریس ہوئی تو سات نمبر گھوڑا ساتویں نمبر پر آیا۔ وہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

سانپ اور بین

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سانپ بین کی آواز پر جھومتا ہے لیکن یہ بات اس لیے صحیح نہیں کیونکہ سانپ کے کان نہیں ہوتے اور وہ سننے کی قدرت نہیں رکھتا چنانچہ بین کی آواز سن کر جھومنا ایک ناممکن بات ہے۔ سانپ دراصل سپیرے اور بین کی حرکت کے مطابق خود کو حرکت دیتا ہے اور دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بین کی آواز پر رقص کر رہا ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

چوٹی کا شاعر

مشاعرے میں کمپیئرنگ کرتے ہوئے مہندر سنگھ بیدی نے بزرگ اور درویش شاعر کا اس طرح تعارف کروایا۔ ''اب میں زحمت کلام دوں گا، چوٹی کے شاعر فنا نظامی کانپوری کو کہ وہ مائک پر آکر اپنی غزل سنائیں۔''

مولانا فنا نظامی مائک کے سامنے آئے اور اس طرح گویا ہوئے۔ ''حضرات! سردار صاحب نے درست نہیں کہا۔ چوٹی کے شاعر تو یہ خود ہیں.....'' انہوں نے اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فقرہ مکمل کیا۔ ''میں تو محض ڈاڑھی والا شاعر ہوں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اس کے بعد کتنے ہی دن بشارت انتظار کرتی رہیں کہ بچوں کی گیند پھر سے بالکونی میں آئے اور وہ اسامہ یا عاطس کو قریب سے دیکھ سکیں مگر یہ مراد بر نہیں آئی پھر ویسے بھی گرمی شدید ہوگئی۔ سہ پہر کے بعد بچوں نے گلی میں کرکٹ کھیلنا بند کردیا۔ بڑا شدید موسم تھا۔ اے سی سے نکلتے ہی جیسے پسینے کی دھاریں بہنے لگتی تھیں۔

اس روز بشارت بیگم ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد حسب معمول وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں۔ کھڑکی میں سے اپنے پیاروں کے نشیمن کو دیکھ رہی تھیں۔ نسرین شاید نہا رہی تھی..... بالا، بشارت بیگم کی کچھ دوائیں لینے کے لیے میڈیسن کی بڑی مارکیٹ میں گیا ہوا تھا۔ بدلتے موسم نے بشارت کی صحت پر بھی منفی اثر ڈالا تھا۔ ٹانگ کے درد میں اضافہ ہوا تھا اور سینے کا درد تو زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بھوک بھی بہت کم لگ رہی تھی۔ وہ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ گود میں ایک فوٹو البم رکھا ہوا تھا۔ گاہے بگاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتی تھیں۔ اس البم میں زیادہ تر تصویریں سات آٹھ سال پہلے کی تھیں جب بیٹا، بہو اور بچے ان کے ساتھ رہتے تھے۔ من موہنی دعا..... شرارتی اسامہ..... ماں کی خفگی کی پروا کیے بغیر ہر وقت ان سے چمٹے رہتے تھے۔ ان کے نت نئے مطالبے پورے کرکے بشارت بیگم کو بھی دلی خوشی ہوتی تھی مگر اب تو یہ سب کچھ ماضی کا حصہ تھا۔

اچانک بشارت کی نظر سات سالہ عاطی پر پڑی۔ اس چلچلاتی، سنسان دوپہر میں وہ پتا نہیں کیسے گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ شاید کسی مکڑی یا تتلی کے پیچھے تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا گھر کی باؤنڈری وال کے سامنے والے باغیچے میں تھا..... پھر بشارت نے دھیان سے دیکھا..... غالباً وہ تتلی ہی تھی۔ وہ دبے پاؤں پودوں میں داخل ہوگیا اور بار بار اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بشارت بیگم کو بہو پر غصہ آیا۔ یہ اس کی غفلت ہی تھی جو وہ اس وقت یہاں موجود تھا۔ وہ کچھ دیر تک تتلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس کا دھیان امرود کے پستہ قد پودوں کی طرف چلا گیا۔ وہ بچوں کی عام عادت کے مطابق کچے پکے امرود توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ سخت گرمی میں وہ ننگے سر تھا۔ بشارت بیگم کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ وہیل چیئر دھکیل کر عقبی کمرے کی طرف گئیں مگر نسرین ابھی تک باتھ روم میں تھی۔ وہ واپس کھڑکی کے سامنے آگئیں تب انہیں ایک بار پھر بری طرح چونکنا پڑا۔ شکل وصورت سے مشکوک نظر آنے والا ایک شخص سنسان گلی میں عاطی کے قریب موجود تھا۔ عمر کوئی پچیس تیس سال رہی ہوگی۔ لباس بھی بے ڈھنگا سا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ہنس ہنس کر عاطی سے بات کررہا تھا۔ عاطی بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یکایک بشارت کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ یہ شخص پہلے تو کبھی یہاں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے موبائل پر عاطی کو کچھ دکھایا جسے عاطی نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔ عاطی معصومانہ انداز میں باتیں کرتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ اب بشارت کے لیے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ پکاریں۔ ''نسرین..... نسرین!''

اسی دوران میں انہوں نے دیکھا کہ نیلے رنگ کا ایک کیری ڈبا سڑک کے موڑ سے نمودار ہوا اور مشکوک شخص اور عاطی کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کے قریب آکر وہ رکا جیسے یکایک بجلی سی چمکتی ہے۔ کیری ڈبے کا دروازہ سلائڈ کرکے کھلا۔ مشکوک شخص عاطی کو اٹھا کر ڈبے میں داخل ہوگیا۔ یہ سب کچھ دو تین سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔

''بچاؤ..... بچاؤ!'' بشارت بیگم پوری طاقت سے چلائیں پھر وہیل چیئر کو اندھا دھند چلاتی ہوئی دروازے سے نکل کر سامنے والی بالکونی کی طرف بڑھیں۔ وہیل چیئر الٹ گئی۔ وہ پیشانی کے بل بری طرح بالکونی کے جنگلے سے ٹکرائیں۔ انہوں نے جنگلے کے اندر سے دیکھا نیلے کیری ڈبے کا راستہ چند سیکنڈ کے لیے ایک ایسی کار نے روک لیا تھا جو ایک کوٹھی کے گیراج سے نکل رہی تھی۔ بشارت بیگم نے اپنے نیم جان جسم کی پوری طاقت کو جمع کیا اور جنگلے کے سہارے گھٹنوں کے بل کھڑی ہوگئیں۔ وہ اپنے بوڑھے سینے کی پوری قوت سے پکاریں۔

''بچاؤ..... بچاؤ..... وہ میرے بچے کو اغوا کررہا ہے۔ وہ بردہ فروش ہے۔ وہ نیلی گاڑی میں..... خدا کے لیے بچاؤ۔''

چلچلاتی سنسان دوپہر میں گلی سنسان پڑی تھی مگر اکا دکا متنفس تو موجود تھے اور ان میں قریبی رہائشی خواجہ صاحب کا وہ بیٹا بھی تھا جس نے ابھی ابھی گاڑی کو ریورس کرکے گیراج میں سے نکالا تھا۔ وہ اب سر اٹھا کر بشارت بیگم کے لہولہان چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ بشارت بیگم نے ایک بار پھر دہائی دی۔ ''وہ دیکھو..... وہ اس نیلی گاڑی میں ہے۔ وہ اس کو لے جارہا ہے۔ اس کو پکڑو۔''

بات نوجوان لڑکے کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ پلک جھپکتے میں دوبارہ گاڑی میں گھسا۔ گاڑی اسٹارٹ ہی تھی۔ اس نے اسے نیلے کیری ڈبے کے پیچھے دوڑا دیا۔ کیری ڈبا اب گلی کے موڑ پر اوجھل ہورہا تھا۔ بشارت بیگم تیورا کر بالکونی

کے اندر ہی گر گئیں۔ نسرین گھبراہٹ میں واویلا کرتی باتھ روم سے نکلی اور بشارت بیگم کی طرف لپکی۔ سنسان گلی میں اب کھڑکیاں کھل رہی تھیں، دروازے وا ہو رہے تھے، مکین ائرکنڈیشنڈ کمروں سے نکل آئے تھے۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔

☆☆☆

خواجہ صاحب کے بیٹے نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس نے نیلی گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے ون فائیو پر پولیس کو بھی کال کر دی تھی۔ نیلی گاڑی کا تعاقب قدرے طویل ثابت ہوا تھا..... بہرطور اقبال ٹاؤن کے گنجان علاقے میں اغوا کنندگان نے کیری ڈبا ایک الیکٹرک پول میں ٹھونک دیا تھا اور پکڑے گئے تھے۔ اس دوران میں فریحہ پر دوبار غشی کا حملہ ہوا تھا۔ پھر اس نے جائے نماز سنبھال لی تھی۔ اس نے سجدے سے اسی وقت سر اٹھایا تھا جب اسے عاطی کے مل جانے کی خبر ملی تھی۔ اب وہ لوگ اسے پولیس اسٹیشن سے گھر لے آئے تھے۔ فریحہ کے رخساروں پر اب آنسو بہہ رہے تھے مگر اب یہ خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔ اسد بھی آبدیدہ تھا.....

اسد نے کہا۔ ''فریحہ! میرے خیال میں، عاطی کے ملنے میں سب سے اہم کردار انہی آنٹی جان کا ہے جو سامنے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔ انہوں نے ہی اس خبیث کو عاطی کے ساتھ دیکھا اور پھر شور مچایا..... میں نے سنا ہے کہ وہ گر کر زخمی بھی ہوئی ہیں۔ شاید انہیں اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

فریحہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''اسد! وہ صرف زخمی ہی نہیں ہوئیں، انہیں دل کا دورہ بھی پڑا ہے۔ نسرین نے بتایا ہے ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان کی عیادت کے لیے جانا چاہیے..... بلکہ ابھی جانا چاہیے..... نسرین بتا رہی تھی اسپتال پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے یہی پوچھا تھا کہ عاطی بچ گیا ہے نا؟''

تقریباً ایک گھنٹے بعد اسد اور فریحہ پنجاب کارڈیالوجی میں موجود تھے۔ انہیں پتا چلا کہ مریضہ آئی سی یو میں ہیں۔ ان کی حالت نازک تھی۔ ابھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں اپنے سابقہ گھر کے ملازموں ذکیہ اور رشید کو دیکھ کر اسد اور فریحہ پہلے تو بری طرح بدکے، پھر بہت حیران بھی ہوئے۔ اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ دونوں انہیں دیکھ چکے تھے.....

''تت..... تم یہاں کیسے رشید؟'' اسد نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹے صاحب! یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہم تو.....'' اسد ایک دم گڑبڑا گیا پھر ذرا غصے سے بولا۔ ''میرے سوال کا جواب دو..... تم یہاں کیوں ہو؟ امی جان تو..... ٹھیک ہیں؟''

اس نے اپنے کندھے کے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں چھوٹے صاحب! ہمیں کچھ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔''

اسد ڈیوٹی ڈاکٹرز کے کمرے کی طرف لپکا۔ چند منٹ بعد اس پر حیرت انگیز اور چکرا دینے والا انکشاف ہوا۔ آئی سی یو کے جس بیڈ پر ان کے عاطی کو بچانے والی مہربان خاتون کو ہونا چاہیے تھا، وہاں اس کی اپنی والدہ لیٹی ہوئی تھیں۔ اسے اپنا دماغ کسی بہت بڑے ہنڈولے کی طرح جھولتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فریحہ بھی بے طرح چکرائی ہوئی نظر آتی تھی..... پھر جب زار و قطار روتے ہوئے ذکیہ اور رشید کے ذریعے اصل بات ان کی سمجھ میں آنا شروع ہوئی تو ان دونوں کے سینے شق ہونے لگے..... ان کے جسموں کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا۔ وہ یقین نہیں کر پا رہے تھے، ان کی ماں..... پورے دس ماہ سے ان کے قریب موجود تھیں۔

یہی وقت تھا جب آئی سی یو سے نکلنے والے ڈاکٹرز نے بشارت بیگم کی موت کا اعلان کر دیا۔ وہ جا چکی تھیں، اپنے پوتے پر قربان ہو چکی تھیں۔ ان کی حالت تو پہلے ہی اچھی نہیں تھی۔ جو صدمہ انہوں نے دیکھا تھا اس کے بعد ان کے ناتواں دل نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ لمحے اسد اور فریحہ کے لیے جتنے حیرت انگیز اور چشم کشا تھے، اتنے ہی کربناک اور جانکاہ بھی تھے۔

اسد دیوانہ وار آئی سی یو میں داخل ہوا۔ ماں کی سرد پیشانی پر بوسے دینے لگا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ انہیں واپس بلا رہا تھا۔ شاید معافی مانگنے کے لیے واپس بلا رہا تھا..... مگر وہ ہر معافی تلافی سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

پھر فلک نے یہ منظر بھی اسد کو دکھایا کہ فریحہ اس کی ماں کے پاؤں سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ''امی جان..... امی جان!'' وہ پکاری چلی جا رہی تھی۔

سوگوار فضاؤں میں جیسے ایک صدا گونج رہی تھی..... بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔

⌘⌘⌘

شہ زور

اسما قادری

قسط: 7

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

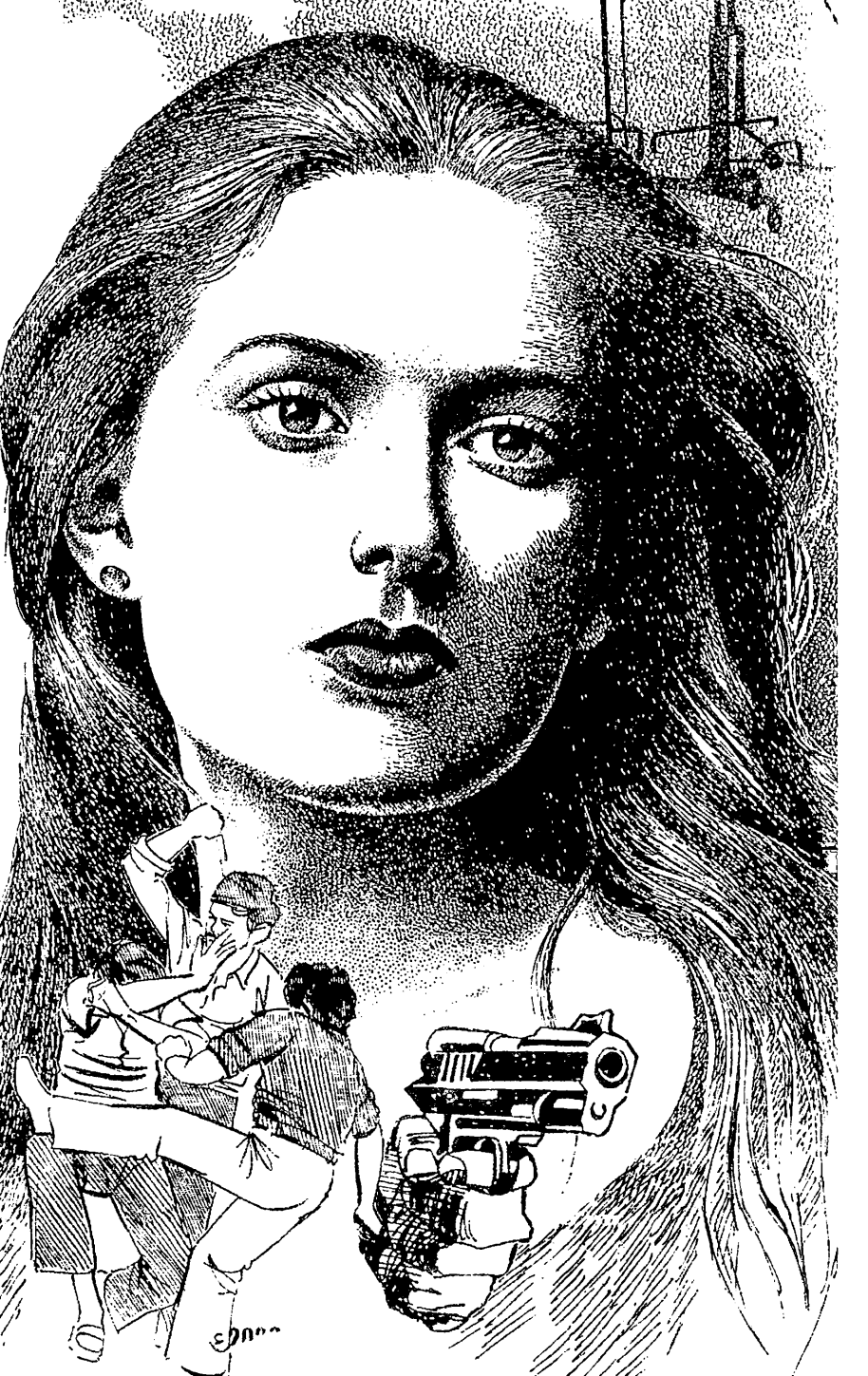

''تم..... تم میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے؟'' کھڑکی میں نظر آتے چہرے کو دیکھ کر بشریٰ غصے سے چیخی۔

''جب تک تم حماقتیں کرنا نہیں چھوڑو گی، میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، کیونکہ تم نادان ہو اور اگر کوئی نادانی میں کنوئیں میں چھلانگ لگانے جارہا ہو تو اس کے دوست اور بہی خواہ خاموشی سے اسے ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔'' وہ شخص جو کہ اعجاز تھا، پُرسکون لہجے میں بولا۔

''تم مجھے نادان نہیں کہہ سکتے۔ میں ایک عاقل و بالغ اور باشعور لڑکی ہوں۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' بشریٰ نے نروٹھے پن سے اسے جواب دیا۔

''تم اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو ورنہ یوں منہ اٹھا کر مہناز کے اپارٹمنٹ کی طرف نہ چل پڑتیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم بہانے سے باذل کو وہاں بلاؤ گی اور پھر اسے قابو کرلوگی۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب کرنا۔ باذل بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم ایک ننھے سے پسٹل کے سہارے اسے کچھ نہیں کرسکتیں۔ فرض کرو کامیاب بھی ہوجاتی ہو تو خود کو کیسے بچاؤ گی؟ مہناز جس بلڈنگ میں رہتی ہے، اس میں جگہ جگہ سیکیورٹی کے لیے سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ تم فوراً ہی پکڑی جاؤ گی۔'' اعجاز نے یوں اس کے سامنے اس کا منصوبہ دہرایا جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا ہو۔ یہ سن کر بشریٰ ہکا بکا رہ گئی۔

''ایسے ہونقوں کی طرح میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ تم سے سینئر ہوں اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ چلو شاباش! اب اچھے بچوں کی طرح گاڑی موڑو اور ہاسٹل واپس جاؤ۔ ابھی مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ شام میں، میں تم سے آکر ملتا ہوں، پھر سوچیں گے کہ تمہارے مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے۔'' اعجاز اسے کسی بچے ہی کی ٹریٹ کررہا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلائی اور جھنجلاہٹ میں اسے جواب دیے بغیر ہی گاڑی اسٹارٹ کرکے بہت تیزی سے اسے موڑا۔ اعجاز کو خود کو بچانے کے لیے تیزی سے اچھل کر ایک طرف ہونا پڑا تھا۔ بہرحال اس نے برا نہ مانا اور بشریٰ کی گاڑی کو خاموشی سے واپسی کے راستے پر جاتا دیکھتا رہا۔ ادھر بشریٰ دانت پر دانت جمائے شدید غصے کے عالم میں ڈرائیو کررہی تھی۔ یہ ایسا غصہ تھا جس کے بارے میں اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ حقیقتاً اس کا ہدف کون ہے۔ یہ بے بسی کی کوکھ سے جنم لینے والا غصہ تھا۔ وہ کچھ نہیں کرپا رہی تھی اس لیے بس غصہ ہی کرتی رہتی تھی۔ غصے کی اس کیفیت میں اس نے سرخ بتی جلنے پر بھی ایسے گاڑی روکی جیسے ٹریفک کا یہ اشارہ بھی اس کا دشمن ہو۔

''بشریٰ!'' دانت پر دانت جمائے وہ سامنے دیکھ رہی تھی کہ دائیں طرف سے کسی کے پکارنے پر رخ موڑ کر اس طرف دیکھا۔ وہ سونیا خان تھی جو حسبِ معمول اپنی شاندار گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیے اسے پکار رہی تھی۔

''آگے ''میری'' پر ملتے ہیں۔'' اس نے اسی روڈ پر آگے موجود ایک فاسٹ فوڈ سینٹر کا نام لے کر بشریٰ سے کہا اور گاڑی کا شیشہ دوبارہ اوپر کرلیا۔ ٹنٹڈ گلاس کے پیچھے اس کا حسین چہرہ اب نظر نہیں آرہا تھا۔ بشریٰ کا دل چاہا کہ اس کی بات ماننے سے انکار کردے لیکن سگنل کھلنے پر اس نے گاڑی آگے بڑھائی تو خود بخود اس ریسٹورنٹ پر لے جاکر روک دی جس کے لیے سونیا نے کہا تھا۔ سونیا کی گاڑی اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی اور اس سے پہلے اس کا ڈرائیور اور سیکریٹری کم باڈی گارڈ باہر نکل کر مؤدبانہ کھڑے ہوئے تھے۔ بشریٰ کی گاڑی رکتے ہی سونیا خان بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اس نے چست پینٹ کے ساتھ کسی ڈھیلے والے کپڑے کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس حلیے میں بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

''کتنے دنوں سے تم سے ملنا چاہ رہی ہوں لیکن تمہاری مصروفیت ہی ختم نہیں ہوتی۔ آج سگنل پر تمہیں دیکھا تو سوچا کہ اب نکلنے نہیں دینا ہے۔ آؤ! اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

بشریٰ یہاں تک آجانے کے باوجود گومگو کی کیفیت میں تھی۔ سونیا نے پُرجوش لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی اندر لے جانے لگی۔ بشریٰ کو ناچار اس کا ساتھ دینا پڑا۔

''کیا بات ہے، تم بہت اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' آخر سونیا نے اس کی کیفیت کو محسوس کرلیا اور اس کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کوئی نئی پریشانی اور غم نہیں ہے۔ بس اپنے مجرموں کو کھلے عام آزادی سے گھومتا دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے اور بس نہیں چلتا کہ ان کے ساتھ کیا کر گزروں۔'' سونیا خان سے کچھ چھپا ہوا نہیں تھا اور وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ بھی تھی اس لیے اس کے سامنے اظہار کرگئی۔

''تمہارا ان پر بس چل بھی نہیں سکتا۔ تمہیں اس حقیقت کو قبول کرنا ہوگا کہ تم ان کے مقابلے میں بہت کمزور ہو۔'' اس

کی بات سن کر سونیا خان نے بے نیازی سے تبصرہ کیا۔

''کمزور ہوں تو کیا ان کا ظلم بھول جاؤں؟'' بشریٰ کو غصہ آ گیا۔

''میں نے تم سے یہ نہیں کہا۔ میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ طاقتور سے مقابلہ کرنا ہے تو خود کو بھی طاقتور بنانا ہوگا وہ راستہ ڈھونڈنا ہوگا جو تمہیں ان تک پہنچا سکے۔ تم نے سنا ہوگا نا کہ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو گرا دیتی ہے لیکن شرط یہی ہے کہ چیونٹی کو ہاتھی کی سونڈ تک پہنچنے کا موقع مل جائے۔ تم بھی اپنے لیے ایسا موقع تلاش کرو۔ ایسا راستہ ڈھونڈو جو تمہیں کامیابی تک لے جائے۔''

''مگر کیسے؟'' بشریٰ نے ناسمجھی کے عالم میں سوال کیا۔

''یہ بھی پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم ہاسٹل جاؤ۔ جا کر فریش ہو اور خود سے پوچھو کہ تمہارے اندر انتقام کی کتنی تڑپ ہے۔ اگر یہ تڑپ اتنی ہو کہ تم اس کی خاطر کوئی بھی قیمت ادا کرنے کے لیے خود کو آمادہ پاؤ تو پھر مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں تمہاری راہنمائی کروں گی۔''

''ابھی ..... ابھی کیوں نہیں بتاتیں آپ مجھے وہ راستہ؟'' سونیا خان کی بات سن کر وہ بے چین ہوئی۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ ابھی تم اچھی طرح سوچو، پھر مجھ سے رابطہ کرنا۔'' سونیا نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپکا۔ اسی وقت ویٹر مشروب کے دو گلاس میز پر رکھ گیا جن کا دورانِ گفتگو سونیا نے آرڈر دیا تھا۔ سونیا نے بشریٰ کو مشروب پینے کا اشارہ کیا اور خود بھی گلاس سے نزاکت کے ساتھ ایک ایک گھونٹ لیتی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ بشریٰ کی ان باتوں میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مشروب پینے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے مشکل سے ایک تہائی گلاس ہی خالی کیا۔

''میں نے تم سے جو کہا ہے، اس پر غور کرنا پھر ہم دوبارہ ملیں گے۔'' سونیا نے اپنا گلاس خالی کیا اور ٹپ سمیت بل میز پر ڈال کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی ایک دوسری میز پر بیٹھا اس کا سیکریٹری کم باڈی گارڈ بھی کھڑا ہو گیا۔ بشریٰ کے لیے بھی مزید وہاں رکنا بے جواز تھا چنانچہ وہ بھی وہاں سے اٹھ گئی۔ ہاسٹل پہنچ کر وہ فریش ہونے کے ساتھ ساتھ اعجاز اور سونیا دونوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اعجاز نے بھی اس سے مل بیٹھنے اور کوئی حل تلاش کرنے کی بات کی تھی اور سونیا بھی اسی قسم کی پیشکش کر گئی تھی لیکن فرق یہ تھا کہ سونیا کا لہجہ زیادہ پُراعتماد تھا اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی واضح پلان موجود ہے لیکن اپنے تعاون کے بدلے میں وہ بشریٰ سے بھی کچھ چاہتی ہے۔ سونیا خان شروع سے اسے کچھ عجیب لگی تھی اور وہ اسے کبھی محض ایک بے حد امیر آدمی کی حسین بیوی کے طور پر نہیں لے سکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ سونیا خان میں کچھ الگ، کچھ مختلف بات ہے اور وہ تھوڑی پراسرار ہے۔ اب اس کا سونیا سے متعلق شک یقین میں بدلنے لگا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ سونیا تعاون کے بدلے اس سے کیا قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ دولت اور سماجی مرتبے کے اعتبار سے سونیا اس سے بہت بلند تھی اور اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا جس کی سونیا کو ضرورت ہوتی۔ اس نے سونیا کے مشورے کے مطابق کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر غور کرنا شروع کر دیا لیکن وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ اسے کیا قیمت ادا کرنی ہوگی۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ سونیا کو اثبات یا انکار میں جواب دینے سے قبل اسے اعجاز سے مل لینا چاہیے۔ اعجاز کے معاملے میں ایک بات بہرحال طے تھی کہ وہ اسے کبھی بھی کوئی نقصان پہنچانے والا مشورہ نہیں دے گا۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور میڈم نازلی کو کال کرنے لگی۔

''یس ڈارلنگ! کچھ چاہیے ہے کیا؟'' میڈم نے اپنی لوچ دار آواز میں اس سے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں چاہیے۔ آپ سے بس اتنا کہنا تھا کہ میرا ایک دوست کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے گا۔ آپ اسے ویٹنگ روم میں بٹھانے کے بجائے سیدھا اوپر میرے کمرے میں بھیج دیجیے گا۔'' اس نے میڈم کو ہدایت دی۔

''او کے! ایز یو وش۔ میں تو تم لوگوں کی خدمت کے لیے ہی یہ ہاسٹل کھول کر بیٹھی ہوں۔ میرے ہاں تمہیں کسی پریشانی یا پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' میڈم کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔ بشریٰ کا دل چاہا کہ وضاحت دے دے کہ اعجاز محض اس کا دوست ہے۔ وہ اسے اس کا کسٹمر سمجھنے کی غلطی نہ کرے لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ یہاں اسی ٹائپ کی خواتین رہتی تھیں۔ اگر وہ وضاحت دے بھی دیتی تو میڈم نازلی اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خاموشی سے ریسیور رکھ دیا اور اعصابی تناؤ سے بچنے کے لیے اعجاز کی آمد تک کچھ دیر آرام کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک گولی پانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتار لی۔ ذہنی تناؤ کم کرنے کے لیے اب وہ کبھی کبھار ایسی گولیوں کا استعمال کرنے لگی تھی۔ گولی نے جلد اثر دکھایا اور اس کے تنے ہوئے اعصاب نے ڈھیلا پڑ کے اسے سونے کی اجازت دے دی۔ وہ کتنی دیر

سوئی، اسے اندازہ نہیں ہوسکا۔ دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اسے آنکھ کھولنے پر مجبور کیا تو اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال اعجاز کا ہی آیا۔ یقیناً وہ طے شدہ وقت پر اس سے ملاقات کے لیے پہنچ چکا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے پہلے جماہی کو روکا اور پھر پکار کر دستک دینے والے کو تسلی کروائی کہ دروازہ کھولنے آرہی ہے۔

سونے کے دوران بکھر جانے والے سنہری بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی ہوئی وہ بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی تو اس کا انداز ڈھیلا ڈھالا تھا اور ذہن پوری طرح دوا کے اثر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ ایک ہاتھ ہنوز بالوں پر رکھتے ہوئے اس نے دروازے کی چٹخنی گرائی ہی تھی کہ دوسری طرف سے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا گیا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ بشریٰ کو ایک طرف ہٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا اور دروازہ آکر سیدھا اس کی پیشانی سے ٹکرایا۔ بے ساختہ ہی اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور بالوں پر سے ہاتھ ہٹ گیا۔ سنہری زلفیں اس کے چہرے پر یوں بکھریں کہ سارے منظر چھپ گئے اور وہ اندر آنے والے کو نہ دیکھ سکی۔ آنے والا آتے کے ساتھ ہی اس پر جھپٹا اور حرکت کرنے کا موقع دیے بغیر ہی اس طرح دبوچا کہ اس کا ایک ہاتھ بشریٰ کے منہ پر تھا تو دوسرے نے اس کے بالائی جسم کو کسی آکٹوپس کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس کی مضبوط گرفت میں جکڑی بشریٰ نے فطری طور پر ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی لیکن اس کا دماغ تیزی سے غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے دیر سے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ نووارد کے اس کے منہ پر جمے ہاتھ میں ایک نم رومال موجود ہے۔ ایسے نم رومال جب کسی لڑکی کے منہ اور ناک پر رکھ کر اسے ہوش وخرد سے بیگانہ کیا جاتا ہے تو پھر ہوش میں آنے کے بعد اس کی دنیا الٹ چکی ہوتی ہے۔ بشریٰ کو بھی کسی بزدل نے نہایت مکاری سے اس کی متاعِ عزیز سے محروم کردیا۔

وہ دوبارہ ہوش میں آئی تو ہاسٹل کے بجائے ہاسپٹل کے کمرے میں تھی۔ اس کے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور جسم پر جابجا میڈیکل بینڈیج چپکی ہوئی تھی۔ وہ ایسی نقاہت اور تکلیف محسوس کررہی تھی جیسے اس کے جسم پر سے کوئی بھاری گاڑی گزار دی گئی ہو۔ ہوش میں آتے ہی اس نے کینولا میں کوئی دوا انجیکٹ کرتی ہوئی نرس کو دیکھا اور لاشعوری طور پر اسے اپنا دشمن سمجھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ نقاہت نے اسے ہاتھ کو پوری قوت سے حرکت نہیں کرنے دی تھی اس لیے نرس کے منہ پر اوچھا ہی وار پڑ سکا تھا، پھر بھی انہماک سے اپنا کام انجام دیتی نرس بری طرح اچھل پڑی اور بوکھلا کر ایک زوردار چیخ ماری۔ جواب میں بشریٰ کے منہ سے بھی بے تحاشا اور لگاتار چیخیں بلند ہونے لگیں۔ چیخنے کے ساتھ وہ کچھ بول بھی رہی تھی لیکن آواز بری طرح پھٹ جانے کے باعث اس کی کوئی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

چیخوں کی آواز سن کر جو پہلا شخص کمرے میں داخل ہوا، وہ اعجاز تھا۔ اعجاز نے تیزی سے آگے بڑھ کر بشریٰ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا اور نرمی اور پیار سے اسے پچکارتا ہوا ریلیکس ہونے کی درخواست کرنے لگا، لیکن بشریٰ پر جیسے کوئی جنون طاری ہوگیا تھا۔ اس نے اعجاز کی بات پر ذرا کان نہ دھرے اور مسلسل چیختی رہی۔ اعجاز کے پیچھے اندر داخل ہونے والے ڈاکٹر نے اسے اشارہ کیا کہ وہ بشریٰ کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ ابتدائی طور پر خوف کا شکار ہوجانے والی نرس بھی اب اپنے حواس میں آچکی تھی اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے تیار تھی۔ اس نے جلدی سے ایک انجکشن تیار کرکے ڈاکٹر کے حوالے کیا اور قابو سے باہر ہوتی بشریٰ کو سنبھالنے میں اعجاز کا ساتھ دینے لگی۔ ڈاکٹر نے پھرتی سے انجکشن کو کینولا میں انجیکٹ کردیا۔ دھیرے دھیرے بشریٰ ڈھیلی پڑگئی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اعجاز نے نرمی سے اسے دوبارہ تکیے پر لٹا دیا اور ایک کرب بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا لیکن اس کے ہونٹ اب بھی سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور بار بار کھلتی بند ہوتی مٹھیاں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ سخت طیش کی کیفیت میں ہے۔

''ریلیکس اعجاز صاحب! اس قسم کے کیسز میں وکٹم کی عموماً یہی بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب کنڈیشن ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو بہت احتیاط اور تدبر سے زندگی کی طرف واپس لانا پڑتا ہے۔ مس بشریٰ ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہیں اور انہوں نے گاہے ارعاصم صاحب جیسی بے باک اور باشعور ہستی کے زیرِ سایہ تربیت پائی ہے۔ سو آئی ہوپ کہ جلد وہ اس ٹراما سے نکل کر حالات کو فیس کرنے کے لائق ہوجائیں گی۔'' اس کے ساتھ چلتے ڈاکٹر نے اس کے اعصابی تناؤ کو محسوس کرلیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا۔ یہ ڈاکٹر، اعجاز کا ایک مدح تھا جو اس کا پروگرام بہت شوق سے دیکھتا تھا اور باقاعدگی سے اپنی رائے بھی دیتا تھا۔ بقول اس کے ینگ جنریشن میں اس نے اعجاز جیسا پوٹینشل کسی اور صحافی یا اینکر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اعجاز کے

بے لاگ تبصروں اور تحقیق و ذمے داری کے ساتھ ناظرین سے کسی خبر کو ڈسکس کرنے کی عادت کا شیدائی تھا، اس لیے عمر میں اعجاز سے بڑا ہونے کے باوجود اس سے بہت عزت و احترام سے پیش آرہا تھا۔

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب! آپ نے اس مشکل وقت میں میرا بڑا ساتھ دیا۔ میں کہیں اور بشریٰ کو لے کر جاتا تو خبر لیک ہوجاتی اور جانے اسے مزید کتنی ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔ انفیکٹ میں اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر اس معاملے کو پبلک نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس حادثے کو کس طرح لیتی ہے اور اس کا کیا ری ایکشن ہونا چاہیے، میں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر سے ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اس سے اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر پہلے تو پل بھر کے لیے چپ ہوگیا اور پھر گلا کھنکھارتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''ایکچوئلی بات یہ ہے اعجاز صاحب کہ میں ایک قانون پسند شہری ہوں اور اس بات کا شدت سے حامی ہوں کہ جو بات قانون کے دائرۂ کار میں آتی ہو، اس سے قانون کے رکھوالوں کو ضرور آگاہ کیا جائے۔ آپ کی وجہ سے میں نے آپ کی پیشنٹ کو فوری طور پر ایڈمٹ کرکے انہیں ٹریٹمنٹ دینا شروع کردی تھی اور یہ شرط نہیں رکھی تھی کہ پہلے پولیس کو اس معاملے سے آگاہ کیا جائے لیکن میرا اسٹاف میرے اصولوں کو جانتا ہے۔ ہمارے اسپتال کی طرف سے پولیس کو انفارم کردیا گیا تھا اور میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ پولیس کے دو اہلکار واقعے کی تفتیش کے لیے یہاں آچکے ہیں۔ فی الحال پیشنٹ تو اس کنڈیشن میں نہیں ہے کہ کوئی بیان دے سکے، نہ ہی میں پیشنٹ کی حالت اطمینان بخش ہونے سے قبل پولیس کو بیان لینے کی اجازت دوں گا لیکن ابتدائی کارروائی کے لیے وہ آپ کا بیان ضرور لینا چاہیں گے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس واقعے کی خبر میڈیا پر نہ آئے تو اس سلسلے میں پولیس والوں سے بات کرسکتے ہیں۔ اپنے اسپتال کی طرف سے میں آپ کو شیورٹی دے سکتا ہوں کہ یہاں سے کوئی خبر باہر نہیں نکلے گی اور مس بشریٰ اپنے مکمل علاج تک یہاں پورے سکون اور اطمینان سے رہ سکیں گی۔''

''اوکے تو پھر چلیں، میں پولیس والوں سے مل لیتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ میری بات سمجھ سکیں۔'' ڈاکٹر کی طویل وضاحت سن کر اعجاز نے ایک گہری سانس خارج کی اور پولیس والوں سے ملاقات کے لیے ہامی بھرلی۔

''نہیں میں اپنے آفس میں بلوالیتا ہوں۔ وہاں آپ پرائیویسی میں ان سے سکون سے بات کرلیجیے گا۔'' ڈاکٹر نے تجویز پیش کی جو ظاہر ہے اعجاز کو قبول کرنی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ پولیس والوں کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چھوٹے رینک کے اور کم تجربہ کار بندے معلوم ہوتے تھے لیکن اتنا بہرحال انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ کوئی ہائی پروفائل کیس ہے جس میں ان کا واسطہ عام عوام سے نہیں پڑا ہے اس لیے گردن میں وہ کلف اور لہجے میں وہ درشتی غائب تھی جسے عوام سے گفتگو کے لیے پولیس والے لازم سمجھتے تھے۔

''ابتدائی معلومات تو ہم حاصل کرچکے ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ زیادتی کا نشانہ بننے والی لڑکی مشہور مرحوم صحافی گلزار عاصم کی بیٹی ہے۔ گلزار عاصم اور ان کی اہلیہ کی اموات جن حالات میں ہوئیں، اس کے بعد ان کی بیٹی کے ساتھ ہونے والے حادثے کو عام نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ فی الحال مریضہ خود بیان نہیں دے سکتی اس لیے ہم آپ سے اس واقعے کے بارے میں معلومات حاصل کرکے اپنی کارروائی کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے جو اے ایس آئی تھا، مہذب انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے بہت زیادہ نہیں ہے۔ مس بشریٰ گلزار میری یونیورسٹی فیلو رہی ہیں۔ انہیں مجھ سے کوئی مشورہ کرنا تھا اس لیے ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہم آج شام مس بشریٰ کے ہاسٹل میں ملاقات کریں گے۔ اتفاق سے شام کے وقت میں کچھ کاموں میں پھنس گیا اور میں نے بشریٰ کو ٹیکسٹ کردیا کہ میں رات آٹھ بجے تک اس سے ملاقات کے لیے پہنچوں گا۔ تبدیل شدہ پروگرام کے مطابق جب میں وہاں پہنچا تو ہاسٹل کی مالکہ میڈم نازلی نے انٹرکام کے ذریعے بشریٰ کو اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن جب کئی بار کی کوشش کے بعد بھی بشریٰ نے کوئی رسپانس نہیں دیا تو میڈم نے ایک ملازمہ کو اس کے کمرے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں ملازمہ کی چیخیں سنائی دیں۔ میں اور میڈم نازلی دونوں گھبرا کر بشریٰ کے کمرے کی طرف بھاگے اور وہاں ہم نے جو منظر دیکھا، اس نے ہمیں دہلا کر رکھ دیا۔ بشریٰ کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس وقت میں اسے ہاسپٹل لانے کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ میڈم اور اس کی ملازمہ کی مدد سے میں نے بشریٰ کو اپنی گاڑی میں منتقل کیا اور ان لوگوں کو کسی چیز کو نہ چھونے اور

بشریٰ کا کمرا بند کردینے کی ہدایت کر کے بشریٰ کو اسپتال لے آیا۔ ہاں ایک بات اور..... جب میں بشریٰ کو اسپتال لا رہا تھا تو میڈم نازلی نے مجھے بتایا تھا کہ شام کے وقت کوئی شخص بشریٰ سے ملنے آیا تھا۔ بشریٰ نے میڈم کو ہدایت کر رکھی تھی کہ شام کے وقت اس سے ملنے جو شخص آئے اسے اوپر اس کے کمرے میں بھیج دیا جائے، سو میڈم نے ایسا ہی کیا۔ وہ شخص کون تھا اور باقی کی تفصیلات تو بشریٰ ہی ہوش میں آنے کے بعد ہمیں بتا سکتی ہے۔ ابتدائی میڈیکل رپورٹ کے مطابق بشریٰ نے اعصاب کو سکون دینے والی ایک میڈیسن لی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ بھی اسے کوئی بے ہوشی کی دوا سونگھائی گئی تھی۔ بشریٰ کی باڈی سے ڈی این اے کے نمونے بھی ڈاکٹر صاحب نے اٹھا کر محفوظ کر لیے ہیں۔ اب باقی آپ پر ہے کہ آپ اس کیس کو کیسے آگے چلاتے ہیں۔ میری فی الحال آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اس خبر کو میڈیا پر نہ جانے دیں اور مس بشریٰ کے بیان کا انتظار کریں۔'' اعجاز نے اس کے سوال جواب کے سلسلے سے بچنے کے لیے خود ہی تفصیل سے ہر بات بتا دی، پھر بھی اس نے اس سے چند سوال کیے اور ڈاکٹر سے بھی کچھ معلومات حاصل کیں۔ اعجاز نے اس دوران ایک اہم کام یہ کیا کہ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے رابطہ کر کے آنے والے پولیس والوں کو یہ احکامات دلوا دیے کہ فی الحال اس کیس کو پبلک کے سامنے نہ لایا جائے اور باقی کی کارروائی خاموشی اور مستعدی سے انجام دی جائے۔ اوپر سے ملنے والے ان احکامات کے بعد پولیس والے پوری طرح تعاون کے لیے آمادہ نظر آنے لگے اور بہت مؤدب انداز میں اعجاز اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

ستاروں کی حسین دنیا کے جادوئی سفر سے لوٹنے کے بعد وہ اجنبی نظروں سے اس مستطیل کمرے کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک نسوانی آواز اسے واپس کھینچ لائی تھی لیکن کمرے میں اس پکارنے والی کا کوئی نام و نشان موجود نہیں تھا۔

''پریشان مت ہو معاذ! بے شک تم مجھے نہیں دیکھ سکتے ہو لیکن میں تمہارے بہت قریب ہوں اور تمہیں اچھی طرح دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تمہاری حالت دیکھ کر شدید افسوس ہو رہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے بے وقوف اور جذباتی انسان ہو گے کہ چند سوالوں کے جواب دینے کے بجائے خود کو اس حال تک پہنچا لو گے۔'' وہ یوں بے تکلفی سے معاذ سے مخاطب تھی جیسے ان کے درمیان برسوں کی جان پہچان ہو، لیکن معاذ اس آواز کو پہچاننے سے قاصر تھا۔ آواز کی نرمی کے باوجود وہ آواز اسے مہربان معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسے جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور یونہی بیٹھا خالی خالی نظروں سے دیواروں کو گھورتا رہا۔ اتنی بات وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کمرے میں کہیں کوئی کیمرا فکس ہے جس کی مدد سے اسے دیکھا جا رہا ہے اور بولنے والی کی آواز کسی خفیہ اسپیکر کے ذریعے اس تک پہنچ رہی ہے۔

''ایسی بھی کیا بے رخی معاذ کہ تم میری بات کا جواب دینا بھی پسند نہیں کر رہے، حالانکہ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میری وجہ سے تم ابھی تک اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ تم جانتے ہو نا کہ یزدانی اور عرفان اللہ تمہارے خون کے پیاسے ہیں اور اسی میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں کہ تم اس دنیا میں نہ رہو لیکن میں نے ان سے تمہاری زندگی کا سودا کر کے تمہارے زندہ رہنے کا انتظام کیا ہے۔ میں نے تمہاری زندگی خریدی ہے معاذ! اس لیے اب تم اور تمہاری یہ زندگی میری ملکیت ہے۔''

''میں نے تم سے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا، اس لیے مجھ پر احسان جتانے کی کوشش مت کرو۔ یہاں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ تم نے بھی اگر میری قیمت چکائی ہے تو اس کے پیچھے تمہاری اپنی کوئی غرض ہو گی۔'' اس کے اترا اترا کر احسان جتانے پر معاذ خاموش نہ رہ سکا اور نروٹھے پن سے اسے جواب دیا۔

''ہا..... تمہاری یہی تو ادا ہے جو تمہیں دوسروں سے مختلف بناتی ہے۔ بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا گیو اینڈ ٹیک کے اصول پر چل رہی ہے اور اگر میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے کچھ خرچ کیا ہے تو مجھے تم سے کچھ لینے کا بھی حق حاصل ہے۔''

''اس قید خانے میں بند، زخموں سے چور، بے بس آدمی سے تم کیا حاصل کر سکتی ہو؟ میں تو خود اپنے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہوں پھر بھلا تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟'' معاذ اس کی باتوں پر اظہارِ بیزاری کرتے ہوئے بولا۔

''تم ہمیشہ قید میں نہیں رہو گے۔ تم اس قید سے آزاد ہو سکتے ہو اور دنیا کی بے شمار نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو، بس اس کے لیے تمہیں صرف اتنا کرنا ہو گا کہ مجھ سے وفاداری کا عہد کر لو۔'' وہ اسے ترغیب دے رہی تھی۔

''یہ تو ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جانے کا معاملہ ہے۔'' معاذ کا ذہن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا

اور وہ اس سودے بازی کا مقصد سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک اجنبی خاتون کو میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ میں ایک عام سا انسان ہوں، جس کے پاس کوئی بھی ایسی غیر معمولی چیز موجود نہیں ہے جس کے لیے کوئی اس پر اس حد تک مہربان ہوجائے۔“

”تم خود غیر معمولی ہو معاذ! اور پلیز تم میرے اس دعوے کو جھٹلانا نہیں۔ میں انسانوں کی پرکھ بھی رکھتی ہوں اور تمہارے بارے میں بہت سی باتوں کا مجھے علم بھی ہے، اس لیے مجھے اپنے دعوے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے اپنی پرکھ پر اتنا بھروسا ہے کہ جب تمہارے گھر والے اور قریبی دوست بھی تمہاری زندگی کی طرف سے شک وشبے میں بتلا تھے تو مجھے یقین تھا کہ تم اس دنیا میں کہیں زندہ سلامت موجود ہو اور دیکھو میرا یقین سچ ثابت ہوا۔“ وہ پتا نہیں کون تھی جسے معاذ اس کی آواز سے قطعی شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اپنی یادداشت پر بھروسا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے بھی اس آواز کو سنا ہوتا تو ضرور اسے پہچان لیتا لیکن وہ قطعی اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

”تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو؟“ اس بار معاذ نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھنے کے بجائے اس سے اس کی غرض جاننے کی کوشش کی۔

”کام بھی پتا چل جائے گا۔ پہلے تمہاری حالت تو بہتر ہوجائے۔ عرفان اللہ نے جو ایک وحشی درندہ پال رکھا ہے، وہ تم جیسوں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ بہرحال اب یہ عرفان اللہ کی ذمے داری ہے کہ وہ تمہارا علاج کروائے۔ علاج کے بعد میں تمہیں اپنے پاس شفٹ کروالوں گی اور یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ تم مجھے دھوکا نہیں دوگے، تمہیں تمہارا کام بھی بتادوں گی۔“ وہ یوں اس سے مخاطب تھی جیسے ہر بات پہلے سے طے کر چکی ہو اور اسے یقین ہو کہ سب کچھ ویسے ہی ہوگا، جیسا وہ چاہتی ہے۔

”تم کون ہو؟“ وہ سوال جو شاید سب سے پہلے کیا جانا چاہیے تھا، اب معاذ کے ہونٹوں سے پھسلا لیکن جواب میں دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

”ہیلو......کہاں ہو تم؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟“ معاذ نے بے چینی سے اسے پکارا لیکن اب بھی اسے خاموشی سے واسطہ پڑا۔ شاید وہ اپنی کہنے کے بعد جا چکی تھی اور اسے معاذ کے کسی سوال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ معاذ نے دو تین بار مزید اسے پکارنے کی کوشش کی

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
750 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

لیکن مسلسل ناکامی کے بعد ہار مان کر چپ ہوگیا۔ خاموش ہوکر لیٹے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے کا واحد دروازہ کھلا اور دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے اور دوسرے کے ہاتھ میں خطرناک گن نظر آرہی تھی۔ گن والے نے دروازہ بند کیا اور کمرے کے ایک گوشے میں اس زاویے سے کھڑا ہوگیا کہ معاذ پر پوری طرح نگاہ رکھ سکے۔ ٹرے والا البتہ معاذ کے قریب آگیا اور ٹرے زمین پر رکھ دی۔ معاذ نے دیکھا کہ ٹرے میں میڈیکل باکس، گرم پانی اور مرہم پٹی سے متعلق دوسرا سامان رکھا ہوا ہے۔

''میں تمہارے زخموں کے علاج کے لیے آیا ہوں۔ اگر تم نے تعاون کیا تو فائدے میں رہو گے ورنہ اپنی جان سے چلے جاؤ گے۔ بولو تم کیا چاہتے ہو؟'' ٹرے والا بظاہر نہتا نظر آرہا تھا لیکن معاذ کو یقین تھا کہ اس نے اپنے لباس میں ہتھیار چھپا رکھا ہے جسے وہ بوقتِ ضرورت فوراً نکال سکتا ہے۔ ادھر خود اس کا یہ حال تھا کہ زخم زخم جسم کو حرکت دینے میں بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ ایسے میں اگر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈالتا تو کامیابی کے بجائے موت سے ہمکنار ہونے کے زیادہ امکانات تھے، اس لیے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اس شخص کو اس کی بات سمجھ جانے کا عندیہ دیا اور یوں سر جھکا لیا جیسے مکمل طور پر اپنی ہار تسلیم کر چکا ہو۔ اس کے اس طرزِ عمل کے جواب میں وہ شخص حرکت میں آگیا اور بڑی مہارت سے اس کے زخموں کو صاف کرکے ان پر مرہم لگانے لگا۔ کچھ گہرے زخموں پر میڈیکل ٹیپ لگانے کے بعد اس نے زیادہ تر زخموں کو یونہی کھلا چھوڑ دیا اور بتایا کہ کھلا رکھنے سے یہ زخم زیادہ جلدی ٹھیک ہوجائیں گے۔ مرہم پٹی کے کام سے فارغ ہوکر وہ ٹرے سمیت کمرے سے باہر چلا گیا لیکن مسلح شخص ہنوز اسی حالت میں اس پر گن تانے اپنی جگہ موجود رہا۔ چند منٹ کے وقفے کے بعد باہر جانے والا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور ٹرے موجود تھی جو سائز میں نسبتاً چھوٹی تھی۔

''اسے کھالو۔'' ٹرے معاذ کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے اسے حکم دیا۔ ٹرے میں ایک درمیانے سائز کے پیالے میں کوئی سوپ نما شے موجود تھی جس میں بوٹیوں اور سبزیوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ خالی پیٹ، نقاہت زدہ معاذ کے نتھنوں سے اشتہا انگیز خوشبو ٹکرائی تو وہ اپنے ہاتھوں کو نہ روک سکا اور چمچے کی مدد سے اس سوپ نما ڈش کو کھانے لگا۔ کھانے میں بھی وہ ڈش خوش ذائقہ تھی۔ معاذ منٹوں میں پورا پیالا خالی کرگیا لیکن ابھی بھوک باقی تھی۔

''فی الحال تمہارے لیے اتنی غذا کافی ہے۔ تم یہ دوائیں کھاؤ اور سوجاؤ۔ صبح تک تمہاری حالت کافی بہتر ہوجائے گی پھر میں تمہارے لیے بھرپور ناشتا لے کر آؤں گا۔'' اس شخص نے معاذ کی کیفیت سے بھانپ لیا کہ اسے مزید غذا کی طلب ہے اس لیے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولا اور سوپ کے پیالے کے ساتھ ہی رکھی ہوئی گولیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان گولیوں میں زخم خشک کرنے والے اینٹی بائیوٹک کیپسول بھی شامل تھے۔ معاذ نے پانی کی مدد سے وہ گولیاں حلق سے نیچے اتار لیں تو وہ شخص ٹرے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اس کا گن بردار ساتھی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ معاذ کچھ دیر اپنی جگہ چپ چاپ لیٹا اس کا پلٹ پر غور کرتا رہا، پھر اسے نیند آنے لگی تو ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک کر سونے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا دیر میں ہی اسے نیند آگئی۔ سوتے ہوئے ڈھائی تین گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک عجیب سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا اور وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اسے نیند میں ایسا لگا تھا کہ کوئی اس پر سنگ باری کررہا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تھا کہ اس کے شانے پر ایک اور پتھر آکر لگا۔ اس بار اس نے سمت کا تعین کرلیا اور سر اٹھا کر اس چھوٹے سے روشن دان کی طرف دیکھا جو اس قید خانے میں باہر کی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ کمرے میں جلتی مدھم روشنی روشن دان تک پہنچنے سے قاصر تھی اور اسے وہاں صرف ایک سیاہ ہیولا ہی نظر آرہا تھا۔

''کیا قیامت کے بوریے سمیٹ کررہے تھے۔ ذرا ہوش میں آجاؤ۔ میں مین سوئچ آف کررہا ہوں، پھر تمہیں یہاں سے نکالنے اندر آؤں گا۔ تم تیار رہو۔'' روشن دان سے جھانکتے شخص نے سرگوشی نما آواز میں اس سے کہا اور غائب ہوگیا۔ معاذ حیران تھا کہ یہ شخص یہاں پر کیسے آگیا؟ لیکن اس سوال کے جواب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکالنے کی بات کررہا تھا۔ معاذ کے اندر یکا یک ایک نیا جوش اور جذبہ پیدا ہوگیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ مزید تیاری اسے کیا کرنی تھی۔ اس کے پاس تو لباس بھی موجود نہیں تھا اور وہ جسم پر موجود واحد جانگیے میں ہی وہاں سے نکلنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی کمرے میں جلتی واحد روشنی بھی بند ہوگئی اور اسے باہر سے مدھم آوازیں سنائی

دینے لگیں۔ یہ اچانک بجلی غائب ہوجانے کا ردِعمل تھا۔ معاذ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے کی پیش رفت کا انتظار کرنے لگا۔

وہ اپنے طور پر دروازے کو کھولنے کی کوشش کر کے دیکھ چکا تھا لیکن دروازہ مقفل تھا اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی تو پوری طرح چوکنا ہوگیا۔

''باہر آجاؤ دوست!'' ایک لمحے کے بعد ہی دروازہ کھلا اور کسی نے اسے سرگوشی میں پکارا۔ وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ آنے والے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کو دوبارہ بند کر کے ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس نے شاید پیروں میں ربر سول کے جوتے پہن رکھے تھے جو اس کے بھاگنے سے بالکل بھی آواز پیدا نہیں ہورہی تھی۔ معاذ تو تھا ہی ننگے پیر، اس لیے اس کے قدم بھی بے آواز تھے لیکن زخموں کی وجہ سے وہ بھاگنے میں مشکل محسوس کررہا تھا۔ آنے والے نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے نہ تھام رکھا ہوتا اور آزادی کی شدید خواہش اس کے اندر نہ جاگ رہی ہوتی تو شاید یوں بھاگنا ممکن بھی نہ ہوتا۔ بھاگتے ہوئے اسے کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ یقیناً عرفان اللہ کے نمک خوار تھے جو پہلے اچانک بجلی بند ہونے کی وجہ سے الجھن میں مبتلا ہوئے تھے اور اب اس بات پر جھنجلا رہے تھے کہ جنریٹر کیوں نہیں آن ہورہا۔ ان میں سے کچھ نے اپنے موبائلوں وغیرہ کی ٹارچیں بھی روشن کرلی تھیں لیکن معاذ اور اس کا ہمدرد ان کی روشنی کے دائرے میں آنے سے محفوظ رہے تھے۔ یوں بھی وہ بیرونی راستے کی طرف جانے کے بجائے بالائی منزل پر جانے والے زینے کی طرف جارہے تھے۔ اوپر چھت پر پہنچ کر اس کے مددگار نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''بائیں طرف کی کوٹھی کی چھت پر کودنا ہے۔'' اور معاذ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کود بھی گیا۔ معاذ کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن زخموں کی وجہ سے کودنے کے نتیجے میں اسے تکلیف محسوس ہوئی۔

''رکنا نہیں ہے۔ یہاں سے نیچے جاکر ہم گاڑی میں باہر نکلیں گے۔'' اس شخص نے ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس وقت ہر جگہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ پورے علاقے کی بجلی غائب ہے۔ معاذ تاروں کی روشنی میں اپنے ہمدرد کا صرف ہیولا ہی دیکھ پارہا تھا لیکن اسے شناخت بہرحال کرچکا تھا۔ اس بار بھی اس نے خاموشی سے اس ہمدرد کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا نیچے پہنچا۔ کوٹھی کے پورٹیکو میں گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے معاذ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوڑ کر گیٹ تک گیا۔ گیٹ کے دونوں پٹ وا کرنے کے بعد وہ دوڑتا ہوا واپس گاڑی تک آیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ معاذ نے دیکھ لیا کہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے اس نے چابی کے استعمال کے بجائے اپنی کاریگری سے کام لیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تیر کی طرح کھلے گیٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔ گاڑی کی رفتار بہت زیادہ تھی اور انہوں نے بہت جلد اس علاقے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، جہاں سے فرار ہوئے تھے۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' آخر کار معاذ نے اس سے سوال کر ڈالا۔

''آپ بتائیں کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے کسی جگہ کا نام لینے کے بجائے الٹا معاذ سے استفسار کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے شہر میں تھا۔ یہاں سے اس کا گھر بہت دور نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا اس کا اپنے گھر جانا مناسب ہوتا؟ اسے قید کرنے والے اس کے گھر سے ناواقف تو نہیں تھے۔ اس کے فرار کا علم ہوتے ہی شاید وہ سب سے پہلے اس کے گھر پر دھاوا بولتے۔ گھر کے علاوہ جو دوسری جگہ اس کے ذہن میں آئی، وہ پولیس اسٹیشن تھی۔ وہ وہاں جاکر دہائی دے سکتا تھا اور جو خود پر گزری، اسے بتاسکتا تھا لیکن ایسی دنیا میں جہاں طاقت اور دولت کی حکمرانی تھی، اس جیسے عام شہری کو تحفظ اور انصاف دلوانے کے لیے پولیس کے محکمے میں کتنے لوگ بیٹھے تھے۔ ذہن میں آتے یہ خیالات اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ آزاد ہوجانے کے باوجود مکمل طور پر آزاد نہیں ہے اور اس احساس کی وجہ سے وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

''فی الحال میں آپ کو اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے چلتا ہوں۔ رات بہت ہوگئی ہے، آپ وہاں کچھ دیر آرام کر کے صبح اطمینان سے فیصلہ کیجیے گا کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔'' اس کی مسلسل خاموشی نے اس کے ہمدرد کو بتادیا کہ وہ کشمکش کا شکار ہے اس لیے خود ہی فیصلہ سنادیا۔ معاذ اس کے فیصلے سے اختلاف نہ کرسکا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ ایک ایسی بلڈنگ کے احاطے میں موجود تھے جس میں بے شمار برسوں پرانے چھوٹے بڑے فلیٹس موجود تھے۔ بڑے سے احاطے میں صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی پورے احاطے کو روشن کرنے میں بری طرح ناکام تھی، بس

ہیولوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں کئی موٹر سائیکلیں اور چند کاریں پارک ہیں۔ معاذ جس نامناسب حلیے میں تھا، اسے احاطے کی ناکافی روشنی اپنے حق میں مناسب معلوم ہوئی اور وہ اپنے ہمدرد کی راہنمائی میں چلتا ہوا دوسرے بلاک کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر احاطے سے بھی کم روشنی تھی اور بصارت سے زیادہ اندازے سے کام لے کر ان سیڑھیوں کو طے کرنا پڑ رہا تھا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر سیڑھیاں چڑھنے کا عمل رک سکا۔ زخم زخم وجود کے ساتھ اتنی سیڑھیاں چڑھنا معمولی بات نہیں تھی لیکن معاذ اپنی قوتِ ارادی کے سہارے چڑھ ہی گیا۔ اس کے محسن نے اپنی جیب سے چابی نکال کر ایک فلیٹ کا تالا کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ اندر پہنچ کر جیسے ہی روشنی ہوئی، معاذ لاؤنج میں رکھے ایک صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔

''پانی پی لیں۔'' ایک منٹ بعد ہی اس نے معاذ کو پکار کر اس سے کہا تو اس نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس جھپٹ لیا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ خالی کر گیا۔ اپنی خراب جسمانی حالت کے ساتھ اس نے جتنی محنت کی تھی، اس نے اس کی ساری طاقت نچوڑ ڈالی تھی اور اب وہ بری طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کو پانی کا گلاس پیش کرنے والے نے اسے تاسف سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے خاموشی سے مڑ گیا۔ دوبارہ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ہلدی ملے نیم گرم دودھ کا گلاس تھا۔

''یہ دودھ پی لیں۔ آپ کی طبیعت تھوڑی بہتر ہوجائے گی۔'' اس کے دل میں پیدا ہونے والی ہمدردی اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

''کیوں کر رہے ہو تم میرے لیے اتنی تکلیف؟''

معاذ نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر بوجھل لہجے میں اس سے دریافت کرنے لگا۔

''انسانی ہمدردی کے ناتے۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور معاذ کو مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولا۔

''رات کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ بہتر ہے آپ کچھ دیر سو جائیں۔ مجھے ابھی اس کار سے نجات حاصل کرنی ہے، جس میں ہم یہاں تک آئے ہیں۔ باتیں ہم صبح آرام سے کر سکتے ہیں۔'' معاذ کو اس کی بات ماننا پڑی کہ اس کی طبیعت کا بوجھل پن بڑھتا جا رہا تھا اور پلکیں نیند کے دباؤ کی وجہ سے خود بہ خود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہ خاصا آرام دہ تھا چنانچہ اسی پر لڑھک گیا اور لمحوں میں خراٹے لینے لگا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا اور اپنی طبیعت کی بشاشت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے اچھی خاصی نیند لے لی ہے۔ طبیعت کی بہتری کے ساتھ ہی اسے بیک وقت بھوک اور مثانے پر دباؤ کا احساس بھی ستا رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ باتھ روم کی تلاش میں کھڑا ہوتا، لاؤنج کے ایک کونے پر موجود دروازہ کھلا اور اس سے وہ نکھرا نکھرا سا برآمد ہوا۔

''آپ اٹھ گئے۔ ایسا کریں جلدی سے فریش ہوجائیں۔ اتنے میں، میں آپ کے اور اپنے لیے ناشتا بناتا ہوں۔'' معاذ کو جاگتے دیکھ کر اس نے اس کی طرف ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھالی اور ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ ایک دوسرے کے برسوں کے شناسا ہوں۔ معاذ کے پاس اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چوائس نہیں تھی، چنانچہ خاموشی سے اٹھ کر اس اٹیچڈ باتھ میں داخل ہوگیا جہاں سے وہ شخص برآمد ہوا تھا۔ غسل کرنے سے اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑا تھا لیکن ساتھ ہی زخموں کی فکر ہوگئی تھی کہ کہیں پانی کی وجہ سے خراب نہ ہوجائیں۔ دوسرا مسئلہ لباس کا تھا۔ نہاتو وہ لیا تھا لیکن اس کے پاس پہننے کے لیے لباس نہیں تھا۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ دروازے پر دستک دے کر اسے ایک دوسرا جانگیا تھما دیا گیا۔ وہ جانگیا پہن کر باہر آیا تو وہ اسی دوستانہ انداز میں اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی لیکن پہلے آپ کے زخموں کی ڈریسنگ ضروری ہے۔ یہ کام ہوجائے تو ہم اطمینان سے ناشتا کریں گے۔'' اس نے معاذ سے کہا اور اسے صوفے پر لیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود حرکت میں آگیا۔ مرہم پٹی سے متعلق سارا ضروری سامان اس کے پاس موجود تھا اور وہ بڑی مہارت سے معاذ کے ہر زخم کی ڈریسنگ کر رہا تھا۔

''یہ کام تو ہوگیا۔ اب ناشتا کرتے ہیں، پھر میں آپ کو دوائیں دوں گا۔'' اپنے کام سے فارغ ہوکر اس نے سارا سامان سمیٹا اور ہاتھ دھو کر ناشتا صوفے کے ساتھ رکھی میز پر سجانے لگا۔ ہاٹ پاٹ میں رکھے گرم پراٹھے، مہارت سے تیار کردہ آملیٹ اور چائے کی بھری کیتلی پر مشتمل ناشتا معاذ کو اپنے گھر کی یاد دلا گیا۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے اسے اپنے پیاروں کی صورت دیکھے اور اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ناشتا کیے۔

''ایسا ناشتا صرف مائیں بناتی ہیں یا مجھ جیسے باہمت

جو ماں کے بغیر زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔'' معاذ کو رغبت سے کھاتا دیکھ کر اس نے مسکرا کر خود ہی اپنی تعریف کی۔ معاذ جواب میں خاموش رہا۔ وہ جاگنے کے بعد سے مسلسل خاموش ہی تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ یہ بندہ خود اسے کچھ بتادے لیکن بندے کے پاس بھی جیسے اس کی خدمت گاری کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے معاذ کو چند گولیاں کھانے کے لیے دیں اور پھر اپنے اور اس کے لیے مزید ایک ایک کپ چائے نکال کر اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سو اب ہم آپس میں بات کرتے ہیں اور میں آپ کو آپ کے ذہن میں موجود سارے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے اپنا پروگرام بتایئے گا۔ میں دیکھوں گا کہ میں کس حد تک آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔'' حسبِ توقع اس نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کردیا اور ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''نام سے تو آپ میرے واقف ہی ہیں کہ مجھے وقاص کہتے ہیں لیکن دوستوں اور جاننے والوں کے حلقے میں، میں عام طور پر وکی کہلاتا ہوں۔ میرے قریبی لوگوں کا خیال ہے کہ میں ایک سر پھرا لڑکا ہوں جو کبھی بھی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس آسیب زدہ سی حویلی کے باغ سے ناریل توڑ کر لے جانے کی عادت کو بھی آپ میری اس فطرت کا نتیجہ ہی سمجھیے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے مجھے اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے اور ہنوز میں اپنی موٹر سائیکل سے محروم ہوں۔ خیر! موٹر سائیکل تو واپس آجائے گی لیکن پہلے میں آپ کو آپ تک پہنچنے کی داستان سنادوں۔ میں اپنی پھرتی کی وجہ سے آپ کو جُل دے کر نکلنے میں تو کامیاب ہوگیا تھا لیکن مسئلہ سواری کا تھا، میں اتنا لمبا راستہ پیدل چل کر آبادی تک پہنچنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہیں ایک درخت پر چڑھ کر چھپ گیا اور مناسب موقعے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے ان لوگوں کے ہاتھوں پکڑے جانے کا منظر دیکھا اور اپنی طبیعت کے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اصل مسئلہ جاننے کے چکر میں پڑ گیا۔ اب یہ الگ داستان ہے کہ میں کیسے آپ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہا اور ہر اس ٹھکانے کو دیکھ لیا جہاں انہوں نے آپ کو منتقل کیا۔ ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ میں ابتدا میں آپ کی شکل دیکھ کر چونک گیا تھا اور مجھے ایسا لگا تھا کہ میں آپ کو جانتا ہوں لیکن کیونکہ آپ کی شکل کافی

سنہرے اقوال

☆ انسان علم کو سیکھتا ہے جب کہ علم انسان کو سکھاتا ہے۔

☆ علم اور عمل کا رشتہ ایسا ہے جیسے جسم اور روح کا۔

☆ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں دیتا۔

☆ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔

☆ اولاد کی والدین سے محبت کا امتحان والدین کی بیماری، بڑھاپے اور اولاد کی شادی کے بعد ہوتا ہے۔

☆ کسی کے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا دراصل اپنے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا ہے۔

☆ اگر بیتے ہوئے وقت کے تاثرات سدا ذہن پر روز اول کی طرح ثبت رہیں تو دوست کبھی دشمن نہ بنتے اور دشمن کبھی دوست نہ بنتے۔

☆ دیکھنی والی نگاہ حسین ہے تو ہر چہرہ حسین نظر آتا ہے۔

☆ انسان کے دو مشیر اس کے دل اور دماغ ہیں۔

☆ دوست کی محبت کی پرکھ اس کے غصے کے وقت ہوتی ہے۔

☆ ہر شہر پر گاؤں میں ایک نہ ایک فتنہ ضرور موجود ہوتا ہے۔

☆ گالی تو جاہلوں کی زبان ہے۔

☆ شیطان کے بعد انسان کا دوسرا بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔

☆ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی نفس کی سرکشی کی دلیل ہے۔

☆ جس کا کوئی نہ ہو اس کا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

مرسلہ: ریحان فاروق، اوکاڑہ

تبدیل ہوگئی ہے، تو میں فوری طور پر آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ بعد میں یاد آیا کہ آپ تو وہی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ معاذ ہیں جو کیمرتھر کے ٹرپ پر پراسرار طور پر غائب ہوگئے تھے اور آپ کے دوستوں نے کافی دنوں تک آپ کی بازیابی کے لیے مہم چلائی تھی۔ اس مہم کے دوران ہی آپ کی تصویریں میری نظروں میں آئی تھیں اور ذرا دیر سے ہی سہی، میں آپ کو پہچان گیا تھا۔ پہچاننے کے بعد میرے دماغ کا کیڑا کلبلایا اور میں نے خدائی فوجدار بن کر اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ اللہ نے مجھے کچھ صلاحیتیں دے رکھی ہیں اور میں چند ہنر جانتا ہوں اس لیے میرے لیے اس عمارت تک رسائی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی جہاں سے میں آپ کو فرار کرا لایا۔ اس کام میں، میرے ایک ساتھی نے بھی میری مدد کی تھی اور میری ہدایت پر اس پورے علاقے کی لائٹ اڑا دی گئی تھی۔ آپ کو قید میں رکھنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی آپ کو ان کی قید سے چھڑوانے کے لیے آسکتا ہے، اس لیے انہوں نے زیادہ مضبوط حفاظتی اقدامات نہیں کیے تھے۔ پڑوس کی کوٹھی میں رہنے والے ادھیڑ عمر جوڑے کو البتہ ذرا سی تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ مجھے انہیں بے ہوش کرنا پڑا تھا اور ان کی گاڑی بھی استعمال کی۔ گاڑی بہرحال انہیں مل جائے گی، بس ذرا پولیس والوں کے ہاتھوں خواری اٹھانی پڑے گی۔'' اس نے اختصار کے ساتھ معاذ کو اس کے آزاد کروانے کی داستان سنا ڈالی۔

معاذ خاموشی سے سنتا رہا اور حیرت سے وقاص عرف وکی کو دیکھتا رہا۔ اس بیس اکیس سال کے لڑکے سے اسے ایسی کارکردگی کی امید نہیں تھی اور یہ بات وہ بھی سمجھتا تھا کہ اسے جتنی سادہ داستان سنائی گئی ہے، بات اتنی سادہ نہیں رہی ہوگی۔ وقاص کو اسے آزاد کروانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنی پڑی ہوگی۔ بقول اس کے اس نے یہ کوشش اپنے دماغ کا کیڑا کلبلانے پر کی تھی لیکن اس بات کو ماننا آسان نہیں تھا کہ کوئی کسی اجنبی کے لیے اتنی زیادہ زحمت اٹھائے کہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے۔

''مان لیں کہ ابھی اس دنیا میں مجھ جیسے لوگ موجود ہیں جو بغیر غرض کے بھی کسی کے کام آسکتے ہیں۔'' اس نے معاذ کی بے یقینی بھانپ لی اور یقین دلانے والے انداز میں بولا۔

''اوکے! تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں لیکن اب..... اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دو۔ مجھے اپنے گھر والوں سے ملنا ہے اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے، اسے پبلک کے سامنے لانا ہے۔'' وہ مشکل حالات سے گزر کر آیا تھا اور بدترین جسمانی تشدد سہا تھا، اس لیے پوری طرح خود کو کمپوز نہیں کرسکا تھا اور اس لڑکے سے مشورہ مانگ رہا تھا جو عمر میں اس سے بھی چھوٹا تھا اور جسے وہ ڈھنگ سے جانتا بھی نہیں تھا۔

''مجھے ان باتوں کا اندازہ تھا اس لیے آپ کے سونے کے دوران میں نے تھوڑی سی کوشش کی تھی کچھ معلومات حاصل کرنے کی۔'' وقاص عرف وکی اس کی بات کے جواب میں بولا اور پھر کچھ دیر کے لیے ایسے انداز میں توقف کیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ آخر اس نے اپنی بات کہہ دینے کا فیصلہ کرڈالا اور بولا۔

''میری معلومات کے مطابق یہاں رہتے ہوئے آپ کی فیملی دباؤ کا شکار تھی اور آپ کے والد کو آپ کے سلسلے میں آواز اٹھانے پر دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے آپ کے کچھ عزیز اصرار کرکے آپ کی فیملی کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے ہیں اور آپ کا رہائشی مکان فی الحال خالی پڑا ہے۔ رہی پبلک تک بات پہنچانے کی بات تو اس کے لیے ہمیں ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ یہاں پولیس والوں سے لے کر صحافیوں تک کسی پر بھی مکمل بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ کچھ ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کرسکوں جو آپ کے معاملے کو دیانت داری سے اٹھاسکیں۔ اتنے عرصے تک آپ یہاں رہیں۔ اپنے کھانے پینے اور علاج پر توجہ دیں۔ میں نے اپنے طور پر آپ کو اچھی میڈیکل ایڈ دے دی ہے پھر بھی کوشش کروں گا کہ کسی پروفیشنل سے بھی اس سلسلے میں مشورہ ہوجائے۔''

معاذ کو حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایسی باتیں بھی کررہا تھا جو اس کی تسلی و تشفی کا سبب بن سکیں۔ معاذ کی تسلی ہوسکی یا نہیں، بہرحال اس نے خاموشی اختیار کرلی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور اس کے ساتھ اس کے سارے پیارے بھی اسی کشمکش سے گزر رہے تھے۔ صداقت شاہ کی ہستی طوفانوں کی زد میں تھی۔ ان کا اکلوتا جوان لختِ جگر اسپتال کے بستر پر لیٹا تھا تو خود ان کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہورہا تھا۔ انہیں رہ رہ کر اس کی آنکھوں کی وہ خفگی اور شکایت یاد آتی تھی جو ان کے تھپڑ مارنے پر پیدا ہوئی تھی۔ وہ ان کی بے اعتنائی پر ان

ے ناراض ہو کر قربان شاہ کی حویلی سے نکلا تھا اور چند گھنٹے بعد یہ اطلاع آئی تھی کہ وہ حویلی سے دور کھیتوں کے قریب شدید زخمی حالت میں بے ہوش پایا گیا ہے۔ ابتدائی طبی امداد دے کر اسے فوری طور پر گاؤں سے منتقل کر کے شہر کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اسپتال کے قابل ڈاکٹر جدید طبی سہولتوں کے سہارے اس کی روٹھتی سانسوں کو منانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے پیارے اس کے لیے رب کے حضور زندگی کی فریاد کرنے میں مصروف تھے۔

وہ جو بڑی اونچی شان والے تھے، چند گھنٹوں میں ایسی کڑی آزمائشوں سے گزر رہے تھے کہ اپنی جگہ ہل کر رہ گئے تھے۔ معظم شاہ اور سجل کا اغوا، آسیہ کی خودکشی کی کوشش اور عالم شاہ پر سنگین الزام، پھر عالم شاہ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ، کوئی بھی تو معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا مصیبتوں نے ان کے گرد مضبوط حصار باندھ دیا ہو اور انہیں اس حصار سے نکلنے کے لیے راستہ دینے کو تیار نہ ہوں۔ معظم شاہ اور سجل کی خیریت کی خوشخبری بھی ان حالات میں ماند پڑ چکی تھی۔ معظم شاہ فون پر اطلاع دینے کے بعد فوری طور پر گاؤں کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے بلکہ شہر میں ہی رک کر پہلے سجل کا طبی معائنہ کروایا تھا اور پھر دونوں اس کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے جہاں عالم شاہ کا قیام رہتا تھا۔ اسی کوٹھی میں معظم شاہ کو عالم شاہ سے متعلق خبر ملی تھی اور وہ سجل کو کچھ بھی بتائے بغیر خود اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اسپتال میں قربان شاہ، صداقت شاہ اور ان کے نمک خواروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ عالم شاہ کے لیے خون کا عطیہ دینے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی اور ہر ایک خواہش مند تھا کہ اس کا خون مالک کے اندر زندگی بن کر دوڑے۔ زندگی جو کسی کے اختیار میں نہیں اور جس کے لیے بے حد صاحبِ اختیار لوگوں کو بھی تڑپنا بلکنا پڑتا ہے۔

''آسیہ اب کہاں ہے؟'' انتظار گاہ میں باپ سے سرگوشیوں میں ساری داستان سننے والے معظم شاہ نے دھیمے لہجے میں ان سے دریافت کیا۔

''میرے حکم پر اسے پہلے ہی شہر بھجوا دیا گیا تھا۔ ویسے گاؤں کے ڈاکٹر نے تسلی کروائی تھی کہ اس کی چوٹیں زیادہ خطرناک نہیں ہیں اور ہاتھ اور پیر کے فریکچرز ٹھیک ہونے کے بعد وہ نارمل ہو جائے گی لیکن میں نے اس لیے اسے وہاں سے ہٹوا دیا تھا کہ اس نے عالم شاہ پر جو الزام لگایا تھا اس پر زیادہ بات نہ ہو سکے۔ منشی عبدالحق میرا نمک خوار ہے لیکن بیٹی کی عزت کے معاملے پر تو کوئی باپ بھی صبر نہ کام نہیں لے سکتا۔ وہ اور اس کا خاندان گاؤں میں رہتے تو عالم شاہ کے خلاف نفرت کی آگ مزید بھڑکتی۔ کچھ بھی سہی، عالم شاہ میرا بھانجا ہے اور مجھے اسے سپورٹ کرنا ہے۔'' قربان شاہ نے بیٹے کو تفصیلی جواب دیا۔

''مجھے اس واقعے پر حیرت ہے۔ عالم کو میں ایک جذباتی اور لاابالی انسان کے طور پر تو جانتا ہوں لیکن اس سے ایسی اخلاقی گراوٹ کی امید کم از کم مجھے نہیں تھی۔'' معظم شاہ نے اس واقعے پر اپنی رائے دی۔

''جوان خون ہے پٹ اور جوانی میں اچھوں اچھوں کے قدم بہک جاتے ہیں۔ اللہ اسے زندگی دے اور میری بہن کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے۔ بعد میں ہم اس مسئلے کو حل کر لیں گے۔'' قربان شاہ کے لہجے میں تھکن اور اداسی تھی۔

''آپ منشی عبدالحق سے رابطہ کر کے آسیہ کے بارے میں دریافت کریں۔ آپ کی خصوصی توجہ اس کا دل موم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی اور آپ کے احسانات کے بدلے وہ عالم شاہ کو معاف کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یہ ہمارے خاندان کی ساکھ ہی نہیں، پھپھا سائیں کی سیاسی ساکھ کا بھی معاملہ ہے۔'' معظم شاہ کے ماتھے پر فکرمندی کی لکیریں تھیں۔ ابھی وہ اپنے اور سجل کے اغوا کی گتھی کو ہی نہیں سلجھا سکا تھا کہ یہ نئی الجھن سامنے آ گئی تھی۔

آشیانۂ آزادی سے سجل کے ساتھ فرار ہونے کے بعد اس نے معاذ کی ہدایت کے مطابق کسی قریبی تھانے کے بجائے اپنے دوست ایس پی کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ مقامی تھانوں کی ملی بھگت کے بغیر کسی جگہ جرائم پیشہ افراد کا پنپنا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے سیدھا اپنے دوست کے پاس گیا تھا۔ اس کے دوست نے اس سے ساری بات سننے کے بعد خاطر خواہ کارروائی کا آغاز کر دیا تھا لیکن بہرحال خاصا وقت لگ گیا تھا اور جب پولیس پارٹی آشیانۂ آزادی پہنچی تھی تو انہیں وہاں کچھ نہیں ملا تھا۔ تھوڑی بہت شہادتیں ضرور تھیں جن سے یہ تو پتا چل رہا تھا کہ وہاں کچھ لوگ رہ رہے تھے لیکن کوئی ذی نفس یا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا جو ان لوگوں کی نشاندہی کر سکتا۔ معظم شاہ کو سب سے زیادہ فکر معاذ کی تھی۔ روشن آنکھوں والا وہ زخمی لڑکا ان کے بہت کام آیا تھا اور حقیقتاً وہ اسی کی وجہ سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے لیکن معاذ کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا یا نہیں۔ اس کے ایس پی دوست نے اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ یہ جاننے کی پوری کوشش کرے گا کہ وہاں کون لوگ رہ رہے تھے اور انہوں نے اس

کے اور اس کی بیوی کے اغوا برائے تاوان کا منصوبہ کیونکر بنایا تھا لیکن فی الحال وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے سجل کی زبانی یہ حیرت انگیز بات بھی سننے کو ملی تھی کہ اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ معظم شاہ سے علیحدگی اختیار کرکے وہیں رہ جائے تو معظم شاہ کو بغیر تاوان کے بھی رہا کیا جاسکتا ہے۔ یہ بہت عجیب وغریب بات تھی اور ڈاکوؤں کے طریقۂ کار کے بالکل خلاف تھی۔ ڈاکو اگر کبھی عورت کے چکر میں پڑ بھی جائیں تو سیدھے سیدھے مطلب برآری سے غرض رکھتے ہیں اور اتنا پیچیدہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ سجل وہاں ان کی دسترس میں تھی لیکن اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے بجائے اسے اس کی رضامندی سے وہاں روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ اس سوال کا جواب بھی تلاش نہیں کرپایا تھا اور اب ایک نئی الجھن کے ساتھ اپنے خاندان کے درمیان کھڑا اپنے باپ کو تجاویز دے رہا تھا۔

''منشی سے رابطہ کرنے کی تو میں خود کب سے کوشش کررہا ہوں لیکن اس کا فون بند جارہا ہے۔'' قربان شاہ نے پریشانی کے عالم میں اسے بتایا۔

''ہوسکتا ہے فون کی چارجنگ یا سگنلز وغیرہ کا مسئلہ ہو۔ پریشانی میں انسان ان چیزوں پر دھیان نہیں دے پاتا۔ آپ اس کا احوال لینے کے لیے کسی بندے کو بھجواتے۔'' معظم شاہ نے انہیں مشورہ دیا۔

''میں ایسا کرچکا ہوں پٹ! اور اصل پریشانی ہی یہ ہے کہ منشی کی دھی کو جس اسپتال میں داخل کروایا تھا، وہ وہاں نہیں ہے۔ اسپتال والوں نے بتایا ہے کہ وہ لوگ کسی دوسرے اسپتال جانے کا بول کر خود وہاں سے چلے گئے تھے۔ ادھر گوٹھ میں بھی منشی کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ اس کی زال اور پٹ دونوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔'' قربان شاہ نے پریشان کن لہجے میں اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

''یہ تو بہت عجیب بات ہے۔ منشی عبدالحق تو کبھی آپ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے کسی مخالف نے موقع کا فائدہ اٹھا کر منشی کو بہکا دیا ہو اور آنے والے چند گھنٹوں میں ہمیں کسی میڈیا ٹرائل کا سامنا کرنا پڑے۔ آج کل یہی ہورہا ہے۔ کسی کی ذرا سی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے تو مخالفین معاملے کو بڑھا چڑھا کر میڈیا پر لے آتے ہیں اور اگلے کی عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں۔'' معظم شاہ کو نئی پریشانی لاحق ہوئی۔

''ہمارا اتنا بڑا مخالف کوئی نہیں ہے۔'' قربان شاہ نے اس بات کو ٹالنا چاہا۔

''ڈائریکٹ نہ سہی لیکن پھپھا سائیں کی وجہ سے تو ہمارے ایسے مخالفین موجود ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آپ خود سیاست میں سرگرم نہیں ہیں لیکن آپ کی پوری سپورٹ پھپھا سائیں کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھپھا سائیں کا سب سے بڑا سیاسی حریف لطیف سومرو تو ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی طرح ان کا سر نیچا کرسکے۔'' معظم شاہ نے باپ کی مخالفت کی۔

''وہ الگ بات ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر بندہ اتنا ہی برا ہو، جتنا ہم اسے سمجھ رہے ہوں۔ لطیف سومرو بھی ان نازک حالات میں میرے بہت کام آیا ہے اور میری ایک پکار پر اس نے میری بڑی مدد کی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیسی مدد؟'' معظم شاہ چونکا۔

''تجھے سارے حالات معلوم ہیں پٹ! تو جانتا ہے کہ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اتنے کم وقت میں ایک دم اتنی بڑی رقم کا انتظام کرسکوں۔ اس بُرے وقت میں مجھے لطیف سومرو کی زمین والی پیشکش یاد آئی۔ میں نے پیغام بھیج کر اسے بلایا اور اس نے ہاتھوں ہاتھ وہ زمین خرید لی، وہ بھی اس قیمت پر جس کی پہلے اس نے آفر کی تھی، ورنہ وہ چاہتا تو میری مجبوری دیکھ کر موقع کا فائدہ اٹھاتا اور زمین کے کم دام لگانے کی کوشش کرتا۔'' قربان شاہ نے ساری بات بتاتے ہوئے ایک بار پھر لطیف سومرو کی تعریف کی۔ معظم شاہ سن کر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ زمین کی فروخت اس کے لیے بھی صدمے کا باعث تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ قربان شاہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''غم نہ کر پٹ! رقم تو میرے پاس محفوظ پڑی ہے۔ لطیف سومرو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اس کی رقم جلد واپس کردوں گا تو وہ مجھے زمین واپس کردے گا۔ یہاں سے نمٹ جائیں تو پھر دوسرے معاملات کو دیکھیں گے۔'' قربان شاہ بیٹے کو تسلیاں دے رہے تھے اور ادھر آئی سی یو کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑے صداقت شاہ کو سننا پڑ رہا تھا۔

''آپ کے پیشنٹ کی حالت بہت نازک ہے۔ ڈاکٹرز اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر طلعت کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ابتدائی شدید ردِعمل کے بعد بشریٰ کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی۔ اس نے چیخنا چلّانا اور اسٹاف پر حملے کرنا چھوڑ دیا تھا

اور چپ چاپ اپنے بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کے جسمانی زخم بھرنے شروع ہو گئے تھے۔ اس پر ظلم کا پہاڑ توڑنے والے نے بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ اس کے پورے جسم پر نوچنے، کاٹنے اور کسی تیز دھار آلے سے ہلکے کٹ لگائے جانے کے نشان موجود تھے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق وہ کوئی جنسی جنونی تھا جس نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ بشریٰ نے پولیس کو اپنا بیان دے دیا تھا۔ وہ نہیں بتا سکی تھی کہ اسے اس طرح نشانہ بنانے والا شخص کون تھا۔ اس نے تو اعجاز کے دھوکے میں کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور پھر فوراً ہی زیر کر لی گئی تھی۔ پولیس کی میڈم نازلی سے تفتیش بھی بے کار گئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس روز ہاسٹل کے استقبالیہ کمرے کی ٹیوب لائٹ خراب ہو گئی تھی اور وہاں ایک کم پاور کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں میڈم آنے والے کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکی تھی۔ یوں بھی اس وقت وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی اس لیے اس کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ بشریٰ اور میڈم کے بیانات کے بعد پولیس دیگر شواہد کی مدد سے اپنی کارروائی آگے بڑھا رہی تھی۔ اعجاز کی مداخلت کی وجہ سے ابھی تک کیس میڈیا پر نہیں آیا تھا۔ اسپتال کی طرف سے بھی مکمل تعاون کیا جا رہا تھا لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا کہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے اور اب بشریٰ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خاموش نہیں رہے گی۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے پولیس کی کارکردگی پر بھی مکمل بھروسا نہیں تھا چنانچہ اعجاز نے اس کے ساتھ مل کر ایک پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق وہ پہلے مرحلے میں بشریٰ کے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان پبلک کے سامنے لاتے، پھر پولیس اور انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے صحافی برادری اور طلبہ کی طرف سے احتجاج اور مظاہرے کیے جاتے۔ اعجاز کا دعویٰ تھا کہ وہ اس معاملے میں اتنی مضبوط کمپین چلائے گا کہ صدر اور وزیر اعظم خود اس کیس کا نوٹس لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بشریٰ جانتی تھی کہ وہ اس کو انصاف دلانے کے لیے انتہائی حد پر جائے گا کہ اس کے لیے بشریٰ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس کے دل میں بستی تھی اور اس کے درد کو وہ اسی طرح محسوس کرتا تھا، پھر بھی اندر کہیں یہ بات اسے مایوس کرتی تھی کہ اس طرح کے کیسز میں عورت کو کبھی انصاف ملتا نہیں دیکھا گیا۔ تو کیا وہ انصاف پا لے گی؟

اس کے برخلاف اعجاز بہت پُرعزم تھا اور اسے یقین دلاتا رہتا تھا کہ کسی کو انصاف ملا ہو یا نہ ملا ہو، بشریٰ کو وہ ضرور انصاف دلائے گا۔ اس سلسلے میں وہ دن رات کام کر رہا تھا اور جانے کون کون لوگ تھے جنہیں اپروچ کر کے اپنی مدد کے لیے راضی کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کافی کچھ کرنے کے بعد آج پرائم ٹائم میں وہ بشریٰ کو اپنے پروگرام میں پیش کرنے والا تھا۔ اس نے بشریٰ کو راضی کر لیا تھا کہ اس شو میں وہ ان باتوں کو بھی عیاں کرے گی جو اس نے پہلے چھپالی تھیں۔ اس نے بشریٰ کو کھل کر یزدانی اور عرفان اللہ کے خلاف بولنے پر رضامند کر لیا تھا اور اس بات پر بھی قائل کر لیا تھا کہ وہ عائشہ گلزار کے کیس میں کھل کر باذل کا نام لے گی۔ وہ بشریٰ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف خاموش اور تنہا انتقامی کارروائی کرنے کے مقابلے میں قانونی جنگ لڑ کر زیادہ کامیاب رہے گی۔ بشریٰ کے پاس اپنے مجرم کا نام نہیں تھا لیکن شک تو بہرحال یہی تھا کہ اس بار بھی دشمن وہی ہے جس نے اب تک اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچائے ہیں۔ اس شک کو اسی روز موصول ہونے والی ڈی این اے رپورٹ نے یقین میں بدل دیا۔ عائشہ گلزار اور بشریٰ کی باڈی پر ملنے والے ڈی این اے کے نمونے آپس میں میچ کر گئے تھے۔ یعنی ماں اور بیٹی دونوں کا مجرم ایک ہی تھا اور اب صرف اس مجرم کو قانون کی گرفت میں لانا تھا۔ پروگرام سے پہلے ہی باذل کی گرفتاری یقینی بنانے کے لیے اعجاز نے پولیس میں اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلانی شروع کر دی تھیں لیکن مخالف اس سے زیادہ چالاک اور رسائی والے تھے اور شام تک متعدد مقامات پر چھاپے مارنے کے باوجود باذل پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اعجاز اس سارے کھیل کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ پولیس میں کتنی کالی بھیڑیں ایسی ہیں جو یزدانی اور عرفان اللہ جیسے لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں۔ وہ بہت غصے اور جوش کے ساتھ پولیس کے اس کردار کو بھی عوام کے سامنے لانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا آج کا پورا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ پیپر ورک، ٹیلی فون کالز، سماجی و سیاسی شخصیات سے رابطے، جانے کیا کیا تھا جو وہ کر رہا تھا کہ شام پانچ بجے اسے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اطلاع دینے والے نے اسے بتایا کہ ملاقاتی کسی بہت اہم اور خفیہ معاملے میں اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اعجاز کے پاس ایسے ملاقاتی آتے رہتے تھے اس لیے اس نے اس وقت اس شخص کو ٹالنے کی ہدایت کر دی لیکن پھر ملاقاتی کی طرف سے ملنے والی ایک چٹ نے اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ چٹ پر لکھا تھا۔

''میں معاذ کیس کے سلسلے میں کچھ بہت اہم انکشافات کرنا چاہتا ہوں۔'' اعجاز کے لیے اس چٹ کو نظر انداز کردینا ممکن نہیں تھا۔ بشریٰ کے کیس میں اصل بنیاد ہی معاذ کیس تھا۔ بشریٰ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی اصل وجہ ہی معاذ سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ اس نے ملاقاتی کو فوراً اپنے دفتر میں بلوالیا۔ آنے والا ایک دبلا پتلا، باریش اور کم عمر نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

''میرا نام وقاص ہے اور میں صحافیوں کی ایک لمبی فہرست کی چھان بین کرنے کے بعد آپ تک پہنچا ہوں۔'' نوجوان نے اس سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''جب آپ اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد مجھ تک آئے ہیں تو جلدی سے بلا جھجک سب کچھ کہہ ڈالیں۔ میں آج بہت زیادہ بزی ہوں اور بہت اہم پروگرام کرنے والا ہوں۔'' اعجاز نے گہری نظروں سے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے اس سے دوٹوک بات کی۔

''میں آپ کو معاذ سے ملوا سکتا ہوں۔'' وقاص نے دھیمی آواز میں ایسی بات کہی جو اعجاز کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئی۔

''کیا کہا تم نے.....؟ تم مجھے معاذ سے ملوا سکتے ہو؟'' اس نے بے یقینی سے وقاص کی بات دہرائی۔

''ہاں! اس وقت وہ میرے مہمان ہیں اور آپ ان سے ان کے غیاب کی پوری داستان سن سکتے ہیں لیکن شرط راز داری اور سیکیورٹی کی ہے۔ معاذ کی زندگی سخت خطرے میں ہے اور کوئی بھی غیر محتاط قدم ان کے لیے بہت مہلک ثابت ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی بات لیک نہیں ہوگی لیکن تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ معاذ کہاں ہے؟ کیا وہ یہاں اسٹوڈیو آکر اپنا بیان ریکارڈ نہیں کرواسکتا؟ آج میں جس ایشو پر پروگرام کرنے جارہا ہوں، اس سے معاذ کا گہرا تعلق ہے۔'' اعجاز اس اطلاع پر بہت زیادہ پُرجوش ہوگیا تھا۔

''وہ اچھے خاصے زخمی ہیں اور میرے خیال میں انہیں کسی تکلیف میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ اسٹوڈیو آنے جانے کے چکر میں وہ کسی کی نظر میں آگئے تو اور زیادہ مسئلہ ہوجائے گا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس جگہ جاکر ان سے ملاقات کرلیں جہاں وہ موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' اعجاز نے اپنے چمڑے کا بیگ اپنی طرف کھسکایا اور اس میں اس طرح ضروری سامان رکھنے لگا جیسے فوری طور پر چل پڑنے کے لیے تیار ہو۔

''ایک منٹ صبر کریں اعجاز صاحب! میں یہاں سے آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ آپ کو خود اس جگہ تک جانا ہوگا۔ میں دور رہ کر نظر رکھوں گا کہ کہیں آپ کے پیچھے لگ کر کوئی شخص وہاں نہ پہنچ جائے۔'' وقاص نے اسے ٹوک کر اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''اوکے! ایز یو وش..... لیکن مجھے کم از کم اتنا تو بتادو کہ معاذ تم تک کیسے پہنچا؟'' اعجاز صحافی تھا اور کوئی صحافی سوال کیے بغیر بھلا کیسے رہ سکتا تھا۔

''یہ سب باتیں آپ معاذ سے پوچھیے گا۔ میں بس اپنے حصے کا کام کررہا ہوں۔ آپ پتا نوٹ کرلیں۔'' وقاص نے اس کے سوال کو ٹال دیا اور اسے پتا لکھوانے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں اپنے کیمرامین کو بلواتا ہوں اور ابھی معاذ سے ملنے کے لیے نکلتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ملاقات میرے آج کے پروگرام کو مزید کامیابی سے ہمکنار کرے گی۔'' اعجاز بہت زیادہ پُرجوش ہوچکا تھا۔

''کوشش کریں کہ سب کچھ بہت خاموشی سے ہو اور اگر کیمرامین کو ساتھ لے جانا مجبوری نہ ہو تو اسے بھی رہنے دیں۔ اس کے پاس کیمرے کی موجودگی لوگوں کو متوجہ کرے گی۔'' وقاص بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

''تم فکر نہیں کرو۔ کیمرامین میرے اعتماد کا بندہ ہے اور بہت چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا استعمال کرتا ہے اس لیے کسی کو خبر بھی نہیں ہوسکے گی کہ ہم ٹی وی والے ہیں۔ میں اگر انٹرویو کے دوران خود سے ویڈیو بنانے کی کوشش کروں گا تو میرا کام متاثر ہوگا۔'' اعجاز نے کیمرامین کی اہمیت پر زور دیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اب میں چلتا ہوں۔'' وقاص اس سے مصافحہ کرکے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ پُرجوش سے اعجاز نے فوراً اپنے اس قابلِ اعتماد کیمرامین کو کال کیا جسے وہ ہر آؤٹ ڈور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

''سر! آپ کب تک واپس آجائیں گے؟ آپ کے پروگرام میں اب چند ہی گھنٹے باقی ہیں۔ میک اپ وغیرہ کے لیے بھی ٹائم چاہیے ہوگا۔ آپ نے گیسٹ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہے کہ انہوں نے کب تک پہنچنا ہے۔'' اعجاز کو کہیں جانے کے لیے پرتولتا دیکھ کر اس کے اسسٹنٹ نے اسے ٹوکا۔

''سب ہوجائے گا یار! ابھی میں جس کام سے جارہا ہوں وہ ہمارے پروگرام کو اور بھی زیادہ کامیابی عطا کرے گا۔ بس تم دعا کرو کہ مجھے جو ٹپ ملی ہے، وہ بالکل صحیح

''اعجاز نے اس کے شانے کو تھپکا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ معاذ کی بازیابی اس کے نزدیک بشریٰ کے کیس کو مضبوط بنانے کے لیے ایک غیبی امداد تھی۔ اس کیس میں اب تک بہت کچھ اس کی حمایت میں ہی ہو رہا تھا۔ ڈی این اے ٹیسٹ ہی سب سے بڑی کامیابی تھی اور ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ وہ جس چینل کے لیے کام کرتا تھا، وہ عرفان اللہ کی مخالف سیاسی پارٹی کو سپورٹ کرتا تھا اس لیے اسے یہ پروگرام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ آج کے پروگرام کے بارے میں چینل کے مالک، ایم ڈی اور اعجاز کے ایک آدھ قریبی شخص کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس موضوع پر پروگرام کرنے جا رہا ہے، البتہ عوام کو متوجہ کرنے اور ریٹنگ بڑھانے کے لیے بار بار آج شو کے خصوصی ہونے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ خصوصی پروگرام کا میزبان پروگرام سے محض چند گھنٹے پہلے اپنے کیمرامین کے ساتھ دفتر سے نکل کر کہیں جا رہا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ کامیابی کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو اس کے تعاقب میں ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے حسب عادت سیٹ بیلٹ باندھی اور ایک بار پھر اس کاغذ پر نظر ڈالی جس پر وقاص کا دیا ہوا ایڈریس لکھا تھا۔

''میرے خیال میں نمائش چورنگی کی طرف سے جانا ٹھیک رہے گا۔'' ایڈریس والا کاغذ اپنے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھے کیمرامین کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اس سے رائے لی اور خود گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر نکالی۔

''اس ایڈریس پر جانے کے لیے نمائش چورنگی کے بجائے اگر.....'' کیمرامین اس کے دیے کاغذ پر نظر جمائے اپنی کوئی رائے دے رہا تھا کہ اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ گولیاں ڈرائیونگ سیٹ والے رخ سے چلائی گئی تھیں اس لیے اعجاز تو فوراً ہی زد میں آ گیا۔ گولیوں نے اس کے بالائی جسم کو شہد کے چھتے میں بدل ڈالا تھا لیکن موت کا اصل سبب وہ گولی بنی جو دائیں کنپٹی سے سیدھی اس کے دماغ میں داخل ہوئی تھی۔ اتنی شدید فائرنگ میں کیمرامین کو بھی کوئی راہِ فرار نہ ملی اور اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گاڑی کے فرش پر جا گرا جہاں اعجاز اور کیمرامین کے خلط ملط ہوتے خون نے اس سفید کاغذ کے ٹکڑے کو احمریں رنگ میں رنگ ڈالا۔ وہ جو بڑی بڑی خبروں پر تبصرے کرتا تھا، جس کے تجزیے اونچے ایوانوں میں ہلچل مچا دیتے تھے، جس کی بات کو حق کی آواز سمجھا جاتا تھا، لمحوں میں خود ایک خبر بن گیا۔ ایسی خبر جو مظلوموں اور اس کے چاہنے والوں کو خون کے آنسو رلانے والی تھی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس خبر کو سن کر ایک نشاط آفریں قہقہہ لگایا تھا اور اپنی رسی ڈھیلی ہو جانے پر خوشی سے جھومنے لگے تھے۔

☆☆☆

وقاص کے چھوٹے سے فلیٹ میں معاذ بہت آرام سے رہ رہا تھا لیکن تنہائی اور ثقل و حرکت کی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے شدید ذہنی کوفت کا شکار تھا۔ وقاص نے اسے گھر والوں سے رابطہ کرنے سے بھی روک دیا تھا۔ یہ بات تو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس کے گھر والے کچھ لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے کراچی سے لاہور منتقل ہو گئے ہیں، اس لیے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وقاص نے اسے موبائل یا سوشل میڈیا کے ذریعے بھی ان لوگوں سے رابطہ کرنے سے روک دیا تھا کہ اگر ان ذرائع پر چیک لگا ہو تو معاذ کے دشمن اسے ٹریس نہ کر لیں۔ یوں وہ آزاد ہو کر بھی خود کو قید میں محسوس کرتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ اس قید میں اسے اذیتیں نہیں دی جاتی تھیں، کھانے پینے اور علاج کی سہولت حاصل تھی۔ وقاص نے ایک ڈاکٹر کا بھی انتظام کر دیا تھا جس نے دواؤں اور خوراک کا پورا شیڈول بنا کر دے دیا تھا اور وقاص نے اسے ہر چیز فراہم کر دی تھی۔ معاذ، وقاص کی ان مہربانیوں کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ وقاص ایک تو بہت کم وقت کے لیے فلیٹ پر آتا تھا، دوسرے اس موضوع پر اس سے بات کرنے سے گریز کرتا تھا، اس لیے معاذ ابھی تک اس سے کچھ اگلوا نہیں سکا تھا۔ بس ایک اندرونی احساس تھا جو وقاص کے خلوص پر یقین کرنے پر مجبور کرتا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں رکا ہوا تھا۔ یہاں رکنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ اسے اپنے زخموں کے ٹھیک ہونے اور صحت کو بحال کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

وقاص اسے جو تھوڑی بہت باتیں بتاتا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا ہوا۔ اپنے قول کے مطابق وہ کسی ایماندار صحافی کی تلاش میں تھا اور آج جانے سے پہلے اسے یہ خوشخبری سنا گیا تھا کہ کافی چھان پھٹک کے بعد وہ ایک ایسے صحافی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہے کہ وہ اس کے کیس کو بالکل دیانت داری سے میڈیا پر پیش کرے گا۔ معاذ اس کی روانگی کے بعد سے ہی انتظار کی کیفیت میں تھا اور وقت گزاری کے لیے ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ معمول کی خبروں کے درمیان اچانک ہی بریکنگ نیوز دی جانے لگی۔ خبر کے مطابق معروف نوجوان صحافی اعجاز احمد اپنے دفتر کے

باہر قتل کر دیے گئے تھے۔ معاذ، اعجاز احمد سے واقف تھا۔ اعجاز یونیورسٹی میں اس سے سینئر اور بہت سرگرم طالب علم رہا تھا، اس لیے باقاعدہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود وہ اعجاز کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بعد میں اس کا پروگرام اس کی شناخت بنا اور دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی اعجاز کو پسند کرنے والوں میں شامل ہوگیا۔ اسے حیرت تھی کہ جب وقاص کسی ایماندار صحافی کی تلاش میں تھا تو اس کے ذہن میں اعجاز کا نام کیوں نہیں آیا اور اب اعجاز کا نام اس صورت اس کے سامنے تھا کہ وہ بے چارہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

خبر میں بار بار اس کی گولیوں سے چھلنی گاڑی اور گاڑی میں گرا ہوا خون دکھایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی مسلسل ہائی لائٹ کیا جا رہا تھا کہ آج اعجاز احمد کسی خاص موضوع پر پروگرام پیش کرنے والے تھے۔ اعجاز کے ساتھی کیمرامین کے بارے میں خبر تھی کہ اسے نہایت تشویش ناک حالت میں اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے جہاں ڈاکٹرز اس کی زندگی بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ معاذ افسردہ سا ان خبروں کو دیکھتا رہا۔ خبر سے صاف ظاہر تھا کہ اعجاز آج کوئی بہت بڑی حقیقت عیاں کرنے جا رہا تھا اور اسے اس کی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ معاذ نے وہی چینل لگایا ہوا تھا جس سے اعجاز وابستہ تھا اس لیے مسلسل اس سے متعلق خبریں دی جا رہی تھیں۔ صحافی برادری، سیاست دانوں، سماجی کارکنوں اور شوبز کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی طرف سے مسلسل اس واقعے کی مذمت کی جا رہی تھی۔ دکھ اور افسوس کے اظہار کے ساتھ ساتھ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اعجاز کے قاتلوں کو تلاش کر کے جلد از جلد انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ خبر سے متعلق مختلف تجزیے اور تحقیقاتی رپورٹیں پیش کرنے کا سلسلہ بھی جلد شروع ہوگیا۔ اس سلسلے میں اعجاز کے اسسٹنٹ کا بھی ایک مختصر سا انٹرویو چلایا گیا۔ اس کے مطابق اعجاز آج بہت پُرجوش تھا اور بہت بڑے لوگوں کے خلاف ثبوتوں کے ساتھ پروگرام پیش کرنے والا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اعجاز کا پروگرام سے قبل کچھ دیر کے لیے دفتر سے جانا طے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پروگرام میں جس مہمان کو پیش کرنے والا ہے، اسے خود جا کر اپنے ساتھ اسٹوڈیو لائے گا لیکن وہ اپنے پروگرام سے ہٹ کر کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے نکل گیا تھا اور اس اچانک روانگی کی وجہ ایک اجنبی ملاقاتی تھا۔ ملاقاتی سے اعجاز کی کیا بات ہوئی تھی اور اس ملاقاتی کے جاتے ہی اعجاز کیوں اپنے دفتر سے روانہ ہوگیا تھا؟ اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اعجاز اپنے دفتر سے اپنا بیگ لے کر نکلا تھا لیکن پولیس کی طرف سے گاڑی میں کسی بیگ کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ چینل والے مسلسل وہ کلپ دکھا رہے تھے جس میں اعجاز اپنا بیگ تھامے گاڑی کی طرف جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کلپ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا کلپ بھی دکھایا جا رہا تھا جس میں دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ اس شخص کی ویڈیو بھی دکھائی جا رہی تھی جو آخری بار اعجاز سے ملنے آیا تھا اور جس سے ملاقات کے بعد اعجاز نے دفتر سے باہر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ معاذ سرسری دلچسپی کے ساتھ اس شخص کی ویڈیو دیکھنے لگا۔ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی موجود تھی اور سر پر لگی کیپ کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے سر کو قدرے جھکا کر چل رہا تھا اور غور کرنے پر یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ وہ ایسا دانستہ کر رہا تھا تاکہ اس کا چہرہ جگہ جگہ لگے کیمروں کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔ اس شخص کا یہ انداز اسے مشکوک ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن معاذ کو کوئی اور بات تھی جو بری طرح کھٹک رہی تھی اور وہ جو سرسری نظروں سے فوٹیج کو دیکھ رہا تھا، بہ نظر غائر دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

غور سے دیکھنے پر چند منٹ میں ہی اس کی الجھن دور ہوگئی اور وہ اس انکشاف پر چونک گیا کہ فوٹیج میں نظر آنے والا شخص وقاص تھا۔ وقاص نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو فلیٹ سے روانہ ہوتے وقت اس کے جسم پر موجود تھے لیکن ڈاڑھی، پی کیپ اور جھکے ہوئے سر کی وجہ سے معاذ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وقاص نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک صحافی سے ملنے جا رہا ہے اس لیے یہ امر تعجب کا باعث نہیں تھا کہ اعجاز کا آخری ملاقاتی وقاص تھا، لیکن یہ بات تعجب اور شکوک کا باعث تھی کہ وقاص نے اس ملاقات سے قبل خود کو ناقابل شناخت بنانے کی کوشش کی تھی۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ معاذ اس سوال کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ڈوربیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وقاص نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ کسی کی آمد پر کوئی رسپانس نہیں دے۔ اس کے قیام کے عرصے میں وہاں سرف بنانے والی ایک کمپنی کی سیلز گرلز کے سوا کوئی آیا بھی نہیں تھا اور وہ لڑکیاں بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی ردعمل ظاہر نہ ہونے پر خاموشی سے واپس چلی گئی تھیں۔ وقاص اکیلا یا ڈاکٹر کے ساتھ جب بھی یہاں آتا تھا، اپنے

چابی سے لاک کھول کر آتا تھا، اس لیے گھنٹی بجنے پر اس کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا۔ گھنٹی بہت عجلت میں اور بار بار بجائی جارہی تھی اس لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ کوئی سیلز گرل وغیرہ آئی ہوگی۔ قدرے تشویش میں مبتلا معاذ دبے قدموں دروازے تک گیا اور ڈور آئی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں اسے وہ ڈاکٹر کھڑا نظر آیا جسے وقاص ایک دو بار اس کے چیک اپ کے لیے لایا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا چہرہ ڈور آئی کے مقابل اس طرح رکھا ہوا تھا کہ معاذ اسے اچھی طرح دیکھ لے۔ معاذ کی دروازے کے قریب موجودگی کو اس نے محسوس کرلیا اور سرگوشی نما آواز میں بولا۔

''پلیز! دروازہ کھولو۔ یہ ایک ایمرجنسی ہے۔'' معاذ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر سے اسے کسی گڑبڑ کی امید نہیں تھی۔ اگر وہ گڑبڑ کرتا بھی تو معاذ کے اندر اتنا دم تو تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود اسے قابو میں کرسکتا۔

''میرے پاس وکی بھائی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے اور تمہیں فوراً یہاں سے شفٹ کرنا ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے پھولی ہوئی سانس کے باوجود ایک سانس میں اپنا جملہ مکمل کیا اور یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑے گا۔

معاذ نے ایک نظر پختہ عمر ڈاکٹر اور دوسری ابھی تک ٹی وی اسکرین پر دکھائی جانے والی وقاص کی فوٹیج پر ڈالی۔ بڑی عجیب بات تھی کہ یہ پختہ عمر کا ڈاکٹر نوجوان وقاص کو بڑے ادب سے وکی بھائی کہہ کر پکار رہا تھا۔

''کیا تم میری بات نہیں سن رہے ہو؟ اگر تمہیں اپنے ساتھ اپنی کوئی بہت ضروری شے لینی ہو تو لے لو اور فوراً میرے ساتھ چلو۔ یہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔'' ڈاکٹر نے اسے یوں ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر جھنجلائے ہوئے لہجے میں ٹوکا۔

''وقاص خود کہاں ہے؟'' معاذ نے اس سے سوال کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس ان کا فون آیا تھا اور وہ بہت جلدی میں لگ رہے تھے۔ مجھے تمہارے متعلق ہدایت دے کر انہوں نے فوراً ہی فون بند کردیا تھا۔ اب تم یہاں سے چلو۔'' ڈاکٹر نے بادل ناخواستہ اس کے سوال کا جواب دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے باقاعدہ باہر کی طرف کھینچ لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں خود چلتا ہوں۔'' معاذ نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑوالیا تو وہ قدرے خفیف ہوگیا لیکن اپنی خفت کو چھپاتا ہوا قدرے ناراض انداز میں اس کی طرف میڈیکل ٹیپ کے ٹکڑے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''انہیں اپنے چہرے پر دو تین جگہ چپکا لو تاکہ تمہارا چہرہ چھپ جائے۔'' معاذ نے اس بار خاموشی سے اس کی بات پر عمل کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس پناہ گاہ سے نکل کر ڈاکٹر کے ساتھ کسی دوسرے ٹھکانے کی طرف جارہا تھا اور ساتھ ہی حیران بھی تھا کہ کیسے وہ ایک اجنبی اور نوعمر لڑکے کی ہدایات پر خاموشی سے عمل کرتا جارہا ہے۔

☆☆☆

بشریٰ کے لیے آج کا دن بہت اہم تھا کیونکہ وہ ایک بار پھر صحیح راستے سے اپنی لڑائی لڑنے جارہی تھی۔ عائشہ گلزار اور گلزار عاصم کی اموات کے بعد اس نے ہر طرف سے مایوس ہوکر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی پر سچ ظاہر نہیں کرے گی اور خود اپنے مجرموں سے انتقام لے گی لیکن وہ ابھی تک کچھ نہیں کرسکی تھی۔ وہ ایک تنہا لڑکی تھی جس کے پاس اتنی بڑی لڑائی لڑنے کے لیے وسائل موجود نہیں تھے۔ واحد اعجاز تھا جس سے اسے کچھ مدد ملی تھی لیکن اعجاز کو اس کے طریقۂ کار پر اختلاف تھا اور ہر بار وہ اسے کوئی قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا۔ اسی اعجاز نے اسے قائل کرلیا تھا کہ وہ تھرو پراپر چینل یہ جنگ لڑے اور اس پل اسے لگا تھا کہ اعجاز کے لہجے میں اس کے والد گلزار عاصم بول رہے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ سیدھے طریقوں سے کام کرنے کے قائل رہے تھے۔ گلزار عاصم کا خیال آجانے پر ہی وہ اعجاز کی بات ماننے پر راضی ہوئی تھی اور اب بے چینی سے منتظر تھی کہ اعجاز اسے اسٹوڈیو لے جانے کے لیے آجائے۔ ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ نے اسے خاص طور پر انصاف کے حصول کے لیے بہت پُرامید کردیا تھا اور یقین تھا کہ اب باذل نہیں بچ سکے گا۔ باذل پر جرم ثابت ہوجاتا تو پھر یہ ثابت کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے حکم پر یہ سب کرتا پھر رہا تھا۔ اعجاز کی زبانی اسے معلوم ہوچکا تھا کہ فی الحال پولیس باذل کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے لیکن باذل کا غیاب اپنی جگہ خود ایک ثبوت تھا کہ وہ مجرم ہے اور سزا سے بچنے کے لیے قانون سے چھپتا پھر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ باذل ایک بار گرفت میں آگیا تو پھر بھیانک سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اپنے دشمنوں کے کیفر کردار تک پہنچ جانے کی امید نے اس کے اندر نئی روح پھونک دی تھی۔ جسم و جاں پر گزرنے والے تازہ حادثے کے باوجود آج وہ بہت پُرجوش اور فعال نظر آرہی تھی۔ ڈاکٹر طلعت نے بھی

آج اس کی طرف سے خاصے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ دل میں ڈھیروں امیدیں لیے وہ وقت گزاری کے لیے دن کا بیشتر حصہ ٹیلی ویژن دیکھتی رہی تھی اور اس کا زیادہ تر فوکس اعجاز کے چینل پر رہا تھا۔ عصر کے بعد جبکہ اعجاز کی اس کے پاس کسی بھی لمحے آمد متوقع تھی، اس نے ٹیلی ویژن پر ایک بالکل ناقابل یقین خبر دیکھی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ خون میں تربتر پڑا شخص اعجاز ہے۔ زندگی سے بھرپور اعجاز، جو اسے جینے کی آس دلاتا تھا۔ جو حق کی، انصاف کی اور قانون کی باتیں کرتا تھا، کھلی لاقانونیت کا شکار ہوکر مارا گیا تھا اور اس کے مرنے پر ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ بشریٰ کو لگا کہ ایک شور اس کے اندر بھی بلند ہورہا ہے۔ قبل اس کے کہ شور اتنا بلند ہوجاتا کہ اس کے اعصاب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے، کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکٹر طلعت اندر داخل ہوئے۔ ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ ان تک بھی خبر پہنچ چکی ہے اور وہ بشریٰ کے ردِعمل کی طرف سے فکرمند ہوکر اس کے کمرے میں آئے ہیں۔ ان کی آمد پر بشریٰ نے لہورنگ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ ٹیلی ویژن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں اب کیمرامین کی زخمی حالت میں اسپتال منتقلی کا عمل دکھایا جارہا تھا اور سنسنی خیز لہجے میں قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں کہ اعجاز کے قتل کا اس کے آج کے پروگرام سے گہرا تعلق تھا۔

''سسٹر! ٹی وی بند کردیں۔ مس بشریٰ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر نے اپنے ساتھ اندر آنے والی نرس کو حکم دیا۔ بشریٰ نرس کو ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''آپ آرام سے بستر پر لیٹ جائیں، مس بشریٰ! اس وقت آپ کے لیے آرام بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اسے ہدایت کی تو اس نے ایک نظر ڈاکٹر اور دوسری ڈاکٹر کے اشارے پر انجکشن تیار کرتی نرس پر ڈالی اور آہنی لہجے میں بولی۔

''نہیں ڈاکٹر! یہ آرام کا نہیں عمل کا وقت ہے۔ اعجاز کے جانے سے اس کا کام ادھورا نہیں رہنا چاہیے۔ اعجاز کو جس پروگرام سے روکنے کے لیے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، وہ پروگرام آج ضرور ہوگا۔''

''لیکن.....'' ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں، ڈاکٹر صاحب! آپ اعجاز کے چینل والوں سے میرا رابطہ کروائیں۔ میں خود انہیں اس پروگرام کے لیے قائل کروں گی۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولی تو ڈاکٹر طلعت نے محسوس کیا کہ ان کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور اس رات بشریٰ نے پاکستانی عوام کے روبرو اول تا آخر اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ اس پروگرام نے ہر طرف ایک ہلچل مچا کر رکھ دی۔ مختلف چینلز کے نمائندوں نے عرفان اللہ اور یزدانی کو اپروچ کرکے ان سے بشریٰ کے الزامات کے بارے میں سوال جواب کرنا شروع کردیے۔ دونوں ہی اس بات سے صاف مکر گئے کہ بشریٰ کی سنائی داستان میں کوئی سچائی ہے۔ انہوں نے اسے مخالفوں کی چال کے ساتھ ساتھ بشریٰ کی طرف سے انتقامی کارروائی قرار دیتے ہوئے اس پر الزام لگایا کہ اصل میں بشریٰ ایک لالچی لڑکی ہے جس نے پہلے یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے حوالے سے الٹی سیدھی کہانیاں بنا کر انہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور جب وہ اس بلیک میلنگ سے نہیں ڈرے تو آئے روز نت نئے ڈرامے کرنے لگی۔ عرفان اللہ نے کھل کر الزام لگایا کہ بشریٰ کو ان کے سیاسی مخالفین کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس ضمن میں اس نے اس امر کی طرف بھی خفیف سا اشارہ کیا کہ اس کے خلاف پروگرام خاص اس چینل سے پیش کیا جارہا تھا جو ان کے سیاسی مخالفین کو سپورٹ کرتا ہے۔

اعجاز کی موت کے بعد اس پروگرام نے ایک بھونچال سا پیدا کردیا تھا۔ ہر طرف تبصرے، تجزیے، قیاس آرائیاں تھیں اور بشریٰ سے ثبوتوں کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ بشریٰ کا استدلال تھا کہ سارے ثبوت اعجاز کے پاس تھے اور اگر ثبوت درکار ہیں تو پولیس کو اعجاز کا وہ بیگ تلاش کرنا ہوگا جو دفتر سے روانہ ہوتے وقت اعجاز کے پاس تھا لیکن بعد میں اس بیگ کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ بیگ کی بازیابی کے ساتھ ساتھ اس نے اس مشکوک شخص کی گرفتاری کا بھی مطالبہ کیا تھا جو اعجاز کے قتل سے پہلے اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور اس سے ملاقات کے بعد ہی اعجاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر دفتر سے باہر نکل گیا تھا۔ اعجاز کے اسسٹنٹ کے مطابق اس شخص نے کوئی ایسی ٹپ دی تھی جسے اعجاز اپنے آج کے پروگرام کے حوالے سے بہت اہم سمجھ رہا تھا لیکن اعجاز کے قتل کے بعد قیاس کیا جارہا تھا کہ اس شخص کی آمد اصل میں ایک سازش تھی اور بہانے سے اعجاز کو باہر نکلوا کر اسے قتل کردیا گیا تھا۔ بے شمار باتیں تھیں لیکن ان سب باتوں کا حتمی نتیجہ یہ تھا کہ آج ایک بار پھر بشریٰ سچ بول رہی تھی لیکن بغیر ثبوتوں کے اس کے سچ کو کوئی گھاس ڈالنے

والا نہیں تھا۔ ایسا صرف اس لیے نہیں تھا کہ قانون اندھا تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ قانون کی بالادستی کا عہد اٹھانے والے قانون کے رکھوالے کرنسی نوٹوں کی خوشبو سے محبت کرتے تھے اور یہ خوشبو انہیں یزدانی اور عرفان اللہ جیسے لوگوں کے پاس سے ہی آتی تھی۔

☆☆☆

''وکی بھائی کی حاضر دماغی نے تمہیں بچالیا۔ اگر ان کے کہنے پر میں نے تمہیں یہاں شفٹ نہ کیا ہوتا تو تم گئے تھے کام سے۔'' معاذ اب ایک نئے ٹھکانے پر تھا اور یہاں بھی سابقہ مشغلے یعنی ٹیلی ویژن دیکھ کر حالات سے باخبر رہنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کا یہ ٹھکانا بھی ایک فلیٹ ہی تھا لیکن یہ عمارت پہلی عمارت کے مقابلے میں نئی، صاف ستھری اور کشادہ تھی۔ اس فلیٹ میں ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا اور بڑی دیر سے کچن میں گھسا کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اب وہ کچن سے برآمد ہوا تھا تو اس کے ہاتھ میں کانچ کا ایک بڑا سا پیالہ تھا اور وہ معاذ کو خبر سنا رہا تھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' معاذ نے ایک نظر اس پر اور دوسری اس کے ہاتھ میں موجود کانچ کے شفاف پیالے پر ڈالی۔ پیالے میں نہایت نفاست سے کاٹے گئے پھلوں کی چاٹ موجود تھی۔

''مجھے ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ کچھ لوگ اس فلیٹ کا تالا توڑ کر اندر گھسے اور وہاں کا سارا سامان الٹ پلٹ ڈالا۔ انہوں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی کہ اس فلیٹ میں کون رہتا ہے؟'' ڈاکٹر نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا اور فروٹ چاٹ سے بھرا بڑا سا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ کھالو۔ فی الحال یہاں فریج میں صرف فروٹ ہی تھے، اس لیے میں تمہارے ڈنر کا یہی انتظام کرسکا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہاں سے نکلوں گا تو تمہارے کھانے پینے کا معقول انتظام کردوں گا۔''

''شکریہ..... لیکن اس زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' معاذ نے اس سے پیالہ لے کر بے دلی سے ایک طرف رکھ دیا۔

''تمہارے لیے کھانے پینے میں بے پروائی بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ اگر تم خود کو فٹ اور صحت یاب دیکھنا چاہتے ہو تو اس طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ دوا کے ساتھ اچھی خوراک انسان کو ری کور کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا۔'' معاذ نے بے دلی سے جواب دیا اور ڈاکٹر کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وقاص..... میرا مطلب ہے آپ کا وکی بھائی کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ وکی بھائی نے تمہیں یہاں شفٹ کرنے کی ہدایت کے بعد دوبارہ کال نہیں کی ہے۔ کیا تمہیں ان سے کوئی کام ہے؟'' ڈاکٹر نے اس کا طنزیہ انداز نظرانداز کردیا اور سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

''کام تو ہے، لیکن خیر..... جب وقاص آئے گا تو میں خود اس سے بات کرلوں گا۔''

معاذ الجھن کا شکار تھا اور بار بار اس کے ذہن میں ٹی وی پر دکھائی جانے والی فوٹیج گھوم رہی تھی۔ اسے ننانوے فیصد یقین تھا کہ فوٹیج میں دکھائی دینے والا شخص وقاص ہی ہے اور یہ ایک بڑی الجھن تھی کیونکہ فوٹیج والے شخص اور اعجاز کے قتل میں گہرا ربط جوڑا جارہا تھا اور ہر طرف ہی آوازیں بلند ہورہی تھیں کہ اس شخص نے بہانے سے اعجاز کو باہر نکال کر اس کے قتل کا انتظام کیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ وکی بھائی یہاں ضرور آئے گا۔ اسے تمہاری بہت فکر ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ایک بات تو بتائیں، ڈاکٹر صاحب! یہ آپ وقاص کو وکی بھائی کیوں کہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ آپ کے مقابلے میں اتنا کم عمر لڑکا ہے، پھر اسے اس طرح مخاطب کرنا.....؟'' معاذ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر پہلے مسکرایا اور پھر رسانیت سے بولا۔

''اکیلا میں ہی نہیں ہوں جو اس نوجوان کو وکی بھائی کہتا ہوں۔ یہاں بہت لوگ ہیں جو انہیں اس انداز میں مخاطب کرتے ہیں اور اس کی کچھ وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ وکی بھائی اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑے انسان ہیں اور ایسے انسان کو احترام سے مخاطب کرنے کو سب کا ہی دل چاہتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' معاذ واقعی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

''وکی بھائی دیکھنے میں ایک کھلنڈرے اور لاابالی سے نوجوان دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں بہت ہمدرد، باہمت اور سمجھ دار انسان ہیں۔ شہر میں کئی گھرانے ایسے ہیں جن کا چولہا وکی بھائی کے دم سے جلتا ہے۔ کئی لوگوں کے مسائل ان کے دم سے حل ہوئے ہیں اور کئی کو انہوں نے ایسے وقت سہارا دیا ہے کہ جب کہیں کوئی سہارا نظر نہیں آتا

تھا۔ میں خود اس کی ایک مثال ہوں۔ میں چھوٹا سا ایک پرائیویٹ کلینک چلاتا ہوں۔ تم اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہ سمجھو تو سچ یہ ہے کہ اللہ نے میرے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے اور میرے چھوٹے سے کلینک پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اکثر مجھے اپنے کلینک سے فارغ ہونے میں آدھی رات ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ آخری مریض کو فارغ کرکے کلینک بند کرنے میں ایک بجے سے اوپر کا وقت ہوگیا تھا۔ اتفاق سے اس روز میرا کمپاؤنڈر اپنی بیوی کی طبیعت کی خرابی کے باعث جلدی چھٹی لے کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ میں نے اپنے نوجوان بیٹے کو بلوالیا تھا۔ ہم باپ بیٹا کلینک بند کرکے گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ تین مسلح افراد نے ہمیں گھیر لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی لٹیرے ہیں، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ انہیں جو لینا ہے لے لیں اور بدلے میں ہمیں خاموشی سے جانے دیں لیکن پتا چلا کہ وہ مال و دولت کے بجائے مجھے لے جانے آئے ہیں۔ ان کا کوئی ساتھی شدید زخمی تھا اور وہ اس کے علاج کے لیے مجھے لے جانا چاہتے تھے۔ اسلحے کی زد پر کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے بھی نہیں کیا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ میرے بیٹے کو جانے دیں لیکن انہوں نے کہا کہ وہ میرے بیٹے کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے تاکہ پیچھے وہ پولیس کو اطلاع نہ دے سکے۔ ہمارے درمیان اس بات پر بحث و تکرار ہونے لگی۔ مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور شک تھا کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد وہ ہم باپ بیٹے کو مار ڈالیں گے، اس لیے میں بیٹے کو کسی صورت اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میری ضد پر ان میں سے ایک نے میرے بیٹے پر گن تان لی اور کہا کہ وہ ابھی اسے مار ڈالے گا۔ اس کے تیور اتنے خطرناک تھے کہ لگتا تھا وہ واقعی گولی چلادے گا اور پھر سچ مچ گولی چل گئی۔ مجھے لگا کہ میرا دل بند ہونے لگا ہے لیکن پھر میں نے عجیب منظر دیکھا۔ گولی چلنے کے بعد میرا بیٹا نہیں بلکہ وہ شخص گرا تھا جو میرے بیٹے پر گولی چلانے والا تھا۔ پہلی گولی چلنے کے بعد تو جیسے وہاں قیامت آگئی۔ مسلح افراد نے اندازے سے ہی فائر کی سمت گولیاں چلانا شروع کردیں۔ میں اور میرا بیٹا اس صورت حال پر اتنا بوکھلا گئے تھے کہ ہمیں اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ خود کو نیچے گرا کر گولیوں کی زد میں آنے سے بچالیتے۔ اس موقع پر ہمارے اس ہمدرد نے ہی عقل مندی اور مہارت سے کام لیا اور بے تحاشا فائرنگ کے جواب میں خود اندھا دھند فائرنگ کرنے سے گریز کیا۔ اس نے بہت تاک کر مزید صرف دو گولیاں چلائیں اور باقی دونوں افراد کو بھی گرادیا۔ ہم باپ بیٹا بچ جانے کے باوجود بھی خوف زدہ تھے۔ اسی شخص نے ساری صورت حال سنبھالی۔ ان تین میں سے ایک مرگیا تھا، جو دو زندہ تھے، ان سے پوچھ گچھ کرکے پولیس نے ان کے ٹھکانے پر چھاپا مارا تو ایک زخمی کے علاوہ ان کے مزید دو ساتھی گرفتار ہوئے اور پتا چلا کہ وہ اسی روز صبح ہونے والی بینک ڈکیتی کی واردات کرنے والا گروہ تھا۔ اس ڈکیتی کی واردات میں بینک سے ڈھائی کروڑ سے زیادہ رقم لوٹنے کے علاوہ ڈاکوؤں نے دو سیکیورٹی گارڈز کو بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اپنے ایک ساتھی کو زخمی حالت میں لے کر فرار ہوئے تھے۔ ڈاکوؤں کا اتنا بڑا گروہ پکڑوانے پر اس شخص نے خود کوئی کریڈٹ نہیں لیا اور سارا کارنامہ پولیس کے کھاتے میں ڈال دیا کہ پولیس کی گشتی ٹیم نے ڈاکٹر کو زبردستی لے جائے جانے کی کوشش کو ناکام بنایا اور کارروائی کرکے ڈاکوؤں کو پکڑ لیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں نے دیکھا کہ پولیس والے بھی اس نوجوان سے نرمی اور احترام سے پیش آرہے ہیں اور اسے وکی بھائی کہہ کر مخاطب کررہے ہیں تو بس میں بھی اسے وکی بھائی کہنے لگا۔ بعد میں میری اس نوجوان سے دوستی گہری ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ اسی عزت کے لائق ہے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کے دکھ اور پریشانی کو اپنا سمجھیں اور اپنے فائدے کی فکر کیے بغیر کسی بھی معاملے میں اس لیے کود پڑیں کہ کسی کمزور پر ظلم ہوتا دیکھنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا، آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ تم اپنا ہی معاملہ دیکھ لو۔ تمہاری اسٹوری کافی حد تک مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ تمہارے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں وہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں لیکن پھر بھی دیکھ لو، وکی بھائی بغیر کسی لالچ کے تمہاری مدد کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں اور تمہارا ہر طرح سے خیال رکھ رہے ہیں۔‘‘

اس نے ایک چھوٹا سا سوال کیا تھا، جواب میں ڈاکٹر نے پوری داستان سنا ڈالی۔ اپنی بات کے آخر میں ڈاکٹر نے اس کے حوالے سے جو دلیل دی، وہ ہلکی نہیں تھی۔ واقعی کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ ہوتے ہوئے بھی وقاص اس کی اس قدر مدد کررہا تھا تو یہ ایک حیرت انگیز بات تھی اور یہی بات حیرت کو مزید بڑھاتی تھی کہ آخر اعجاز کے قتل سے وقاص کا کیا تعلق تھا؟ وہ ابھی اس تعلق کا کوئی سرا ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ٹی وی پر اعجاز ہی کا پروگرام کوئی اور اینکر پیش کرنے لگا۔ پروگرام کے

آغاز میں اس نے اعجاز کے قتل پر افسوس اور اظہارِ مذمت کیا، پھر اس بات کو واضح کرتے ہوئے کہ وہ نہیں جانتا کہ آج کے پروگرام میں اعجاز کس حقیقت سے پردہ اٹھانے والا تھا، بتایا کہ مشہور صحافی گلزار عاصم کی بیٹی، بشریٰ گلزار کے اس دعوے کے بعد کہ وہ اعجاز کے پروگرام کی نوعیت سے اچھی طرح واقف ہیں، انہیں اس پروگرام میں پیش کررہا ہے۔ بشریٰ گلزار اس پروگرام میں جو کچھ کہیں گی اس سے میزبان کا یا ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ میزبان کی اس ساری وضاحت کے بعد کیمرا بشریٰ پر ڈالا گیا اور جانے کتنے دنوں بعد معاذ نے بشریٰ کا چہرہ دیکھا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جب کیرتھر کی پیر کے لیے گیا تھا تو تب بھی بشریٰ کچھ اچھے حال میں نہیں تھی اور کار کے حادثے کے بعد بستر پر پڑی ہوئی تھی لیکن اب..... اب تو وہ کوئی مُردہ لگ رہی تھی، جسے قبر سے اٹھا کر بولنے کی صلاحیت دے دی گئی تھی۔ رنگت کا پیلا پن سنہری بالوں کی وجہ سے کچھ اور نمایاں ہورہا تھا۔ جسم کے کھلے حصوں پر یا تو جا بجا میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی یا مندمل ہوتے زخموں کی کھرنڈ نظر آرہی تھی۔ بدیسی ماں سے ورثے میں ملی خوبصورت آنکھوں سے ان کی مخصوص چمک غائب تھی اور اس چمک کی جگہ غم، غصے اور بے بسی نے لے لی تھی۔ خوبصورت سانچے میں ڈھلا نازک سا بدن ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا تھا۔ کہنے کو وہ بشریٰ تھی لیکن اس میں سے بشریٰ کی جملہ صفات غائب ہوچکی تھیں اور وہ بشریٰ کے بجائے اس کی پرچھائیں محسوس ہوتی تھی۔

معاذ دکھ اور حیرت کے عالم میں اسے بولتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ شروع سے اب تک خود پر بیتی ظلم و زیادتی کی داستان سنا رہی تھی اور معاذ کے سارے وجود میں تیر سے اترتے جارہے تھے۔ کیا جرم تھا اس پیاری لڑکی کا؟ صرف یہی نا کہ اس نے کچھ لوگوں کا فراڈ کھول کر لوگوں کو سچ سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔ انہیں بتانا چاہا تھا کہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم میں وہ جو اپنے خوابوں کا آشیانہ بنانے جارہے ہیں، اس آشیانے کی بنیادیں دھوکے پر رکھی گئی ہیں۔ دوسرا سچ اس نے معاذ کی گمشدگی کے حوالے سے بولا تھا اور ان لوگوں کی نشاندہی کی تھی جن کا معاذ کے غیاب میں ہاتھ تھا، جس پر وہ طاقت میں بدمست ہاتھی مزید چراغ پا ہوگئے تھے اور اس کمزور سی لڑکی کا آشیانہ ہی اجاڑ ڈالا تھا۔ اتنے ظلم کے بعد بھی شاید انہیں اس لڑکی سے کوئی خطرہ تھا جو انہوں نے دکھوں سے نڈھال اس کے وجود کو ایک بار پھر بری طرح روند ڈالا تھا۔ وہ اپنے لب نہ بھی کھولتی تو اس کا حال اس پر بیتی ساری داستان سنا رہا تھا لیکن یہاں مظلوم کی داد رسی کا نظام ہی کہاں تھا؟ مظلوم کے سچ کے نتیجے میں اس پر شک کے اتنے تیر چلائے جاتے تھے، الزامات کی ایسی بوچھاڑ کی جاتی تھی، سوالوں کے اتنے نشتر چلائے جاتے تھے کہ وہ جو پہلے ہی خود پر بیتی پر نڈھال ہوتا تھا، اتنے سارے حملوں پر بوکھلا کر بالکل ہی ادھ موا ہوجاتا تھا۔ بشریٰ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہورہا تھا۔ اس سے پوچھا جارہا تھا کہ وہ پہلے کیوں خاموش رہی؟ اس نے اپنے ماں باپ کی موت کے وقت باذل کا نام کیوں نہیں لیا؟ معاذ سے اس کا کیا تعلق ہے؟ وہ اپنا گھر بیچ کر میڈم نازلی کے بدنام زمانہ ہاسٹل میں کیوں رہ رہی تھی؟ اعجاز سے اس کی دوستی کی نوعیت کیا ہے؟ کیا اس نے دیکھا تھا کہ میڈم نازلی کے ہاسٹل میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے والا شخص باذل ہی تھا؟ وہ جس ڈی این اے رپورٹ کا ذکر کررہی ہے، وہ رپورٹ کہاں ہے؟ ایسے اور اس جیسے کئی دوسرے سوالات تھے جو اس سے کیے جارہے تھے۔ وہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی بات پوری طرح سنے بغیر اس پر مزید سوالوں کی یلغار کردی جاتی تھی۔

وہ ماضی میں ایک نہایت پُراعتماد اور بولڈ لڑکی ہوا کرتی تھی لیکن اب اتنے بڑے بڑے حادثات سے گزر کر آنے کے بعد ظاہر ہے اس کی خود اعتمادی اور بولڈنیس کا گراف نیچے چلا گیا تھا۔ معاذ کو اس کا بوکھلانا، گھبرانا، بار بار چپ ہوجانا تکلیف دے رہا تھا اور یاد آرہا تھا کہ وہ کتنا بے تحاشا اور بے تکان بولا کرتی تھی۔ اس پیاری لڑکی کا یہ بدلا ہوا روپ اس کے لیے اس لیے بھی زیادہ تکلیف کا باعث تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اس نے جو دکھ اٹھائے ہیں ان دکھوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ معاذ سے محبت کرتی تھی اور اس محبت میں اپنی طاقت سے زیادہ جدوجہد کرتی رہی تھی یا پھر یہ تھا کہ اس کے دشمن ہی بہت گھٹیا اور نیچ تھے جنہوں نے خود کو بچانے کے لیے سامنے والے پر اس کی استعداد سے زیادہ ظلم ڈھایا تھا۔ حسنین کی دردناک موت بھی ان کے ظلم کا ایک ثبوت تھی لیکن یہ سارے ثبوت بے کار تھے کہ انہیں کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا اور ظالم بڑی مکاری سے کہہ رہے تھے کہ یہ سارے الزام جھوٹے ہیں۔ ان کے خلاف کاروباری اور سیاسی ہتھکنڈے ہیں، میڈیا وار ہے۔ ان کے پاس ہر وقوعے والے روز باذل کی کہیں اور موجودگی کے ثبوت اور عینی شاہدین موجود تھے۔ ایسے میں سچ کون سنتا اور اس پر کتنوں کو یقین آتا۔

☆☆☆

سر پر ہیلمٹ لگائے وقاص، اعجاز کے چینل والے روڈ کے اگلے چوراہے پر اپنی بائیک سمیت موجود تھا۔ وہ معاذ کے معاملے میں بہت محتاط تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اعجاز کا تعاقب کر کے معاذ تک پہنچ جائے، اس لیے اپنی طرف سے اس امر کو یقینی بنانے کا پلان بنایا تھا کہ کوئی اعجاز کا تعاقب کرے۔ اسے اعجاز کے تعاقب کا اس لیے اندیشہ تھا کہ آج اعجاز کوئی بہت اہم پروگرام کرنے والا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کی اپنی صحافی برادری کے لوگ اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اس کا ایک آدمی چینل کے دفتر کے سامنے متعین تھا جو اعجاز کے روانہ ہوتے ہی اسے اطلاع دے دیتا۔ حسب توقع اسے اعجاز کی روانگی کی اطلاع ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور اسے اس کے ساتھی نے اطلاع دی کہ اعجاز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی گاڑی میں دفتر سے باہر آرہا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر وقاص نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کے لیے کک لگائی اور اپنے ساتھی کو کوئی ہدایت دینے لگا لیکن پھر فائرنگ کی تیز آواز میں اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائرنگ کی یہ آواز اسے ایسے بھی سنائی دے رہی تھی اور موبائل کے اسپیکر سے بھی بلند ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ فائرنگ اسی جگہ ہوئی ہے جہاں اس کا ساتھی موجود تھا۔

''کیا ہوا موی؟'' اس نے چیخ کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''اعجاز کی گاڑی پر کسی نے فائرنگ کی ہے وکی اور میرے خیال میں اعجاز نہیں بچا۔ اس کے سر میں گولی لگتے میں نے خود دیکھی ہے۔'' دوسری طرف سے اس کے ساتھی نے ہیجانی لہجے میں جواب دیا۔

''وہاٹ! کس نے کی ہے یہ فائرنگ؟'' وقاص دہاڑا۔

''میں نہیں دیکھ سکا لیکن ایک سیاہ لینڈ کروزر فائرنگ کے فوراً بعد بہت تیزی سے وہاں سے نکلی ہے۔'' موی اسے بتا ہی رہا تھا کہ وقاص نے اپنے قریب سے ایک لینڈ کروزر کو طوفانی رفتار سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

''میں نے اس لینڈ کروزر کو دیکھ لیا ہے۔ تم میرے پیچھے آؤ، ہم اس کا تعاقب کریں گے۔'' وقاص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا اور خود لینڈ کروزر کے پیچھے لگ گیا۔ لینڈ کروزر آس پاس کی گاڑیوں کا خیال کیے بغیر کسی سانڈ کی طرح سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ حادثے سے بچنے کے لیے دوسرے گاڑی والوں کو خود ہی اسے راستہ دینا پڑ رہا تھا۔ وقاص ماہر بائیکر نہیں ہوتا تو اس کا تعاقب نہ کر پاتا اور الٹا خود حادثے کا شکار ہو جاتا لیکن اس کی مہارت کام آئی اور ٹریفک کے ازدحام میں وہ کامیابی سے لینڈ کروزر کے تعاقب میں لگا رہا۔ لینڈ کروزر اسی رفتار سے بھاگتی ہوئی ایسی سڑکوں پر مڑنے لگی کہ وقاص کو شک ہوا کہ وہ شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہی ہے۔ وہ موی کو بھی اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتا رہا۔ ہینڈ فری کے استعمال کی وجہ سے اسے موی سے بات کرنے میں آسانی تھی۔ موی بھی اسی کی طرح بہت ماہر بائیکر تھا اس لیے زیادہ وقت لگائے بغیر خود بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''اب میں تھوڑا پیچھے رہ جاؤں گا اور تم لینڈ کروزر کا تعاقب کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے مسلسل اپنے پیچھے دیکھ کر انہیں تعاقب کا اندازہ ہو جائے۔'' وقاص نے موی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور اپنی بائیک کی رفتار تھوڑی سی کم کر لی۔ تھوڑی دیر میں موی اور لینڈ کروزر دونوں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن موی سے مسلسل رابطے کی وجہ سے وہ ان کی لوکیشن سے آگاہ تھا اور اس کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی کہ لینڈ کروزر شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہی ہے۔

''میں اپنی بائیک لینڈ کروزر سے آگے لے جا رہا ہوں وکی، تاکہ انہیں لگے کہ میں اپنے راستے پر جانے والا عام سا مسافر ہوں۔ یہ سڑک بالکل سیدھی جا رہی ہے اس لیے یہ ڈر نہیں ہے کہ لینڈ کروزر درمیان میں کہیں مڑ جائے گی۔'' کچھ دیر بعد موی نے اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم سیدھے نکلتے چلے جاؤ۔ اب میں ان لوگوں کو چیز کروں گا۔'' وکی نے اسے ہدایت دی اور خود اپنی بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ ہینڈ فری پر اسے موی کی بائیک کے علاوہ ایک آدھ دوسری گاڑیوں کے انجنوں کی بھی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کے درمیان اس نے اچانک ہی ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنی۔

''کیا ہوا ہے موی، سب ٹھیک تو ہے؟'' بے ساختہ ہی اس نے چیخ کر پوچھا لیکن پھر احساس ہوا کہ اس کا موی سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ کسی انہونی کے خیال سے اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور بائیک کی رفتار انتہائی حد تک بڑھا دی۔ چند منٹ میں وہ اس سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے دیکھ لیا کہ ایک مقام پر حادثے کا منظر ہے۔ گری ہوئی بائیک، پولیس موبائل اور ایک ٹویوٹا کرولا اس منظر کا اہم حصہ تھے۔ ٹویوٹا کرولا کے ڈرائیور اور پولیس والوں نے مل کر ایک جگہ ہجوم کر رکھا تھا۔ وقاص نے اپنی بائیک سیدھی اس ہجوم کے پاس لے جا کر روکی اور بھاگتا ہوا ان لوگوں

کے درمیان سے راستہ بنا کر نیچے پڑے مومی تک پہنچا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کی دائیں ٹانگ غیر فطری انداز میں مڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے اسے؟'' وہ دیکھ چکا تھا کہ مومی کے جسم کے کسی حصے سے خون نہیں بہہ رہا ہے لیکن وہ بے ہوش تھا تو یہ ایک تشویش ناک بات تھی اس لیے چیخ کر پوچھنے لگا۔

''تو کون ہے اوئے، اس لڑکے کو جانتا ہے کیا؟'' پولیس والوں نے اس کی مومی سے وابستگی بھانپ لی اور کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''میں وقاص ہوں اور یہ میرا دوست معمر ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' اس بار اس نے خود پر قابو پا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مومی کے حادثے نے فی الحال اسے لینڈ کروزر والوں کی فکر سے آزاد کر دیا تھا اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ مومی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

''یہ ایک بڑی گڈی کو اوورٹیک کر رہا تھا کہ گڈی نے اسے سائڈ ماری اور تیزی سے آگے نکل گئی۔ ہم پیچھے آ رہے تھے لیکن فاصلہ زیادہ تھا اس لیے گڈی کو نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ بے ہوش ہو کر سڑک پر پڑا تھا اس لیے ہمارا اس کے پاس رکنا ضروری تھا۔'' ایک پولیس والے نے اسے بتایا۔

''اور یہاں رک کر آپ کیا کر رہے ہیں؟ اسے اسپتال کیوں شفٹ نہیں کرتے؟'' وقاص نے جھنجلا کر کہا۔ ساتھ ہی وہ مومی کے چہرے کو تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

''ایمبولینس کو کال کر دی ہے، آ ہی رہی ہوگی۔'' پولیس والے نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ابھی اس کا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ فضا میں ایمبولینس کا سائرن گونجنے لگا۔ مومی کو فوری طور پر ایمبولینس میں منتقل کر کے اسے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ وقاص کی بائیک اور پولیس والوں کی موبائل ساتھ ساتھ تھی۔ وقاص نے پہلے ہی مومی کو شہر کے ایک بہت بڑے نجی اسپتال لے جانے کا کہہ دیا تھا اس لیے ایمبولینس کا رخ اسی طرف تھا۔ اعجاز کے دفتر سے نکلنے کے بعد وہ اپنے چہرے پر چپکی ڈاڑھی اور سر پر پہنا پی کیپ اتار کر پھینک چکا تھا۔ یہی سلوک اس نے اپنی شرٹ کے ساتھ بھی کیا تھا اور اب اس کے جسم پر اندر پہنی ہوئی ہلکی پھلکی ٹی شرٹ موجود تھی۔ اس حلیے میں وہ اس وقاص سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جس نے اسٹوڈیو میں اعجاز سے ملاقات کی تھی، اس لیے فی الحال اسے اپنے پہچان لیے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن مختصر وقت میں ہونے والے دو حادثوں نے اسے پہلے سے زیادہ چوکنا کر دیا تھا۔

اسپتال کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی اس نے ڈاکٹر کو کال کی اور معاذ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی تاکید کر دی۔ اسپتال پہنچ کر وہ مومی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ نجی اسپتال تھا، سو مریض کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وقاص کو تسلی دی گئی کہ اس کے مریض کو ہر ممکن بہترین طبی امداد دی جائے گی۔ ادھر پولیس والوں نے تاڑ لیا تھا کہ اس کی جیب میں مال ہے اور وہ اچھی پارٹی ہے، سو وہ بھی اپنی جیبیں بھرنے کے چکر میں اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اس سے الٹے سیدھے سوالات کر رہے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ لینڈ کروزر نے مومی کی بائیک کو کیوں ٹکر ماری؟ وقاص نے اسے کہانی سنائی۔

''میں اور میرا دوست معمر یونہی تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ راستے میں ہمیں ریس لگانے کی سوجھ گئی۔ ریس لگاتے ہوئے مومی مجھ سے آگے نکل گیا اور پھر اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آ گیا۔ میرے خیال میں گاڑی والوں نے اسے ٹکر نہیں ماری ہوگی بلکہ تیز رفتاری کے باعث وہ اوورٹیک کرتے ہوئے خود ہی زد میں آ گیا ہوگا۔'' اس کے اس بیان میں پولیس والوں کے لیے آسانی تھی اور انہیں ہاتھ پیر ہلائے بغیر حادثے کی ذمے داری لڑکے کی بے پروائی پر ڈال کر آرام سے بیٹھ جانا تھا۔ وقاص کے بیان کو قبول کرنے میں انہیں کوئی تامل اس لیے بھی نہیں تھا کہ وقاص نے چائے پانی کے خرچے کے نام پر انہیں اچھی خاصی رقم سے نواز دیا تھا۔ پولیس والوں سے جان چھوٹ جانے پر اسے آزادی نصیب ہوئی تو ادھر اُدھر کے حالات معلوم کرنا شروع کیے۔ اعجاز کی موت کی تصدیق ہوگئی، معاذ کے محفوظ ٹھکانے پر منتقلی کا بھی پتا چل گیا۔ اپنی مشکوک سی سی ٹی وی فوٹیج کے بارے میں بھی علم ہو گیا اور ایسے ہی آہستہ آہستہ ہر خبر علم میں آتی رہی۔ خبروں کے حصول کے ساتھ ساتھ وہ مومی کی خیریت بھی معلوم کرتا جا رہا تھا۔ مومی اس کا کوئی عام ساتھی نہیں تھا۔ وہ اس کا بہت پرانا دوست تھا اور اس کے لیے وہ اتنا فکر مند تھا کہ ایک پل کے لیے اسپتال سے کہیں جانا گوارا نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ چاہتا تو اس کے ایک اشارے پر دس بندے یہاں اس کی جگہ آ کھڑے ہوتے۔ اپنے کسی بھی ساتھی کو کال کرنے کے بجائے اس نے صرف ایک ہستی کو کال کی تھی۔ وہ ہستی مومی کی غیر اعلانیہ منگیتر نیلوفر عرف نیلی تھی۔ نیلی اس کی کال پر دوڑی چلی آئی تھی۔

''کیا ہوا ہے وکی بھائی! کیسے ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے موی کا؟'' خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی نیلی کی سسکیاں نکل گئی تھیں۔

''اتنی بہادر ہوکر روتی ہے۔ رونا دھونا گھر میں بیٹھ کر برتن مانجھنے والی لڑکیوں کا کام ہے۔ تیرے جیسی تیس فٹ اونچی رسی پر سے پلک جھپکتے ہی گزر جانے والی لڑکی روتی اچھی نہیں لگتی۔'' وقاص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔

''وہ دوسری بات ہے وکی بھائی! پر موی کی بات الگ ہے۔ موی کے معاملے میں، میں بہت بزدل ہوں۔'' نیلی نے جذباتی لہجے میں اسے جواب دیا لیکن غیر اختیاری طور پر وہ اپنے آنسو صاف کرتی جارہی تھی۔

''کوئی دوسری بات نہیں ہوتی نیلی! تو موی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر موت کے کنوئیں کا چکر لگاتی ہے تو کیا تجھے معلوم نہیں ہوتا کہ کبھی بھی، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ تو نے ساری زندگی سرکس میں کام کرتے گزاری ہے، تجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ بڑے بڑے بازی گروں کی بازی ایک پل میں پلٹ جاتی ہے۔ اس دنیا کو بھی ایک سرکس یا موت کا کنواں ہی سمجھ جہاں کس کی بازی کب پلٹ جائے، کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' وقاص کے لہجے میں زندگی کی تلخیاں بول رہی تھیں۔

''کیا موی کی حالت بہت خراب ہے؟'' نیلی اس کی گفتگو سے مزید دہل گئی۔

''اچھی حالت میں اسپتال کے بستر پر آکر لیٹ جانے والے وزیر، سفیر، بیوروکریٹس وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہم جیسے تو بُرے حالوں میں ہی یہاں آتے ہیں، پر تو فکر نہ کر، اپنا موی اچھا ہوجائے گا۔ میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے، سارے ٹیسٹ وغیرہ لے لیے ہیں اس کے۔ ٹوٹی ٹانگ کا پلاستر بھی کردیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہوجائے گا۔'' تلخ لہجے میں بولتے بولتے اسے احساس ہوا کہ وہ نیلوفر کو مزید پریشانی میں مبتلا کررہا ہے تو اپنی ٹون بدلی اور اسے تسلی دینے لگا۔ اس کے بعد ان میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بیٹھے انتظار کرنے لگے کہ دیکھو موی کے متعلق کب کیا اطلاع ملتی ہے۔ نیلی کے ہلتے لب ظاہر کررہے تھے کہ وہ زیرلب کچھ پڑھنے میں مصروف ہے۔ یقیناً موی کی سلامتی کے لیے دعائیں ہی مانگ رہی تھی۔ عام سے قمیص شلوار اور دوپٹے میں ملبوس انیس بیس سال کی اس دبلی پتلی، سلونی سی بوٹے قد کی لڑکی کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کیسی ماہر فن اور جی دار ہے۔ تنی ہوئی رسی کو بغیر سہارے کے مہارت سے پار کرجانا، موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے سوار کے پیچھے بیٹھ کر کرتب دکھانا، آگ کے دائرے میں سے ہوا کی طرح گزر جانا، سر پر سیب رکھ کر بندوق تانے نشانے باز کے سامنے بغیر جنبش کیے کھڑے رہنا سب آتا تھا اس لڑکی کو۔ وہ اپنے سرکس کی جان تھی اور خود اس کی جان موی میں تھی، اس لیے اس وقت اس کا حال بُرا تھا۔ وقاص اس کے حال سے بے خبر نہیں تھا۔ خود اس کے اندر بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ موبائل پر اپ ڈیٹس لینے اور ہدایتیں دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا لیکن دھیان بہرحال موی کی طرف ہی تھا۔ اللہ اللہ کرکے انتظار کی مشکل گھڑیاں گزریں اور انہیں موی کی طرف سے یہ مثبت خبر ملی کہ کوئی بہت زیادہ تشویش ناک بات نہیں ہے۔ سر پر گرنے سے اندرونی چوٹ ضرور آئی ہے لیکن معمولی نوعیت کی ہے اور دواؤں کے استعمال سے علاج ہوجائے گا۔ اس خبر کے ساتھ ہی دوسری اچھی خبر یہ ملی کہ موی ہوش میں آچکا ہے لیکن فی الحال اس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وقاص اور نیلی نے اصرار کیا تو انہیں بس اتنی اجازت ملی کہ وہ باہر شیشے میں سے اس کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ دونوں اسی پر راضی ہوگئے۔ شیشے کے پار موی بستر پر اسپتال کے مخصوص کپڑوں میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ دواؤں کے زیراثر معلوم ہوتا تھا اور نظریں یک ٹک چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''موی ٹھیک ہوجائے گا نیلی! وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والا بندہ ہے۔ اسے زندگی کی بازی جیتنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔'' وہ خود جو اتنی دیر سے امید و بیم کے درمیان اٹکا ہوا تھا، موی کی کھلی آنکھیں دیکھ کر جی اٹھا اور نیلوفر کو یقین دلانے لگا۔ نیلوفر نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر آنسو بہاتی آنکھوں سے اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی جس نے اسے اس کے موی کی زندگی کی امید دلا دی تھی۔

☆☆☆

کافی رات ہوچکی تھی لیکن نیند معاذ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ڈاکٹر اسے آرام کرنے کی ہدایت دے کر اپنے کلینک کے لیے روانہ ہوچکا تھا۔ روانگی سے قبل اس نے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی فلیٹ میں لاکر رکھ دیا تھا اور بتایا تھا کہ کلینک سے وہ اپنے گھر چلا جائے گا اور صبح کسی وقت

وہاں کا چکر لگائے گا۔ اس نے توقع ظاہر کی تھی کہ شاید رات میں کسی وقت وکی بھائی فلیٹ پر آ جائے لیکن یہ کوئی پکی بات نہیں تھی، پھر بھی معاذ ایک موہوم سی امید کے سہارے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نیند اسے یوں بھی نہیں آ رہی تھی۔ بے بسی کے احساس نے طبیعت پر بیزاری طاری کر رکھی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے شہر میں واپس آ کر بھی کیرتھر کی پہاڑیوں میں بسی اس بستی میں رہ رہا ہے جہاں رہ کر وہ ساری دنیا سے کٹ گیا تھا، بلکہ وہاں رہنا بھی کسی حد تک آسان تھا کہ کھلی فضا میں سانس لینے اور انسانوں سے ربط ضبط کی تو سہولت تھی۔ یہاں تو وہ ان سہولیات سے بھی محروم تھا۔ وہاں اسے کسی کے متعلق کوئی تکلیف دہ خبر بھی نہیں ملتی تھی لیکن یہاں وہ سب خبریں سن رہا تھا اور بے بس تھا کہ کسی کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا ہے۔ بے بسی کی اسی شدید کیفیت کے تحت اس نے وقاص اور ڈاکٹر کی ہدایات کے برخلاف یہاں سے نکلنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ وہ فلیٹ سے نکل کر نیچے اترنے کے لیے لفٹ میں سوار ہی ہوا تھا کہ لفٹ مین نے اسے گھورنا شروع کر دیا اور پھر سرد لہجے میں پوچھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں سر؟''

''میں کہیں بھی جاؤں، تمہیں اس سے مطلب؟'' معاذ اس کے سوال پر بگڑ گیا۔

''مطلب ہے سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ آپ کو یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں۔ ہاں، اگر آپ کو کوئی ضرورت ہے تو ہمیں بتا سکتے ہیں۔'' لفٹ مین نے مہذب لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ اس دوران لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ چکی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور سیکیورٹی گارڈ کی یونیفارم میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ بھاری تن و توش کے اس آدمی کے بائیں ہاتھ میں ایک جدید گن بھی موجود تھی۔

''صاحب کو اوپر ان کے فلیٹ پر واپس چھوڑ دو شکور اور ان سے پوچھ لو کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' لفٹ مین نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا تو معاذ سمجھ گیا کہ اسی نے اس سیکیورٹی گارڈ کو لفٹ میں بلایا ہے۔

''تم میرے بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟'' لفٹ دوبارہ اوپر کا سفر شروع کر چکی تھی۔ معاذ نے طیش اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں ان سے پوچھا۔

''ہم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں سر! ہمیں جو آرڈر ملا ہے ہمیں اسے ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ اب آگے آپ سمجھ دار ہیں کہ بغیر شور مچائے خاموشی سے اپنی جگہ واپس چلے جاتے ہیں یا شکور کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔'' لفٹ مین کا نرمی سے دیا ہوا جواب بھی اسے اپنے منہ پر طمانچے کی طرح لگا تھا۔ وہ بہت مہذب لہجے میں اسے دھمکا رہا تھا اور وہ مجبور تھا کہ اپنی حالت اور حالات دونوں کی وجہ سے کسی سے جھگڑا نہیں مول لے سکتا تھا۔

لفٹ اوپر جا کر رکی تو کسی کے کچھ کہے بغیر ہی وہ اپنے لیے مخصوص فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سیکیورٹی گارڈ فلیٹ کے دروازے تک اس کے پیچھے آیا۔ معاذ نے اندر جانے کے بعد بیرونی دروازہ اس زور سے بند کیا جیسے سیکیورٹی گارڈ کے منہ پر مار دینے کی خواہش رکھتا ہو لیکن ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اندر آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک غصے سے بل کھاتا رہا۔ فلیٹ کا دروازہ ان لاک چھوڑ کر وہ لوگ مسلسل اسے اس دھوکے میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے آزاد ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بھی اسے بڑی کامیابی سے بے وقوف بنایا تھا اور ڈنر میں فروٹ چاٹ کھلانے کے بعد ضرورت کا تھوڑا سا سامان تھما کر چلا گیا تھا حالانکہ وہ چاہتا تو اپنے زرخرید غلاموں سے بیٹھے بیٹھے بھی سب کچھ منگوا سکتا تھا لیکن پھر معاذ کو اس کی آزادی کا دھوکا کیسے دیا جاتا۔ اس پر اپنی نام نہاد آزادی کا بھانڈا پھوٹا تو یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ پچھلے فلیٹ میں بھی اس کی نگرانی کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہوگا لیکن اس نے وہاں پر باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اس لیے بے خبر رہا تھا۔ اپنے آپ کو یوں بے وقوف بنائے جانے پر وہ بیٹھا تاؤ کھاتا رہا۔ ساتھ ہی یہ فکر بھی لگ گئی کہ جانے وقاص اور اس کے ساتھیوں کی حقیقت کیا ہے اور ہمدردی کی آڑ میں وہ اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ بظاہر تو ابھی تک اس کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا تھا لیکن کون کیا چال چل رہا تھا اس کا بھی تو علم نہیں تھا اور کچھ نہیں تو رہ رہ کر وقاص کی ٹی وی پر دکھائی جانے والی فوٹیج ہی یاد آ جاتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ کسی خطرناک گینگ کا بندہ ہو۔ انہی سوچوں میں گم اس نے کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز سنی اور وقاص کو دروازہ کھولتے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اسے ذرا تولتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کہیں میرے سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں؟'' اسے خود کو یوں گھورتا پا کر اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا اور زمین پر پڑے کشنز پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ابھی تک وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو معاذ نے فوٹیج میں دیکھے تھے البتہ شرٹ مختلف تھی۔

''کون ہو تم؟'' معاذ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں وقاص احمد عرف وکی..... تعارف کروایا تو تھا اپنا۔'' اس نے بے پروا لہجے میں جواب دیا لیکن معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنا بھی انجان نہیں ہے جتنا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں آتے ہوئے لازماً اسے بتا دیا گیا ہوگا کہ معاذ نے وہاں سے باہر جانے کی کوشش کی تھی۔

''میں تم سے تمہارا نام نہیں، مکمل تعارف جاننا چاہتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں اس طرح قید میں رکھنے کا کیا مقصد ہے؟'' آخر کار معاذ پھٹ پڑا۔

''پلیز! بدگمان نہ ہوں۔ آپ یہاں قیدی نہیں، میرے مہمان ہیں۔ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑا ہے، وہ آپ کی نگرانی نہیں، حفاظت پر مامور ہیں اور یہ ان کی ذمے داری ہے کہ آپ کسی وقت جذبات میں آکر یہاں سے نکلنے کا غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔ میں آپ کے معاملے کو بہت اچھے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس بار اس نے کوئی اداکاری نہیں کی اور بہت رسانیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''اسی طریقے سے جس طریقے سے آج ہینڈل کیا ہے؟ کیا قصور تھا اس صحافی اعجاز کا کہ اسے جان سے مار دیا گیا؟'' اس نے جیسے وقاص پر الزام لگایا اور وہ اس الزام کو سمجھ بھی گیا اس لیے چہرے پر اداسی سجا کر بولا۔

''یقیناً آپ نے میری ٹی وی پر دکھائی جانے والی فوٹیج پہچان لی ہے لیکن یقین کریں کہ میرا اعجاز کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں حلیہ بدل کر اس سے ملنے گیا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر پہلے ہی اس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ میں تو اس سے صرف آپ کے سلسلے میں ملنے گیا تھا کیونکہ مجھے پتا چلا تھا کہ اعجاز ان گنے چنے صحافیوں میں سے ایک ہے جس نے کبھی اپنے قلم کی آبرو پر حرف نہیں آنے دیا۔ اعجاز کے قتل کو تو میں خود ایک نقصان کردان رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نہیں۔'' معاذ نے سر کو زور سے نفی میں جنبش دی۔

''بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی تم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہاری اس بات کو سچ مان سکتا ہوں کہ اعجاز کے قتل سے تمہارا کوئی تعلق نہیں لیکن ایسا بہت کچھ ہے جو تم نے مجھے نہیں بتایا ہے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتاتے ہو یا نہیں۔ اگر تم سچ نہیں بولنا چاہتے تو مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو اور دیکھو یہ مت سمجھنا کہ میں تم یا تمہارے آدمیوں سے ڈر کر چپ بیٹھ جاؤں گا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو کچھ اور ہو نہ ہو، اچھا خاصا ہنگامہ ضرور ہو جائے گا اور شاید یہ تمہارے مفاد میں نہ ہو۔''

''ہنگامہ تو آپ کے اپنے مفاد میں بھی نہیں ہے۔ ایسا کر کے آپ اپنے دشمنوں کو اپنی طرف متوجہ کریں گے لیکن خیر میرے خیال میں آپ کو فی الحال میری یہ بات سمجھ نہیں آئے گی اس لیے میں آپ کا مطالبہ پورا کر دیتا ہوں اور آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا ہوں پھر اس کے بعد آپ فیصلہ کر لیجیے گا کہ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں یا نہیں۔'' وقاص نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور تھوڑی دیر یوں خاموش بیٹھا رہا جیسے جو کچھ کہنا چاہتا ہو اس کے لیے اپنے الفاظ کو ترتیب دے رہا ہو۔ آخر کہنا شروع کر دیا۔

''میں نے سرکس کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ میں، میری ماں اور میری جڑواں بہن، بس ہم تین لوگ تھے ہمارے خاندان میں۔ باپ کے بارے میں جب بھی پوچھا، ماں نے بس اتنا بتایا کہ وہ بہت امیر اور طاقتور آدمی تھا۔ ہم اس کے ساتھ کیوں نہیں رہتے یا وہ ماں کو کیوں چھوڑ کر چلا گیا، اس بارے میں ماں نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھول جاؤ کہ باپ بھی کوئی رشتہ ہے۔ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہاری ماں ہوں اور یہ سرکس ہماری دنیا۔ میں یا میری بہن اس سے کبھی زیادہ اصرار اس لیے نہیں کر سکے کہ وہ ہمارے اصرار پر رونے لگتی تھی اور ہمیں ماں کا رونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ تو ہنستی، مسکراتی، ناچتی، گاتی ہی اچھی لگتی تھی۔ میری ماں سرکس کی سب سے خوبصورت عورت تھی اور لوگ اس کا آگ کے شعلوں کے درمیان کرتب نما رقص دیکھنے بہت شوق سے آتے تھے۔ میں نے چونکہ اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لیے مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ کوئی معیوب کام ہے۔ میں خود سرکس کا حصہ تھا اور کم عمری ہی میں میرے ماہر بازی گر ہونے کی پیش گوئیاں ہونے لگی تھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں، میں نے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل کے علاوہ کار تک چلانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ میں پلک جھپکتے میں رسی پر لنک کر بلند مقام تک پہنچ جاتا تھا۔ آگ کے شعلوں کو پھلانگ جاتا تھا۔ میں منہ سے جلتا ہوا آگ کا گولہ نکال کر دکھا دیتا تھا۔ میری طرح میری بہن بھی سرکس کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ شکل وصورت میں بالکل ماں پر گئی تھی اور ماں ہی کی طرح خوبصورت آواز اور رقص کی صلاحیت پائی تھی، اس

لیے پندرہ سال کی عمر میں وہ سرکس میں ماں کی جگہ لے چکی تھی۔ ماں نے اپنا فن اس میں منتقل کرنے کے بعد خود ریٹائرمنٹ لے لی۔ میری ماں بیمار رہنے لگی تھی اور اس کی کام کرنے کی ہمت ختم ہوگئی تھی اس لیے وہ خود شو نہیں کرتی تھی لیکن میری بہن کو شو کرنے کے دوران خود سارا وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیٹی حسین ہے اور حسین صورتیں لوگوں کو بدنظری پر اکساتی ہیں۔ اپنے تئیں وہ بیٹی کے آس پاس رہ کر اس کی حفاظت کرتی تھی لیکن جب بری گھڑی آئی تو اس کے ناتواں بازو بیٹی کی حفاظت میں ناکام ہوگئے۔'' معاذ نے دیکھا کہ داستان کے اس موڑ پر آکر وقاص کی آنکھیں لہو رنگ ہونے لگی تھیں اور وہ بولتے ہوئے یوں بار بار تھوک نگل رہا تھا جیسے کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک رہی ہو۔

''یہ جن دنوں کی بات ہے، ان دنوں ہماری سرکس کمپنی فیصل آباد میں رکی ہوئی تھی۔ میرا موت کے کنوئیں میں کار چلانے والا شو بہت ہٹ جا رہا تھا اور لوگوں کا اتنا رش ہوتا تھا کہ ہر تھوڑی دیر بعد مجھے کرتب دکھانے کے لیے موت کے کنوئیں میں کار چلانے کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ لوگ میری مہارت پر خوش ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا کر داد دینے کے ساتھ ساتھ سکّوں اور نوٹوں کی برسات بھی کر دیتے تھے۔ اس روز بھی میں لوگوں کے دل خوش کر کے اپنی روزی کمانے میں مصروف تھا کہ میری دنیا لٹ گئی۔ میری طرح اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اپنی روزی کمانے والی میری معصوم بہن کم بخت بدنظروں کی نظر میں آگئی۔ انہوں نے ہجوم کی پروا کیے بغیر اسے اٹھا لے جانے کی کوشش کی۔ سرکس کی انتظامیہ اور میری ماں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہتھیار نکال لیے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں نے خوف زدہ ہو کر ان غنڈوں کا راستہ چھوڑ دیا لیکن ممتا کی ماری ماں کیسے کسی کو اپنی بیٹی یوں اٹھا کر لے جاتے دیکھ سکتی تھی۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ یہاں تک کہ حفاظت کے خیال سے ہر دم اپنے پاس رہنے والی چھری نکال کر ایک غنڈے کے بازو میں بھی گھونپ ڈالی لیکن اس کی ممتا چند انچ کی سیسے کی گولی سے ہار گئی۔ ظالموں نے اسے عین سینے میں گولی ماری تھی اور گولی اس کے دل میں اتر کر اسی وقت اسے ہمیشہ کی نیند سلا گئی تھی۔ جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، میں موت کے کنوئیں میں گاڑی چلا رہا تھا۔ فائرنگ اور شور کی آوازیں مجھ تک بھی پہنچی تھیں لیکن مجھے بہت زیادہ تشویش اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ کبھی کبھی ہمیں اس طرح کی بدنظمی کا سامنا ہو ہی جاتا تھا۔ وہ تو جب میں موت کے کنوئیں سے باہر نکلا تو پتا چلا کہ میری زندگی اندھیر ہو چکی ہے۔ رانی کو اٹھا لے جانے والے کون تھے اور کس نے میری ماں کو گولی ماری، کوئی نہیں بتا سکا۔ پولیس آئی، کارروائیاں ہوتی رہیں لیکن نہ تو میری ماں کا قاتل گرفتار ہوا اور نہ ہی میری بہن رانی بازیاب ہو سکی۔ ان دنوں میری حالت دیوانوں کی سی تھی اور میں چوبیس گھنٹے پولیس اسٹیشن کے باہر ڈیرا ڈالے رہتا تھا کہ مجھے انصاف دلاؤ۔ پولیس میرے مطالبے پر اور تو کچھ نہ کر سکی لیکن ایک دن میری بہن کی کٹی پھٹی، گلی ہوئی لاش میرے حوالے کر دی۔ میں ماں کو قبر میں اتارتے ہوئے اتنا نہیں تڑپا تھا جتنا اس کی لاش دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔ وہ میری ماں جائی تھی، ہم ماں کی کوکھ سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ہم نے زندگی کا ہر دکھ سکھ ایک دوسرے سے بانٹا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کی لاش اس حال میں دیکھ کر نہ تڑپتا۔ میں تڑپا اور ایسا تڑپا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ میں نے پولیس والوں کو گالیاں دیں، ان کے گریبان پکڑے، ان پر پتھر برسائے اور چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ وہ مجرموں کے ساتھی ہیں اسی لیے مجرموں کو نہیں پکڑتے۔ میرے اس پاگل پن کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنی بہن کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکا اور لاک اپ سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر چیختا رہا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانے دو کہ میں اپنی رانی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار سکوں لیکن ان ظالموں پر میری کسی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس ظلم نے میرے اندر اتنا غصہ بھر دیا کہ جب کھانا دینے کے لیے ایک سپاہی میرے لاک اپ میں آیا تو میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ممکن تھا کہ میں اسے گلا گھونٹ کر مار ہی ڈالتا لیکن ساتھی قیدیوں اور دوسرے سپاہیوں نے مل کر اسے مجھ سے چھڑا لیا۔ اس سنگین جرم کے الزام میں مجھ پر بڑا سخت پرچہ بنوایا گیا۔ اگر سرکس کا مالک بھاگ دوڑ نہ کرتا اور میرے لیے اچھے وکیل کا انتظام نہ کرتا تو میں لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جاتا۔ وکیل نے اپنی مہارت اور قابلیت سے عدالت پر ثابت کیا کہ اپنے ساتھ بیتنے والے حادثات کی وجہ سے میں ذہنی عدم توازن کا شکار تھا اور چونکہ پولیس کی جانب سے مجھے بہن کے جنازے میں شرکت نہ کرنے دینے کی زیادتی ہوئی تھی، اس لیے مجھ سے وہ سنگین حرکت سرزد ہوگئی۔ عدالت نے میرے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا اور میرا ذہنی علاج کروانے کے بعد مجھے صرف تین سال کی سزا سنائی۔ جیل کے تین سالوں نے جہاں مجھے بہت سے زخم

دیے، وہیں بہت کچھ سکھایا بھی اور کچھ دوست بھی عطا کیے۔ ان دوستوں میں لالہ عیسیٰ اس وقت شامل ہوا جب مجھے بچہ جیل سے بڑوں کی جیل میں منتقل کیا گیا۔ لالہ عیسیٰ مجھے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ وہ انڈر ورلڈ کا ایک بہت بڑا نام ہے لیکن مجھ سے بالکل بچوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ کچھ میری صلاحیتوں کا کمال ہے اور کچھ لالہ عیسیٰ کی نظرِ کرم کہ میں چند سالوں میں ہی گینگ میں خاص مقام حاصل کر گیا ہوں اور مجھ سے بڑی عمر کے لوگ بھی مجھے عزت سے وکی بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنی اس زندگی سے میں مطمئن ہوں یا نہیں، یہ بات میں خود بھی نہیں جانتا لیکن اپنی ماں اور بہن کی موت اور اپنی بے بسی کا زخم اب بھی میرے سینے پر بالکل تازہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی بے بس اور شریف انسان کو ظلم کا شکار ہوتے دیکھتا ہوں تو خود کو اس کی مدد سے روک نہیں پاتا۔ امید ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے آپ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔'' اپنی داستان مکمل کر کے اس نے معاذ کی طرف زخمی نظروں سے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور آہستہ سے بولا۔

''سوری یار! مجھ سے تمہیں سمجھنے میں تھوڑی سی غلطی ہو گئی لیکن امید ہے کہ یہ سمجھ کر نظر انداز کر دو گے کہ میں جن حالات کا شکار ہوں، اس میں بندے سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔'' معاذ نے دوستانہ لہجے میں اس سے معذرت کی۔

''ساری غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں تو پلیز، اب مجھے سونے کی اجازت دے دیں۔ باقی سوالوں کے جواب میں آپ کو پھر کبھی دے دوں گا۔ فی الحال میں تھوڑی دیر نیند لے کر فریش ہونا چاہتا ہوں۔ صبح مجھے اسپتال جانا ہے۔ وہاں میرا ایک جگری دوست ایڈمٹ ہے۔''

''ٹھیک ہے، سو جاؤ۔ میں بھی اب سوؤں گا۔'' معاذ نے اس کے معصوم انداز میں درخواست کرنے پر ہنس کر کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ذہن پر موجود بوجھ کسی حد تک کم ہو جانے کی وجہ سے اس بار اسے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور تھوڑی ہی دیر میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو وقاص جاچکا تھا۔ وہ فریش ہو کر کچن میں آیا تو وہاں ناشتے کے لوازمات موجود تھے۔ اس نے دیگر چیزوں کو نظر انداز کر کے دودھ میں کارن فلیکس ڈالا اور پیالے میں چمچہ گھماتا ہوا لاؤنج میں آبیٹھا۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی آن کیا اور دھیرے دھیرے کارن فلیکس کھاتا ہوا خبریں دیکھنے لگا۔ زیادہ تر گزشتہ روز کی ہی خبریں تھیں لیکن وہ نئے سرے سے تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اس کے کارن فلیکس کھانے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ خود کو اس تکلیف سے نکالنے کے لیے اس نے ٹی وی بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے اس فیصلے پر عمل کے لیے ابھی اس نے ریموٹ اٹھایا ہی تھا کہ بریکنگ نیوز کا اعلان کیا جانے لگا۔ اس کی انگلی پاور آف کا بٹن دباتے دباتے رک گئی۔ نوک پلک سے تیار طرح دار نیوز کاسٹر سنسنی خیز لہجے میں خبر سنا رہی تھی۔

''میڈیکل کالج کے طالب علم کا کھلے عام اغوا۔ تفصیلات کے مطابق طالب علم سعد ہاسٹل سے کالج جانے کے لیے نکلا تھا کہ راستے میں اسے روک لیا گیا اور اغوا کار اسے اسلحے کے زور پر جعلی نمبر پلیٹ والی گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ واضح رہے کہ طالب علم سعد، یونیورسٹی کے اس طالب علم معاذ کا بھائی ہے جو کچھ عرصہ قبل کیرتھر کی پہاڑیوں پر غائب ہو گیا تھا اور جس کی بازیابی کے سلسلے میں صحافی گزار عاصم کی بیٹی بشریٰ گلزار نے بھرپور کمپین چلاتے ہوئے معاذ کے غیاب کا الزام مشہور بلڈر یزدانی اور صنعت کار سیاست دان عرفان اللہ کے بیٹوں پر لگایا تھا۔'' نیوز کاسٹر خبر نہیں سنا رہی تھی، معاذ کے وجود پر برچھیاں چلا رہی تھی۔ سعد..... اس کا پیارا بھائی سعد دن دہاڑے اغوا کیا جاچکا تھا۔ یہ کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ اس خبر کو سن کر اس کا پورا وجود ساکت ہو گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر اب وہ مقام دکھایا جا رہا تھا جہاں سے سعد کو اغوا کیا گیا تھا۔ نیوز چینل کا نمائندہ ہاتھ کے اشارے سے وہ بائیک دکھا رہا تھا جس پر سعد سوار تھا۔ معاذ اس موٹر سائیکل کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ یہ اس کی اپنی موٹر سائیکل تھی۔ اس موٹر سائیکل کے مرر پر ایک بار ماضی میں اسے بشریٰ کا ساتھ دینے پر دھمکی آمیز پیغام ملا تھا۔ اس نے وہ مرر تبدیل کروالیا تھا لیکن آج پھر مرر پر پرمنٹ مار کر سے اس کے نام ایک مختصر پیغام لکھا تھا۔ چینل کا نمائندہ اس مختصر پیغام کو پڑھتے ہوئے حیرت کا اظہار کر رہا تھا کہ یہ پیغام کس نے اور کیوں دیا ہے؟ کیمرا مرر کو زوم کر کے پیغام کے الفاظ دکھا رہا تھا۔ سرخ رنگ سے لکھا وہ تین لفظی پیغام معاذ خود اپنی آنکھوں سے پڑھ سکتا تھا۔ وہاں لکھا تھا۔ ''معاذ! کم بیک۔''

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

میں اس بات پر بالکل بھی راضی نہیں تھا کہ اس سے ہوں کیونکہ اس وقت میں بالکل بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی اس سے شادی کرے۔ میرا خیال تھا کہ ایک دفعہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرلے پھر عملی زندگی میں کسی عملی قسم کے آدمی کو پسند کر کے اس سے شادی کرے۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص سے شادی نہیں کرے گی جو صرف میری پسند کا ہو۔ ارینج میرج کے نام سے ہی اسے چڑ تھی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی شادی خوابوں کی دنیا میں رہنے

بے درد مسیحا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

دنیا میں کئی جگہ انقلاب برپا ہوئے، کہیں اثرات مثبت نکلے اور کہیں برپا ہونے والے یہ انقلاب دیرپا ثابت نہ ہو سکے... کیونکہ جب مظلوموں کے خواب بکھر جاتے ہیں تو ہمت اور گروہ سب بکھر جاتے ہیں... کچھ ایسا ہی حال ان کا بھی تھا مگر بے بس... صرف دل میں ایک درد کا احساس لیے جینے پر مجبور تھے...

مایوس کن لمحات میں بے درد مسیحاؤں کے بے وقت چلن کا قصہ.....

والے کسی ایسے آدمی سے ہو جو دنیا کے اصل داؤ پیچ سے واقف نہ ہو۔

آج کل کے بچے شادی کے ارادے کے بارے میں شکوک میں مبتلا رہتے ہیں اور اریج قسم کی شادی کو تو کسی عذاب سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔ میری بھی ارینج شادی ہی ہوئی تھی۔ حنا میری زندگی میں بہار کی طرح آئی اور بہار کی طرح ہی چھائی رہی تھی، کرن میری بیٹی اس کی نشانی تھی۔ حنا کی زندگی میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے بعد کوئی بھی لڑکی مجھے جچے گی ہی نہیں۔

میری بہنیں، ماں اور باپ سب ہی مجھے کئی سالوں تک سمجھاتے رہے کہ کرن کے لیے بھی بہتر ہے کہ میں دوسری شادی کرلوں۔ میں تھوڑا بہت قائل بھی ہوجاتا تھا مگر نہ جانے کیوں حنا کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے میرا دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ شادی سے پہلے میں نے حنا کو دیکھا تک نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابو، امی اور بہنوں کی پسند اچھی ہی .... ہوگی۔ یہی بات سچ بھی ثابت ہوئی۔ شادی کے تھوڑے دنوں بعد ہی سے میں اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ تھوڑی سی زندگی جو ہم نے ساتھ گزاری اس کی شاندار یادیں ایسی تھیں کہ وہ میرے جسم وجاں اور روح کا حصہ بن کر رہ گئی تھی۔

شادی کے فوراً بعد میں اسے لے کر نیویارک آگیا تھا۔ اس زمانے میں، میں نیویارک کے ایک علاقے کوئنز میں ایک کشادہ اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ زندگی نے بے شمار کامیابیاں میری جھولی میں ڈال دی تھیں۔ میرا اچھا کاروبار تھا، اچھی آمدنی تھی، پاکستان میں کوئی خاص ذمے داری نہیں تھی، امریکا میں مالی طور پر آسودہ لوگوں سے میری دوستی تھی۔ زندگی جتنی بھی حسین ہوسکتی تھی، اتنی ہی حسین تھی۔

شروع کے تین سال تو نہ جانے کیسے گزر گئے۔ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا اور وہ بھی کسی دیوتا کی طرح میری پرستش کرتی رہی، میں اس کا عاشق تھا اور وہ میری۔ ہم دونوں نے پورے امریکا کو ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک سڑکوں سڑکوں گھوما اور جس شہر میں جو بھی قابلِ ذکر چیز تھی اسے دیکھتے گئے۔ حنا کو تاریخ اور عجائب گھروں سے بہت دلچسپی تھی۔ میں جب کام پر ہوتا تو وہ دنیا اور امریکی تاریخ کو کھنگالنے میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ میں کئی سالوں سے امریکا میں تھا مگر مجھے امریکی تاریخ سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ امریکا کے قدیمی لوگ کہاں سے آئے تھے۔ وہ کیسے رہتے تھے، ان کا کیا مذہب تھا، چیف شیاٹل کون تھا اور تھینکس گیونگ کی چھٹیاں کیوں ہوتی ہیں۔ امریکا میں گورے کیسے پہنچے تھے، کالوں کو کس طرح غلام بنا کر لایا گیا تھا اور کس طرح سے انہیں غلام بنا کر رکھا گیا تھا۔ حنا کی وجہ سے مجھے امریکی تاریخ کے ان گنت عجیب وغریب واقعات کا پتا لگا۔ اسے امریکا اور دنیا کی تاریخ پر اچھی دسترس حاصل تھی۔

حنا کی ہی وجہ سے ہم دونوں ایک بار دس دنوں کے لیے واشنگٹن گئے، جہاں کے پانچ بڑے میوزیم میں ہم دونوں نے دل بھر کے دن گزارے تھے۔ امریکی تاریخ کے عجائب گھروں کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ امریکی اپنی برائیوں کو نہیں چھپاتے ہیں۔ امریکی جنگِ آزادی ہو کہ جنگِ عظیم، ویت نام کی جنگ ہو یا امریکا کے اندر کی خانہ جنگی، وہ سب کچھ تاریخ کا حصہ تھی اور اسے اس کی اصل شکل میں دکھایا اور بتایا گیا ہے۔ اچھی یا بری تاریخ سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ قومیں جو اپنی کمزوریوں کو چھپا کر رکھتی ہیں اس کے بارے میں بات ہی نہیں کرنا چاہتی ہیں، وہ دنیا میں کیسے رہ سکتی ہیں۔ حنا کی تاریخ میں دلچسپی کی وجہ سے میں بھی ایک اچھا خاصا تاریخ داں بن گیا اور مجھے بھی تاریخ اور تاریخی واقعات سے دلچسپی ہوگئی تھی۔

شادی کے چوتھے سال کرن روشنی کی طرح ہماری زندگیوں میں جلوہ گر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے وہ چار سال کی ہوگئی تھی، ہم دونوں کسی دوسرے بچے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ یکا یک حنا کی طبیعت خراب ہوئی اور پتا لگا کہ حنا کو خون کا سرطان ہوگیا ہے۔

تین سال..... تین سال کس طرح گزرے اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک چھوٹی سی بیٹی، ایک اس کی ماں اور یہی میری محبوب بیوی جو بڑی تیزی سے موت کی جانب سفر کررہی تھی اور ایک اکیلا میں۔ بہت دنوں تک تو میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں کہ حنا بیمار ہے۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تیزی سے زندگی کی بازی ہار رہی ہے کیونکہ میں خود بھی ذہنی طور پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے میڈیکل سائنس پر یقین تھا کہ ڈاکٹر اسے بچالیں گے۔ دوائیں، ریڈیو تھراپی، ٹرانسپلانٹ سرجری، کچھ نہ کچھ ہوجائے گا اور میری حنا بچ جائے گی۔ حالانکہ ڈاکٹروں نے صاف صاف بتادیا تھا کہ آج کل کے علاج کے ذریعے زندگی تھوڑی

طویل تو ہو جائے گی مگر مکمل طور پر صحت یابی ممکن نہیں ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ نیو یارک کے کینسر اسپتال کی ڈاکٹر نے مجھے تفصیل سے سب کچھ سمجھایا مگر میں اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔

حنا نے بڑی بہادری سے اپنی بیماری کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر مری اور ہر ایک دن اس نے مجھے اور کرن کو چاہا۔ آخر کے دنوں میں، میں اور کرن اس کے ساتھ ساتھ رہے اور ایک دن وہ میرا اور کرن کا ہاتھ پکڑے پکڑے چلی گئی۔ ہمیشہ کے لیے انجانے سفر پر۔

میری زندگی کرن کی زندگی کے چاروں طرف گھومتی رہی تھی، حقیقت تو یہ ہے کہ اس چھوٹی سی بچی نے میری زندگی پر راج کیا تھا۔ ہر ایک بات اس کی مانی تھی میں نے اور شاید وہی تھی جس کی وجہ سے کبھی بھی کوئی اور عورت میری زندگی میں نہیں آسکی یا میں نے اسے آنے ہی نہیں دیا۔

کرن پڑھتی رہی، اسکول سے نکلی، کالج چلی گئی اور کالج سے اسے نیو یارک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے داخلہ مل گیا۔ کرن میں اس طرح کی تعلیم کے جراثیم حنا سے آئے تھے۔ محسن سے اس کی ملاقات یونیورسٹی میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اس سے دو سال سینئر تھا اور اسی کی طرح سے اینتھروپولوجی میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ مجھے ان دونوں کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن شادی جیسے فیصلے پر یقینی طور پر بہت سارے اعتراضات تھے۔ میرے اعتراضات کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ کرن اور محسن کی دوستی محبت میں بدل گئی ہے اور آخر کار میں اس بات پر تیار ہو گیا تھا کہ محسن سے ملاقات کروں۔

محسن سے پہلی ملاقات خوشگوار تھی۔ وہ دبلا پتلا اور لانبے قد کا مالک دلچسپ قسم کا بندہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی جو ٹھوڑی پر تھوڑی زیادہ بڑھی ہوئی تھی، گورے چٹے رنگ پر سنہری مائل سے بال اس پر خوب جچتے تھے۔ بھری بھری مونچھیں تھیں جنہوں نے اس کے ہونٹوں کو چھپایا ہوا تھا۔ اس نے جینز کے اوپر کھدر کا کرتہ پہنا ہوا تھا اور گلے میں سرخ و سیاہ رنگ کا مفلر تھا۔ مفلر کے سرخ رنگ کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل اور بھی زیادہ پُرکشش ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔ اس کے والدین نیو جرسی میں رہ رہے تھے۔ اس کے ماں اور باپ دونوں ہی ڈاکٹر تھے اور بہت پہلے ہندوستان سے امریکا آکر آباد ہو گئے تھے۔ وہ پیدائشی امریکی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ امریکا میں پڑھنے پڑھانے کے باوجود اس کی اردو بہت شستہ تھی۔ وہ حیدر آبادی انداز میں اردو بول رہا تھا جو میرے کانوں کو بہت بھلا لگا۔

”تمہاری اردو بہت اچھی ہے۔“ میں نے اس سے کہا تھا۔

”جی ہم لوگ گھر میں ہندی ہی بولتے ہیں۔ میرے ابا، اماں اور خاص طور پر میری دادی، وہ ہر وقت ہی اردو ہندی میں بات کرتی ہیں اور ان کی ہی وجہ سے میں کئی دفعہ حیدر آباد بھی گیا ہوں۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں ان کے ساتھ جاتا تھا مگر اب تو وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہیں اور میں اکیلا ہی جاتا ہوں اور ان کے لیے کتابیں رسالے لے کر آتا ہوں۔“ وہ ہنس دیا تھا۔ ”جب بھی واپس آتا ہوں تو مجھے سونگھ سونگھ کر کہتی ہیں کہ تم سے حیدر آباد کی خوشبو آتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ زور سے ہنسا تھا۔

محسن کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ وہ سوشلسٹ تھا، اسے امریکا سے شکایت تھی، اسے سرمایہ داری نظام سے نفرت تھی، اس کا خیال تھا کہ منظم اور پُرتشدد مذہب سارے مسائل کی جڑ ہے۔ دنیا بھر سے غلامی کا نظام ختم کرنا ہوگا۔ وہ کارل مارکس کا مداح تھا، کارپوریٹ سیکٹر، ملٹی نیشنل اور بینکنگ کے بارے میں اس کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔ دنیا کی سیاست میں امریکا اور یورپی ممالک کے کردار کے بارے میں اس کے خیالات بہت واضح تھے اور ایشیا، افریقا کے ممالک میں سیاستدانوں کی نااہلی کے سلسلے میں اس کا ایک خاص نظریہ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں اس کے چاروں طرف جمع رہتے ہوں گے۔ اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی، ظالمانہ کشش۔ کرن کا متاثر ہونا میری سمجھ میں آگیا تھا۔

محسن سے اور بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ میرے گھر آتا جاتا رہا اور کئی دفعہ اس کے ساتھ مختلف ریسٹورنٹ میں اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کا موقع ملا۔ ہر بار اس نے مجھے متاثر کیا۔ ہر بار وہ اپنے خاندان کی بات ضرور کرتا۔ ہر بار اپنی دادی کا کوئی نہ کوئی قصہ ضرور سناتا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی زندگی پر اس کی دادی کافی اثر انداز ہیں۔ اسے ہندوستان و پاکستان کے سماجی حالات کا خوب پتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ دونوں ملک نام کے آزاد ہیں کیونکہ ان ملکوں کے عوام ابھی تک غلام ہیں اور یہاں ان ملکوں کے بڑے لوگوں کی ہی حکومت ہے۔ میری دادی کہتی ہیں کہ ہندوستان کو جو آزادی

انگریزوں سے ملی ہے، وہ ہندوستان کے عوام کو نہیں ملی ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا اور اس کے خیالوں کی طرح اس کے خواب بھی تھے۔ امریکا کے بارے میں، یورپ کے بارے میں، ساری دنیا کے بارے میں۔ نوجوان ایسے ہی ہونے چاہئیں، خواب دیکھنے والے، وہ ہمیشہ بچپنے میں ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھار سوچتا تھا کہ محسن عام پاکستانی ہندوستانی امریکن بچوں سے مختلف کیوں ہے۔ اس کا اندازِ فکر جداگانہ تھا، وہ کچھ مختلف کرنا چاہتا تھا اور مختلف ہی کر رہا تھا۔ عام طور پر پاکستانی بچے کمپیوٹر، میڈیسن، انجینئرنگ پڑھتے ہیں، وہ اینتھروپولوجی پڑھ رہا تھا۔ بہت سارے پاکستانی بچے سارے امریکا بھر کو مسلمان کرنا چاہتے ہیں، وہ ساری دنیا میں انصاف چاہتا تھا۔ کچھ پاکستانی بچے پاکستان جا کر جہاد میں شامل ہو کر شہید ہونا چاہتے ہیں۔

ایک دن اس نے ہم دونوں کو اپنے گھر مدعو کرلیا۔ مجھے پتا تھا کہ ایک دن مجھے اس کے امی ابو سے ملنا ہوگا۔ ایک دن یہ رشتے داری ہو جائے گی کیونکہ کرن اور محسن ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میرے چاہنے نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ دونوں ساتھ ہی رہیں گے، اسی لیے میں خود بھی چاہ رہا تھا کہ محسن کے گھر والوں سے مل لوں۔ ایک دن کرن نے تو چلے ہی جانا تھا۔ یہی دنیا کا دستور ہے، وقت کس کے لیے ٹھہرا ہے۔ میرے لیے بھی نہیں ٹھہرے گا۔ مناسب یہی تھا کہ میں اس کے خاندان کے لوگوں سے تعلقات قائم کرلوں۔

محسن کے امی ابو دونوں ہی اس کی طرح خوش مزاج لوگ تھے۔ دلچسپ اور گرمجوش۔ مجھے شروع سے ہی اندازہ ہوگیا کہ میری خوب جمے گی۔ تھوڑی دیر ان سے بات چیت میں گزری ہی تھی کہ محسن کی دادی اپنے واکر کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی محسن کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''یہ ہیں میری دادی، میری باغی دادی، جنہوں نے مجھے ہندی اور اردو سکھائی ہے۔''

میں نے خوبصورت بوڑھی عورتیں کم ہی دیکھی ہیں۔ ان کی عمر نوّے سال سے زائد تھی اور وہ خود واکر کے سہارے چلتی ہوئی آئی تھیں۔ محسن جیسا ہی گورا رنگ، چوڑی پیشانی اور ستواں ناک کے ساتھ پتلے پتلے ہونٹ۔ ابھی بھی وہ ہنستی تھیں تو ان کے دونوں گالوں پر گڑھے نمودار ہو جاتے تھے۔ وہ حیدر آبادی لہجے میں صاف اردو بول رہی تھیں۔ ان کی پوری شخصیت میں ایک خاص قسم کا حسن تھا، ایک ٹھہراؤ۔ وہ انتہائی جاذبِ نظر شخصیت کی مالک تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ محسن کے اندر آپ کا باغی بولتا ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔ ''نہیں میں صرف ایک آواز ہوں باغی تو محسن کے دادا تھے جنہوں نے صرف بغاوت کی بلکہ بغاوت کی آگ میں جل بھی گئے۔ یہ کہہ کر وہ رکیں۔ کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ''باغی تو مخدوم اور اس کے ساتھی تھے، میں تمہیں باغی مخدوم کے کچھ شعر سناتی ہوں، جس نے ہم سب کی زندگیوں میں بغاوت گھول دی تھی۔'' پھر وہ آہستہ آہستہ بولی تھیں۔

برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو نہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ میں اب آگ لگانے دے مجھے

اسی آگ میں محسن کے دادا جل گئے اور وہی آگ محسن کے چاروں طرف نظر آتی ہے مجھے۔'' انہوں نے بڑے غرور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم سب ہنس دیے مگر میں ان کے حافظے اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس دبلی پتلی بوڑھی عورت کا اپنا ایک کیریکٹر ہے، ایک شخصیت ہے، اپنا ایک وجود اور اس وجود کے اندر سوچنے سمجھنے والا ایک دماغ۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ اور اپنا اور اپنے شوہر کا سب کچھ اپنے پوتے کو دینے کی کوشش میں لگی رہی ہیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ محسن کی سوچ مختلف کیوں ہے۔ وہ دوسرے ہندوستانی پاکستانی بچوں سے جدا کیوں ہے۔

کھانے کی میز پر بات بڑھ گئی۔ انہوں نے بتایا وہ اور محسن کے دادا حیدر آباد میں تلنگانہ کی انقلابی تحریک کے دوران ملے تھے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ حیدر آباد کے آس پاس کوئی جگہ ہے جہاں پاکستان ہندوستان بننے سے پہلے کوئی انقلابی مہم چلی تھی، جہاں کسان جاگے تھے، جو دھرتی مالک بننے کا خواب دیکھتے ہوئے زمینوں پر قابض ہو گئے تھے، جنہوں نے نوابوں، راجاؤں، جاگیرداروں زمینداروں کے خلاف بغاوت کی تھی۔

پاکستان میں تو ہم لوگوں کو اس بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا اور نہ ہی ہمیں کچھ بتایا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور ہندوستان سے نفرت بھری تاریخ پڑھائی جاتی ہے، ایسے ہی جیسے ہندوستان میں ہر طرف مسلمانوں کے خلاف نفرت کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تلنگانہ میں کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے مل کر زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ نظام دکن، ان کے سپاہیوں اور خاکسار تحریک کے کارکنوں نے غریب کسانوں کے گاؤں جلائے تھے۔ ان کی عورتوں کی آبروریزی کی تھی، ان کا قتلِ عام کیا تھا۔ تاریخ کی ان بے درد حقیقتوں کا مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ مخدوم محی الدین نام کے اس شاعر کے بارے میں نظام دکن کا حکم تھا کہ اسے مار دیا جائے۔ ان تمام باغیوں کو تلنگا کہا جاتا تھا، مجھے یاد آیا تھا کہ کراچی میں یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران انقلابی قسم کے طالب علموں کو جو چی گویرا کے ٹی شرٹ پہنتے اور ماؤ کیپ سر پر لگاتے، تلنگا ہی کہا جاتا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اس بغاوت کے دوران چار ہزار سے زائد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ تلنگانہ کی بغاوت میں حصہ لینے والا کوئی حسن ناصر بھی تھا جسے بعد میں پاکستان میں ایوب خان کے دور حکومت میں پھانسی لگا دی گئی تھی جس کی لاش کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ انہیں پاکستان کے بارے میں وہاں کی سیاست کے بارے میں اور وہاں کے مزدوروں کسانوں سے ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ بہت کچھ پتا تھا۔ ان کی دلچسپی مزدور، کسان اور انقلاب میں برقرار رہی تھی۔''

انہوں نے بتایا کہ وہ بھی کسانوں کے ساتھ جدوجہد میں شامل تھیں، جہاں ان کے والد کسانوں کی مدد کر رہے تھے۔ سترہ سترہ دیہاتوں کو ملا کر ایک کمیون بنایا گیا تھا جہاں زمینیں کسانوں کو دے دی گئی تھیں اور زمینداروں سے بغاوت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اسی کمیون میں ان کی ملاقات محسن کے دادا محسن شاہ سے ہوئی اور ان دنوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ وہ محسن ہی کی طرح کے تھے، شعلہ بیان اور ہر پل بے چین۔ کسی بڑے کام کو کرنے کے لیے تیار۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں آگ لگا دی تھی، وہ مخدوم اور راج بہادر کے ساتھ ساتھ ہر جگہ پہنچے ہوتے تھے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں اور دور دیکھتے ہوئے جیسے اپنے ذہن کے پردے پر کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

برکھارت میں
ستمبر 2020ء کے
شمارے کی جاودانیاں

اولین صفحات

برائی کا وجود نا قابلِ برداشت تھا اُس کا خاتمہ ضروری تھا۔ قاتل کے پیچھے قاتل تھا۔ جرم اور طاقت کی سنسنی خیز داستان..... **امجد رئیس** کے قلم کا شاہکار

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان..... **امجد جاوید**
کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے **الاؤ** کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی**
کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

ایک نوجوان لڑکی کا لرزا خیز قتل..... جرم، سنسنی، دہشت اور پُراسراریت سے بھرپور کہانی.....

دوسرا رنگ

ہر جگہ طاقت کا قانون ہے..... اور انصاف، قانون کے سامنے بے بس ہے..... سرورق کی تیکھی کہانی

چٹی نکتہ چٹی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

''کیا تلنگانہ کے کسانوں کو حق ملا؟'' میں نے نہ جانے کیوں جھجکتے ہوئے پوچھا۔

ان کے چہرے پر جیسے روشنی آئی اور آنکھوں میں اداسی اترتی چلی گئی۔

''باغیوں نے اکتالیس ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے میں حکومت قائم کرلی تھی۔ کسانوں کو 100 ایکٹر سوکھی زمین اور 10 ایکڑ بھیگی زمین بانٹی گئی تھی، دو ہزار گاؤں میں سلیمان، مخدوم، حسن ناصر، پھلتسام، دھرما اور راجاراؤ نے کسانوں کی حکومت قائم کردی تھی مگر آصف جاہ کی بادشاہت، انگریز کی حکومت اور خاکساروں نے پانچ سال کی مسلسل جنگ کے بعد سب کچھ ختم کردیا۔ خواب بکھر گئے، گھر اجڑ گئے، غریب غریب ہی رہا، شاید دنیا غریبوں کے لیے ہے ہی نہیں، ان کی آزادی ان سے چھین لی گئی۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہنے لگیں۔ ''اور محسن تو جیسے ٹوٹ گئے، ساری زندگی جدوجہد کی، ہم سب کے لیے جیے مگر تلنگانہ ان کی زندگی سے نہیں نکل سکا۔'' ان کے ہونٹوں پر ایک سوگوار سی مسکراہٹ جیسے رقص کررہی ہوتی تھی۔

میری دوستی محسن کے ابو امی سے زیادہ محسن کی دادی سے ہوگئی۔ شاید ہم دونوں کا درد ایک ہی تھا، عمروں کا طویل فرق تھا مگر ہم دونوں کی کہانی کا آخری پنکھ ایک سا ہی تھا۔ ہم دونوں نے ہی اپنی اپنی محبتوں کو کھودیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے انہیں حنا کی باتیں سن کر مزہ آتا تھا، مجھے ان کے منہ سے محسن کے تذکرے میں بھری بھری محبت کی خوشبو آتی تھی، میں ان کے سامنے حنا کی باتیں کرتا، اس کے قصے سناتا، بیتے دنوں کی بے شمار باتیں دہراتا۔ کرن محسن اس کے ابو امی میری اور ان کی باتوں کو سنتے۔ شام دبے پاؤں رات میں ڈھل جاتی، کسی شام کو اٹھنے سے پہلے انہوں نے اپنی دلکش آواز میں مخدوم کی یہ نظم سنائی تھی۔ وقت کے بارے میں جو بے درد سمجھا ہے۔

درد کی رات ہے
چپ چاپ گزر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ
دل کو آواز نہ دو
نورِ سحر کو نہ جگاؤ
زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو

وہ شام وہ رات ایک یادگار شام اور رات کی طرح گزری تھی جس نے میرے دماغ و دل کو مسحور کردیا تھا۔

میرا محسن کے گھر آنا جانا بڑھ گیا، محسن کی دادی۔ مجھ میں دوبارہ سے تاریخ میں دلچسپی کا پودا بار یاب کرد تھا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے قصے سناتیں اور خاص طر پر دکن کی حکومت، دکن کی سیاست اور تلنگانہ میں کامیابی کے بعد ناکامی کے قصے تو جیسے ان کی ذات کا حصہ تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھے کرشن چندر کے ناول ''جب کھیت جاگے'' کے مختلف صفحات پڑھ کر سنائے، مجھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ تلنگانہ کے باغیوں نے کس طرح کے انقلاب برپا کیا تھا اور کس طرح سے تلنگانہ کی صورت بدل دی تھی اور کس طرح سے نظام اور ہندوستان کی حکومتوں نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کردیا تھا۔ اگست کی آزادی سے پہلے ہی آزاد ہونے والوں کو دنیا کی قید سے ہی جبر آزادی دے دی گئی تھی۔ میں جب بھی ان سے بات کرتا ایسا لگتا جیسے تلنگانہ کے باغی بیدار ہورہے ہیں، جیسے کھیت دوبارہ جاگ رہے ہوں، جیسے دور کسی گاؤں میں کمیون بن رہے ہوں اور کسان اپنے ہاتھوں میں درانتی اٹھا۔ انقلاب کا جشن منا رہے ہیں۔ ان کی باتیں ایسی ہی ہو تھیں۔ خوابوں کی باتیں جو دل میں شوق جذبہ لگن پیدا کر ہیں۔ امید پیدا کرتی ہیں کہ وقت بدل جائے گا کیونکہ وقت کو تو بدلنا ہی ہوتا ہے۔

ایک دن باتوں باتوں میں، میں نے ان سے پوچھ تھا کہ انقلاب دیرپا کیوں نہیں ہوسکا۔ کیوں جب مظلوموں نے حکومت سنبھالی تھی تو ان کے خواب بکھر گئے آزادی سے پہلے تلنگانہ میں اور آزادی کے بعد ہندوستان میں۔ پاکستان، بنگلا دیش اور بھارت میں نہ کسان آزاد ہے، نہ مزدور، نہ عورت، نہ سماج۔

پہلی دفعہ ان کے حسین دلکش چہرے کے پیچھے ایک دوسرا چہرہ نظر آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ نظر چرا رہی ہیں وہ تھوڑی دیر سوچتی رہیں اور ایک اداس مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھر آئی تھی۔ ''تلنگانہ کے باغی تو بے غرض محرو کسان تھے، انہیں نظام کی بادشاہت اور انگریز کی سرکا نے ختم کردیا۔ پاکستان ہندوستان نے باغی تو باغی ہی نہیں تھے، وہ تو خود غرض موقع پرستوں کے سیاسی گھرانے تھے بغاوت، سیاست اور مصلحت ساتھ ساتھ نہیں چلتی ہے، ا کی مصلحتوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا، اپنے آپ کو خود ہی خ کردیا ان لوگوں نے!

تاریخ کا یہ سبق میں نے کہیں نہیں پڑھا تھا۔

⌘⌘⌘

چیلا رام کی بہو ابھی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ پیچھے سے اس کی ساس کی آواز آئی۔ ''اری نندنی! صبح صبح کہاں چل دی؟''

''کہیں نہیں اماں! حویلی جارہی ہوں۔ رات ٹھکرائن نے کہلوایا تھا کہ صبح ذرا جلدی آجانا، کچھ کام ہے۔''

''کیا کام ہے، صبح صبح کھیتوں میں پانی دلوانا ہے؟'' ساس نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

نندنی سنی ان سنی کر کے دروازے کی جانب بڑھتی رہی۔

''اکیلی جارہی ہے، ساتھ بیٹی کو بھی لے جا۔'' ساس نے آواز لگائی۔

''میں نہیں لے جارہی کسی کو بھی۔'' نندنی نے جواب دیا۔

''اچھا ہے کچھ ہاتھ ہی بٹا دے گی۔'' ساس نے لقمہ دیا۔

''مجھے بہت تلخ تجربہ ہے۔'' نندنی نے جواب میں کہا۔ ''اسی طرح میری ماں مجھے لے گئی تھی۔ وہاں بڑے ٹھاکر صاحب نے مجھے لہولہان کر دیا تھا۔''

''لیکن تم تو ٹھکرائن کے بلانے پر جارہی ہو۔''

''اماں کو بھی ٹھکرائن نے بلوایا تھا۔'' نندنی نے جواب میں کہا۔

زنجیر

غلام قادر

طاقت کے نشے میں چُور... اور اقتدار کی بے ساکھیوں کے سہارے چلنے والے جب لڑکھڑاتے ہیں تو پتا بھی نہیں چلتا کہ ان کے پیروں تلے آنے والا ایک معمولی پتھر بھی ان کے لیے موت کا سامان پیدا کر سکتا ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جو اپنی کمزوری کو اپنی ہمت اور طاقت میں بدلنے کی آرزومند تھی...

زندانوں کی زنجیروں کو توڑنے والی ایک

برباد حسینہ کا قصہ.....

''تمہیں اب کیا ڈر ہے؟'' ساس نے کہا۔ ''ٹھاکر صاحب توکل کے شہر گئے ہوئے ہیں۔''

''لیکن وہ شہر سے کبھی بھی واپس آسکتے ہیں۔''

''اچھے لوگوں پر شک نہیں کرتے بہو۔'' ساس نے کہا۔

''بس میں نے کہہ دیا کہ میں اپنی بیٹی کو نہیں لے جاؤں گی وہاں۔''

''تمہارا کام جلد ختم ہوجائے گا۔'' نندنی کی ساس اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

''میں اپنی ماں کی طرح اپنی بیٹی کو دیکھ کر آنسو نہیں بہا سکتی۔''

''آخر کب پیچھا چھوٹے گا ان ٹھاکروں، جاگیرداروں اور سرداروں کے ظلم سے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو مارتے بھی ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔'' نندنی کی ساس بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ نے کچھ کہا؟'' نندنی نے جاتے ہوئے رک کر سوال کیا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ یہ ٹھاکر، سردار اور وڈیرے مارتے بھی ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''مجھے اس روز کے بعد پندرہ روز اسپتال میں رہنا پڑا تھا لیکن پولیس نے میرے والد کو ٹرخا دیا کہ تم اتنے بڑے آدمی کو بلیک میل کرنے کے لیے اس پر ایف آئی آر کٹوانا چاہتے ہو حالانکہ تمام شواہد ہمارے حق میں تھے اور وہ ڈاکٹر گواہی دینے کے لیے بھی تیار تھی جس کے پاس میں زیر علاج تھی۔''

''تم غلط نہیں کہہ رہی ہو۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''پھر بھی آپ مجھے بیٹی کو ساتھ لے جانے کے لیے کہہ رہی ہیں؟'' نندنی نے کہا۔

''میں تو تمہارے آرام کے لیے کہہ رہی تھی۔'' ساس نے جواب دیا۔

''نہیں چاہیے مجھے ایسا آرام جس کے بعد تمام زندگی رونا پڑے۔ اب ہر کوئی آپ جیسے دل کا مالک تو نہیں ہوتا کہ بہت کچھ جاننے کے باوجود اپنی بہو بنائے۔'' نندنی نے کہا۔

''تمہارے لیے رشتہ لے جانے کے لیے بھی ہمیں ٹھاکر صاحب نے ہی کہا تھا۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''کتنے پیسے لیے تھے آپ نے مجھے بہو بنانے کے لیے؟'' نندنی کا لہجہ تلخ تھا۔

''تم یہ کیسی باتیں کررہی ہو؟'' اس کی ساس نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ مت کہیے گا کہ آپ لوگوں نے اس کے عوض رقم نہیں لی تھی۔'' نندنی یہ جاننا چاہتی تھی۔

''ہم نے رقم نہیں لی تھی البتہ ٹھاکر صاحب نے شہر میں رمیش کو دکان کروادی تھی۔''

''کمال بے غیرت ہیں آپ لوگ۔'' نندنی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اس میں بے غیرتی والی کیا بات ہے؟''

''ٹھاکر نے اس طرح کی آفر میرے بابا کو بھی کی تھی کہ وہ میرے بھائی کو دکان کروا کر دے سکتا ہے لیکن بابا اور بھائی دونوں نے انکار کردیا تھا۔'' نندنی نے کہا۔

''اس میں بے غیرتی والی کیا بات ہے؟'' نندنی کی ساس نے اسی لہجے میں کہا تھا۔ ''ہم نے تمہیں بغیر جہیز کے قبول کیا تھا۔''

''جہیز تو تم لوگوں نے حاصل کرلیا تھا ٹھاکر سے۔'' نندنی کا جواب تھا۔ ''اب میں سمجھی کہ تم مجھے بیٹی کو ساتھ لے جانے کے لیے کیوں کہہ رہی تھیں۔'' نندنی کی آواز قدرے تیز تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ساس نے بھی اسی لہجے میں سوال کیا۔

''تم لوگ دکان ایک سے دو کرنا چاہ رہے ہو نا؟'' نندنی کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''آٹھ برس پہلے ٹھاکر نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا اور تم لوگوں نے سودے بازی کرکے معاملے کو دبانے میں مدد کی تھی، اب پھر الیکشن کا زمانہ ہے۔ بیٹا اپنے باپ کی نشست پر امیدوار ہے اور تم لوگ.....'' نندنی نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بڑے ٹھاکر نے الیکشن جیتنے کے لیے یہ سب کیا تھا؟'' نندنی کی ساس کی آواز بھی تیز تھی۔

''اگر ایف آئی آر درج ہوجاتی تو ٹھاکر کبھی نہ جیت پاتا۔'' نندنی نے کہا۔

''تم اس کی ماں ضرور ہو لیکن وہ ہماری بھی کچھ ہے۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''جو خاندان بیٹے کے کاروبار کے لیے ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا سکتا ہے جس کا ریپ کیا گیا ہو، وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔'' نندنی کی آواز بلند ہوگئی تھی۔

''مت بھولو کہ اب تم بھی اس خاندان کا ایک فرد ہو۔''

''میں اس باپ کی بیٹی ہوں جس نے سودے بازی سے انکار کردیا تھا۔'' نندنی نے کہا۔

''سوائے تھانے کے چکر لگانے اور بیٹی کو رسوا کرنے کے علاوہ کیا حاصل کیا؟'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''اور آپ نے وہ کیا جو ریڈ لائٹ ایریا کی نائکہ بھی نہیں کرتی۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' نندنی کی ساس جیسے پھٹ پڑی۔

''ریڈ لائٹ ایریا کا رواج ہے کہ وہاں بیٹیوں سے پیشہ کروایا جاتا ہے لیکن بہوؤں سے نہیں۔'' نندنی نے کہا۔

''ہم نے کون سا تم سے پیشہ کروایا؟'' نندنی کی ساس کی آواز بلند تر تھی۔

''مجھے ریپ کرنے والے سے تو سودے بازی کی، میری قیمت وصول کی اور آج بھی اسی کمائی سے آپ کا گھر چل رہا ہے۔'' نندنی کی آواز بھی کم نہیں تھی۔

''آہستہ بولو۔ یہ شہر ہے اور یہاں ہماری وجہ سے تمہاری بھی عزت ہے۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''یہ جھوٹی عزت اور شان و شوکت ختم ہوتی ہے تو ہو جائے، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔'' نندنی نے کہا۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' نندنی کی ساس نے تنبیہہ کی۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ ہر شخص یہ جان لے کہ اس کاروبار، اس عزت اور اس شان و شوکت کی حقیقت کیا ہے۔'' نندنی نے کہا۔ اس کے لہجے میں موجود دھمکی کو اس کی ساس نے بھی اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

''ہم ڈوبیں گے تو تم بھی ساتھ ہی ڈوبو گی۔'' نندنی کی ساس نے جوابی دھمکی دی۔

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' نندنی نے کہا۔

''کیوں پروا نہیں؟'' ساس نے سوال کیا۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ ٹھاکر، سردار اور وڈیرے کس کس طرح سے غریب کی بچیوں کی عزت لوٹتے ہیں اور پھر پیسے کے زور پر معاملے کو کس طرح دباتے ہیں۔ ان کے لیے بھی کوئی سیر پہ سوا سیر ہو اور وہ اپنے انجام کو پہنچیں۔'' نندنی کا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔

''آٹھ برس پہلے جو ہوا اس پر وقت کی گرد پڑ چکی ہے اس لیے.....'' نندنی کی ساس کے لہجے میں خوشامد تھی۔

''آپ مجھے روکنا چاہو گی؟'' نندنی نے سوال کیا۔

''بالکل!'' ساس نے جواب دیا۔

''اس بار چھوٹے ٹھاکر کا الیکشن میں، میں مقابلہ کروں گی۔'' نندنی نے کہا۔

''جس حلقے سے وہ جیتتے رہے ہیں، وہاں تمہاری بات کون سنے گا؟'' نندنی کی ساس نے اسے ڈرایا۔

''آپ اس الیکشن مہم میں میرا ساتھ دیں گی۔'' نندنی نے کہا۔ ''گواہی دیں گی کہ بڑے ٹھاکر نے مجھ سے رشتہ کرنے کے لیے رشوت دی تھی۔''

''بیٹا! اب وہ کافی بیمار ہیں۔ تم کیوں.....'' نندنی کی ساس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ چاہتی ہیں نا کہ آئندہ کوئی سردار یا کوئی وڈیرا میری طرح کسی لڑکی کی عزت نہ لوٹے اور نہ ہی آپ جیسی ماں کو مجبور کرے کہ وہ ایک عزت لوٹی جانے والی لڑکی کو بہو بنالے؟''

''چاہتی تو ہوں لیکن ہم مجبور لوگ ہیں۔'' نندنی کی ساس نے کہا۔

''آپ ایک بار، صرف ایک بار میرا ساتھ تو دے کر دیکھیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' نندنی نے کہا لیکن ساس خاموش رہی۔

''ہاتھی جب بچہ ہوتا ہے تو اس کے پیروں میں بھاری زنجیریں ڈال دی جاتی ہیں۔ وہ بار بار ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ نہیں توڑ پاتا۔ پھر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ وہ زنجیروں کو توڑ دے مگر وہ کوشش ہی نہیں کرتا کیونکہ اسے بچپن یاد ہوتا ہے کہ کوشش کے باوجود وہ زنجیر توڑ نہیں سکا تھا۔ حالانکہ وہ طاقتور ہو جاتا ہے لیکن وہ اسے اپنا نصیب سمجھ لیتا ہے اور کوشش ہی نہیں کرتا۔'' نندنی خاموش ہوئی تو اس کی ساس کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی تھی۔

''آپ کے اور میرے بڑوں نے زنجیریں توڑنے کی کوشش کی ہوگی لیکن تب ان کے پاس ووٹ کی طاقت نہیں تھی۔ آج ہمارے پاس ووٹ کی طاقت ہے۔ ہمیں اپنا ماضی بھولنا ہوگا اور ایک بھرپور کوشش کرنی ہوگی تاکہ ہمارے بعد کی نسلیں محفوظ ہو جائیں۔ ہمارے بچے بھیڑ اور بکری نہ رہیں کہ جس کا دل چاہے اپنے مقصد کے لیے انہیں قربان کر دے۔ یہ سلسلہ اب ختم کرنا ہوگا کہ کسی بچی کی عصمت لوٹی جائے اور ایف آئی آر بھی درج نہ ہو۔'' نندنی بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

اپنی بات ختم کر کے اس نے ساس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو ساس نے پوری گرمجوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

الیکشن مہم شروع ہوئی۔ نندنی نے بھی فارم بھرے اور چھوٹے ٹھاکر بھی میدان میں آئے۔ چھوٹے ٹھاکر نے خوب دھمکیاں بھجوائیں۔ دکان میں اچانک آگ لگ گئی۔ روزگار ختم ہو گیا لیکن نندنی دستبردار نہیں ہوئی۔

انتخابات کے نتائج آئے تو نندنی دس ہزار سے زیادہ ووٹوں سے جیت گئی۔ وہ زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بقول فیض.....

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں

⌘⌘⌘

بھوبل

مرزا امجد بیگ

شکست خوردہ محبت بھوبل سے کہیں زیادہ تباہ کن اور زہرناک ہوتی ہے... ناکام ہونے والا اکثر دل میں نفرت کو پروان چڑھائے موقع کی تلاش میں کہیں آس پاس ہی مگر... نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرتا ہے... اب یہ اور بات کہ وقت اسے موقع فراہم کرتا ہے یا اپنے ہی دام میں الجھا کر منہ کے بل گرا دیتا ہے... وہ بھی ایک ایسی ہی محبت کا شکار تھا مگر... انتقام کی آگ میں جانے کتنے بے قصوروں کو شکار کر بیٹھا اور بھول گیا کہ قدرت کا انتقام بڑے سے بڑے شکاری کو بھی زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے... اور اس بے خبر کو خبر ہی نہ تھی کہ قدرت تو اس کے تعاقب میں ہے...

بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک اور عبرت اثر واقعے کی تفصیل.....

الیکشن کی آمد آمد تھی۔ عام انتخابات سے پہلے کی سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر دکھائی دیتی تھیں۔ گلی کوچوں میں غوغا اور گہما گہمی کا راج تھا۔ تمام سیاسی پارٹیاں اس انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں، بازاروں اور چوراہوں پر جھنڈوں اور رنگ برنگ بینرز کی بہار نظر آتی تھی۔ مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے نامزد امیدواروں کی جانب سے جلسے جلوس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایسے ہی ایک جلسے میں صوبائی اسمبلی کے ایک امیدوار کے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر ارشاد حسین کو گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا.....!

آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے الیکٹرانک میڈیا یا اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ آجا کر صرف ایک قومی ٹیلی ویژن سینٹر یعنی ''پی ٹی وی'' ہی تھا، تاہم پرنٹ میڈیا میں اس قتل کی واردات کو بڑھ چڑھ کر کوریج دی گئی تھی۔ گولی چلانے والے مبینہ شخص کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ بھی آلۂ قتل سمیت۔

اپنی کہانی کے آغاز میں قتل کی اس واردات کا تذکرہ ایک خاص پیرائے سے کیا گیا ہے اور وہ سبب ہے..... شاکر علی..... وہی شخص جس نے مبینہ طور پر ڈاکٹر ارشاد حسین کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس واقعے کے چند ہفتے بعد شاکر علی کا کیس خود چل کر میرے پاس آ گیا تھا۔

وہ موسم گرما کی ایک تپش زدہ سہ پہر تھی۔ سورج منزلِ غروب کی جانب رواں دواں تھا، لیکن ماحول کی حدت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ سورج ابھی عین سر پر کھڑا آگ برسا رہا ہو۔ اس بیرونی فضا سے قطع نظر میں اس وقت اپنے ائرکنڈیشنڈ آفس کے ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری سیکریٹری انیلا نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔

''سر! ایک ضعیف العمر شخص آپ سے ملنے آئے ہیں مگر ان کے پاس اپائنٹ منٹ نہیں ہے۔''

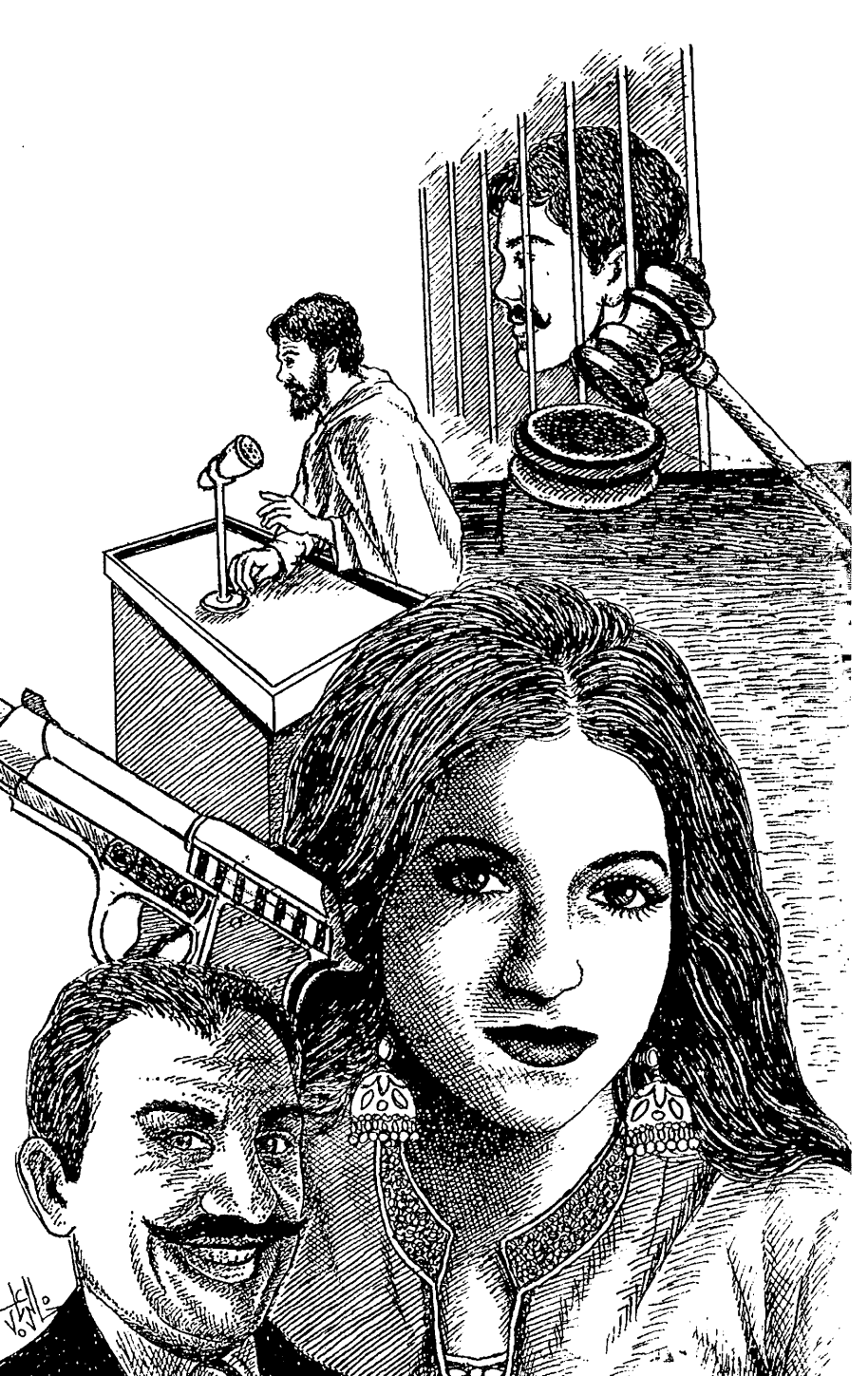

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لابی میں کلائنٹس کی کیا صورت حال ہے؟''

''تین افراد اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔'' سیکریٹری نے بتایا۔ ''اگر ان کے فارغ ہونے تک کوئی اور نہیں آ گیا تو میں ان بزرگ کو آپ کے پاس بھیج سکتی ہوں۔''

''آج کی تاریخ میں اور کتنے اپائنٹ منٹس باقی ہیں؟''

''دو'' انیلا نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ ان بزرگوار کو سچویشن سمجھا کر انتظار کرنے کو کہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''وہ انتظار کرنے کو تیار ہیں۔''

''دیٹس گڈ!'' یہ کہتے ہوئے میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میری سیکریٹری نے ان ضعیف العمر صاحب کو میرے چیمبر میں بھیج دیا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور میز کی دوسری طرف موجود کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔

''تشریف رکھیں جناب!''

''شکریہ وکیل صاحب .....'' وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے ان کی سمت دیکھا اور کہا۔ ''جی فرمائیں ..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''بغیر اپائنٹ منٹ کے ملاقات کے لیے وقت دینے پر میں آپ کا ممنون ہوں، وکیل صاحب!'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''میرا نام باقر علی ہے اور ماسٹر صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

باقر علی کی عمر ستّر کے اریب قریب رہی ہوگی۔ باقر علی اپنے انداز و اطوار اور بول چال سے ایک سلجھا ہوا نستعلیق انسان نظر آتا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کن ماسٹر صاحب کی بات کر رہے ہیں؟''

''ماسٹر عبدالقدوس۔'' انہوں نے جواب دیا، پھر ایک پرائمری اسکول کا نام لینے کے بعد بتایا۔ ''کسی زمانے میں ماسٹر صاحب اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ آج کل ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں اور ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی.....''

باقر علی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بے ساختہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا یہ اضطراری ردِعمل باقر علی کے بیان کردہ پرائمری اسکول اور اس کے ہیڈ ماسٹر عبدالقدوس صاحب کا رہین منت تھا کیونکہ میں نے اسی اسکول سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی۔ عبدالقدوس صاحب، ماسٹر صاحب کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔

''کیا ہوا ماسٹر صاحب کو؟'' میں نے بے چینی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''لگتا ہے آپ نے ماسٹر صاحب کو پہچان لیا ہے؟''

''جی ..... صد فیصد!'' میں نے جواب دیا۔ ''ماسٹر صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا جو ابھی تک میرے کام آ رہا ہے۔''

''وکیل صاحب! میں عبدالقدوس صاحب کے لیے آپ کے عقیدت بھرے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' باقر علی نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ ''آپ اپنی سیٹ پر اطمینان سے تشریف رکھیں، پھر بات کرتے ہیں۔''

میں نے باقر علی کی بات پر فوراً عمل کیا۔

''میں اور عبدالقدوس ایک ہی بیچ کے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگے۔ ''انہوں نے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لیا تھا اور میں پرائیویٹ سیکٹر کی طرف نکل گیا۔ ہمارے درمیان ہمیشہ اچھے دوستانہ تعلقات رہے ہیں بلکہ ہمارے اس رشتے کو برادرانہ کہا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ خیر، میں تو اللہ کا شکر ابھی تک ہاتھ پاؤں سے سلامت ہوں۔ کسی کام کاج کے قابل تو نہیں رہا مگر کسی طرح کی محتاجی بھی نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتا ہوں، بغیر کسی کے سہارے کے، مگر عبدالقدوس کئی سالوں سے بیڈ پر ہیں.....'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''چند سال پہلے ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ علاج معالجے سے دس پندرہ فیصد افاقہ ہوا ہے۔ دوسروں کی بات سن اور سمجھ لیتے ہیں اور اس بات کا جواب بھی دے پاتے ہیں لیکن زیریں دھڑ ناکارہ ہو جانے کے باعث وہ مکمل طور پر بیڈ کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ انسان کی عمر بھر کی اصل کمائی اس کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر کسی انسان کی اولاد ناخلف اور بے حس نکل آئے تو پھر سب کچھ وہی ہوتا ہے جیسا ماسٹر صاحب کے ساتھ ہوا.....''

''آپ مجھے ماسٹر صاحب کا ایڈریس دیجیے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں بہت جلد انہیں دیکھنے جاؤں گا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت ہو رہی ہے کہ انہوں نے

مجھے یاد رکھا ہوا ہے۔''

''ماسٹر صاحب نے اپنے اسکول سے پاس آؤٹ ہونے والے ہر اس اسٹوڈنٹ کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہے جو زندگی میں کسی باعزت مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور آپ کا شمار بھی ایسے اسٹوڈنٹس ہی میں ہوتا ہے۔'' باقر علی نے کہا۔ ''اگر آپ ماسٹر صاحب سے ملاقات کرنے ان کے گھر جائیں گے تو انہیں آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی.....'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میں آپ کے پاس ایک ذاتی کام سے آیا ہوں۔ میں ایک قانونی مسئلے میں الجھ کر سخت پریشان ہوگیا ہوں۔ جب میں نے ماسٹر صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ چند لمحات تک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے، پھر مجھے ہدایت کی کہ میں آپ سے ملوں۔ سو، میں آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔''

''باقر صاحب!'' میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ماسٹر صاحب نے میرے پاس بھیجا ہے۔ آپ میرے لیے اتنے ہی محترم ہیں جتنے کہ ماسٹر صاحب..... حکم کریں، میں آپ کی کیا قانونی مدد کرسکتا ہوں؟''

''حکم نہیں، عرض ہے وکیل صاحب!'' وہ معتدل لہجے میں بولے۔ ''میری پریشانی کی وجہ میرا اکلوتا بیٹا شاکر علی ہے۔ وہ اس وقت جیل کسٹڈی میں ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔''

''آپ کے بیٹے پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟'' میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے سوال کیا۔

''مقتول کا نام ہے..... ڈاکٹر ارشاد حسین!'' باقر علی نے بتایا۔

باقر علی کا جواب سن کر میرے دماغ میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''آپ اسی ڈاکٹر ارشاد کی بات کر رہے ہیں نا جو رشتے میں ایک معروف سیاست دان کا سالا لگتا ہے اور ایک جلسے میں چند ہفتے پہلے اسے شوٹ کر دیا گیا تھا.....؟''

''جی بالکل..... میں اسی مقتول ڈاکٹر کا ذکر کر رہا ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''یہ الیکشن سے چند روز پہلے کی بات ہے۔''

میرے ذہن میں جو روشنی کا جھماکا ہوا تھا، اس نے چند ہفتے پہلے کی اخباری خبروں کو بالکل واضح کر دیا تھا۔ جنرل الیکشنز کو نمٹے چند روز ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے باقر علی کی طرف دیکھتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔

''لیکن میں نے تو سنا تھا کہ قاتل کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا۔ جس گن سے پولیٹیشن کے سالے کو نشانہ بنایا گیا اس پر شاکر علی کے فنگر پرنٹس ملے ہیں.....!''

''یہ کہانی اپنی جگہ سولہ آنے درست ہے اور اسی وجہ سے کوئی سنجیدہ اور بردبار وکیل میرے بیٹے کے کیس میں ہاتھ نہیں ڈال رہا۔'' وہ زخمی لہجے میں بولا۔ ''شروع میں شاکر علی کے لیے میں نے ایک وکیل کیا تھا لیکن اس کی کارکردگی نے مجھے سخت مایوس کیا۔ شاکر کی ضمانت نہ کرا سکنا تو ایک طرف، وہ وکیل تو ڈھنگ سے اپنے موکل کے حق میں دلائل بھی نہیں دے سکا تھا۔ جب میں نے اس سلسلے میں اس سے بات کی تو جانتے ہیں اس نے کیا جواب دیا.....؟''

بات ادھوری چھوڑ کر باقر علی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں چونکہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا، اس لیے کہا۔ ''آپ بتائیں.....!''

اس نے بتایا۔ ''ان وکیل صاحب نے مجھ سے کہا..... انکل! یہ کوئی سیدھا سادہ کیس نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے پر نہ صرف یہ کہ قتل کا الزام ہے بلکہ جائے وقوعہ سے آلۂ قتل کے ساتھ گرفتار ہوا ہے اور پھر دوسری جانب بہت اثر رسوخ والے سیاسی اور کاروباری لوگ ہیں۔ یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں، اس لیے آپ کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا.....'' لمحاتی توقف کر کے باقر علی نے افسردہ نظر سے مجھے دیکھا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! ان وکیل صاحب کو کوئی حلوا کیس چاہیے تھا اور جب میں نے محسوس کیا کہ شاکر علی کا کیس ان کے بس کا نہیں تو پچھلی پیشی پر میں نے ان سے معذرت کر لی۔ ایسا وکیل انتہائی خطرناک ہوتا ہے جو مخالف پارٹی کی طاقت سے مرعوب ہو.....!''

باقر علی نے بات تو بالکل درست کی تھی۔ میں نے بصد احترام پوچھا۔ ''اور آپ کو پکا یقین ہے کہ آپ کے بیٹے نے ڈاکٹر ارشاد حسین کو قتل نہیں کیا؟''

''جی..... اتنا پکا یقین کہ جیسے میں کہوں کہ..... میں اس وقت مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا اپنی بپتا سنا رہا ہوں۔'' وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولا۔ ''شاکر علی میری اکلوتی اولاد ہے۔ وہ اس وقت لگ بھگ پینتیس سال کا ہے۔ اس کی ساری زندگی میری نگاہ میں ہے۔ اپنی ماں کے انتقال کے بعد اس نے مجھے سنبھالا ہے، پھر جب اس کی بیوی اور بچے کا انتقال ہوا تو وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ بہرحال اس نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا۔ وہ

اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک محنت کش شخص ہے۔ میں سمجھتا ہوں، کسی گہری سازش کے تحت میرے بیٹے کو اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔ میرے خون میں اس نوعیت کے مجرمانہ اثرات نہیں ہیں وکیل صاحب! میں نے رزقِ حلال سے شاکر کی پرورش کی ہے اور اس نے بھی اپنے روزگار میں کبھی ایک پیسے کی ہیرا پھیری نہیں کی۔''

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ والدین کی نگاہ میں ان کی اولاد بے قصور ہی ہوتی ہے لیکن اپنے بیٹے کی بے گناہی میں باقر علی اس وقت جو کچھ بھی کہہ رہے تھے، وہ خاصا وزن دار اور متاثر کن تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''باقر صاحب! آپ کو ماسٹر صاحب نے میرے پاس بھیجا ہے۔ آپ کے بیٹے کے سلسلے میں مجھ سے جو بھی بن پڑا، میں ضرور کروں گا مگر میرا ایک اصول ہے کہ جب تک میری تسلی نہ ہو جائے، میں کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ہامی نہیں بھرتا۔ آپ نے شاکر علی کی عادات، مزاج، فطرت اور کردار کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، میں نے من و عن اس پر یقین کر لیا ہے لیکن میں چاہوں گا کہ اگر آپ خصوصاً اس کیس کے حوالے سے مزید کچھ جانتے ہوں تو پلیز وہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ مجھے بتا دیں تاکہ مجھے کیس کی نوعیت اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی رہے۔''

''بیگ صاحب! میں جتنا جانتا تھا، وہ آپ کو بتا چکا ہوں۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''اس سے زیادہ اگر آپ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہوں تو جیل میں شاکر علی سے ایک ملاقات کر لیں۔''

''شاکر علی سے میرا ملنا تو کئی لحاظ سے ضروری ہے۔'' میں نے چُرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ''اگلی پیشی کب ہے؟''

''دس دن کے بعد.....'' انہوں نے جواب دیا۔

یہ سوال میں نے محض اس لیے کیا تھا کہ اگر ایک دو روز بعد پیشی ہو تو میں عدالت ہی میں اس سے ملاقات کر لوں لیکن دس دن اچھا خاصا ٹائم ہوتا ہے لہٰذا میں نے جیل جا کر شاکر علی سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اس کے باپ سے کہا۔

''ٹھیک ہے باقر صاحب! آپ تین روز بعد آفس آ کر مجھے ملیں۔ اس دوران میں، میں جیل جا کر آپ کے بیٹے سے ملاقات کر لیتا ہوں۔''

''آپ کو جیسا مناسب لگے، بیگ صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تین دن کے بعد دوبارہ آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔ اگر آپ اپنی فیس کے بارے میں بتا دیں تو نوازش ہوگی۔''

''میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کے بارے میں، میں آپ کو شاکر سے ملاقات کرنے کے بعد بتا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ دھیمے انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! میں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر میں آپ کے پاس ماسٹر صاحب کے ریفرنس سے آیا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی فیس میں کوئی کمی یا آپ سے کسی اور قسم کی رعایت لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر آپ شاکر کا کیس لینے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو میں آپ کی فیس ادا کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

باقر علی نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

آئندہ روز میں وقت نکال کر شاکر علی سے ملنے سینٹرل ڈسٹرکٹ جیل چلا گیا۔ اگر آپ کو کبھی جیل جا کر کسی قیدی سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ پرائیویسی میں کسی قیدی سے طویل بات چیت کے لیے کس طرح متعلقہ جیل کے عملے کی مٹھی گرم کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال میں نے ''مٹھی گرمانا'' کے عمل کے ساتھ ہی اپنے تعلقات کا استعمال بھی کیا اور بالکل علیحدگی میں لگ بھگ آدھا گھنٹا شاکر علی سے گفتگو کر لی۔

شاکر علی کی عمر کم و بیش پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ متناسب قد کا مالک ایک عام انسان تھا۔ اس نے ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس واقعے سے پہلے وہ ایک بسکٹس فیکٹری میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ مذکورہ فیکٹری کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی جبکہ اس کی رہائش ناصر کالونی میں تھی۔ کسی زمانے میں قیوم آباد سے لے کر کورنگی تک کا علاقہ ویران اور سنسان ہوا کرتا تھا لیکن آج کل اس ایریا میں خاصی رونق نظر آتی ہے۔ ناصر کالونی، کورنگی کے آغاز کا علاقہ ہے۔

اس روز شاکر علی نے مجھے جو کہانی سنائی، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر ارشاد حسین کا قتل اس نے نہیں کیا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس سنگین واردات میں ملوث کیا گیا تھا۔ میں نے وکالت نامے اور درخواستِ ضمانت کے علاوہ چند دیگر اہم کاغذات

پر اس کے دستخط لیے اور اسے تسلی تشفی دینے کے بعد وہاں سے واپس آ گیا۔

شاکر علی سے میری کیا بات چیت ہوئی، اس حوالے سے میں فی الحال آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مختلف مقامات پر چیزیں خود بخود کھل کر آپ کے سامنے ظاہر ہونے لگیں گی۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کی موت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے سر پر گولی مار کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ قاتل کی چلائی ہوئی گولی، مقتول کی کھوپڑی میں گھسنے کے بعد دوسری جانب سے باہر نکل گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسے فوری طور پر ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے اسپتال مہنگا ہو یا خیراتی، کوئی ڈاکٹر قابل ہو یا اناڑی ..... لاش کو زندہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ گولی لگتے ہی مقتول کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی.....!

پولیس کی جانب سے اس مقدمے کا جو چالان عدالت میں پیش کیا گیا، اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔ میں اس سرکاری رپورٹ کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کرائم سین کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا، یہ الیکشن کی ہنگامہ خیزی کا زمانہ تھا۔ مقتول کا بہنوئی صوبائی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہا تھا اور اس انتخابی مہم میں مقتول کا سب سے اہم کردار تھا۔ پارٹی کے ٹکٹ سے لے کر الیکشن کمپین تک ہر جگہ مقتول سرگرم عمل نظر آتا تھا۔ ہر جلسے اور ہر اہم میٹنگ میں وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ ہوتا تھا۔ مقتول کی اس کارکردگی کو دیکھ کر بعض لوگ تو یہاں تک کہہ رہے تھے ..... ''بہنوئی تو ایک ڈمی کیریکٹر ہے، اصل الیکشن تو سالا لڑ رہا ہے۔ اگر بہنوئی اس الیکشن میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ سارا کریڈٹ سالے صاحب کا ہوگا!''

صوبائی امیدوار کو جس بھی جلسے میں تقریر کرنے جانا ہوتا، مقتول اس سے پہلے وہاں موجود ہوتا تھا اور ہر جلسے کی کمپیئرنگ بھی اسی کے ذمے تھی۔ صوبائی امیدوار کی تقریر تو بس ایویں سی ہوتی تھی لیکن اس کے اسٹیج پر آنے سے پہلے مقتول ایک بھرپور خطاب کیا کرتا تھا جو عوامی امنگوں کا ترجمان ہوتا تھا۔ مقتول اپنی تقریر میں پورے جوش و جذبات کے ساتھ حاضرین مجلس کے احساسات کی تسکین کر دیا کرتا تھا لہٰذا صوبائی امیدوار کی پھسپھسی تقریر کے اثرات سامنے نہیں آپاتے تھے۔ اس تقریر کو آپ ''خانہ پری'' سمجھ لیں۔

وقوعہ کے روز بھی مقتول جوشیلی تقریر کرنے میں مصروف تھا۔ اس جلسے کا اہتمام ایک خالی پلاٹ میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے اور دائیں بائیں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ جلسہ گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور کرسیوں کے اختتام پر کافی سارے لوگ کھڑے ہوئے بھی دکھائی دیتے تھے۔ صوبائی اسمبلی کے امیدوار ابھی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ اطلاع یہی تھی کہ وہ راستے میں ہیں اور چند منٹ میں وہ جلسہ گاہ پہنچ جائیں گے۔ اس چند منٹی... اطلاع کے بعد ہی مقتول نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا۔

اس پُرجوش اور ولولہ انگیز خطاب کے دوران میں پارٹی کے من چلے حمایتی نعرہ زنی بھی کر رہے تھے۔ مقتول ڈاکٹر صاحب زور خطابت میں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے کہ اسٹیج کی بائیں جانب سے ایک فائر ہوا اور چشم زدن میں ایک خطرناک گولی مقتول کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین پر جا گرا۔

صوبائی اسمبلی کے امیدوار نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس جلسے کی عمومی سیکورٹی کے لیے چار پولیس اہلکار بھی وہاں بلا رکھے تھے جن میں ایک سب انسپکٹر اور تین کانسٹیبل تھے۔ صوبائی اسمبلی کا امیدوار اپنی حفاظت کے لیے ذاتی گارڈز پر ہی بھروسا کرتا تھا جو سائے کی طرح اس کے ساتھ چلتے تھے۔

مقتول کو گولی لگی تو جلسہ گاہ میں افراتفری مچ گئی۔ سب انسپکٹر نے اس موقع پر بڑی پھرتی دکھائی۔ وہ لوگوں کی بے ہنگم بھیڑ کو چیرتے ہوئے آناً فاناً میں اسٹیج پر پہنچا اور مقتول کو دو کانسٹیبلز کی معیت میں اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرنے کے بعد اس نے اسٹیج کی بائیں جانب توجہ دی کیونکہ گولی اسی سمت سے چلائی گئی تھی۔

فائر کی آواز سنتے ہی حاضرین جلسہ میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ جس کا جدھر جی چاہا، بھاگ نکلا۔ اسی بھگدڑ میں اکثر کرسیاں بھی الٹ گئی تھیں یا پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ انہی بے ترتیب گری پڑی کرسیوں کے بیچ میں اسٹیج کی بائیں جانب سب انسپکٹر کو ایک شخص پڑا ہوا ملا۔

سب انسپکٹر لپک کر مذکورہ شخص کے پاس پہنچا تو اسے اس بندے کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آیا۔ سب انسپکٹر

نے اپنے ساتھی کانسٹیبل کی مدد سے اس گن بردار شخص کو گرفتار کرلیا۔

گرفتار شدہ مردِ مذکور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اور اس کی شرٹ پر کالر کے نزدیک تازہ بہ تازہ خون بھی لگا ہوا تھا۔ بعد ازاں پتا چلا کہ شرٹ کے کالر پر نظر آنے والا خون اس کا اپنا ہی تھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے میں کوئی چوٹ لگی تھی جہاں سے رسنے والا خون کالر تک پہنچ گیا تھا۔ اس نیم بے ہوش زخمی گن بردار کا نام تھا، شاکر علی.....!''

☆☆☆

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو بہ غور دیکھا، پھر میری جانب نگاہ اٹھا کر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ملزم نے اپنا وکیل تبدیل کرلیا ہے.....؟''

''یس یور آنر!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس سے پہلے ملزم کی جانب سے اس کیس کی پیروی ایڈووکیٹ وسیم خان کررہے تھے لیکن وہ مخالف پارٹی کے اثر رسوخ سے بری طرح مرعوب تھے لہٰذا جب ملزم کے باپ کو اندازہ ہوگیا کہ وسیم خان ان کے کسی کام نہیں آسکتے تو انہوں نے وکیل صاحب کی چھٹی کردی.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے اس کیس میں ملزم کا دفاع میں کروں گا۔''

اس کے بعد میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔ وکیل استغاثہ نے بڑھ چڑھ کر ضمانت کو رکوانے کی کوشش کی۔ قتل کے کیس میں ملزم کی ضمانت کرانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے اور اس کیس میں تو ملزم گن سمیت رنگے ہاتھوں جائے وقوعہ پر گرفتار ہوا تھا۔ میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے سلسلے میں جو بھی تگ و دو کی، وہ میرے فرائض کا حصہ تھا جبکہ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ میری یہ کوشش رنگ نہیں لاپائے گی۔

قصہ مختصر..... جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے دی۔

اگلی پیشی پر استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلۂ آغاز ہوا۔ قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ اپنے پہلے گواہ کو کٹہرے میں بلاتا، میں نے جج سے درخواست کی۔

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہوں کے بیانات سے پہلے میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

جج کی اجازت حاصل کرتے ہی اس مقدمے کا تفتیشی افسر سب انسپکٹر ناصر مجید وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ مکمل پولیس یونیفارم میں تھا۔ کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر یعنی تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

ناصر مجید کی عمر پینتالیس کے اریب قریب تھی۔ وہ سانولی رنگت والا ایک پستہ قامت اور قوی الجثہ شخص تھا۔ پستہ قامتی سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ آئی او کوئی بونا تھا۔ بہرحال اس کا قد نارمل ہائیٹ سے کچھ کم تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑے سب انسپکٹر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس زحمت کے لیے میں معذرت خواہ ہوں لیکن آپ چونکہ وقوعہ کے روز پہلے سے موقع واردات پر موجود تھے اس لیے آپ سے بعض انتظامی امور کی تکنیکی تصدیق چاہتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق اس روز آپ اپنے تین ساتھیوں کانسٹیبل افتخار، کانسٹیبل عارف اور کانسٹیبل جاوید کے ساتھ جلسہ گاہ میں موجود تھے اور آپ کے وہاں ہونے کا مقصد ایک طرح سے اس سیاسی پروگرام کو عمومی سیکیورٹی فراہم کرنا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟''

''نہیں وکیل صاحب! آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم لوگ سرِ شام ہی وہاں پہنچ گئے تھے اور اس جلسہ گاہ کو ہر زاویے سے ہم نے چیک کیا تھا، پھر جب یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تو میں فوراً اسٹیج پر چڑھ گیا تھا۔ میں نے افتخار اور عارف کو گھائل سیاسی لیڈر کے سالے کے ساتھ اسپتال بھیج دیا تھا اور خود جاوید کی معیت میں، میں نے پہلے ملزم کو رنگے ہاتھوں گن سمیت گرفتار کیا۔ اس کے بعد کرائم سین کی ضروری کارروائی مکمل کی تھی.....''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''آپ تو سرِ شام ہی جلسہ گاہ پہنچ گئے تھے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول سیاست دان کے سالے ڈاکٹر ارشاد حسین کی موت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو وہاں اچھا خاصا وقت گزارنے کا موقع ملا تھا، چنانچہ یقیناً وہ جلسہ گاہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ کی یادداشت میں محفوظ ہوگی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس کیس کو چونکہ بعد میں ٹیک اپ کیا ہے

اس لیے میں اپنی بہت سی اِن پٹ کو آپ کی مدد سے کاؤنٹر چیک کرنا چاہتا ہوں.....'' میں نے کہا۔ ''امید ہے آپ میرے سوالات کے ٹو دی پوائنٹ جواب دیں گے۔''

''جی ضرور.....!'' اس نے کہا۔ ''آپ جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں، سوال کریں۔''

''میرے حساب کے مطابق، جلسہ گاہ میں شرکاء کے بیٹھنے کے لیے تین جانب کرسیاں لگائی گئی تھیں۔'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یعنی اسٹیج کے سامنے اور دائیں بائیں۔ کرسیوں کی ایک قطار اسٹیج کے آخری حصے میں بھی لگی ہوئی تھی جس پر معززین شہر کو تشریف فرما ہونا تھا۔ مذکورہ کرسیوں میں سے اکثر خالی پڑی ہوئی تھیں کیونکہ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے امیدوار سیاست دان کے ساتھ بھی چند اہم افراد کو آنا تھا۔ یہ کرسیاں انہی کے لیے خالی چھوڑی گئی تھیں.....؟''

یہاں تک بولنے کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے انکوائری آفیسر کی جانب دیکھا تو وہ تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں، وکیل صاحب!''

''وہ جلسہ گاہ ایک خالی پلاٹ پر بنائی گئی تھی۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جس کی ایک جانب کوئی چھوٹا سا کارخانہ تھا لہٰذا کارخانے کی دیوار کو چھوڑ کر باقی دو اطراف یعنی جلسہ گاہ کا عقبی حصہ اور دائیں جانب قناتیں لگا دی گئی تھیں جبکہ چوتھی سمت کو بالکل کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ جلسہ گاہ کا سامنے والا حصہ تھا جہاں سے پبلک کی آمد تھی۔''

''آپ تو جلسہ گاہ کا نقشہ اس طرح کھینچ رہے ہیں جیسے آپ خود بھی وہاں موجود تھے.....!'' آئی او نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''یہ سب میرے پیشے کا حصہ ہے، آئی او صاحب.....!'' میں نے انکسار بھرے انداز میں کہا۔ ''اَن دیکھی چیزوں کو بھی اتنی ہی تفصیل کے ساتھ یاد رکھنا پڑتا ہے جتنا کہ آنکھوں دیکھی بھالی چیزوں کو۔ خیر.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق جلسہ گاہ کے اندر (علاوہ اسٹیج) آٹھ سو افراد کے کرسیوں پر بیٹھنے کی گنجائش تھی، یعنی اسٹیج کے سامنے والے حصے میں پچاس، پچاس کرسیوں والی بارہ قطاریں تھیں جن پر چھ سو افراد بیٹھ سکتے تھے جبکہ اسٹیج کے دائیں اور بائیں پچیس، پچیس کرسیوں والی چار، چار قطاریں لگائی گئی تھیں۔ مطلب، سو افراد اسٹیج کی دائیں جانب اور سو ہی افراد اسٹیج کی بائیں طرف بھی بہ آسانی براجمان ہو سکتے تھے.....!''

''یہ ٹھیک ہے کہ کرسیوں کی تعداد کی رو سے جلسہ گاہ میں آٹھ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔'' آئی او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس رات وہاں پر آنے والوں کی تعداد کم و بیش ایک ہزار تھی۔ دو سو لوگ کرسیوں کے پیچھے اپنے قدموں پر کھڑے تھے۔''

''لیکن صرف جلسہ گاہ کے سامنے والی کرسیوں کے پیچھے!'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''دونوں اطراف میں بچھی کرسیوں کے پیچھے ہرگز نہیں۔''

''ان کے پیچھے کھڑے ہونا تو ممکن بھی نہیں تھا۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''کیونکہ بائیں جانب کرسیوں کی آخری قطار کارخانے کی دیوار کے ساتھ جوڑ کر لگائی گئی تھی اور دائیں طرف والی کرسیوں کی آخری یعنی چوتھی قطار کے عقب میں قنات تنی کھڑی تھی۔ مطلب یہ کہ دونوں جانب کی کرسیوں کی آخری قطار کے پیچھے کسی انسان کے کھڑے ہونے کی گنجائش بالکل بھی نہیں تھی۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے، آئی او صاحب!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جو لوگ دوسروں کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے کام میں لگے رہتے ہیں، اللہ ان کی مشکلات کو ٹالنے کا بندوبست کرتا رہتا ہے.....''

اس کے چہرے پر یکایک الجھن بھری لکیریں نمودار ہوئیں اور ان گنت سوالات سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری کہی ہوئی بات کی گہرائی پر غور کر رہا ہو۔ میں نے اسے کسی نتیجے پر نہیں پہنچنے دیا اور اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا۔

''آئی او صاحب! جلسہ گاہ کے اسٹیج کے بارے میں آپ کی مستند رائے جاننا چاہتا ہوں؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''اسٹیج خاصا کشادہ تھا اور اس کے اوپر شامیانہ بھی لگایا گیا تھا۔''

''اسٹیج کی اونچائی کے بارے میں آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے؟''

''اسٹیج کی اونچائی کم و بیش دو فٹ تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے اس اندازے میں آپ ایک آدھ انچ کی کمی بیشی کی گنجائش رکھ سکتے ہیں۔''

''دو سے تین انچ کی کمی بڑھتی بھی چلے گی آئی او

صاحب!'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے مکمل اتفاق کرتے ہیں؟''

''یس!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''سینٹ پرسنٹ!''

''قاتل نے اسٹیج کی بائیں سمت سے فائر کیا.....''

میں نے آئی او کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''گولی ڈاکٹر ارشاد حسین کی کھوپڑی میں بائیں جانب سے گھسی اور دائیں طرف سے نکل گئی جو مقتول ارشاد حسین کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی.....!''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''گولی کے مقتول کی کھوپڑی میں دخول و خروج کا مقام لیفٹ رائٹ کے فرق سے تقریباً یکساں ہے۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گولی مقتول کی بائیں کنپٹی سے کھوپڑی میں گھسی اور دائیں کنپٹی سے باہر نکلی.....؟''

''جی.....یہی حقیقت ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''آئی او صاحب! آپ نے ملزم کو جائے وقوعہ سے آلۂ قتل سمیت گرفتار کیا ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ وہ آپ کو نیم بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا، اس طرح کہ اس کے ایک ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی اور اس کی شرٹ کا کالر خون آلود تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب.....آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''ملزم آخری یعنی چوتھی اور تیسری رو کے بیچ آڈیٹیز ھا پڑا تھا۔ فائر کی آواز سن کر لوگوں میں جو بھگدڑ مچی تھی اسی میں گھسی کا دھکا ملزم کو لگا ہوگا جس کی وجہ سے اس کا سر سامنے والی کرسی سے ٹکرایا اور وہ زمین پر جا گرا۔ کرسی سے ٹکراؤ کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا، جہاں سے بہنے والے خون نے اس کی شرٹ کے کالر کو رنگین کر دیا۔ بہرحال، ہم نے مستعدی کا مظاہرہ کیا اور قبل اس کے کہ ملزم اٹھ کر فرار ہونے کی کوشش کرتا، میں نے فی الفور اسے گرفتار کر لیا۔''

''ویل ڈن!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ توقع کر رہے ہوں گے کہ اس کارنامے پر آپ کو گولڈ میڈل سے نوازا جائے گا.....ہیں نا؟''

''میں نے کسی گولڈ میڈل کے بارے میں تو نہیں سوچا لیکن جب یہ عدالت ملزم کو قرار واقعی سزا سنائے گی تو میں سمجھوں گا میری محنت وصول ہوگئی.....'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں آپ کا خیر خواہ ہوں، آئی او صاحب.....!'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''اس لیے یہ سوچ کر مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے کہ ''محنت وصولی'' والی آپ کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہو سکے گی۔''

''یہ تو وقت بتائے گا کہ آگے چل کر کسے فتح نصیب ہوگی اور کون شکست کا مزہ چکھے گا۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''سو لیٹس ویٹ اینڈ سی.....!''

''آپ نے ملزم کو نیم بے ہوشی کی حالت میں گرفتار کیا.....'' میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن مجھے کہیں بھی ملزم کی میڈیکل رپورٹ نظر نہیں آئی۔ ایسا کیوں آئی او صاحب؟''

''آپ کس قسم کی میڈیکل رپورٹ کی بات کر رہے ہیں، وکیل صاحب؟'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''ملزم کے زخمی سر کا معائنہ اور اس کے معدے کا کیمیاوی تجزیہ.....!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں.....'' اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہوگئی۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''مائی ڈیئر آئی او صاحب.....!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ملزم کے سر کے زخم کا معائنہ کرایا جاتا تو ڈاکٹر بڑے وثوق سے اپنی رپورٹ میں لکھتا کہ وہ کوئی پرانا زخم تھا جس پر دوبارہ چوٹ لگنے سے خون نکل آیا تھا۔ دوسرے، شاید آپ نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ وہ زخم ملزم کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں ہے۔ اگر کسی کا دھکا لگنے سے وہ سامنے والی کرسیوں سے جا ٹکراتا تو یقیناً اس کا چہرہ یا پیشانی زخمی ہوتی اور جہاں تک ملزم کے معدے کے تجزیے کا معاملہ ہے تو.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا، پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تو اس ٹیسٹ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی کہ اس کے معدے میں کوئی نشہ آور چیز یا اس کے اثرات موجود تھے اور ملزم کی نیم بے ہوشی یا غنودگی کا سبب بھی یہی تھا۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ملزم نے بہ قائمی ہوش و حواس گولی نہیں چلائی تھی.....؟'' آئی او نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔ میں ایسا تو نہیں کہنا چاہ رہا.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''تو آپ کا مطلب ہے، گولی چلاتے وقت ملزم مکمل

طور پر اپنے ہوش وحواس میں تھا؟''

''میں نے کب کہا کہ میرے مؤکل نے مقتول پر گولی چلائی تھی؟'' میں نے برہمی سے پوچھا۔ ''آپ اپنے الفاظ میرے منہ میں کیوں ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں؟''

''تو پھر.....'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آخر.....آپ کہنا کیا..... چاہ رہے ہیں.....؟''

جج کافی دیر سے بڑی دلچسپی کے ساتھ ہم دونوں کے بیچ ہونے والے سوال و جواب کو سن اور دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا ملزم کے سر والی چوٹ کے طبی معائنے اور اس کے معدے کے کیمیاوی تجزیے کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی.....!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''عدالت آپ کے دعوے کی وضاحت چاہتی ہے۔'' جج نے بڑے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟''

''جناب عالی! وقوعہ سے پانچ روز قبل میرے مؤکل کو فیکٹری میں اس وقت سر کے عقبی حصے میں ایک چوٹ لگی تھی جب وہ نیچے بیٹھے ہوئے اچانک اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور اس کا سر ایک سخت چیز سے ٹکرا گیا تھا، تاہم وقوعہ والے روز تک یہ زخم کافی حد تک ٹھیک ہوچکا تھا.....'' میں نے جج کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''وقوعہ کی رات جب ڈاکٹر ارشاد حسین پر گولی چلائی گئی اور فائر کی آواز سے جلسہ گاہ میں افراتفری مچی تو ایک سازش کے تحت ملزم کے سر کے زخم پر چوٹ لگائی گئی جس کی وجہ سے وہ زمین بوس ہوگیا۔ قبل ازیں بھی وہ غنودگی محسوس کررہا تھا کیونکہ جلسہ گاہ میں آنے سے پہلے اس نے ایک قریبی ہوٹل سے چائے پی تھی اور اسی وقت سے اسے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر جب وہ جلسہ گاہ میں پہنچ کر اسٹیج کے بائیں جانب والی کرسیوں کی آخری یعنی چوتھی قطار میں بیٹھ گیا تو سر کے بھاری پن کے علاوہ اسے نیند کا بھی احساس ہونے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے ہوٹل سے جو چائے پی تھی، اس چائے کے اندر کچھ ملایا گیا تھا۔ کوئی ایسی شے جو اس کے ہوش و حواس کو رفتہ رفتہ معطل کررہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے بعد سب کچھ آناً فاناً میں ہوگیا۔ میرے مؤکل کو مطلق خبر نہ ہوئی کہ کب کسی نے اس کے ہاتھ میں ایک گن تھمادی۔ جب یہ بے چارہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اسے ہتھکڑی پہنائی جاچکی تھی۔ دیٹس آل یور آنر.....!''

''آپ نے کہانی تو بہت اچھی بُن لی ہے، وکیل صاحب.....'' آئی او نے مجھ پر بڑی گہری چوٹ کی۔ ''لیکن آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ جب استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوگا تو اس کہانی کا غبارہ پلک جھپکتے میں پھس ہوجائے گا۔ استغاثہ کے پاس مضبوط گواہوں کے علاوہ ملزم کا مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ٹھوس جواز بھی موجود ہے۔''

''جب استغاثہ اس ٹھوس جواز کو سامنے لائے گا، تب کی تب دیکھی جائے گی، آئی او صاحب!'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال آپ میرے آخری سوال کا جواب دیں.....''

وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جی پوچھیں۔''

''آپ نے ملزم کا پیرافین ٹیسٹ کیوں نہیں کیا؟'' میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیس کی فائل میں مجھے اس ٹیسٹ کی رپورٹ کہیں نظر نہیں آئی.....!''

پیرافین (Paraffin) دراصل ایک طرح کا لیکوئیڈ ویکس یعنی موم ہے جو پیٹرولیم مصنوعات سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی گن سے فائر کرتا ہے تو بارود کے نادیدہ ذرات اس کے گن والے ہاتھ پر لگ جاتے ہیں۔ پیرافین ٹیسٹ کی مدد سے ان نادیدہ ذرات کو ڈھونڈ کر اس امر کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ اسی شخص نے گن سے فائر کیا تھا۔

آئی او نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہم نے پیرافین ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ملزم آلۂ قتل سمیت ہمارے قبضے میں آچکا تھا۔ گن پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے اور وہ رنگے ہاتھوں جائے وقوعہ سے پکڑا گیا تھا۔''

''رنگے ہاتھوں نہیں، رنگے کالر..... اور وہ بھی اپنے ہی خون سے!'' میں نے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا، پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''جناب عالی! مجھے آئی او صاحب سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اس کے بعد استغاثہ کے گواہ مقبول احمد کو شہادت کے لیے پیش کیا گیا۔ مقبول احمد نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''مقبول صاحب!'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کو

مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز آپ جلسہ گاہ میں کس جگہ بیٹھے ہوئے تھے؟''

''اسٹیج کی بائیں جانب والی کرسیوں پر۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''آپ نے جس مقام کا ذکر کیا، اس حصے میں کرسیوں کی پچیس، پچیس والی چار قطاریں لگائی گئی تھیں، یعنی وہاں ایک سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔'' وکیل استغاثہ نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس قطار میں، کہاں بیٹھے تھے؟''

''تیسری قطار کے تقریباً وسط میں۔'' گواہ نے بتایا۔

''اور ملزم؟''

''یہ مجھ سے پچھلی یعنی چوتھی اور آخری قطار میں بیٹھا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے عین عقب میں نہیں بلکہ بائیں طرف تھوڑا ہٹ کر.....''

''آپ نے فائر کی آواز تو واضح طور پر سنی ہوگی.....؟''

''جی بالکل.....'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے پیچھے بائیں جانب کوئی بم پھٹا ہو..... سچ پوچھیں تو میں گولی چلنے کی آواز سے بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گولی چلنے کی آواز اسی طرف سے آئی تھی جدھر ملزم بیٹھا ہوا تھا.....؟'' وکیل استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے اپنے گواہ کو دیکھا۔

''جی ہاں..... بالکل!'' گواہ نے وکیل استغاثہ کے حسبِ منشا جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے جرح موقوف کردی۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کرکے گواہوں والے کٹہرے کے قریب چلا گیا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

''مقبول صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل سرکار کو بتایا ہے کہ فائر کی آواز سنتے ہی آپ بہت زیادہ ڈر گئے تھے.....؟''

مقبول احمد کی عمر پچیس کے نزدیک تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک، گندمی رنگت والا ایک عام سا شخص تھا۔ اسے کھیل تماشے اور جلسے جلوس میں شرکت کا بہت شوق تھا۔ اپنے اسی شوق کی تسکین کی خاطر وہ وقوعہ کی رات جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

''وکیل صاحب! وہ بڑی خوفناک اور دل دہلا دینے والی آواز تھی۔ میں ڈرتا نہیں تو اور کیا کرتا.....!''

''اس خوف زدگی کے عالم میں آپ نے سب سے پہلا کام کیا، کیا تھا؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہر انسان کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے، وکیل صاحب.....'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جیسے ہی گولی چلنے کی آواز سنی اور اسٹیج پر ڈاکٹر صاحب کو گرتے دیکھا تو گرتے پڑتے، دوڑتے بھاگتے میں فوراً جلسہ گاہ سے باہر نکل گیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ملزم کو کرسیوں کی تیسری اور چوتھی قطار کے بیچ نیم بے ہوش پڑے نہیں دیکھا تھا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی نہیں!''

''کیا آپ ملزم کو پہلے سے جانتے تھے؟'' میں نے بہ دستور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''مطلب..... اس رات جلسہ گاہ میں آپ نے ملزم کو پہلی بار دیکھا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں..... پہلی بار۔'' استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں، مقبول صاحب.....'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''فائر کی آواز سنائی دینے سے پہلے آپ والے حصے میں موجود ایک سو افراد بشمول آپ اور ملزم اپنی اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے یا ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین چار افراد کھڑے ہوئے بھی تھے.....؟''

''کوئی ایک بھی کھڑا نہیں تھا۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے ڈاکٹر صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔''

''مقبول صاحب! آپ سے میرا آخری سوال.....'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل سرکار کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ کی عقبی جانب، بائیں سمت میں گولی چلنے کی آواز اسی مقام سے ابھری تھی جہاں ملزم بیٹھا ہوا تھا۔ کیا آپ.....!''

''میں نے جو سنا، وہ بیان کیا ہے۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ کو میری بات پر یقین کرنا ہے تو کریں ورنہ آپ کی مرضی۔''

''میرے یقین کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ بہت بعد میں آئے گا، مقبول صاحب!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال میں آپ سے جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دیں۔ اگر آپ نے قطع کلامی نہ کی ہوتی تو میرا سوال آپ تک پہنچ گیا ہوتا۔ خیر، میں اپنی ان کہی کو آپ کی سماعت تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میرا یہ سوال آپ کی سماعت میں ایٹمی دھماکا کرے تو پیشگی معذرت......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی، پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین پر گولی چلاتے دیکھا تھا؟''

''نن...... نہیں!'' اس نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا چنانچہ جج نے تین ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے پہلے دو ایسے گواہ پیش کیے گئے جن کا تعلق مقتول ڈاکٹر کے اسپتال سے تھا۔ میں باری باری ان کے بیانات اور جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

اشتیاق حسین کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ مقتول کے اسپتال کا چوکیدار تھا اور ہر وقت اسپتال کے گیٹ پر مسلح کھڑا رہتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی رات میں ہوتی تھی۔ دن کے وقت ایک دوسرا شخص یہی ڈیوٹی انجام دیا کرتا تھا۔ اشتیاق حسین کو جس مقصد کی خاطر گواہی کے لیے لایا گیا تھا، وہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔

گواہ کا بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیلِ استغاثہ نے اس سے پوچھا۔ ''اشتیاق حسین! آپ کو وہ رات یاد ہے جب ملزم نے اسپتال کے گیٹ پر آپ سے بڑی سنگین گفتگو کی تھی؟''

''جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس وقت رات کے گیارہ، سوا گیارہ بجے تھے۔ ملزم بہت غصے میں اسپتال کے اندر سے نکلا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا ہوا بھائی؟ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا...... میں اس اسپتال کے مالک کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بہت جلد میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوگا۔''

''اسپتال کے مالک سے ملزم کی کیا مراد تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''ظاہر ہے، اسپتال کے مالک تو ڈاکٹر ارشاد حسین صاحب ہی ہیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''ملزم نے انہی کی جان لینے کی بات کی تھی۔''

''یہ مقتول کی موت سے کتنا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے؟''

''لگ بھگ چھ ماہ پہلے......'' گواہ نے بتایا۔

''گویا، ملزم اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا......'' وکیل استغاثہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''پھر چھ ماہ بعد اسے یہ موقع میسر آگیا اور اس نے جلسہ گاہ میں جاکر مقتول کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔''

''جی...... بالکل......'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خطرناک لوگ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے تو سالوں تک انتظار کرتے ہیں، وکیل صاحب......!''

گواہ کے اس جواب سے مطمئن ہوکر وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح ختم کردی اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''یور ٹرن......!''

''اشتیاق صاحب......!'' میں نے اپنی باری پر وٹنس باکس کے قریب جاکر استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔ ''کیا آپ انسانوں کی نیت پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟''

''نہیں، وکیل صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نیت کا حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

''تو پھر آپ بلا کے چہرہ شناس ہوں گے......؟''

''مم...... میں...... سمجھا نہیں جناب......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اپنے گواہ کو مصیبت زدہ جانتے ہوئے وکیل استغاثہ فوراً مدد کو لپکا۔ ''اشتیاق حسین ایک سیدھا سادہ نائٹ واچ مین ہے۔ میرے فاضل دوست غیر متعلقہ اور نامناسب سوالات کرکے گواہ کو پریشان کررہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''اگر میرے فاضل دوست ''غیر متعلقہ'' اور ''نامناسب'' کی تشریح کردیں تو ممکن ہے ان سوالات کی ضرورت ہی نہ رہے......'' میں نے کرسیِ انصاف پر بیٹھے ہوئے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

''جناب عالی! اس وقت عدالت میں ڈاکٹر ارشاد حسین مرڈر کیس کی سماعت ہورہی ہے اور وٹنس باکس میں

کھرا سادہ لوح گواہ مقتول کے اسپتال میں چوکیداری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ انسانوں کی نیت کو پڑھ لینا، ان کے چہرے کے تاثرات سے ان کے ارادوں کو بھانپ لینا جیسے سوالات کا بھلا اس کیس سے کیا لینا دینا......؟''

''آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے، بیگ صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''یور آنر! میں نے استغاثہ کے گواہ سے جو دو سوالات کیے ہیں، ان کا زیرِ سماعت کیس سے بہت زیادہ لینا دینا ہے اور میری جرح اس تعلق کو ابھی واضح کر دے گی لیکن چونکہ وکیلِ سرکار کے مطابق استغاثہ کا گواہ ایک سیدھا سادہ معصوم انسان ہے اس لیے......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''......اس لیے میں گواہ کی آسانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہی سوالات سادہ الفاظ میں پوچھ لیتا ہوں۔''

''اوکے!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں، پلیز......!''

''اشتیاق صاحب!'' میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مقتول کے اسپتال میں کب سے نوکری کر رہے ہیں؟''

''تقریباً پانچ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مقتول کے مزاج، فطرت اور عادت واطوار کو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟''

''جی ہاں......!'' اس نے کہا۔

''اور اسپتال کے معیار اور قواعد و ضوابط کو بھی......؟'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

اس نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔ ''جی بالکل۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ سے کم وبیش چھ ماہ پہلے آپ نے ملزم کو بہت غصے میں اسپتال سے نکلتے دیکھا تھا اور اس نے طیش کے عالم میں اسپتال کے مالک یعنی مقتول ارشاد حسین کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔'' میں نے بہ دستور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ملزم کی اس برہمی اور اشتعال کا سبب کیا تھا؟''

''ملزم اپنی بیوی کو بچے کی پیدائش کے لیے اسپتال لے کر آیا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''پھر اسپتال میں اس کی بیوی چل بسی۔ بس، اسے اپنی بیوی کی موت کا غم تھا۔ وہی اس کے غصے میں بدل گیا۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وکیل صاحب۔ ہمارا اسپتال اس شہر کا سب سے جدید اور ترقی یافتہ اسپتال ہے۔ علاج ومعالجے کی اس سے زیادہ بہتر سہولیات اور کسی اسپتال میں مہیا نہیں ہیں۔ ہمارے اسپتال کے ڈاکٹرز مریض کی صحت یابی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ آگے اللہ کی مرضی......''

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ نے بتایا کہ اس رات ملزم اپنی بیوی کی موت کے صدمے سے اس قدر ٹوٹ گیا تھا کہ اس نے اسپتال کے مالک ڈاکٹر ارشاد حسین کو جان سے مارنے کی دھمکی دے ڈالی۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن ڈیفنس کی نظر میں استغاثہ کے گواہ کا بیان نامکمل ہونے کے ساتھ ہی اپنے اندر کئی ایک تکنیکی سقم بھی رکھتا ہے......!''

''مثلاً؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وکیلِ استغاثہ نے سوال کر دیا۔

''مثال کے طور پر......'' میں نے وکیلِ مخالف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس رات صرف ملزم کی بیوی اسپتال کی عدم توجہی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں نہیں چلی گئی تھی بلکہ ماں کے پیٹ میں موجود بچہ بھی اس دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گیا تھا۔ بیوی اور بیٹے کی موت نے یقیناً ملزم کو حد سے زیادہ دکھی اور جذباتی کر دیا تھا اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں کہ دل گرفتگی کی اس کیفیت میں ملزم نے اس اسپتال اور اسپتال کے مالک کے خلاف کافی کچھ کہہ ڈالا تھا لیکن ملزم کی اس دہائی کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ اسپتال کے ڈاکٹروں کی کسی کوتاہی یا غفلت کے باعث اس کی بیوی اور بیٹے کی موت واقع ہو گئی تھی۔''

''پھر......پھر ملزم نے اسپتال کے مالک کو جان سے مارنے کی دھمکی کیوں دی تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''آپ تو مجھ سے اس طرح سوال کر رہے ہیں جیسے آپ کو اس بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ واقعی کچھ نہیں جانتے؟''

''آپ اس فکر میں دبلے نہ ہوں کہ استغاثہ کیا جانتا اور کیا نہیں جانتا۔'' وہ خاصے روکھے لہجے میں بولا۔ ''آپ معزز عدالت کے سامنے اپنے مؤقف کی وضاحت کریں تاکہ

ہمیں پتا چلے کہ آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

''میرے فاضل دوست! میں آپ کی تشفی چند منٹ بعد کر پاؤں گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''امید ہے آپ تھوڑا انتظار کرلیں گے۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''ڈیفنس دیدہ و دانستہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ لگتا ہے اپنے کہے ہوئے الفاظ کو ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے، اسی لیے چند منٹ کی مہلت مانگ کر بات کو کسی اور جانب گھمانے کی کوشش کی جارہی ہے۔''

''جناب عالی! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''بلکہ ''واپس'' کا لفظ مناسب نہیں۔ یوں سمجھیں کہ میں اپنے الفاظ کو ادھر سے ادھر شفٹ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس روز ملزم نے مقتول کے اسپتال کے ڈاکٹروں کی کسی کوتاہی یا غفلت کے نتیجے میں اسپتال کے مالک کو جان سے مارنے کی دھمکی نہیں دی تھی؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''وہ الگ معاملہ ہے، جس پر میں بعد میں روشنی ڈالوں گا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اپنے الفاظ کو شفٹ کرنے سے میری کچھ اور مراد ہے۔''

''جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی لچھے دار باتوں سے اس کیس کو الجھانے کی کوشش کررہے ہیں.....'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''انہیں ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کی سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ پہلے اپنی ''مراد'' کی وضاحت کریں۔ اس کے بعد ڈاکٹروں کی غفلت اور کوتاہی والے معاملے پر روشنی ڈالیں۔''

''جناب عالی! تھوڑی دیر پہلے میں نے استغاثہ کے گواہ اشتیاق حسین کے حوالے سے کہا تھا کہ کیا وہ انسانوں کی نیت کو پڑھنا جانتے ہیں اور کیا وہ چہرہ شناسی کے علم پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔'' میں نے جج کے احکامات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے یہ الفاظ استغاثہ کے گواہ سے وکیل استغاثہ کی طرف شفٹ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ دونوں صلاحیتیں میرے فاضل دوست میں بہ درجہ اتم پائی جاتی ہیں، جس کا ثبوت وکیل موصوف کا میرے بارے میں یہ اظہارِ رائے ہے..... ڈیفنس دیدہ و دانستہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ لگتا ہے اپنے کہے ہوئے الفاظ کو ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے، اسی لیے چند منٹ کی مہلت مانگ کر بات کو کسی اور جانب گھمانے کی کوشش کی جارہی ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! وکیل سرکار کے اس دعوے سے تو یہی لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی نادیدہ قوت کی مدد سے میرا چہرہ اور نیت کو نوشتۂ دیوار کی طرح پڑھ لیا ہے۔ میں اپنے فاضل دوست کی عظمت کو سیلوٹ کرتا ہوں سر.....!''

میری اس وضاحت پر وکیل استغاثہ ایسی نظر سے مجھے گھورنے لگا جیسے کچا ہی چبا ڈالے گا تاہم اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور وہ ڈاکٹروں کی غفلت یا کوتاہی کا کیا معاملہ ہے؟''

''جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس ایشو پر میں تھوڑی دیر کے بعد روشنی ڈالوں گا تو میں اپنے ان الفاظ کا پابند ہوں جناب عالی!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''اگر چیزیں ایک خاص ترتیب میں رہیں گی تو اس سے عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں ہوگا اور اس ترتیب کا تقاضا ہے کہ میں استغاثہ کی گواہ نورین صاحبہ پر جرح کے دوران میں اس موضوع کو اٹھا کر اپنے مؤقف کی وضاحت کروں.....''

میں آج عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی پیش کار سے مل کر یہ معلوم کرچکا تھا کہ آج استغاثہ کی جانب سے اشتیاق حسین اور نورین صاحبہ کو گواہی کے لیے پیش کیا جائے گا اسی لیے میں نے بڑے اعتماد سے نورین کا نام لے دیا تھا۔

''کیا استغاثہ کی گواہ نورین کو آج پیش کیا جائے گا؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔

''یس سر!'' وکیل استغاثہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ.....!'' جج نے مجھ سے کہا۔

''اشتیاق صاحب!'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''تو آپ کے خیال میں مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کا پرائیویٹ اسپتال اس شہر کا سب سے زیادہ جدید اور قابلِ بھروسا اسپتال ہے؟''

''یہ میرا خیال نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے وکیل صاحب!'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

''اس حقیقت کا لٹمس ٹیسٹ بھی کرتے ہیں۔'' میں

نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے آپ یہ بتائیں، کیا آپ ہمیشہ رات ہی کی ڈیوٹی کرتے ہیں یا کبھی دن میں بھی یہ فریضہ انجام دیتے ہیں؟''

''عمومی طور پر تو میں رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ڈیوٹی کرتا ہوں اور خورشید علی صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لیکن اگر کبھی کوئی ہنگامی صورتِ حال کا سامنا ہو تو ہم دونوں اپنی ضرورت کے تحت شفٹ ایک دوسرے سے بدل بھی لیتے ہیں یا پھر ڈیوٹی ٹائم میں تھوڑا ردوبدل کر کے اپنے مسائل سے نمٹ لیتے ہیں مگر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہوگیا.....'' میں نے عام سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا وہ رات آپ کی یادداشت میں محفوظ ہے جب آپ کے مالک کو جلسہ گاہ میں گولی لگی تھی؟''

''جی..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

''اس رات دس اور بارہ بجے کے درمیان آپ کہاں تھے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ.....'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''جب مقتول ڈاکٹر کو اسپتال لایا گیا تو اس وقت آپ گیٹ پر موجود تھے؟''

''نن..... نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''مطلب..... آپ کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے؟''

''نہیں جناب..... میں اسپتال کے گیٹ پر موجود تھا لیکن.....!''

گواہ نے ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو میں نے اس پر چڑھائی کر دی اور خاصے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''لیکن کے آگے کیا.....؟''

''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو کسی اور اسپتال لے جایا گیا تھا.....''

''وہ کیوں.....؟'' میں نے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

''جائے وقوعہ سے نزدیک ترین اسپتال، مقتول کا ذاتی پرائیویٹ اسپتال تھا جس کے بارے میں آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ شہر میں اس کی ٹکر کا کوئی اور اسپتال نہیں ہے۔ علاج معالجے کی جدید ترین سہولیات فراہم کرنے والے مقتول کے عظیم الشان اسپتال کو نظر انداز کر کے اسے کسی اور اسپتال میں کیوں لے جایا گیا تھا؟''

''میں..... اس بارے میں..... کچھ نہیں جانتا.....''

اشتیاق حسین بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں اس بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین اور اس کے لواحقین اچھی طرح اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ دوسو گز کے پلاٹ پر، شہر کے مرکز میں بنا ہوا وہ تین منزلہ مہنگا اسپتال صرف نوٹ چھاپنے کی مشین ہے۔ اس کا معیار وہ نہیں ہے جو کہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ معاملہ ہاتھی کے دانتوں ایسا ہے یعنی دکھانے کے اور، چبانے کے اور..... اور اس کا سبب خود مقتول ہی تھا۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں.....؟'' وکیلِ استغاثہ نے بھویں سکیڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے مقتول نے جان بوجھ کر اپنے اسپتال کے معیار کو گرایا ہوا تھا..... کوئی شخص بھلا ایسا کیوں کرے گا؟''

''نان پروفیشنل ازم میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیلِ استغاثہ کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مقتول کا میڈیکل اینڈ میڈیسن کے شعبے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ ایک میٹرک فیل شخص تھا۔ اپنے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا لفظ اس نے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے لگایا ہوا تھا۔ اس اسپتال کے قیام سے قبل وہ کباڑ کے بزنس سے وابستہ تھا۔ اگرچہ اس بزنس میں بھی بہت پیسا ہے لیکن وہ عزت نہیں جو اس معاشرے میں کسی ڈاکٹر کو حاصل ہے لہٰذا اپنے سیاست داں بہنوئی کے مشورے پر اس نے کباڑ کی خرید و فروخت کا دھندا چھوڑ کر شہر کے قلب میں ایک تین منزلہ پرائیویٹ اسپتال بنا لیا جہاں پر کام کرنے والے تمام ڈاکٹرز، نرسز و دیگر ٹیکنیکل اسٹاف اپنے اپنے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کی قابلیت اور صلاحیت پر پچھلے دو سال میں سیکڑوں سوالات اٹھ چکے ہیں جبکہ مذکورہ اسپتال کے چارجز کو ہوش ربا کہا جاسکتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ میں.....''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ مقتول چونکہ بائی پروفیشن ڈاکٹر نہیں تھا اس لیے آپ کے مؤکل نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا؟'' وکیلِ استغاثہ نے قطع کلامی کر۔

ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے میرے فاضل دوست۔'' میں نے طنزیہ نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے مجھے اپنی بات مکمل کرنے دی ہوتی تو آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی.....!''

''تو بتائیں.....'' وہ خجالت بھرے انداز میں بولا۔

''آپ معزز عدالت کے سامنے کیا ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے؟''

''صرف یہی کہ اگر ڈرائیور اناڑی یعنی ڈرائیونگ کے ہنر سے نابلد ہو تو اسے مہنگی ترین آٹومیٹک کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھادینے سے کسی قسم کے مثبت نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اول تو وہ گاڑی کو چلا ہی نہیں پائے گا اور اگر انکل پیچ کا استعمال کرکے اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کر بھی لیا اور گاڑی آگے بڑھنے لگی تو پھر روڈ پر آتے ہی کوئی خوفناک حادثہ ناگزیر ہے۔ بالکل ایسا ہی معاملہ کسی کباڑیے کا اسپتال کھولنے کا بھی ہے۔ میں صرف یہ بتانے کی کوشش کررہا تھا کہ نام نہاد ڈاکٹر مقتول ارشاد حسین کا اسپتال انتہائی ناقص کارکردگی کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلسہ گاہ میں گولی لگنے کے بعد اس کے لواحقین اور خیر خواہ افراد نے اس اسپتال کا رخ نہیں کیا تھا۔''

''اور وہ مزے کی بات کیا ہے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

وکیل استغاثہ کی قطع کلامی کے باعث میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ جج نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں نے مکمل لہجے میں جواب دیا۔

''جناب عالی! میں نے مقتول کی تعلیم، پیشے اور طریقۂ واردات کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا اسے معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کرسکتا ہوں لیکن چونکہ ان موضوعات کا زیر سماعت کیس سے کوئی علاقہ نہیں ہے لہٰذا میں عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ بس، وہ مزے کی بات یہی تھی کہ میں نے اپنے موکل کے علاوہ مقتول پر بھی باثبوت تھیسس کررکھا ہے اور جہاں تک قاتل کو اس عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانے کی ذمے داری ہے تو میرے خیال میں یہ بوجھ استغاثہ کے کندھوں پر زیادہ اچھا لگتا ہے.....'' پھر میں نے وکیل استغاثہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سلگانے والے انداز میں پوچھا۔ ''آپ اس ذمے داری کو اٹھانے کے لیے تیار ہیں نا.....؟''

''استغاثہ کو اپنے فرائض اور ذمے داریوں کا اچھی طرح احساس ہے میرے فاضل دوست۔'' وکیل استغاثہ نے معاندانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے کام پر توجہ دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''میں اس نادر و نایاب مشورے کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔'' میں نے میٹھا طنز کیا، پھر روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

اشتیاق حسین کمرائے عدالت سے رخصت ہوا تو وٹنس باکس میں استغاثہ کی گواہ نورین نے لے لی۔ نورین مقتول کے اسپتال میں بہ طور ریسپشنسٹ کام کرتی تھی اور جس روز ملزم اپنی بیوی کو لے کر اسپتال پہنچا تو نورین نائٹ ڈیوٹی کررہی تھی۔ نورین کو استغاثہ کے گواہوں میں اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ اس رات میرے موکل نے اس کے سامنے مقتول کے خلاف بڑے جوشیلے انداز میں دھمکی آمیز باتیں کی تھیں۔

نورین نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کی غرض سے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا، پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے گواہ سے پوچھا۔

''نورین صاحبہ! کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟''

''جی..... بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''اس رات جب یہ شخص اپنی بیوی کی زچگی کا کیس لے کر اسپتال پہنچا تو اس وقت آپ ریسیپشن پر موجود تھیں؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''اور ملزم نے آپ کے سامنے مقتول اور مقتول کے اسپتال کو بہت برا بھلا کہا تھا ..... ہیں نا؟''

''جی.....!'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''اس بندے نے درجن بھر افراد کے سامنے ڈاکٹر ارشاد حسین کو قتل کرنے اور اس کے اسپتال کو جلا کر راکھ کردینے کی دھمکی دی تھی۔''

''اسپتال تو ابھی تک اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے مگر اس واقعے کے چھ ماہ بعد ڈاکٹر ارشاد حسین کو ایک جلسہ گاہ میں شوٹ آؤٹ کردیا گیا۔'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر ملزم کو جائے واردات سے فی الفور گرفتار نہیں کرلیا گیا ہوتا تو پھر اسپتال کی سلامتی کو بھی سنگین خطرات لاحق ہوسکتے تھے.....؟''

وکیل استغاثہ نے اپنی بات کے اختتام پر استفساریہ انداز میں گواہ کی جانب دیکھا تو وہ جلدی سے اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''جی بالکل..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

گواہ کے تائیدی جواب پر وکیل استغاثہ نے جرح موقوف کردی۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کرکے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''نورین صاحبہ! آپ مقتول کے اسپتال میں کتنے عرصے سے کام کررہی ہیں؟''

''دوسال سے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ آپ ملزم کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا مجھے بتائیں کہ آپ ملزم کے بارے میں کیا کیا جانتی ہیں؟''

''بس یہی کہ یہ چھ سات ماہ سے اپنی بیوی کو لے کر اسپتال آتا رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اس کے علاوہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں!''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ ملزم کو جانتی نہیں، محض پہچانتی ہیں.....'' میں نے کہا۔ ''میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''میری ڈیوٹی شفٹ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی مارننگ، کبھی آفٹر نون اور کبھی نائٹ۔ میں نے دو تین بار دن کے وقت بھی اسے اسپتال آتے دیکھا تھا۔''

''میرا موکل عموماً دن ہی میں اپنی بیوی کے چیک اپ کے لیے اس اسپتال جایا کرتا تھا کیونکہ اس نے ڈیلیوری کے لیے چند ماہ پہلے وہیں رجسٹریشن کرا رکھی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ہر ماہ نہایت ہی پابندی کے ساتھ اپنی بیوی کے چیک اپ کی غرض سے اسپتال پہنچتا تھا۔ یہ ان کا پہلا بچہ تھا لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں ڈیلیوری ہو۔ بے چارہ ایک تھرڈ کلاس اسپتال کو اے ون سمجھ کر ڈاکٹر کی بھاری فیس اور دیگر اخراجات برداشت کررہا تھا.....!''

میں نے اپنی بات اس طرح مکمل کی تھی کہ استغاثہ کی گواہ اس پر اظہارِ خیال کرے لیکن خلافِ توقع وہ خاموش کھڑی رہی۔ نورین کی عمر ستائیس سے تیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلی پتلی اور خوش شکل لڑکی تھی۔ نورین کے لیے ''اسمارٹ ریسپشنسٹ'' کا ٹائٹل انتہائی موزوں تھا۔

''نورین صاحبہ! کیا آپ کی شادی ہوگئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''جی ہاں۔''

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ہم اس نعمت خداوندی سے محروم ہیں۔''

''تو پھر آپ اس عظیم نعمت کے چھن جانے کے دکھ سے بھی ناآشنا ہوں گی۔ خیر، اچھی طرح سوچ کر بتائیں.....'' میں نے استغاثہ کی گواہ کو اپنے مختلف الزاویہ سوالات کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس رات ایسا کیا ہوا تھا کہ ملزم نے اسپتال کو جلا ڈالنے اور مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کی دھمکی دے ڈالی تھی؟''

''یہ اپنی بیوی کے ساتھ اسپتال پہنچا تھا اور خاصا گھبرایا ہوا تھا کیونکہ اس کی بیوی کی زچگی کا وقت آن پہنچا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی بیوی کو داخل کرلیا گیا۔ متعلقہ ڈاکٹر نے ملزم کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ ڈیلیوری میجر آپریشن سے ہوگی جس کا خرچہ لگ بھگ بارہ ہزار روپے ہوگا۔ ملزم کی بیوی کو لیبر روم میں لے جانے سے پہلے ملزم سے کہا گیا کہ وہ کچھ رقم ریسیپشن پر جمع کرادے.....''

''اس وقت ریسیپشن پر آپ کی ہی ڈیوٹی تھی؟'' میں نے گواہ کو بیچ میں ٹوکنا ضروری جانا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟''

''جی..... آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''میں نے پوچھا۔ ''نورین صاحبہ! آپ نے ملزم سے کتنے پیسے جمع کرانے کے لیے کہا تھا؟''

''پانچ ہزار روپے!'' اس نے بتایا۔ ''دراصل اسپتال کے مروجہ اصول کے مطابق کسی بھی میجر آپریشن کی صورت میں سرجن کی فیس اور سرجری کے اخراجات ایڈوانس میں وصول کرلیے جاتے ہیں۔''

''آپ کے پانچ ہزار روپے کے تقاضے پر ملزم نے کیا کہا تھا؟'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''اس نے کہا تھا کہ آپ لوگ آپریشن شروع کریں۔ یہ اگلی صبح پانچ ہزار جمع کرادے گا۔''

''کیا آپ لوگوں نے ملزم کی درخواست منظور کرلی تھی؟''

''نہیں!'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ آپ کے اسپتال کا یہ اٹل اصول ہے کہ جب

تک مریض کے ورثاء اسپتال کے کھاتے میں ایک مخصوص رقم جمع کرا کے اس کی رسید نہ لے لیں، سرجن آپریشن تھیٹر میں قدم رکھتا ہے اور نہ ہی مریض کو ہاتھ لگاتا ہے۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔ آپ درست فرما رہے ہیں۔'' استغاثہ کی گواہ نے کہا۔ ''ہمارے اسپتال کا یہی قاعدہ ہے جس پر... بہرصورت عمل کیا جاتا ہے۔''

''نورین صاحبہ! کیا پچھلے سات آٹھ ماہ میں ملزم نے اسپتال کی کسی بھی چھوٹی بڑی پے منٹ میں کوئی تاخیر یا کوتاہی کی تھی؟'' میں نے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔

''جی نہیں!'' اس نے جواب دیا۔ ''اس حوالے سے ملزم کا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔''

''کیا ملزم نے آپریشن والے پانچ ہزار روپے اگلی صبح جمع کرانے کی کوئی وجہ بتائی تھی؟''

''اس نے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس وقت ملزم کے پاس مذکورہ رقم موجود نہیں تھی۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

''آپ کا اندازہ صد فیصد درست ہے، نورین صاحبہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کا بھی ایک سبب تھا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی متوقع ڈیلیوری ڈیٹ سے چند روز پہلے ہی ملزم کی بیوی کو مخصوص درد شروع ہو گیا تھا اور اسے لگ بھگ آدھی رات کو ایمرجنسی میں اسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ اتفاقاً اس موقع پر اس کی جیب میں پانچ ہزار کی رقم موجود نہیں تھی اور..... ان نازک لمحات میں اسپتال کا رویہ جلادانہ ہو گیا تھا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک افسردہ سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔

''ایڈوانس میں رقم جمع کراؤ گے تو تمہاری بیوی کا آپریشن کیا جائے گا ورنہ وہ جیے یا مرے، یہ اسپتال والوں کا مسئلہ نہیں ہے..... یہی ہے نا آپ کے اسپتال کا زریں اصول.....؟''

وہ کچھ نہیں بولی، ندامت بھری نظر سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔ میرے سوال کا جواب دینے کی اس کے اندر تاب نہیں تھی۔ میں اس کی مجبوری کو سمجھ سکتا تھا مگر میری نگاہ میں اس وقت اپنے موکل کی مجبوری زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔

''میرے موکل کی بیوی کے اس سے قبل دو ابارشنز ہو چکے تھے۔'' میں نے غموں سے چُور لہجے میں کہا۔ ''آٹھ سال بعد قدرت اس پر مہربان ہوئی تھی۔ وہ ایک پھول جیسے بیٹے کو جنم دینے والی تھی لیکن آپ کے اسپتال کے غیر انسانی اصول نے اس کی جان لے لی اور اس کے شکم میں موجود بچہ بھی اس دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو گیا.....''

''مجھے اس واقعے کا بہت افسوس ہے۔'' وہ شرمندگی بھری آواز میں بولی۔ ''لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں.....''

''میں کب آپ کو قصوروار ٹھہرا رہا ہوں، نورین صاحبہ!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تو اس جعلی ڈاکٹر مقتول ارشاد حسین کے اسپتال کے اصولوں کی بے حسی اور بے رحمی کا نوحہ سنا رہا ہوں۔ اتنی درندگی اور سفاکی تو شاید جانوروں میں بھی نہ پائی جاتی ہو.....'' میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''جناب عالی! اس رات میرے موکل کی بیوی اپنے نامولود بچے سمیت تڑپ تڑپ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ ڈاکٹروں کی غفلت اور کوتاہی کا رونا تو اس وقت رویا جائے نا جب انہوں نے کسی مریض کو اٹینڈ کیا ہو۔ یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ ہَوا و ہوس پر مبنی اسپتال کے جلاد صفت اصولوں نے ایک بے یار و مددگار عورت کو اپنے جگر گوشے کے ساتھ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس قیامتِ صغریٰ پر اگر ایک سوختہ دل اور انگارہ دماغ انسان نے اس موذی اسپتال کو جلا کر راکھ کر دینے اور اسپتال کے مالک کو موت کے گھاٹ اتارنے کی بات کی تھی تو اس میں کیا عجب ہے.....؟ آگ بھانکنے والے دہانے پھول نہیں اگلا کرتے جناب عالی!..... اپنی بیوی اور بیٹے کے سفاک قتل پر اگر میرے موکل نے غبارِ جگر دھو ڈالا تو اس کے دو جملوں پر استغاثہ کی عمارت کھڑی کر کے اسے مقتول کے قتل کے الزام میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے نازک لمحات ضرور آتے ہیں جب جذبات کے بہاؤ پر اس کا قابو نہیں رہتا اور وہ بے اختیاری کی کیفیت میں کچھ بھی بول جاتا ہے جس پر عمل کرنے کی اس کی نیت ہوتی ہے اور نہ ہی ارادہ..... دیٹس آل یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مخصوص وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

شاکر علی کا باپ باقر علی ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا تھا۔ ہم ایک ساتھ ہی کمرۂ عدالت سے باہر نکلے تو اس نے مجھ سے کہا۔

''وکیل صاحب! میں آپ سے ایک دو ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں؟''

''ضرور دے سکتا ہوں باقر صاحب!'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں آپ کے بیٹے کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔ آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی سے پہلے ہو سکتا ہے، وقت نہ ملے......''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ ایک درخت کے نزدیک رکتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ شاکر سے مل کر آجائیں۔''

میں باقر علی کو وہاں چھوڑ کر جیل وین کی جانب بڑھ گیا جو سٹی کورٹ کے احاطے میں ایک طرف کھڑی اپنے مسافروں کا انتظار کر رہی تھی۔ جیل میں موجود جن قیدیوں کی کسی عدالت میں تاریخ ہوتی ہے، یہ وین انہیں جیل سے کورٹ اور کورٹ سے واپس جیل پہنچانے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم شاکر علی بھی جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں تھا۔

آئندہ پیشی پر میں اپنے مؤکل سے بھی چند اہم سوالات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی سلسلے میں اسے یاد دہانی کرانا تھی کہ وہ اس کام کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے۔ شاکر علی ایک باشعور اور سمجھ دار انسان تھا۔ اپنا مقصد اس پر واضح کرنے میں مجھے بہ مشکل پانچ منٹ لگے۔ میں نے علیحدگی میں اس سے ٹو دی پوائنٹ مختصر سی بات کی، پھر میں اس کے باپ باقر علی کے پاس آ گیا۔

''جی باقر صاحب......!'' میں نے اپنے مؤکل کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بتائیں، آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں؟''

''اب تک جو بھی عدالتی کارروائی ہوئی ہے اس میں، میں آپ کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔'' وہ اپنا متفکر نظر مجھ تک پہنچاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بڑی محنت اور مہارت کے ساتھ میرے بیٹے کا دفاع کر رہے ہیں لیکن ہزار بار سوچنے کے باوجود بھی میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کن نکات کی بنا پر شاکر کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوں گے......؟''

''آپ کی سمجھ میں اس لیے نہیں آ رہا کہ آپ اپنے دماغ سے سوچ رہے ہیں۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میرا سوچا ہوا آپ تک ٹرانسفر نہیں ہو رہا جبکہ میں نے اچھی طرح یہ طے کر رکھا ہے کہ میں نے وننگ شاٹ کب اور کس بال پر کھیلنا ہے......!''

''یہ تو بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ آپ نے اس کیس کے اینڈ تک سب کچھ پلان کر رکھا ہے۔'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر ایک آسودہ سانس خارج کرنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میں اس حوالے سے آپ کو کریدنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے اطمینانِ قلب کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اپنے وننگ اسٹروک کے بارے میں مکمل جان کاری رکھتے ہیں۔''

''میں آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا باقر صاحب!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں میں فیصلہ آپ کے بیٹے کے حق میں آجائے گا...... انشاء اللہ!''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!'' وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

میں نے زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

سامعین و ناظرین کی اچھی خاصی تعداد کمرائے عدالت میں موجود تھی۔ اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کو عدالت میں لایا گیا تھا، جن میں سے دو کے بیانات میں کوئی خاص بات نہیں تھی لہٰذا میں ان کے ذکر سے پہلوتہی کرتے ہوئے تیسرے گواہ کی جانب بڑھتا ہوں جس کا نام عامر فیضی تھا۔ یہ شخص اسی بسکٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا جہاں ملزم سپروائزر ہوا کرتا تھا۔

عامر فیضی کی عمر چالیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک پستہ قامت اور مائل بہ فربہی بدن کا مالک شخص تھا۔ فیضی کی شخصیت میں دو چیزیں بہت نمایاں تھیں ایک تو یہ کہ اس کے سر کے بال بیچ میں سے اڑن چھو ہو چکے تھے، کھوپڑی کے گرداگرد بالوں کی ایک جھالر سی دکھائی دیتی تھی، دوسرے اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ اس کے دہانے اور جثے کو دیکھ کر بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ حد سے زیادہ کھاتا ہوگا۔ اس کی وضع قطع میں بسیار خوری کی ساری علامات موجود تھیں۔

عامر فیضی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

''عامر فیضی! کیا آپ ملزم کو پہچانتے ہیں؟''

''جی ..... بہت اچھی طرح!'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''یہ ہماری فیکٹری کا سپروائزر ہے۔''

''یعنی آپ ملزم کے انڈر کام کرتے ہیں؟''

''کرتا تھا جناب.....'' گواہ نے ناپسندیدہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب ہمارے سپروائزر واصف صاحب ہیں۔''

''آپ کے نئے سپروائزر کا اس کیس سے کوئی کنکشن نہیں ہے لہٰذا ہم آپ کے سابق سپروائزر اور زیر سماعت کیس کے ملزم کے بارے میں بات کریں گے۔'' وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ ملزم کا دوسرے فیکٹری ورکرز کے ساتھ کیسا رویہ تھا اور یہ مزاج و عادات کا کیسا ہے؟''

''میں نے اس شخص کو بہت ہی مغرور اور کینہ پرور پایا ہے۔'' عامر فیضی نے زہر افشانی کرتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے ورکرز کے ساتھ اس کا سلوک، بس ٹھیک ہی تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ملزم میں خود پسندی بہت زیادہ ہے۔ یہ اپنے مزاج کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کرتا اور فوراً غصے میں آجاتا ہے۔''

''وقوعہ سے کم و بیش چھ ماہ پہلے ملزم کی بیوی اور نامولود بیٹے کا انتقال ہوگیا تھا۔'' وکیلِ استغاثہ نے تیکھے لہجے میں اپنی جرح کو آگے بڑھایا۔ ''اس واقعے نے ملزم کو ذہنی طور پر بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہ اپنی بیوی اور بیٹے کی موت کا ذمے دار اس پرائیویٹ اسپتال کے مالک یعنی مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کو سمجھتا تھا اور ہر وقت مقتول کے خلاف انتقام بھری باتیں کرتا رہتا تھا۔ کیا آپ نے بھی ملزم کے منہ سے ایسا کچھ سنا تھا؟''

''جی بالکل، کئی بار سنا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ ملزم مقتول کے خلاف اپنے دل و دماغ میں بہت زیادہ نفرت رکھتا تھا اور اکثر و بیشتر یہ اپنے اسی غم و غصے کا برملا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے کانوں سے ملزم کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا..... میں اس کمینے اور ذلیل ڈاکٹر ارشاد حسین کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میری بیوی اور بیٹے کا قاتل ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں بڑی بیدردی سے ڈاکٹر ارشاد حسین کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا.....''

''اور یہ سنہری موقع چھ ماہ کے بعد ملزم کے ہاتھ لگا.....'' وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ پوری تیاری کے ساتھ اس جلسہ گاہ میں پہنچا جہاں مقتول کو تقریر کرنا تھی۔ جب مقتول پُرجوش انداز میں خطاب کررہا تھا تو ملزم نے چپکے سے ایک گولی مقتول کی کھوپڑی میں اتار دی لیکن اس کی بدقسمتی کہ فرار کی کوشش کے دوران میں کسی کا دھکا کھا کر یہ کرسیوں کے بیچ گر گیا اور اگلے ہی لمحے مستعد سب انسپکٹر نے اسے گرفتار کرلیا.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یور آنر! استغاثہ کے گواہان اشتیاق حسین، نورین صاحبہ اور عامر فیضی نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ ملزم، مقتول کی جان لینے کا پکا ارادہ رکھتا تھا۔ وقوعہ کے روز وہ مسلح ہوکر جلسہ گاہ میں پہنچا اور اس نے اپنے انتقامی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا لیکن آخری مرحلے پر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ فائر کی آواز نے جلسہ گاہ میں افراتفری پھیلا دی تھی چنانچہ ملزم فرار ہونے کی کوشش میں بے ہنگم بھاگتے ہوئے کسی شخص سے ٹکرا کر ادھر ہی گر گیا۔ قبل اس کے کہ یہ سنبھل کر جائے واردات سے غائب ہونے کی کوشش کرتا، پولیس نے اسے گن سمیت چھاپ لیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلۂ قتل کے لیبارٹری تجزیے نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مقتول کی کھوپڑی کے آر پار ہونے والی گولی اسی گن سے چلائی گئی تھی جو ملزم کے ہاتھ میں دبی ملی تھی۔ علاوہ ازیں مذکورہ گن پر ملزم کے فنگر پرنٹس کی موجودگی بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کی موت کا ذمے دار صرف اور صرف ملزم ہی ہے..... دیٹس آل!''

وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کی تو میں اپنی مخصوص سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور وٹنس باکس کی جانب بڑھنے سے پہلے میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ استغاثہ کے گواہ عامر فیضی سے چند سوالات کروں گا مگر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال چمکا ہے اور وہ یہ کہ..... استغاثہ کے گواہ پر جرح کا آغاز کرنے سے پہلے مجھے اس کیس کے انکوائری آفیسر سے دو ننھے منے سوالات کرنا چاہئیں لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے.....!''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے فوراً اعتراض کردیا۔ ''میرے فاضل دوست پچھلی ایک پیشی پر آئی او صاحب سے کافی طویل سوال و جواب کرچکے ہیں۔ ڈیفنس کو ایسا موقع دوبارہ فراہم کرنے سے عدالت کا قیمتی وقت

ضائع ہوگا۔''

''کیا قانون کی کسی کتاب میں ایسا کوئی اصول بیان کیا گیا ہے کہ وکیل صفائی، تفتیشی افسر سے صرف ایک ہی بار سوال و جواب کرسکتا ہے.....!'' میں نے برہمی بھری نظر سے وکیل سرکار کو گھورا۔ ''اگر آپ نے کہیں ایسا کچھ لکھا ہوا پڑھا ہے تو ریفرنس دے کر مجھے بھی سمجھا اور بتادیں۔ اگر آپ میرے علم میں اضافہ فرمائیں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔''

میری اس کھنچائی پر وکیل استغاثہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

''آبجیکشن اوور رولڈ۔'' جج نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اینڈ پریشن گرانٹیڈ۔''

اس کیس کا تفتیشی افسر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوا تو میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر شائستہ لہجے میں کہا۔

''سب انسپکٹر ناصر مجید صاحب! تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کو قاتل ثابت کرنے کی کوشش میں آپ کی مستعدی اور چابکدستی کا ذکر کرتے ہوئے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ نے کس طرح ملزم کو جائے وقوعہ پر گن سمیت گرفتار کرلیا تھا۔ آپ کے حوالے سے وکیل سرکار کے اس ستائشی تذکرے نے مجھے آپ کی یاد دلا دی اور چشم زدن میں، میں نے فیصلہ کیا کہ لگے ہاتھوں میں بھی آپ سے دو سوال کرلوں۔ کیا وکیل استغاثہ کی طرح آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے دوبارہ کچھ نہیں پوچھ سکتا؟''

''ایسی کوئی بات اگر ہوتی تو عدالت آپ کو یہ اجازت نہ دیتی۔'' آئی او نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے جتنی بار بھی کٹہرے میں بلائیں گے، مجھے آنا ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے میرے فاضل دوست مجھ سے اٹکھیلیاں کرنے کے موڈ میں ہیں.....'' میں نے وکیل سرکار کے وار کا جواب دیتے ہوئے کہا، پھر آئی او سے پوچھا۔ ''تو آپ تیار ہیں؟''

''ابور ریڈی!'' وہ سینہ تان کر بولا۔

''ویٹس گڈ!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''قتل کے کسی بھی مقدمے میں تین چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ نمبر ایک، مقتول۔ نمبر دو، قاتل اور نمبر تین، آلۂ قتل۔ زیر سماعت کیس میں مقتول اور آلۂ قتل کے حوالے سے تو اضی طرفین کی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی استغاثہ اور ڈیفنس اس بات پر متفق ہیں کہ مقتول نام نہاد ڈاکٹر ارشاد حسین ہی ہے اور اسے اسی گن سے ہلاک کیا گیا ہے جو اس مقدمے میں ''آلۂ قتل'' کی حیثیت کی حامل ہے۔ اب باقی بچا قاتل کا معاملہ.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے تولتی ہوئی نظر سے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''استغاثہ ملزم شاکر علی کو قاتل ثابت کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے اور ڈیفنس ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔ اس جنگ میں جیت کس کا مقدر ٹھہرے گی اور ہار کس کے حصے میں آئے گی، یہ سب تو آنے والا وقت ہی طے کرے گا۔ فی الحال آپ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ ملزم کے قد کے بارے میں آپ کا ریکارڈ کیا کہتا ہے؟''

''ملزم کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور مقتول کی قامت کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟''

وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''مقتول کا قد چھ فٹ، ایک انچ تھا۔''

''آپ کا میتھ بہت اچھا ہے آئی او صاحب!'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''میں نے انٹر سائنس کیا ہوا ہے۔''

''میڈیکل یا نان میڈیکل؟''

''نان میڈیکل!'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ.....تبھی آپ میتھ میں کافی تیز ہیں۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''معاف کیجیے گا، میں نے آپ کی تعلیم کے بارے میں ضمناً پوچھ لیا ورنہ میرے ننھے منے دو سوال تو مقتول اور ملزم کے قد کے حوالے ہی سے تھے۔ اب آپ چل کریں۔ آئندہ پیشی پر آپ کو پھر زحمت دوں گا۔''

میرے ان خیالات پر جواباً اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی خاموشی رضامندی کا پیش خیمہ تھی۔ میں اس وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا جہاں استغاثہ کا گواہ عامر فیضی کھڑا تھا۔

''فیضی صاحب!'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک عجیب وغریب سوال کیا۔ ''کیا آپ عابد، جنید، مسعود، شاہد، فواد، خالد، سلیم اور حنیف کو جانتے ہیں؟''

میں نے اس سوال کو عجیب وغریب یوں کہا ہے کہ میں نے آٹھ افراد کے نام انتہائی تیز رفتاری سے عامر فیضی کی سماعت میں انڈیل دیے تھے۔ یقیناً وہ مجھ سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں کررہا تھا۔ میرے استفسار پر وہ بوکھلا کر

رہ گیا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں.....؟''

''لگتا ہے، اوور ڈوز ہو گیا.....'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا، پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ آپ بسکٹ فیکٹری میں کام کرتے ہیں تو مجھے اپنے سوالات کو آپ کی فیکٹری تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال، یہ بتائیں کہ کیا آپ جنید، فواد اور حنیف کو جانتے ہیں؟''

''جی..... جی ہاں.....'' اس نے شک زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ ''یہ تینوں بھی بسکٹ فیکٹری میں میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔''

''ویری گڈ.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا، پھر کریدنے والے لہجے میں سوال کیا۔ ''فیضی صاحب! کیا آپ ادھار مانگنے اور قرض کی رقم کو واپس نہ کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں؟''

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''سوال کی اقسام پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''پہلے آپ ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دیں۔''

عامر فیضی کے چہرے پر یہ یک وقت پریشانی، خجالت اور خوف کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ اس موقع پر وکیلِ استغاثہ کو اپنے فرض کی سوجھی اور وہ فوراً گواہ کی مدد کو لپکا۔

''آئی آبجیکٹ یور آنر.....!'' اس نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''اس وقت عدالت میں ڈاکٹر ارشاد حسین مرزا کیس زیرِ سماعت ہے اور میرے فاضل دوست استغاثہ کے معزز گواہ کی..... کردار کشی پر تلے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کس قسم کا مذاق ہے؟''

''اول تو یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے لہٰذا اس کی اقسام پر بھی بحث کی ضرورت نہیں.....'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''دوم، میں آپ کے معزز گواہ کی کردار کشی نہیں کر رہا بلکہ سچائی کو سامنے لانے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ اس سچائی کے جوانب و عواقب میں بہت سارے جھوٹ بھی موجود ہیں جو معزز عدالت کے علم میں لانا بہت ضروری ہیں۔ سوم، اگر آپ کا معزز گواہ لوگوں سے ادھار مانگنے اور قرض کی رقم واپس نہ کرنے کا مریض نہیں تو ویری سمپل..... وہ میرے سوال کا جواب نفی میں دے سکتا ہے۔''

وکیلِ استغاثہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عامر فیضی

سنہرے اقوال

☆ دنیا کے مال و اسباب پر مغرور مت ہو۔ کیا خبر اس رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے۔

☆ جو شخص خدا کی محبت کا مدعی ہے اور اسے اپنے مسلمان بھائی سے نفرت ہے، وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں کیونکہ مخلوق کی محبت ہی خالق کی محبت ہے۔

☆ کل کی فکر نہ کرو۔ کل اپنے لیے آپ فکر کرلے گا۔ تمہارے لیے آج ہی کی فکر کافی ہے۔

☆ تم لوگوں کی خطاؤں کو درگزر کرو۔ خدا تمہارے قصور معاف کرے گا۔

☆ تم جیسا برتاؤ چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں، ویسا ہی برتاؤ تم لوگوں کے ساتھ کرو۔

☆ اپنی نگاہ میں اپنے آپ کو دانش مند مت جان۔ خداوند سے ڈر اور بدی سے باز رہ۔

☆ بے عمل عالم کی مثال ایسی ہے جیسے اندھے کے ہاتھ میں مشعل۔ لوگ اس سے روشنی تو حاصل کرتے ہیں لیکن وہ خود اندھیرے میں ہے۔ یعنی روشنی سے محروم ہے۔

☆ خدا اور موت کو کبھی نہ بھول۔ اپنی نیکی اور دوسروں کی بدی کو بھول جا۔

☆ اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا۔ اس لیے بُرے درخت کو آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ یہی مثال انسان کی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

گریبان

حضرت نظام الدین اولیاء کا فرمان ہے کہ جھانکنے کی بہترین جگہ انسان کا اپنا گریبان ہے۔ جس شخص کو بھی دیکھو، اُسے خود سے بہتر خیال کرو، چاہے تم اس سے زیادہ عبادت گزار ہو اور وہ تم سے زیادہ گناہ گار..... کیونکہ عین ممکن ہے کہ یہ تمہاری آخری عبادت ہو اور وہ اس کا آخری گناہ!

مرسلہ: ریاض تبسم، لیہ

اضطراری لہجے میں بول اٹھا۔ ''الحمد للہ...... میں ایسے کسی مرض کا شکار نہیں ہوں۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ......'' میں نے وکیلِ استغاثہ کو مداخلت کا موقع فراہم نہ کرتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔ ''آپ نے اپنے فیکٹری کولیگز جنید کے پانچ ہزار روپے، فواد کے آٹھ ہزار روپے اور حنیف کے چھ ہزار روپے نہیں دینا ہیں؟''

''بالکل نہیں!'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''آپ جو کچھ بھی بیان کر رہے ہیں، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

''کل تک تو آپ اپنے قرض خواہوں کو وعدۂ فردا پر ٹرخا کر اپنی جان بچا رہے تھے۔ آپ کے شکنجے میں پھنسے ہوئے لوگ، ٹرک کی بتی کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہی سمجھ رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن آپ ان کی رقم لوٹا دیں گے لیکن عدالت میں آپ کے اس چٹے انکار کے بعد جنید، فواد، حنیف اور دیگر پانچ افراد آپ کا کیا حشر کریں گے، وہ نظارہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔ بہرحال، یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان جو بوتا ہے، وہ ایک دن اسے کاٹنا بھی پڑتا ہے......!''

وکیلِ استغاثہ اور اس کے گواہ کی حالت دیدنی تھی۔ میرے طنزیہ کلمات نے وکیلِ استغاثہ کو سلگا کر رکھ دیا۔ وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے میں بولا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! استغاثہ کا گواہ بڑے واضح الفاظ میں معزز عدالت کو بتا چکا ہے کہ وہ کسی کا مقروض نہیں۔ اس کے باوجود بھی ڈیفنس ایک ہی راگ کا الاپ جاری رکھے ہوئے ہے۔ بہ فرضِ محال، اگر گواہ نے کسی شخص کی کوئی رقم دینا بھی ہے تو اس کا زیرِ سماعت مقدمے سے کیا تعلق، واسطہ ہے......؟''

''بیگ صاحب!'' جج نے وکیلِ استغاثہ کی شنوائی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ کی اس جرح کا ڈاکٹر ارشاد حسین مرڈر کیس سے کوئی لنک ہے؟''

''بڑا اسٹرانگ لنک جناب عالی!'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''اگرچہ استغاثہ کا گواہ عامر فیضی اس حقیقت سے انکاری ہے کہ اس نے کسی کا کوئی پیسا نہیں دینا لیکن میں نے ابھی جن آٹھ افراد کے نام گنوائے ہیں، انہیں عدالت میں بلا کر میرے دعوے کی تصدیق کی جاسکتی ہے مگر یہ میرا مطمحِ نظر نہیں ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ڈیفنس معزز عدالت کے علم میں صرف یہ بات لانا چاہتا ہے کہ استغاثہ کا گواہ عامر فیضی لوگوں سے قرض لینے اور پھر کبھی وہ ادھار واپس نہ کرنے کا عادی ہے بلکہ اسے ''عادی مجرم'' کے اعزاز سے نوازا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس کی یہی عادتِ بد اسے میرے مؤکل کے خلاف زہر اگلنے کے لیے یہاں لے آئی ہے۔''

''بیگ صاحب! آپ کی بات خالی از دلچسپی نہیں ہے۔'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ اپنے اس مقصد کو آسان الفاظ میں بیان کریں گے تو نوازش ہوگی۔''

''شیور یؤر آنر......!'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں استغاثہ کے گواہ سے چند ضمنی سوالات پوچھنا چاہوں گا۔''

''اوکے......!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''پلیز پروسیڈ۔''

''فیضی صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے اپنے وکیل کے سوال کے جواب میں عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم ایک مغرور اور کینہ پرور شخص ہے۔ یہ اپنے مزاج کے خلاف بات سن کر فوراً غصے میں آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملزم میں خود پسندی بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیا آپ اس عدالت کے سامنے ملزم کی کینہ پروری، غرور، خود پسندی اور غصہ ور ہونے کے تین واقعات بیان کر سکتے ہیں؟''

''وہ......وہ......'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

''یہ آپ نے کیا ''وہ، وہ'' لگا رکھی ہے؟'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ بات میں نے...... مقتول کے حوالے...... سے کی تھی......'' وہ لکنت زدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں یکایک ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔ ''مقتول کے حوالے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ ملزم کی بیوی اور بیوی کے پیٹ میں موجود بچے کی موت مقتول کے اسپتال میں ہوئی تھی اس لیے یہ انتقاماً بھڑک کر مقتول کے خلاف ہوگیا تھا۔'' وہ اپنے موقف کی حمایت میں بولا۔ ''یہ ہر وقت مقتول کی برائی کرتا رہتا تھا اور جوش و جذبات میں یہ ساری حدود پھلانگ کر نفرت انگیز انداز میں مقتول کو قتل کرنے اور اس کے اسپتال کو جلا کر راکھ کر دینے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔''

''کیا ملزم نے مقتول کے اسپتال کو جلا کر راکھ کر دیا......؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''مقتول

اسپتال تو اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''کیا اس عدالت نے میرے مؤکل کے خلاف فیصلہ سنا دیا ہے؟''

''نہیں ..... یہ کیس تو ابھی چل رہا ہے!'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''کیا تم اس واردات کے چشم دید گواہ ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مقتول پر گولی چلاتے دیکھا تھا؟ کیا تم اس جلسہ گاہ میں مقتول یا ملزم کے بہت زیادہ نزدیک موجود تھے؟''

وہ اپنے سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب!''

''پھر تم کس بنا پر کہہ رہے ہو کہ ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا.....؟''

''ملزم پر مقتول کو قتل کرنے کا مقدمہ ہی تو چل رہا ہے.....'' وہ لٹکڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''یہ مقدمہ ابھی زیرِ سماعت ہے اور ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ اس عدالت نے کرنا ہے، تم نے نہیں.....'' میں نے معاندانہ نظر سے استغاثہ کے گواہ کو گھورتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ملزم تم سے اکیلے میں مقتول کے خلاف دھمکی دار سنگین باتیں کیا کرتا تھا؟''

وہ میرے سوال کی خطرناکی کو سمجھ نہیں پایا اور جھٹ سے بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے کہ ملزم نے تنہائی میں صرف مجھ سے ہی مقتول کے خلاف باتیں کی ہوں۔ اس کو جب بھی موقع ملتا، یہ لوگوں کے سامنے مقتول کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا کرتا تھا۔''

''کیا تم تین ایسے افراد کے نام بتا سکتے ہو جن کے سامنے میرے مؤکل نے مقتول کی جان لینے کا عزم ظاہر کیا ہو.....؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''انہیں گواہی کے لیے عدالت تک لانے کا بندوبست استغاثہ خود کر لے گا.....''

''مم ..... مجھے ..... اس وقت تو ..... یاد نہیں آ رہا.....'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''استغاثہ کا ہوم ورک اپنی جگہ مکمل ہے میرے فاضل دوست۔'' وکیلِ استغاثہ نے مجھ پر چوٹ کی۔ ''آپ اپنے مؤکل کی فکر کریں۔''

''فیضی!'' میں نے وٹنس باکس میں موجود وہ استغاثہ کے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا وقوعہ سے چند روز قبل تم نے ملزم سے دس ہزار روپے ادھار مانگے تھے اور اس نے تمہیں رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تھا؟''

''نہیں ..... میں نے کبھی ملزم سے دس روپے نہیں مانگے، دس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے وکیل صاحب.....'' وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''تم ایسے تین افراد کے نام بتانے سے قاصر ہو جن کے سامنے میرے مؤکل نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کی بات کی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ڈیفنس کم از کم تین ایسے افراد کو ضرورت پڑنے پر عدالت میں پیش کرنے کا ذمہ لیتا ہے جن کی موجودگی میں ملزم نے تمہاری بے عزتی کی تھی.....''

''میری بے عزتی.....'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ادھار مانگنے کے جواب میں ملزم نے تمہیں دھتکارتے ہوئے بڑے ہی خراب لہجے میں یہ کہا تھا..... ''تمہیں مجھ سے دس ہزار روپے ادھار مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تم نے اپنا ریکارڈ دیکھا ہے؟ آج تک تم نے جس سے بھی قرض لیا، اسے کبھی واپس نہیں کیا.....'' اور ملزم کے اس منہ توڑ جواب پر تم تلملا کر رہ گئے تھے کیونکہ اس وقت فیکٹری کے اور کئی ورکرز بھی آس پاس موجود تھے۔ بعد ازاں تم نے کئی ایک لوگوں سے اپنے اس ارادے کا اظہار بھی کیا تھا..... ''سپروائزر نے مجھے بری طرح ذلیل کیا ہے۔ میں اسے ضرور مزہ چکھاؤں گا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر بہ دستور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''پھر جب جلسہ گاہ میں مقتول کو شوٹ آؤٹ کر دیا گیا تو پولیس کی تفتیش کا سلسلہ دراز ہو کر بسکٹ فیکٹری تک بھی جا پہنچا۔ ملزم کے خلاف بھڑاس نکالنے کا اس سے زیادہ موزوں موقع شاید تمہیں پھر کبھی نہ ملتا۔ تم نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ملزم کے خلاف بیان دینے کا فیصلہ کر لیا اور تمہارے اسی فیصلے نے آج تمہیں وٹنس باکس میں کھڑا کیا ہوا ہے.....!''

میرے بیان کے جواب میں عامر فیضی نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ میں نے طنزیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی رسٹ واچ کو تک رہا تھا۔ میں نے عدالت کی دیوار پر آویزاں وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر روئے سخن جج کی طرف کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''جناب عالی! عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں اپنے مؤکل سے چند ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل، اس کیس کا ایک اہم کردار مسنگ ہے۔ کیس فائل میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ ملزم مذکورہ مفقود الخبر کردار پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے اور ہاں.....'' میں لمحے بھر کو رکا پھر وٹنس باکس میں پشیماں و حیراں کھڑے عامر فیضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

''مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج نے اس پیشی کے آخری دس منٹ میں مجھے اپنے مؤکل سے بات کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ میں بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے اکیوزڈ باکس کے نزدیک پہنچا، پھر ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاکر علی! کیا وقوعہ کی رات تم اکیلے ہی جلسہ گاہ میں گئے تھے؟''

''نہیں جناب! ریاض احمد بھی میرے ساتھ تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بلکہ ریاض ہی مجھے وہاں لے کر گیا تھا۔''

''کیا ریاض بھی تمہارے محلے یعنی ناصر کالونی ہی میں رہتا ہے؟''

''نہیں!'' ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''ریاض کی رہائش قیوم آباد میں ہے۔''

''ریاض کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بنیادی طور پر وہ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتا ہے۔'' ملزم نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ وہ سیٹل منٹ کے کام بھی کرتا ہے۔''

''سیٹل منٹ کے کام سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ.....'' وہ سیٹل منٹ یعنی دو افراد کے بیچ کسی بھی قسم کے تنازع کو رفع دفع کرانا..... کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسے میاں بیوی کا جھگڑا، ڈوبی ہوئی رقم کی وصولی، کسی بھی نوعیت کی زیادتی کا بدلہ .....وغیرہ وغیرہ!''

''گویا ریاض احمد کا سیٹل منٹ کا دھندا خاصا سنگین اور سنسنی خیز ہے۔'' میں نے اپنے مؤکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں بسا اوقات مار پیٹ کی نوبت آتی رہتی ہوگی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، وکیل صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ریاض اپنے مار دھاڑ سے بھرپور کارناموں کا احوال سناتا رہتا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگوں کی اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی..... ہیں نا؟''

''جب تک ریاض ناصر کالونی میں رہتا تھا تو ہمارے درمیان زیادہ میل جول تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پھر آٹھ سال پہلے جب وہ ناصر کالونی سے قیوم آباد شفٹ ہوگیا تو ہماری ملاقات کبھی کبھار تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لیکن ہم جب بھی ملتے تو ایک ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا کرتے تھے۔''

''وقوعہ کی شام بھی تم دونوں کے بیچ اسی نوعیت کی ملاقات ہوئی تھی.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی..... اس شام ہم لگ بھگ دو ماہ بعد ملے تھے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اسی لیے گپ شپ کرنے چائے کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے تھے۔''

''اور پھر اسی ہوٹل سے اٹھ کر آپ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چلے گئے تھے؟''

''جی ہاں!''

''کیا تمہیں معلوم تھا کہ اس رات جلسہ گاہ میں مقتول تقریر کرنے والا ہے؟'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ مردود ڈاکٹر اس جلسے میں تقریر کرنے والا ہے تو میں وہاں ہرگز نہ جاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جلسہ گاہ میں قدم رکھنے سے پہلے تک مجھے یہ بھی نہیں تھا کہ میں جس سیاسی امیدوار کی تقریر سننے آیا ہوں، وہ رشتے میں اس شیطان ڈاکٹر کا بہنوئی لگتا ہے۔''

''تو آپ کو جلسہ گاہ میں پہنچ کر پتا چلا تھا.....؟''

''جی بالکل!''

''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تمہارے جلسہ گاہ میں داخلے سے لے کر مقتول کی موت تک وہاں کیا حالات پیش آئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں جو بھی یاد ہے، وہ بیان کرو۔''

''ہوٹل میں چائے پینے کے دوران میں، مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''پھر جب ہم جلسہ گاہ میں جا کر بیٹھے تو مجھے نیند آنے لگی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن تو رہا تھا مگر مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا لگ رہا تھا، جیسے میں کسی سریع الاثر دوا کے زیر اثر ہوں اور ایک بے نام سی غنودگی مجھ پر حملہ آور ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر میں ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا تھا۔''

''جب تم ریاض کے ساتھ چائے کے ہوٹل میں جا کر بیٹھے تو تمہاری ذہنی اور جسمانی حالت بالکل نارمل تھی۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''ہوٹل سے نکلتے وقت تمہاری طبیعت میں بدلاؤ آچکا تھا اور جلسہ گاہ میں بیٹھنے تک اس سمجھ میں نہ آنے والے بدلاؤ میں بہت زیادہ شدت آگئی تھی؟''

''جی..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''جلسہ گاہ میں تم دونوں کہاں بیٹھے تھے؟''

''اسٹیج کی بائیں جانب لگائی جانے والی کرسیوں کی چوتھی یعنی آخری قطار میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم اس قطار کی درمیان والی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''جب وہ منحوس ڈاکٹر تقریر کرنے اسٹیج پر آیا تو میں نے خفگی آمیز انداز میں ریاض سے کہا۔ ''یار! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس پر ریاض نے جواب دیا۔ میں تو دراصل سیاسی امیدوار کو سننے آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا سالا بھی اس جلسے میں تقریر کرے گا۔ خیر..... اب آگئے ہیں تو تھوڑا برداشت کرلو۔ ہم جلدی یہاں سے نکل جائیں گے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما، پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں ریاض کی وجہ سے وہاں بیٹھنے پر مجبور ہوگیا۔ پھر ریاض یہ کہتے ہوئے جلسہ گاہ سے باہر نکل گیا۔ ''یار! میں سگریٹ لینا تو بھول ہی گیا۔ تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی سگریٹ کا پیکٹ لے کر واپس آجاتا ہوں۔'' میں جانتا ہوں کہ ریاض اسموکنگ کرتا ہے، اس لیے میں چپ چاپ اس کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگا مگر اس کی واپسی سے پہلے ہی جلسہ گاہ میں گولی چل گئی۔ فائر کی آواز سن کر لوگوں میں وہ بھگدڑ مچی کہ وہ جلسہ گاہ میدانِ حشر کا نقشہ پیش کرنے لگی، جہاں پر کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے بچاؤ کے لیے یہاں سے وہاں اور ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر میں بھی بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس وقت میری جو ذہنی حالت تھی، اس کا میں تفصیلی ذکر کرچکا ہوں۔ میں جیسے ہی کرسی سے اٹھا، مجھے بہت زور کا چکر آیا تھا۔ اسی وقت مجھے کسی کا زوردار دھکا لگا اور میں الٹی پلٹی کرسیوں کے بیچ جا گرا۔ اس کے بعد کا مجھے ہوش نہیں۔ جب میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے خود کو پولیس کی حراست میں پایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ پستول کب

محبت کے روپ

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ نے ان کے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام سے جدا کردیا۔ پھر اللہ نے بتیس (32) سال کے بعد ملنے کی اجازت دی۔ جب باپ بیٹا ملے تو گلے لگ کر اتنا روئے کہ بے ہوش ہوگئے، پھر اٹھے، پھر اتنا روئے کہ دوبارہ بے ہوش ہوگئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔ ''یا باری تعالیٰ! اتنی محبت بھی کوئی کسی سے کرتا ہے؟'' تو باری تعالیٰ نے فرمایا۔ ''جبرائیل! میں امت محمد ﷺ کے ہر فرد سے اس سے 70 گنا زیادہ محبت کرتا ہوں۔'' (سبحان اللہ)

شیطان کی شکایت

شیطان نے کہا مجھے شکایت ہے:

ان لوگوں سے جو دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا گر نہیں جانتے۔

ان فلم سازوں سے جو ایکشن فلمیں بناتے ہیں لیکن ان میں کوئی قتل نہیں ہوتا۔

ان تاجروں سے جو اپنا ٹیکس باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔

ان لوگوں سے جو موقع ملنے کے باوجود غیر قانونی کاروبار نہیں کرتے۔

ان طالب علموں سے جو محنت کرکے پاس ہوتے ہیں۔

ان تاجروں سے جو نہ تو ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور نہ چیزوں میں ملاوٹ۔

پلیز آپ شیطان کو خوش ہونے کا موقع نہ دیں۔

الٹی گنگا

کہتے ہیں کہ رزق عورت کے مقدر سے ملتا ہے اور اولاد مرد کے مقدر سے ملتی ہے لیکن اکثر یوں ہوتا ہے کہ اولاد نہ ہونے پر مرد عورت کو چھوڑ دیتا ہے اور رزق کم یا نہ ہونے پر عورت مرد کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

اور کس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔''

''ٹھیک ہوگیا.....'' میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ہم واپس گولی کی طرف آتے ہیں۔ کیا تمہیں اتنا تو یاد ہے نا کہ تم نے فائر کی آواز سنی تھی؟''

''جی، اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اگرچہ اس وقت میں نیند سے لڑنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن اس کیفیت کے دوران میں بھی میں نے فائر کی بڑی واضح آواز سنی تھی۔''

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم نے گولی چلنے کی آواز کس سمت میں سنی تھی؟''

''اپنے عقب میں!'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''عقب میں.....'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم تو کرسیوں کی آخری قطار میں بیٹھے تھے، جس کے پیچھے کارخانے کی دیوار تھی۔ کرسیوں کی یہ آخری اور چوتھی قطار کارخانے کی دیوار کے ساتھ جوڑ کر لگائی گئی تھی.....؟''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو سنا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔''

''جب پولیس نے آلۂ قتل سمیت تمہیں گرفتار کیا تو تمہارے سر کے عقبی حصے سے خون نکل رہا تھا، جس نے تمہاری شرٹ کے کالر کو رنگین کر دیا تھا.....'' میں نے کہا۔ ''اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

''وقوعہ سے پانچ روز قبل فیکٹری میں میرے سر کے پچھلے حصے میں ایک چوٹ لگ گئی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا، اس وقت تک وہ چوٹ کافی حد تک ٹھیک ہو چکی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جلسہ گاہ میں جب میں کسی کا دھکا لگنے سے لڑکھڑایا اور کرسیوں کے اوپر جا گرا تو میرے سر کا چوٹ والا حصہ کسی کرسی سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔''

''اب تمہارے سر کا وہ زخم کیسا ہے؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہوگیا ہے جناب!''

''وقوعہ کی رات سے آج تک ریاض احمد سے تمہاری کتنی ملاقاتیں ہوئی ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''مطلب یہ کہ جلسہ گاہ میں یا تھانے میں اور یا پھر جیل میں وہ ایک بار بھی تم سے ملنے نہیں آیا؟''

''بالکل نہیں وکیل صاحب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تم ریاض کے گھر اور آفس یعنی جس ٹریول ایجنسی پر وہ کام کرتا ہے، وہاں کا ایڈریس تو جانتے ہو نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی.....!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں ایڈریس مجھے زبانی یاد ہیں۔''

''جناب عالی!'' میں نے ملزم سے اپنے سوالات کو اختتامی موڑ دینے کے بعد جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملزم اس ریاض احمد نامی شخص کے ایما پر وقوعہ کی رات جلسہ گاہ میں گیا تھا۔ اسی ریاض احمد کی معیت میں ہوٹل پر چائے پیتے ہوئے ملزم کی طبیعت خراب ہوئی۔ وہی ریاض احمد ملزم کو جلسہ گاہ میں بیٹھا چھوڑ کر سگریٹ لانے کے بہانے وہاں سے کھسک لیا اور وہی ریاض احمد ان آٹھ دس ماہ میں ایک مرتبہ بھی ملزم سے ملنے یا اس کی خیریت دریافت کرنے نہیں آیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جلسہ گاہ میں چلنے والی گولی اور اس کے بعد وہاں مچنے والی ہڑبونگ سے ریاض احمد قطعی لاعلم رہا ہوگا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی، پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ ریاض احمد نامی یہ شخص زیر سماعت کیس میں ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ استغاثہ نے ریاض احمد کو نظر انداز کیوں کر رکھا ہے، حالانکہ ملزم نے پولیس کسٹڈی میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ اگر اسے یہاں بلا کر اس کا ٹرائل کیا جائے تو بہت ساری باتیں سامنے آ سکیں گی جو یقیناً اس کیس میں مددگار ثابت ہوں گی۔''

میری تجویز میں وزن دار معقولیت پائی جاتی تھی لہٰذا جج نے استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ پیشی پر ریاض احمد کو عدالت میں حاضر کرنے کا بندوبست کرے۔

اس کے بعد جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ہم عدالت سے باہر آئے تو باقر علی نے مجھ سے کہا۔

''آج میں ماسٹر صاحب کی طرف جاؤں گا۔ اگر آپ کا موڈ ہو تو میرے ساتھ چلیں۔''

''ماسٹر صاحب سے ملنے کو دل تو بہت مچلتا ہے لیکن آج میری مصروفیت کچھ اس قسم کی ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے پاؤں گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان کی رہائش گاہ کا ایڈریس مجھے نوٹ

کروادیں۔ میں اپنی سہولت کو دیکھتے ہوئے کسی دن ان سے ملنے چلا جاؤں گا۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ فرماں برداری سے بولے۔

''جیسی آپ کی مرضی۔''

اس کیس سے نمٹنے کے بعد میں ایک روز ماسٹر صاحب سے ملاقات کرنے ان کے گھر واقع انگوائری آفس ناظم آباد چلا گیا۔ ماسٹر صاحب سے طویل عرصے کے بعد ملنے کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ ملاقات میرے لیے کافی دکھ کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ میں کسی تفصیل میں جائے بغیر صرف یہ کہوں گا کہ.....!

ماسٹر صاحب ایک بہت اچھے انسان تھے لیکن وقت اور حالات نے ان کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی چار اولادیں تھیں جن میں تین بیٹے عبدالجبار، عبدالغنی اور عبداللہ اور ایک بیٹی عائشہ فاطمہ تھی۔ ماسٹر صاحب نے اپنے تمام بچوں کو اپنی بساط کے مطابق اچھی تعلیم دلائی تھی لیکن انہیں اولاد کا سکھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ تینوں بیٹے شادی کے بعد ایک ایک کر کے ان سے الگ ہوگئے تھے اور بالآخر انہیں اپنی بیٹی کے ہاں پناہ لینی پڑی تھی۔ عائشہ کا شوہر عبید الرحمٰن ایک بینک میں آفیسر کے عہدے پر کام کرتا تھا۔ اس نے راضی خوشی ماسٹر صاحب کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ انکوائری آفس کے ایریا میں عبید الرحمٰن کا ذاتی گھر تھا۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ انتہائی افسوس ناک تو ہے مگر اسے حیرت انگیز اور انوکھا نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے معاشرے میں اولاد خصوصاً بیٹوں سے بہت زیادہ توقعات قائم کرلینے والے والدین میں سے اکثر کو ایک دن اس کڑوے سچ کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے.....!

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا لیکن وٹنس باکس گواہ کے وجود سے خالی نظر آرہا تھا۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وکیل صاحب! آج آپ ریاض احمد نامی ایک شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں لانے والے تھے، اس کا کیا ہوا؟''

''یور آنر! مذکورہ بندے کو عدالت میں حاضر کرنا سردست ممکن نہیں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔

''اس کا سبب کیا ہے؟'' جج نے استفسار کیا۔

''جناب عالی! ریاض احمد کی تلاش میں اس کی رہائش گاہ واقع قیوم آباد اور ٹریول ایجنسی بہ مقام صدر کو اچھی طرح چیک کیا گیا ہے اور دونوں جگہوں سے ہمیں ایک ہی جواب ملا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ان دونوں مقامات سے ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ریاض احمد چار ماہ پہلے ملک چھوڑ کر جرمنی جاچکا ہے۔ جس ٹریول ایجنسی پر وہ کام کرتا تھا، وہاں سے پتا چلا کہ وہ کافی عرصے سے یورپ کے کسی ٹھنڈے ٹھار ملک جانے کی کوشش کررہا تھا۔ بالآخر اس کی مراد بر آئی اور اسے جرمنی کا وزٹ ویزا مل گیا۔ وہ محض جرمنی کی سیر کرنے کے ارادے سے وہاں نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس کا واپس آنے کا کوئی پروگرام تھا۔ وہ پوری کاغذی تیاری کے ساتھ جرمنی میں سیاسی پناہ لینے کی غرض سے وہاں پہنچا تھا، لہٰذا اس کے لوٹ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کے گھر والے صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ باقی جرمنی میں اس کے ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر کا کسی کو کچھ پتا نہیں۔ اگر میرے فاضل دوست ریاض احمد نامی اس شخص کو کوئی انٹرنیشنل ہائی پروفائل کرمنل سمجھتے ہیں تو اسے اس عدالت میں لانے کے لیے ہم انٹرپول سے رجوع کرسکتے ہیں۔ باقی جہاں تک زیرِ سماعت مقدمے کا معاملہ ہے تو.....'' وہ سانس لینے کے لیے رکا اور تمسخرانہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''.....تو استغاثہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کیس کو فیصلے کی منزل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی مرحلے پر کسی ریاض احمد کی گواہی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے.....دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے اپنی وضاحت کے اختتامی حصے میں مجھ پر بڑی گہری چوٹ لگائی تھی۔ جج نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟''

''اگر استغاثہ کا رویہ ترکِ موالات کی تفسیر ہی ہے تو اس سلسلے میں ڈیفنس کا کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''انٹرپول کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے ہمیں اس کیس کی کارروائی کو آگے بڑھانا چاہیے۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ اپنا کوئی اور گواہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں جناب.....!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''استغاثہ کے تمام گواہوں کے بیانات ہوچکے ہیں۔''

''تو پھر دلائل کا سلسلہ شروع کیا جائے۔'' جج نے

تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کو قاتل ثابت کرنے کے لیے دلائل دینا شروع کیے۔ ''استغاثہ کے معزز گواہان اشتیاق حسین، عامر فیضی اور نورین صاحبہ نے عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم نے ان کے سامنے مقتول کی جان لینے کے پختہ عزم کا اظہار کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ علاوہ ازیں، پولیس نے ملزم کو جائے وقوعہ سے اس طرح گرفتار کیا ہے کہ گن اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ مذکورہ گن کے لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا ہے کہ مقتول کی موت اسی گن سے چلنے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ اس گن پر ملزم کے فنگر پرنٹس کی موجودگی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مقتول ڈاکٹر ارشاد حسین کو ملزم شاکر علی ہی نے موت کے گھاٹ اتارا ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے اپیل کرتا ہوں کہ ملزم کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ تین سو دو کے تحت سزا سنائی جائے۔ یہ سیدھا سیدھا قتلِ عمد کا کیس ہے یور آنر..... دیٹس آل!''

وکیل استغاثہ اپنی باری لے چکا تو میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد جج سے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ اپنی پوزیشن کلیئر کر چکا۔ میری نظر میں اس نے کوئی قابلِ ذکر اسکور نہیں کیا۔ میں اس ہدف کو بہ آسانی پورا کر کے یہ میچ جیت جاؤں گا بہ شرط یہ کہ خلافِ اصول ''میری مرضی'' کی فیلڈنگ کھڑی کی جائے۔''

''بیگ صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں؟'' جج نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''جناب عالی! کرکٹ کے کھیل کا اصول تو یہی ہے کہ باؤلنگ کرانے والی ٹیم اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق میدان میں فیلڈنگ کھڑی کرتی ہے لیکن عدالت کے اکھاڑے میں اگر میری مرضی کی فیلڈنگ لگائی جائے تو میچ کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میچ استغاثہ اور ڈیفنس کے مابین کھیلا جارہا ہے اور وٹنس باکس والی پوزیشن کو خالی دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ استغاثہ کے تمام گواہ تو بھگت چکے۔ استغاثہ سے متعلق صرف دو افراد اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود ہیں، یعنی وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر۔ میں اپنے فاضل دوست کو تو زحمت دینے کی جسارت نہیں کرسکتا چنانچہ میری خواہش ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر سب انسپکٹر ناصر مجید صاحب فیلڈنگ کے لیے وٹنس باکس میں تشریف لے آئیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد آئی او، جج کے حکم پر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''آئی او صاحب! آپ کو ایک بار پھر تکلیف دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ یقین جانیے کہ میری طرف سے آپ کو پہنچنے والی یہ آخری زحمت ہے۔''

''اٹس او کے.....'' وہ دھیرے سے بولا۔

''جناب عالی!'' میں انکوائری آفیسر کو چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیل سرکار نے میرے مؤکل کو فٹ کرنے کے ذیل میں جو دلائل دیے ہیں، میں ان پر بات نہیں کروں گا کیونکہ میری نگاہ میں ان پوائنٹس کی ذرا سی بھی اہمیت نہیں ہے۔ میں آج استغاثہ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ ملزم کا پیرافین ٹیسٹ کیوں نہیں کیا گیا تھا اور یہ سوال بھی نہیں کروں گا کہ ملزم کے معدے کا کیمیاوی تجزیہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی گئی؟ آج صرف میتھیمیٹکس کی زبان میں بات ہوگی۔ ریاض نہ سہی تو ریاضی ہی سہی.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے استہزائیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا، پھر وٹنس باکس کی جانب بڑھتے ہوئے انکوائری آفیسر سے مخاطب ہوا۔

''آئی او صاحب! گزشتہ پیشی پر آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے میتھ کے ساتھ انٹر سائنس کر رکھا ہے۔ کیا آپ ابھی تک اپنے بیان پر قائم ہیں؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''ویٹس فائن.....'' میں نے گہری نظر سے اسے گھورا اور پوچھا۔ ''ریاضی یعنی میتھ کے تین بڑے شعبے ہیں..... الجبرا، جیومیٹری اور ٹریگونومیٹری۔ آپ کس شعبے سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں؟''

''الجبرا مجھے مشکل سے سمجھ میں آتا تھا اور ٹریگونومیٹری بھی بس ٹھیک ہی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''البتہ جیومیٹری میرا پسندیدہ شعبہ رہا ہے۔''

''ویٹس ایکسٹرا فائن.....'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''استغاثہ کے ایک گواہ مقبول احمد نے اپنی گواہی میں معزز عدالت کو بتایا تھا کہ جلسہ گاہ میں جب فائر کی آواز سنائی دی تو اسٹیج کی بائیں جانب والی سو کرسیوں پر تمام افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ کوئی ایک شخص بھی عقب میں نہیں تھا۔ گواہ اسی حصے میں، کرسیوں کی تیسری قطار میں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنے عقب میں یعنی کرسیوں کی چوتھی اور آخری قطار میں عین اس مقام سے

گولی چلنے کی آواز سنی جہاں ملزم بیٹھا ہوا تھا۔ کیا آپ استغاثہ کے اس بیان سے اتفاق کرتے ہیں؟''

میں نے گھما پھرا کر خاصی لمبی چوڑی بات کی تھی جس کے جواب میں آئی او نے صرف اتنا کہا۔

''جی ہاں!''

''آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے اس حصے سے بھی اتفاق فرما چکے ہیں کہ قاتل کی چلائی ہوئی گولی مقتول کی بائیں کنپٹی کے مقام سے کھوپڑی میں گھس کر دائیں کنپٹی کے مقام پر مقتول کی کھوپڑی سے باہر نکلی تھی۔'' میں نے آئی او پر اپنا شکنجہ کستے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ گولی نے مقتول کی کھوپڑی کے اندر کس زاویے پر سفر کیا تھا؟''

''ون ایٹی ڈگری پر۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''آپ کا مطلب ہے، ایک سو اسی درجے خطِ مستقیم پر؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل!'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

''آئی او صاحب.....!'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی اور تندی بھرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ جب مقتول کو گولی لگی اس وقت وہ اسٹیج کے اوپر کھڑا تقریر کر رہا تھا؟''

''جی..... یہی حقیقت ہے۔''

''آپ ہی کی زبانی معزز عدالت یہ جان پائی ہے کہ مقتول کا قد چھ فٹ اور ایک انچ تھا اور اسٹیج کی اونچائی دو فٹ تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ ''اس حساب سے اگر مقتول کے جوتوں کی اونچائی کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب مقتول کو گولی لگی، اس وقت اس کا سر سطحِ زمین سے لگ بھگ آٹھ فٹ ایک انچ کی بلندی پر تھا..... ہیں نا؟''

''جی..... جی ہاں.....'' اس نے الجھن زدہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''اگر استغاثہ کے گواہ مقبول احمد کے بیان کے اس حصے کو درست مان لیا جائے کہ جب گولی چلی، اس وقت تمام لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ملزم نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے فائر کیا تھا.....؟''

''ظاہر سی بات ہے۔'' انکوائری آفیسر کی الجھن میں فکر بھی شامل ہوگئی۔

''مائی ڈیئر آئی او.....!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اگر ملزم نے کرسی پر بیٹھ کر گولی چلائی تھی تو وہ گن کو تین فٹ سے زیادہ بلند نہیں کر پایا ہوگا۔ اس صورت میں گن کے بیرل اور مقتول کی کنپٹی کے بیچ ایک سو بیس درجے کا زاویہ بنتا ہے اور جیومیٹری کے اصول کے مطابق، اس سچویشن میں چلنے والی گولی کو مقتول کی کھوپڑی میں گھس کر سر کے بالائی حصے سے باہر نکلنا چاہیے تھا.....؟''

اس نے ایک لمحے سوچا، پھر بولا۔ ''آپ بجا فرماتے ہیں مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملزم نے اچانک کھڑے ہو کر گولی چلا دی ہو.....!''

''اس امکان کو بھی جیومیٹری کی کسوٹی پر گھس کر دیکھ لیتے ہیں آئی او صاحب!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''فرض کریں..... میں فرض اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ آپ کی فرمائش ہے، ورنہ مجھے تو یقین ہے کہ جب فائر کی آواز گونجی، میرا موکل کرسی پر نیم غنودگی کے عالم میں بیٹھا اپنے ساتھی ریاض احمد کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ خیر.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے بتانے والے انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا، پھر آئی او کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔

''فرض کر دا ملزم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اغل بغل کی پروا کیے بغیر اس نے ''ٹھائیں'' سے مقتول پر گولی چلا دی، لیکن ایسا فرض کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا آئی او صاحب ..... آپ کی فیورٹ جیومیٹری یہاں بھی آڑے آ رہی ہے۔''

وہ بے ساختہ مستفسر ہوا۔ ''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے آئی او صاحب.....'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اگر ملزم نے کھڑے ہو کر گولی چلائی تھی تو وہ اپنے قد پانچ فٹ اور آٹھ انچ کی بدولت گن کو فائرنگ پوزیشن میں زیادہ سے زیادہ چھ فٹ بلند کر پایا ہوگا۔ اس صورت حال میں گن کے بیرل اور مقتول کی کنپٹی کے درمیان ایک سو پچاس درجے کا زاویہ بنے گا اور جیومیٹری کی رو سے اس گن سے نکلنے والی گولی مقتول کے بائیں جبڑے سے اندر گھس کر دائیں کان کے اوپر سے، کھوپڑی سے باہر نکلے گی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا آئی او صاحب..... یہ تو لائنوں اور زاویوں کی ملکہ جیومیٹری کا فرمان ہے۔''

''جیومیٹری غلط نہیں کہہ رہی.....'' وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کسی تھکے ہوئے کھلاڑی کے مانند بولا۔

آئی او نے بڑے واضح انداز میں اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ میں نے اس ہارے ہوئے جواری کو وِٹنس باکس کے سپرد کیا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

''جناب عالی! مقتول کی کھوپڑی کے اندر گولی نے ون ایٹی ڈگری پر سفر کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ گولی کم وبیش آٹھ فٹ کی بلندی سے چلائی گئی تھی جو ون ایٹی ڈگری پر، خط مستقیم میں سفر کرتے ہوئے مقتول کی بائیں کنپٹی کے مقام سے کھوپڑی میں گھسی اور دائیں کنپٹی سے باہر نکل گئی اور..... ایسا فائرنگ پوائنٹ صرف ایک ہی ہے۔''

میں اس وقت براہ راست جج سے مخاطب تھا لیکن جج کے سوال کرنے سے پہلے وکیل استغاثہ کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''کون سا فائرنگ پوائنٹ.....؟''

''جناب عالی!'' میں نے وکیل سرکار کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جج سے کہا۔ ''میرے مؤکل کو... خوامخواہ کسی گہری سازش کے تحت اس مرڈر کیس میں رگیدا جارہا ہے۔ یہ بے چارہ بے گناہ و بے قصور ہے۔ ابھی میں نے تفتیشی افسر کی مدد سے معزز عدالت کے سامنے ثابت کیا ہے کہ میرے مؤکل نے کرسی پر بیٹھ کر گولی چلائی اور نہ ہی کھڑے ہوکر فائر کیا۔ ہاں، اگر وکیل استغاثہ ان لمحات میں یہ سوچ رہے ہیں کہ ملزم نے کسی ہانگ کانگ میڈ ایکشن مووی کے ہیرو کے مانند آٹھ فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے مقتول کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا ہوگا تو میں اپنے فاضل دوست کی سوچ پر کوئی قدغن نہیں لگاسکتا۔ میں تو معزز عدالت کے سامنے حق اور سچ کو اجاگر کرنے کی کوشش کررہا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ.....'' میں نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا، پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے نامکمل الفاظ میں گرہ لگادی۔

''اور..... سچ تو یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہ مقبول احمد نے کرسیوں کی سیکنڈ لاسٹ رو میں بیٹھے ہوئے اپنے عقب میں گولی چلنے کی آواز سنی تھی اور میرے مؤکل نے کرسیوں کی لاسٹ رو میں بیٹھے ہوئے اپنے پچھواڑے فائر کی آواز سماعت کی تھی۔ مطلب یہ کہ گولی تو عقب ہی سے چلائی گئی تھی اور وہ بھی آٹھ فٹ کی بلندی سے..... یعنی کارخانے کی دیوار کے اوپر سے.....!''

''انٹریسٹنگ.....!'' جج کی آنکھوں میں مجھے ایک ذہانت بھری چمک دکھائی دی۔ ''وھاٹ از فردر مور؟'' اس نے پُراشتیاق لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''یور آنر! میں نے خود جاکر جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا مؤکل وقوعہ کی رات کرسیوں کی چوتھی یعنی آخری قطار میں بیٹھا تھا اور اس قطار کے پیچھے کارخانے کی دیوار ہے۔ میں نے اس دیوار کی، اپنے ہاتھوں سے پیمائش کی ہے اور اس کی اونچائی کو پورے آٹھ فٹ پایا ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، اس نے کارخانے کی اسی دیوار کے اوپر سے فائر کرکے مقتول ارشاد حسین کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یقیناً وہ قاتل ہرگز ہرگز میرا مؤکل نہیں ہوسکتا.....!''

''تو پھر قاتل کون ہے؟'' وکیل استغاثہ کی جھنجلاہٹ بھری آواز کمرۂ عدالت میں گونجی۔

یہ سوال اس نے یقیناً مجھ سے کیا تھا لیکن میں دانستہ انجان بن گیا اور میں نے تفریح لینے والے انداز میں اس سے پوچھا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ عدالت سے استفسار کررہے ہیں یا مجھ سے؟''

''ظاہر ہے، آپ سے۔'' وہ انگلی سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''انکشاف آپ نے کیا ہے، جواب بھی آپ ہی دیں گے۔''

''کیا آپ اپنا کام بھی ڈیفنس ہی سے کروائیں گے؟'' میں نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ''قاتل کو گرفتار کرکے اسے قرار واقعی سزا دلوانا تو استغاثہ کی ذمے داری ہے۔ میں تو اپنے مؤکل کے دفاع کے لیے یہاں آیا ہوں اور الحمدللہ! میں نے اپنا فرض بہ طریق احسن ادا کردیا ہے لیکن آپ نے چونکہ پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے اس لیے میں آپ کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گا۔ آپ کے لیے میرے پاس ایک ٹپ ہے۔ فی الحال وہی دے سکتا ہوں۔''

سچی بات یہ ہے کہ میں یہ سارا نانک وکیل استغاثہ کی کلاس لینے کے لیے کررہا تھا لیکن چونکہ میرا انداز سنجیدگی کی چادر کے اندر لپٹا ہوا تھا اس لیے وہ میری باتوں کو کافی سیریس لے رہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

''کیسی ٹپ.....؟''

''میری انٹرپول کے ایک افسر سے یاد اللہ ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کا موڈ ہو تو میں اس افسر سے آپ کی سیٹل منٹ کرادیتا ہوں۔ آپ اس افسر کی مدد سے شہنشاہِ سیٹل منٹ ریاض احمد کو جرمنی سے واپس لائیں۔ اس بات کی گارنٹی میری ہے کہ اگر پولیس بھگوڑے ریاض احمد کا سنجیدہ ٹرائل کرے تو بہ آسانی قاتل تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے.....''

میرا سیریس مذاق وکیل سرکار کی سمجھ میں آیا یا نہیں، اس کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری

اس وضاحت کے جواب میں وہ بس مجھے گھور کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مخصوص وقت ختم ہوگیا۔ جج نے فیصلے کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر بس رسمی سی کارروائی ہوئی۔ گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم شاکر علی کو بے گناہ ثابت کرنے کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچادیا تھا لہٰذا حالات و واقعات، میرے ٹھوس دلائل اور ناقابلِ تردید شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے شاکر علی کو اس کیس سے بری کردیا گیا۔

شاکر علی کی باعزت بریت پر سب سے زیادہ خوشی اس کے باپ باقر علی کو ہوئی تھی۔ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے شاکر علی کی زبان بھی تھکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور جہاں تک میری بات ہے، تو ظاہر ہے اس کیس میں کامیابی کی خوشی تو مجھے بھی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی دل میں ایک پھانس سی چبھ کر رہ گئی تھی۔ یہ خلش مجھے ہر پل غیر محسوس انداز میں بے چین رکھتی تھی کہ ریاض احمد اچانک منظر سے غائب کیوں ہوگیا تھا.....؟

یہ کہانی بظاہر یہیں ختم ہوجاتی ہے کہ میں نے جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شاکر علی کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا، میرے مؤکل کے بری ہونے کے ساتھ ہی وہ ٹارگٹ پورا ہوگیا۔ عدالت کے فیصلے کی شکل میں ''نیک نامی'' کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ شاکر علی آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک تھا مگر میرے اندر کافی کچھ ٹھیک نہیں تھا.....!

مجھے اپنی بے چینی کا علاج ڈھونڈنے میں تین ماہ لگ گئے۔ اس دوران میں، میں نے اپنے تمام وسائل استعمال کرکے بھگوڑے ریاض احمد کے بارے میں مصدقہ معلومات اکٹھا کیں۔ ان معلومات کو ترتیب دینے سے میرے ذہن میں جو تصویر بنی اس میں میرے ہر تشنہ سوال کا جواب موجود تھا۔ میں نے اس تصویر پر تصدیق کی مہر ثبت کرنے کے لیے ایک روز چھٹی کے دن شاکر علی کو اپنے گھر پر بلالیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''وکیل صاحب! خیریت تو ہے نا، آپ نے اچانک مجھے اپنے پاس بلالیا.....؟''

''شاکر میاں! پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''دراصل میں نے جعلی ڈاکٹر ارشاد حسین کے قاتل کا پتا چلالیا ہے.....''

''کیا واقعی.....؟'' وہ بھونچکا رہ گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''مجھے تو اپنی ریسرچ کے بارے میں کوئی ڈاؤٹ نہیں ہے۔'' میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ یہ راز تم سے بھی شیئر کروں۔ اب میں تمہارے کیس کے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو تو کچھ بتانے سے رہا.....''

''جی، جی..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے قاتل کا نام بتائیں.....''

''میں تم سے چند آسان سے سوالات کروں گا۔ تم نے ان کا ٹو دی پوائنٹ نہایت ہی مختصر جواب دینا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''قاتل کا نام خود بہ خود تم تک پہنچ جائے گا۔''

''جی اچھا.....!'' وہ پہلو بدلتے ہوئے اضطراری انداز میں بولا۔ ''آپ سوال کریں وکیل صاحب!''

''کیا تمہاری مرحوم بیوی کا نام فرزانہ تھا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ریاض احمد کو تمہاری بیوی اور بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے اندوہناک واقعے کا علم تھا؟''

''جی۔ آٹھ سال پہلے ریاض، ناصر کالونی سے قیوم آباد تو شفٹ ہوگیا تھا لیکن اس کی ناصر کالونی میں گاہے بہ گاہے آمد و شد رہتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اکثر مجھ سے بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔ میری بیوی اور بیٹے کی دردناک موت سے پوری ناصر کالونی آگاہ تھی۔ بالکل..... ریاض کو بھی اس کا علم تھا۔''

''میں نے تم سے ٹو دی پوائنٹ جواب دینے کے لیے کہا تھا اور تم نے مجھے کہانی سنانا شروع کردی۔'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس سوال کا جواب تم محض ''ہاں'' میں بھی دے سکتے تھے۔''

''سوری سر.....!'' وہ معذرت خواہانہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''غلطی ہوگئی۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''گڈ!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ناصر کالونی میں ریاض، فرزانہ کا پڑوسی تھا؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ریاض، فرزانہ کو پسند کرتا تھا؟''

''جی۔ اس نے فرزانہ کا رشتہ بھی مانگا تھا مگر فرزانہ کے والدین نے صاف انکار کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس انکار کی بھی ایک خاص وجہ تھی مگر آپ نے تفصیل بتانے سے منع کر رکھا ہے، اس لیے.....!''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اب کی بار میں نے اسے جھڑکنا ضروری نہیں جانا اور گمبھیر انداز میں کہا۔

''میں وہ وجہ اچھی طرح جان چکا ہوں، شاکر میاں۔ فرزانہ کے والدین ریاض احمد کو ایک راؤڈی (Rowdy) سمجھتے تھے۔ سیٹل منٹ کے دھندے میں اسے بعض اوقات مار پیٹ کا کام بھی کرنا پڑتا تھا اور فرزانہ کے والدین کو ریاض کا یہ غنڈوں والا کردار ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا.....؟''

''جی۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''اسی لیے جب تمہارے گھر سے فرزانہ کا رشتہ مانگا گیا تو ادھر سے فوراً ہاں کہہ دی گئی۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ ریاض کے مقابلے میں فرزانہ کے والدین کی نگاہ میں تم ایک مہذب اور شریف انسان تھے۔''

''آپ حقیقت بیان کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''تمہاری اور فرزانہ کی شادی کے فوراً بعد ریاض نے ناصر کالونی کو خیر باد کہا اور قیوم آباد میں سکونت اختیار کر لی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر وہ دل میں تمہاری نفرت کو پروان چڑھاتا رہا۔''

''یہ مجھے نہیں معلوم جناب۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس دوران میں جب بھی ریاض سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔''

''یہ تمہاری سادگی اور اس کی فنکاری ہے، شاکر میاں!'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے بھوبل کا نام سنا ہے؟''

''نن.....نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''بھوبل، یعنی گرم راکھ بڑی ظالم شے ہے اور جذبۂ انتقام کی خطرناک چنگاری اس کے اندر چھپی رہتی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہ جس مقام پر بھی بسیرا کر لے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ریاض تمہاری نفرت کی بھوبل کو اپنے دل میں دبا کر ناصر کالونی سے قیوم آباد شفٹ ہو گیا تھا۔ قبل اس کے کہ یہ راکھ اسے جلا کر خاکستر کر دیتی، مقتول کے اسپتال والا واقعہ پیش آ گیا۔ تم نے تو صرف فرزانہ کو اس سے چھینا تھا، جعلی ڈاکٹر کے پرائیویٹ اسپتال کے غیر انسانی اصولوں نے فرزانہ کی زندگی ہی چھین لی۔ اب تم ریاض کی نظر میں دشمن نمبر ون اور ارشاد حسین دشمن نمبر ٹو ٹھہرا تھا۔ ریاض چونکہ سیٹل منٹ کا ماہر تھا اس لیے اس نے بڑی ذہانت سے ایک منصوبہ بنایا..... دشمنِ اول کو قربانی کا بکرا بنا کر دشمنِ ثانی کا شکار اور..... وہ راؤڈی اپنے اس گھناؤنے مقصد میں ففٹی پرسنٹ کامیاب ہو گیا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ اس لیے نہیں کہ یہ ادھوری کامیابی ہے۔ ارشاد حسین تو کندۂ جہنم بن چکا ہے لیکن تم اس کیس سے باعزت بری ہو گئے ہو۔''

''اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی، وکیل صاحب!'' وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اس روز چائے کے ہوٹل میں ریاض ہی نے میری چائے میں کچھ ایسا ملا دیا تھا جس سے مجھے اپنی سوچ اور حواس پر اختیار نہ رہے۔ یقیناً اس نے اپنے کسی آدمی کو میری بغل میں بٹھا رکھا ہوگا۔ وہ مجھ سے سگریٹ لانے کا بہانہ کر کے جلسہ گاہ سے نکلا اور کارخانے کی آٹھ فٹی دیوار کے پیچھے چلا گیا، پھر ڈاکٹر ارشاد کو گولی کا نشانہ بنانے کے بعد اس نے وہ گن اپنے آدمی کو دے دی ہوگی اور اسی آدمی نے مجھے دھکا دینے کے بعد مذکورہ گن مجھے تھما دی ہوگی.....''

''یہ میری ریسرچ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ضروری نہیں کہ تم اس پر یقین بھی کر لو۔''

''سر! آپ کی ریسرچ لاجواب ہے۔'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا اس پر یقین کیسے نہیں کروں گا!''

''یقین ضرور کرو لیکن اس حقیقت کو بھی اپنے ذہن میں ہر دم تازہ رکھو کہ ریاض احمد جرمنی گیا ہے، عدم آباد نہیں۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ راؤڈی، فرزانہ سے محبت کرتا تھا اور محبت کرتا رہے گا۔ وہ جب تک زندہ ہے، تمہارے سر پر خطرے کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہے گی۔ یاد رکھنا..... شکست خوردہ محبت بھوبل سے کہیں زیادہ تباہ کن اور زہرناک ہوتی ہے۔ بی ویری کیئر فل مائی ڈیئر کلائنٹ.....!''

وہ سہم کر خوفزدہ نظر سے مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے میں بیٹھے بٹھائے یکایک کسی عفریت میں بدل گیا ہوں.....!

(تحریر: حسام بٹ)

کبھی کوئی دولت کے نشے میں انسانی رشتوں کو ٹھکراتا ہے اور کبھی کوئی دولت کے حصول کے لیے اجنبی رشتوں میں اپنی ذات سمو دینے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلتا ہے... وہ بھی تو کھوئے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے رشتوں میں جانے کس کو تلاش کرتا پھرتا تھا... پھر ایک روز اس کے بند دروازے پر ایک انجانے رشتے نے دستک دی تو اس کے چہرے میں ماضی کے نقوش ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا...

بند دروازوں کے پیچھے قید لمحوں کی ایک پردرد کہانی کے کردار.....

دستک

آصفہ ضیا احمد

ٹی وی کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ کبھی اسکرین یک دم تاریک ہو جاتی، کبھی زور زور سے تھپتھپانے پر ایک لمبی گڑگڑاہٹ کے بعد عجیب و غریب آواز کے ساتھ آڑی ٹیڑھی لہریے دار تصاویر کچھ اس طرح ظاہر ہوتیں کہ اس سے صرف مرلی منوہر ہی محظوظ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجبور تھا۔ روٹی خریدنے کے لیے اس کے پاس دھیلا نہیں تھا تو بھلا وہ ٹی وی کہاں سے خریدتا۔ اکلوتی بیٹی رنجنا مہانگر پالیکا کے دفتر میں بحیثیت کلرک کام کرتی تھی۔ اس کی کمائی سے دونوں باپ بیٹی

کے حلق تر ہو رہے تھے۔ اپنی قلیل سی تنخواہ میں سے وہ ہر مہینے باپ کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھ دیتی جسے وہ شراب میں اڑا دیتا اور وہ ہر ماہ پیسا باپ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ایک ٹیچر کی طرح شراب اور نشے کی ان گنت خرابیاں گنواتی۔ پھل اور دودھ لینے کے لیے راضی کرتی لیکن مرلی منوہر کی ڈھٹائی دیکھ کر اس کا دل چاہتا اپنی ہی بوٹیاں نوچ ڈالے۔ آج بھی وہ نئی بوتل خرید کر لایا تھا۔ ریموٹ پر انگلیاں تھرک رہی تھیں لیکن ٹی وی خراب تھا۔ اسی چکر میں اس نے غٹاغٹ شراب کی آدھی بوتل اپنے حلق میں انڈیل لی اور باقی آدھی سالخوردہ لکڑی کی میز پر رکھنے کو گیا تو وہ زمین پر لڑھک گئی۔ اپنے آپ کو بکتا جھکتا وہ پھر دارو کے اڈے پر پہنچ گیا۔ اڈے کے مالک نے اسے مزید ادھار شراب دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کبیدہ خاطر دکان کے باہر لوہے کی بینچ پر آ بیٹھا۔ اس کا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔ اسی وقت اس کا جگری یار شمبھوناتھ وارد ہو گیا۔ مرلی منوہر دکان کے مالک کو اول فول بکنے میں مگن تھا۔ شمبھوناتھ اس بگڑے ہوئے ہاتھی کا مہاوت بنا اور اسے سمجھا بجھا کر پھر شراب خانے میں لے آیا۔ اپنے مخصوص انداز میں دو بوتلوں کا آرڈر دے کر مرلی کو بھی بٹھایا اور خود بھی چُرمُر کرتی کرسی پر ٹک گیا۔ مرلی نے زبان سے تو دوست کا شکریہ ادا نہیں کیا لیکن اس کی آنکھوں میں ممنونیت اور تشکر تھا۔ بوتل میز پر آتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے کاک اڑایا اور ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ آنکھیں ٹی وی پر لگی ہوئی تھیں جہاں دوردرشن پر سماچار آ رہے تھے۔ اچانک ایک خبر نے مرلی منوہر کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ نشہ ہرن ہو گیا۔ ہمہ تن گوش ہو کر وہ اس خبر کو سن بھی رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ ٹی وی پورے زوروشور سے کہہ رہا تھا کہ ملک کے مشہور ارب پتی جگدیش راٹھور جو کہ ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ کارپوریشن کے مالک اور کرتا دھرتا ہیں اور دیس کے بہت بڑے نیتا، مہان سیاستدان اور دیس سیوک ہیں، انہوں نے اپنی ایک بیٹھک میں یہ بھاشاوَنی دے کر جنتا کو ایک بڑا جھٹکا دیا ہے۔ دیس اور دیس واسیوں کے لیے اپنے پران نچھاور کرنے والا یہ نیتا اب مکمل طور پر سیاست سے ریٹائرمنٹ لے رہا ہے۔ اپنی ایک نجی میٹنگ میں مہاشے نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی اپنی پرسنل لائف جنتا میں ہمیشہ چرچے کا باعث رہی ہے۔ اس لیے اب جب کہ وہ سیاست کی فیلڈ سے ہٹ رہے ہیں تو انہوں نے یہ نرنئے (فیصلہ) لیا ہے کہ اپنی نجی زندگی پر سے پردہ ہٹا دیں۔ جگدیش راٹھور نے یہ بتا کر سب کو چکت کر دیا کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی پتنی ان کی پریمیکا بھی تھی اور یہ ان کی لو میرج تھی۔ اس پتنی سے ان کی ایک سپتری (بیٹی) بھی ہے... جو پتا نہیں کہاں ہے... لیکن وہ اپنی بیٹی کا کھوج لگانے کے لیے پاتال میں بھی جا سکتے ہیں۔ ان کی دوسری شادی ارینج میرج تھی۔ دوسری پتنی ترشا ان کی ماتا کی پسند تھی۔ جیون کے سفر میں چلتے چلتے وہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ دوسری پتنی سے انہیں کوئی سنتان (اولاد) نہیں ملی۔ ٹی وی جگدیش راٹھور کی مختلف النوع کی کئی تصاویر ایکسپوز کر رہا تھا لیکن اب مرلی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ جگدیش راٹھور کی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی آپ بیتی سنتا۔ وہ بوکھلا کر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ خوشی کے مارے اس کے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آ گرے گا۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ شمبھوناتھ کی منگوائی ہوئی بوتل اس نے ہوا میں اچھال کر ایک ''ہرّے'' کا نعرہ لگایا اور باہر دوڑتا ہوا نکل گیا۔ شمبھوناتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کم بخت کو آج پھر چڑھ گئی۔'' آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے تو کوئی اثر ہی نہیں لیا کیونکہ اس قسم کے ناٹک وہ شراب خانے میں روز ہی دیکھتے تھے۔

''رنجنا اری او رنجنا بڑا شبھ سماچار لایا ہوں تیرے لیے۔ ارے بھگوان نے چھپر پھاڑ دیا ہے، اب تو ہمارا ہر دن ہولی اور رات دیوالی ہے۔'' رنجنا رسوئی میں کام میں مگن تھی۔ باپ کی چیخ پکار سن کر اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور تفکر آمیز لہجے میں بولی۔

''آج باپو تو زیادہ ہی بہک گیا۔ اسی لیے ہمیشہ منع کرتی ہوں کہ نشے سے دور رہا کر مگر تیرا تو اس کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں بھی بڑی ابھاگن (کم نصیب) ہوں۔ ماتا پتا کا پیار اور آشیرواد کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہی نہیں۔''

مرلی نے بیٹی کے سارے بھاشن کو ہوا میں اڑا دیا۔ خوشی کے مارے وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا اس لیے وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر ٹی وی کی خبر صحیح طور پر سنا نہیں پا رہا تھا۔ شدت جذبات کی وجہ سے بے ربط جملے اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔ رنجنا ہاتھ کا کام چھوڑ کر تشویش ناک نظروں سے ٹکٹکی باندھے باپ کو تک رہی تھی۔ وہ اس بات سے خائف تھی کہ شراب نے اس کے مخبوط الحواس باپ کا دماغ ہی تو نہیں الٹ دیا۔ بڑی مشکل سے وہ باپ کی بات سمجھ پائی۔ خودکلامی کے انداز میں وہ آہستہ سے بولی۔ ''آج نو بجے کی نیوز نے باپو کا

چکرا دیا ہے۔ ضرور کوئی امپورٹنٹ پوائنٹ چھپا ہے۔ تب ہی تو وہ سما چار سما چار کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔''

اس نے اپنے تمام کام پس پشت ڈالے اور پڑوس میں رہنے والی اپنی سہیلی شیلا ماتھر کے گھر پہنچ گئی۔ شیلا کا ٹی وی آن تھا۔ ٹی وی پر کوئی ڈراما آرہا تھا۔ اس لیے تمام فیملی ممبران ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔ رنجنا بھی ایک خالی کرسی پر ٹک گئی۔ ڈرامے میں تو اس کا دل نہیں لگا کیونکہ اسے نہ تو آگا پتا تھا نہ پیچھا لیکن وہ من مار کر بیٹھی رہی۔ کیونکہ اسے شیلا کے پتی کی اس عادت کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرامے کے بعد کسی بھی نیوز چینل سے خبریں ضرور دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ چپکی بیٹھی رہی۔ جیسے ہی نیوز ریڈر نے خبریں پڑھنا شروع کیں وہ سراپا گوش بن گئی۔ راٹھور انٹر پرائز کے ڈائریکٹر اور مالک کی سیاست سے ریٹائرمنٹ اور اپنی گمشدہ بیٹی کی تلاش کی خبر سن کر اس کا دل بھی سینے میں یوں دھڑکنے لگا جیسے کوئی برقی روگزر رہی ہے۔ اپنا آپ سنبھالنا اسے بھی مشکل ہو گیا۔ شیلا اور اس کا شوہر اس سے اس کی خیر خیریت پوچھ رہے تھے اور وہ خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں مختصراً جواب دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں جوش اور مسرت کی تمتماہٹ تھی وہیں گہری تشویش کے آثار بھی تھے۔ گھبرائی گھبرائی سی وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں میاں بیوی سے بغیر اجازت لیے وہاں سے سرپٹ دوڑ گئی۔ وہ دونوں حیران کن نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

مرلی کو جوں ہی بیٹی کا چہرہ نظر آیا' وہ اپنی پلنگڑی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''دیکھ آئی سما چار۔ اب تو تجھے میری بات پر وشواس آ گیا۔ ارے پتر! تیرے جیون میں بہار آنے والی ہے۔ تیرے سارے سپنے سچ ہونے والے ہیں۔ صرف تیرے سپنے نہیں بلکہ میرے بھی وہ سارے خواب اب پورے ہونے کا سے آپہنچا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا۔ ارے اوپر والے کی لیلا تو دیکھ' بن مانگے تیرا آنچل موتیوں سے بھر دیا۔ ارے میری بچی اسی دن کا ہی تو میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔ اب یہ نشچت (طے) ہے کہ جگدیش راٹھور کی ساری سمپتی (جائداد) کی مالکن صرف اور صرف تو ہے۔''

رنجنا کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ پہلے تو فیصلے انداز میں باپ کو گھورتی رہی پھر ڈپٹ کر بولی۔ ''بس باپو بہت بکواس کر چکا۔ اب میں آگے ایک شبد بھی نہیں سنوں گی۔ جو پاپ تو مجھ سے کروانا چاہتا ہے نا...، وہ میں ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔ جگدیش راٹھور کی دولت پر ہمارا کوئی ادھیکار نہیں۔ رچنا آنٹی تیری سگی بہن ضرور تھی لیکن تُو نے ہی اسے گھر سے بے گھر کیا اور ایسے سے کیا جب اس کے پیٹ میں جگدیش راٹھور کی اولاد پل رہی تھی۔ بچی کے سنسار میں آتے ہی تُو نے اپنی ماں اور بہن کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا کٹھور بیٹا اور کٹھور بھائی سارے جگ میں نہیں ملے گا۔ تو نے ہمیشہ دوسروں کے راستوں میں کانٹے ہی بچھائے ہیں۔ تب ہی تو ایک ایک پائی کے لیے ترستا ہے۔ تیرے کرموں (اعمال) کا بھگتان میں بھی بھوگ رہی ہوں۔ میری سکھی سہیلیاں آج سہاگن بھاگن ہیں اور میں تجھ جیسے نکمے اور شرابی باپ کا پالن پوشن بھی کر رہی ہوں اور اوور ٹائم لگا کر تیرے دارو کا بھی پربندھ (بندوبست) کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رنجنا کے نین ساون بھادوں بن گئے۔ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکی اور پھر بولی۔ ''پاپو تو نے ہمیشہ ببول بویا ہے اور دل میں یہ لیے بیٹھا ہے کہ تجھے آموں کی فصل مل جائے تو بھلا ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔'' پھر وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ''جو بویا وہی تجھے کاٹنا ہے۔ یہی اوپر والے کا نیم (اصول) ہے۔''

مرلی نے غراہٹ سے بھرپور ایک طویل ہنکاری بھری۔ اپنی چندی چندی گھورتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا اور کرکراتے لہجے میں بولا۔ ''جگدیش راٹھور، رچنا اور ان دونوں کی بیٹی اور میری ماں۔ اور جگدیش کی ساری دھن سمپتی اس وشئے (موضوع) پر تو میں تجھ سے بعد میں بات کروں گا۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائے گی کہ یہ ساری کتھائیں اور گھٹنائیں (شکایتیں اور واقعات) کس نے تیرے کانوں میں ڈالی ہیں جس نے بھی تجھے یہ سب سنایا ہے' میں اس کا خون پی جاؤں گا۔''

رنجنا نے ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ باپ کو دیکھا اور استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''اس کا خون تو، تو پہلے ہی کر چکا۔ یہ ساری باتیں مجھے میری سورگباسی ماں نے بتائی تھیں جو تیرے ظلم اور اتیا چار (ظلم و ستم) سہتے سہتے بستر سے جا لگی تھی۔ جب بھی تو اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کرتا، وہ چیختی چلاتی اور ادھ مری ہو کر گھنٹوں زمین پر پڑی رہتی۔ ان ہی دنوں تو نے بہت بڑا وشواس گھات کیا۔ کوئی جھوٹی سچی کہانی گھڑی، اپنی بہن رچنا کو سنائی اور اسے اس کے سسرال سے لے آیا۔ وہ پیٹ سے تھیں۔ جگدیش انکل ملک سے باہر تھے۔ تو نے دونوں کے ساتھ ایک خطرناک گیم کھیلا۔ رچنا آنٹی اور جگدیش انکل کی دولت دیکھ کر تیری رال ٹپک رہی تھی۔ انکل کے باہر جاتے ہی تُو آنٹی کو اس بہانے سے لے آیا کہ تجھے ماں بہت یاد کر رہی ہے اور تو ہی اتنے بڑے سنسار میں اس کا اکلوتا بھائی

تھا۔ اس لیے جگدیش انکل کی بہن نے رچنا آنٹی کو تیرے حوالے کر دیا اور اس کے بعد تو نے آنٹی کا جینا دوبھر کر دیا۔ انکل جو کچھ اس کے حوالے کر گئے تھے تو نے حلق میں انگلی ڈال کر اس سے سب کچھ چھین لیا۔ تیری ماں بھی تجھ جیسے راکھشش کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ان ہی دنوں اس گھر میں دو لڑکیوں کا جنم ہوا۔ آنٹی کے یہاں بھی بیٹی پیدا ہوئی۔ جو کہ ایک دھنوان پریوار کی بیٹی تھی اور ان ہی دنوں میں نے بھی اپنی ماں کے پیٹ سے جنم لیا۔ ہم دونوں کی شکلیں ایک دوسرے سے اتنی ملتی کھاتی تھیں کہ زیادہ تر لوگ ہمیں جڑواں بہنیں سمجھتے تھے۔ میں پوری پوری اپنی پھوپی پر گئی تھی اور پھوپی کی بیٹی اپنی ماں پر گئی تھی۔ اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کا پرچھاواں تھیں۔ ہم دونوں کی حیرت انگیز مشابہت دیکھ کر تیرے شیطانی دماغ نے ایک شیطانی پلان بنایا۔ اپنی بھانجی اور بہن کا گلا گھونٹ کر انہیں اگلی دنیا میں روانہ کروں اور مجھے پال پوس کر ایک دن ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کروں کہ یہ جگدیش راٹھور کی بیٹی ہے۔ اس طرح اس کی ساری دولت پر تو ناگ بن کر بیٹھ جائے گا۔ میں تو باپو تیرا صرف ایک مہرہ ہوں جس روز تیری شطرنج کی بساط پر میں پٹ گئی سمجھو وہ دن میرے جیون کا انتم (آخری) دن ہوگا۔ اگر تیری ماں کو تیرے پلان کی بھنک نہ مل جاتی تو اسی سے میری دادی، پھوپی اور اس کی بیٹی کو تو نے موت کے گھاٹ اتار دینا تھا لیکن تو نے غلطی یہ کی کہ اپنا راز دار اپنی پتنی کو بنایا اور میری ماں کو تیری شیطانی عادتوں کا اچھی طرح پتا تھا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر ان تینوں کا ساتھ دیا اور .... تیری منصوبہ بندی کی ساری رپورٹ ان کے کانوں میں انڈیل دی ...نانی اپنی بیٹی اور نواسی کو لے کر راتوں رات ایسی بھاگی کہ تو ہوا میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ گیا۔ تیرا سارا غصہ میری ماں پر اترا۔ تو نے اسے وہ چار چوٹ کی لگائی کہ وہ خون تھوکنے لگی۔ لیکن کیول (صرف) میرے لیے وہ اپنے آپ کو سنبھالتی رہی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ماں نے تیرے کرتوتوں کی ساری رام کہانی مجھے کہہ سنائی۔''

جیسے ہی مرلی کو اس بات کی آگاہی ہوئی کہ شیطانی اور مذموم مقاصد اس کی بیٹی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں تو وہ کسی شکاری درندے کی طرح بیٹی پر جھپٹ پڑا۔ اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے کر بولا۔ ''تو یوں نہیں مانے گی۔ تیرا زہر نکالنا ہی پڑے گا۔''

وہ ہذیانی انداز میں چیخی تو مرلی نے اس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے نازک چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر مارتے مارتے خود ہی رک گیا کیونکہ رنجنا کی چیخیں یکا یک تھم گئی تھیں۔ وہ حرکت بھی نہیں کر رہی تھی۔ مرلی نے خوف زدہ ہو کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور جلدی سے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ جیسے ہی رنجنا نے آنکھیں پٹپٹائیں، مرلی کی جان میں جان آئی۔ ہلدی بھرا دودھ گرم کر کے بیٹی کو پلایا۔ اس سے معافی مانگی لاڈ دلار کیا۔ اس وقت تو سلا دیا لیکن رات بھر خود ایک پل کے لیے بھی نہیں سو پایا۔ صبح نمودار ہوتے ہی اس کے دل نے ایک قلابازی کھائی۔ بڑی دھانسو قسم کی ترکیب اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھی۔ اس صبح اس نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بیٹی کے پرس میں سے پیسے چرا کر انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن لا کر اس کے لیے ناشتا تیار کیا۔ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر اسے کھلایا پلایا۔ رات گئی بات گئی پر عمل کرتے ہوئے رنجنا بھی سب بھول بھال کر گرما گرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہی تھی۔ چونکہ اتوار کا دن تھا اس لیے دفتر کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مرلی نے جب دیکھا کہ بیٹی بالکل ہشاش بشاش ہے تو اس نے آنکھیں چمکاتے ہوئے بیٹی کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اپنے لہجے کو شیریں بناتے ہوئے نہایت نرمی سے بولا۔

''آج تو دن بھر آرام کرے گی۔ گھر کا سارا کام میں کروں گا۔ میں تجھے دن بھر کی مہلت دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لے۔ یہ کام اگر تو نے کر لیا تو ہمارے وارے نیارے ہیں۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

رنجنا نے ناگواری سے منہ پھیر لیا اور حتمی لہجے میں بولی۔ ''میرا جواب جو رات میں تھا وہی اب بھی ہے۔''

مرلی پھر اپنی اصلیت پر آ گیا اور غرایا۔ ''بس تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لے وہ تیرا پریمی ہے نا... کیا نام ہے اس کا پردیپ شری واستو، جگدیش راٹھور کی طرح وہ بھی بہت پیسے والا اور بڑے گھرانے کا بیٹا ہے۔ تو اس پر جان نچھاور کرتی ہے اور وہ بھی تجھ پر لٹو ہے لیکن اگر تو نے میرے کام سے انکار کیا تو یہ سمجھ لے کہ تم دونوں کے لیے ایسا سازشی جال بنوں گا کہ تو اور پردیپ اس میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ پوری عمر کے لیے جیل میں نہ سڑوایا تو نام بدل دینا۔''

مرلی کے لہجے میں آگ ہی آگ تھی۔ رنجنا اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے باپ کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ ''نہ باپو نہ تو ایسا کچھ بھی نہیں کرے گا۔ میں تیری ہر آگیا کا پالن کروں گی۔ جو تو کہے گا میں وہی کروں گی۔''

مرلی نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے

ہوئے ایک قہقہہ مارا۔ اور اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگا۔ رنجنا بے بس اور مجبور نگاہوں سے اسے تکتی رہی، بولی کچھ نہیں لیکن باپ کے لیے اس کے دل میں نفرت اور کراہیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

☆☆☆

گارڈ نے انٹرکام پر رابطہ کیا اور منظوری کے بعد اس حسینہ نازنین کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اندر جانے تک وہ رنجنا کو تکتا رہا۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ بھری، دھیرے سے اپنے آپ سے بولا۔ ''ہائے ربا میرے نصیب میں ہی بھینس نما پتنی لکھی تھی۔ اس سندری کی تو مانو کمر یا ہی نہیں ہے۔''

رنجنا اتنی دیر میں اندر داخل ہو چکی تھی۔ خواب اور بیداری کی حالت میں وہ یہ محل نما مکان دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی راج بھون میں آگئی ہو۔ وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی اس عمارت کو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہال نما کشادہ کمروں میں دفتری کام بھی ہو رہا تھا اور سامنے ہی ہرا بھرا سرسبز باغ اور لان تھا۔ یہاں آنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ملک کی ایک بڑی درآمدی برآمدی کارپوریشن کا مالک جب اس کے .... سامنے ہوگا تو وہ کیا کہے گی۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اس نے کئی پاپڑ بیلے تھے۔ تب جا کر اس راج محل کی دہلیز پار کر سکی تھی لیکن جگدیش راٹھور کو اپنی آمد کا کیا جواز بتائے گی؟ سلسلۂ کلام کس طرح شروع کرے گی؟ اس کا تو اس نے کوئی ہوم ورک ہی نہیں کیا تھا۔ اپنی ہڈیاں پسلیاں عزیز تھیں اور اپنے محبوب کی زندگی، اسی لیے وہ بغیر سوچے سمجھے یہاں دوڑی چلی آئی تھی۔ اچانک اپنے عقب میں اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ اس سے فقط چند قدم کے فاصلے پر وہ شخص کھڑا تھا جس کے ساتھ اسے ایک لمبا گیم کھیلنا تھا۔ وہ بارہا جگدیش راٹھور کا دیدار ٹی وی اور اخبارات میں کر چکی تھی۔ شناسا چہرہ تھا اس لیے شناخت میں لمحہ بھی نہیں لگا۔ اپنی دانست میں وہ بڑی چتر چالاک، ہوشیار اور زیرک تھی لیکن اس وقت وہ اپنے آپ کو احمق اور مورکھ تصور کر رہی تھی۔ جگدیش راٹھور کی پُروقار شخصیت کے سامنے وہ ساری تیزی طراری بھول گئی تھی۔ پنا دل اسے بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

ادھر جگدیش راٹھور کی نگاہیں جیسے ہی اس کے چہرے سے ٹکرائیں اس کی آنکھوں میں تیز چمک لہرائی۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سرگوشیانہ انداز میں سرسراتی آواز میں بولا۔ ''رچنا۔'' رنجنا اس وقت بری طرح خوف زدہ اور خائف تھی لیکن پھوپی کا نام جگدیش کی زبان سے سن کر اسے یوں محسوس ہوا کہ آدھا گیم وہ جیت چکی ہے۔ اس کی خود اعتمادی اور بے خوفی لوٹ آئی۔ بڑے مان سمان سے اس نے پرنام کیا اور جگدیش کے قدموں میں جھک گئی۔ تعظیم دے کر جب کھڑی ہوئی تو اپنا سر اپنے نقلی باپ کے سامنے جھکاتے ہوئے انتہائی لجاجت سے بولی۔

''ڈیڈی! کیا بچھڑی ہوئی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھنا بھی گوارا نہیں۔ مجھے تو صرف آپ کا آشیرواد اور دعائیں چاہئیں۔ بس ایک بار ''میری بیٹی'' کہہ کر اپنے سینے سے لگا لیں گے تو میں سمجھوں گی کہ میری ماں کی ساری تپسیا (ریاضت) پھل (کامیاب) ہوگئی۔''

جگدیش راٹھور ابھی تک ساکت کھڑا گہری نظروں سے رنجنا کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب قدرے چونک کر بولا۔ ''تم..... تم..... بالکل اپنی ماں کی کاپی ہو۔ میں تو سوچ رہا تھا اپنی بیٹی کو تلاش کرنے میں پتا نہیں مجھے کتنے سنگلوں (مشکلات) کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم خود چل کر میرے پاس آجاؤ گی۔'' یہ کہتے ہوئے جگدیش نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور اسے رہائشی حصے کی جانب لے کر بڑھا۔

یہاں بھی سیکیورٹی کا سخت انتظام تھا۔ ساری حویلی کی زیب و زینت اور شان و شوکت دیکھ کر وہ اش اش کر اٹھی۔ اپنے شرابی باپ کی حکمتِ عملی پر وہ اس وقت نازاں تھی۔ جگدیش راٹھور کا ویل ڈیکوریٹڈ ڈرائنگ روم دیکھ کر تو اس کی سانسیں بے ترتیب ہوگئیں۔ بہ وقت تمام اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جگدیش نے اس حصے میں قدم رکھتے ہی تخلیے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ اس لیے مکمل سناٹا اور خاموشی تھی۔ اس کے دماغ میں کئی سوالیہ نشان منہ اٹھائے کھڑے تھے۔ وہ ان سب سوالات کے جوابات بیٹی سے تنہائی میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی اس نے سوالوں کا آغاز کیا، رنجنا دھواں دھار انداز میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی سسکیاں، ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں جب اچھی طرح من کا غبار نکال چکی تو دل شکستہ لہجے میں بولی۔ ''ڈیڈی! ماں کو یہ سنسار چھوڑے ہوئے کافی سمے گزر گیا ہے۔ اب تو میں سب بھول بھال گئی ہوں۔ ہاں البتہ نانی اچھی طرح یاد ہیں۔ بھگوان نے انہیں بہت لمبی عمر دی تھی۔ انہوں نے ہی مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے اور پھر نانی.....'' اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی جگدیش راٹھور نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس پر ایک سنسناتا ہوا تیر چھوڑا۔ چند لمحوں کے لیے رنجنا بری طرح بوکھلا گئی پھر دل گرفتہ

لہجے میں بولی۔

''آپ نے ماما کی یاد دلا کر تو میرے دل پر قیامت ڈھا دی۔ ایک ہی ماما تھا میرا لیکن اسے بھی یہ دنیا چھوڑے ہوئے برسوں گزر گئے۔ ماں نے کبھی آپ کو ملوایا تھا ماما سے؟''

''نہیں۔'' جگدیش راٹھور نے اپنی بھاری بھرکم گونج دار آواز میں جواب دیا۔ ''البتہ تمہاری ماں اکثر اس کا ذکر کرتی رہتی تھی لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس نے کبھی بھائی کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔ نکھٹو، نکما، جواری، شرابی آدمی تھا۔ اس پر میرا ابھی ایک حساب واجب الادا تھا۔ سوچا تھا کبھی جیون میں ٹکراؤ ہوا تو ماں کا تول جواب دوں گا۔ لیکن وہ خود ہی اپنی پاپوں کی گٹھری باندھ کر روانہ ہوگیا۔''

رنجنا دل ہی دل میں دانت پیس کر رہ گئی۔ جگدیش نے اس کے باپ پر جو تبصرہ کیا تھا' ناگواری اس پر فطری امر تھا لیکن اس نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جگدیش کے ہر کڑوے بول کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی لیا۔ جگدیش نے اگلا سوال اس سے اس کی رہائش کے بارے میں کیا۔ اس سوال پر بھی رنجنا بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کو اس طرح آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے جگدیش نے دیکھا تو اپنا سوال پھر دہرایا۔

اس بار رنجنا نے ایک طویل سرد آہ بھری اور معصومیت کا ماسک لگا کر بھولپن سے بولی۔ ''ڈیڈی! میرا کوئی گھر گھاٹ نہیں ہے۔ ابھی فی الحال تو ایک ہاسٹل میں اسٹے ہے۔ جب تک نائی جیوت رہی تب تک تو زندگی کوئی مسئلہ نہیں تھی لیکن اب ان کے بنا قدم قدم پر مجھے ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

جگدیش انتہائی قیمتی صوفے پر متمکن تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹی کی پشت تھپتھپائی اور انتہائی خوش دلی سے بولا۔ ''ابھی تک جتنے بھی دکھ تم نے سہے ہیں' اس میں کچھ تمہارا نصیب شامل تھا اور کچھ میری اپنی کوتاہی تھی لیکن بہرحال اب یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ تم کہو تو میں میڈیا پر ابھی اپنا اسٹیٹ منٹ جاری کرسکتا ہوں کہ مجھے میری کھوئی ہوئی بیٹی مل گئی ہے یا پھر یوں کرتے ہیں کہ اسی ہفتے میں ایک پریس کانفرنس بلوا کر ڈکلیئر کردوں گا۔ تمہاری اپنی موجودگی بھی وہاں ضروری ہے... کیونکہ میڈیا والے یقیناً تم سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔'' یہ سن کر یکلخت رنجنا بری طرح گھبرا گئی۔ غیر معمولی احتیاط اور ہوشیاری کے باوجود وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پائی۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر جگدیش نے پیار اور شفقت بھری نظروں سے رنجنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس قسم کی گیدرنگ کی تم یقیناً عادی نہیں ہو۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا لیکن ہم دونوں کی نشستیں برابر برابر ہوں گی۔ فل ٹائم ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ تمہیں خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''او کے ڈیڈی! میں گاہے بگاہے آپ سے ملنے آتی رہوں گی لیکن ابھی میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایئے گا۔''

جگدیش راٹھور بخوشی راضی ہوگیا۔ وہ آج بے حد خوش تھا۔ اسے اس وقت رچنا بہت یاد آرہی تھی۔ جب تک رنجنا اس کے پاس بیٹھی رہی وہ بار بار اسے یہ باور کرواتا رہا کہ وہ اپنی ماں کا آئینہ ہے۔ رنجنا کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ یہ شخص آج بھی اس کی پھوپی سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ نہ اس نے کوئی باز پرس کی نہ کوئی بحث' پل ہی پل میں وہ حقیقتاً اسے اپنی اولاد مان بیٹھا۔ صرف مشابہت کی بنا پر اپنی جائداد اس کے نام کرنے والا تھا۔ مہلت صرف اس نے اس لیے مانگی تھی کہ وہ سارا حال احوال پردیپ کے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے ''مرے ہوئے ماما'' کو روپوش کروانا بھی ضروری تھا۔ اس لیے اس وقت اس نے بڑی چالاکی سے جگدیش راٹھور کی سوچ کو الٹوا میں ڈال دیا۔ وہ جس طرح ٹیکسی سے آئی تھی اسی طرح واپس بھی گئی۔ جگدیش نے کار اور ڈرائیور کی آفر بھی کی تو اس نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا۔ ناٹک میں رنگ آمیزی کی خاطر چہرے پر سوگوار کیفیت طاری کی اور ڈیڈی کہتے ہوئے جگدیش کے سینے سے جا لگی۔ اس وقت حقیقتاً اس کے دل نے یہی تمنا کی کہ کاش مرلی کے بجائے جگدیش ہی اس کا اصلی باپ ہوتا۔ راٹھور بھون سے نکلنے کے بعد وہ سارے راستے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی کہ اس کا تعاقب تو نہیں کیا جارہا ہے۔

گھر پہنچی تو مرلی کو اپنا منتظر پایا۔ رنجنا کو دیکھتے ہی تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ رنجنا بھی ایک گھاگ تھی۔ وہ چار دن تو باپ کو یہ بہلاوے دیتی رہی ''باپو' بڑے لوگوں کے دروازے اتنے بڑے اور سنگین ہوتے ہیں کہ ہم جیسے چھوٹے لوگ صرف باہر سے دیکھ سکتے ہیں۔''

مرلی ہائے کر کے رہ گیا۔ مایوس نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگا تو رنجنا نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور بولی۔ ''باپو' ایسے کام اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ مجھے اور مجھے دھیرج سے کام لینا ہوگا۔ ابھی تو ہمیں جال پھینکنا ہے۔ مگر مچھ کب پھنستا ہے یہ تو اوپر والا ہی جانے۔ بس تو روزانہ پرارتھنا کر۔ دل چھوٹا نہ کر۔ میں دو چار دن کے گیپ سے پھر راٹھور بھون کا چکر لگاؤں گی۔ بس مجھے تیرا آشیرواد چاہیے۔''

بیٹی کی امید افزا باتیں سن کر مرلی پھر سے جی اٹھا۔ و

پھر سے خوش ہو گیا اور بولا۔ ''مجھے تیرے بھاگیہ پر وشواس ہے۔ تیرے لیے بہت جلد خزانوں کے منہ کھلنے والے ہیں۔ تیری تو اب آن بان شان ہی نرالی ہوگی۔''

رنجنا نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''دھن، دولت اور سمان سب میرے چرنوں کی دھول ہے اب تو، لیکن تجھے میرے ساتھ دیکھ کر وہ بدک نہ جائے۔ اس لیے باپو تیرا کوئی نہ کوئی پربندھ (بندوبست) کرنا پڑے گا۔''

بیٹی کی بڑبڑاہٹ سن کر مرلی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''اری زور سے تو بولا کر، پتا ہے کہ میں اونچا سننے لگا ہوں۔''

رنجنا نے اپنی چارپائی پر کروٹ لیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''ارے باپو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ تیرے کان تو اب خود بخود ہی بجنے لگے ہیں۔''

مرلی زور زور سے اپنے کان جھاڑنے لگا اور رنجنا ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے کب سوئی اسے یاد نہیں۔ دوسری صبح جاگی تو موبائل کی رنگ ٹون سے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے موبائل اسکرین پر نظر ڈالی تو پردیپ کا نام نظر آیا۔ ہائے ہیلو کے بعد ملاقات کی جگہ اور وقت طے کر کے اس نے فوری ملنے کی تاکید کی۔ خود بھی بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہا دھو کر آسمانی رنگ کی کامدانی ساڑی جسم پر لپیٹی۔ موگرے، چنبیلی کا گجرا سر میں لگایا۔ اب وہ بلاشبہ اپسرا لگ رہی تھی۔

مرلی نے یوں اسے تیار ہوتے دیکھا تو مریل آواز میں بولا۔ ''اری کہاں جا رہی ہے، کچھ بتا کر تو جا۔''

رنجنا نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''اپنے دفتر جا رہی ہوں اور کہاں جاؤں گی۔''

مرلی چرس کی ترنگ میں تھا لیکن دماغ برابر کام کر رہا تھا۔ سلگتی آواز میں بولا۔ ''مور کھ لڑکی یہ چند ٹکوں کی نوکری کے لیے بھاگی بھاگی جا رہی ہے۔ ارے بھاگوان راٹھور پریوار کی بہتی گنگا تیری پرتیکشا کر رہی ہے۔ وہاں جانے کے لیے یہ ہار سنگھار کرنی تو کوئی بات بھی تھی۔ آج اس سج دھج کے بعد تو، تو بالکل رنجنا لگ رہی ہے۔ میری مان ایک چکر راٹھو بھون کا لگا لے۔ بھگوان کسم، تجھے آج جگدیش نے بیٹی کہہ کر گلے نہ لگایا تو میرے منہ پر تھوک دینا۔''

رنجنا نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے دیوار میں آویزاں آئینے میں اپنے آپ کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور پرس اٹھا کر چلتی بنی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔ پردیپ طے شدہ جگہ پر کھڑا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے یوں ملے جیسے کسی سنگم پر دو دوزیا آپس میں ٹکراتے ہیں۔ رنجنا نے پھوپی، پھوپا کی لو اسٹوری سے لے کر راٹھور بھون میں ہونے والی پچھلی میٹنگ لفظ بہ لفظ سنا دی۔ پردیپ دنگ رہ گیا۔ رنجنا نے لفظوں کے ہیر پھیر سے باپ کو بھی اس طرح پاک صاف کر دیا کہ اسے شک بھی نہیں گزرا کہ رنجنا کا باپ ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔

ساری رام لیلا سننے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا۔ ''رنجنا یہ تو کہاں مکڑی کے جال میں پھنس گئی۔ جگدیش راٹھور کوئی معمولی آدمی نہیں۔ ہمیشہ یاد رکھ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ وہ بہت جلد لنگر اہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، جونہی راٹھور کو اصل اور نقل میں فرق محسوس ہوگا، تم دونوں باپ بیٹی کے لیے زمین تنگ کر دے گا۔ تو کیا سمجھ رہی ہے، اپنے پُرکھوں کی جائداد وہ اتنی آسانی سے تیرے اور تیرے باپو کے حوالے کر دے گا؟ اس کی یہ دھن دولت کوئی پلیٹ میں رکھا ہوا حلوا نہیں ہے کہ تم لوگ ہپ ہپ کر کے کھانا شروع کر دو گے۔''

رنجنا کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ پردیپ کی نصیحتیں حالانکہ حقیقت پر مبنی تھیں لیکن اس کے لالچی باپ نے اپنی چرب زبانی سے اس کے پردہ ذہن پر یہ نقش کر دیا تھا کہ جگدیش راٹھور کا کونسا والی وارث بیٹھا ہے جو یہ جائداد اسٹیٹ سنبھالے گا۔ رچنا آخر تیری سگی پھوپی تھی۔ بس یہ ہے کہ سارا روپیا پیسا بٹورنے کے لیے ہمیں ذرا سی انگلی ٹیڑھی کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کے علاوہ باپ نے جو دھمکی اسے پردیپ کے حوالے سے دی تھی، اس سے بھی وہ بری طرح دہل گئی تھی۔ کیونکہ باپ کے عادات وخصائل سے اچھی طرح واقف تھی۔ اب جبکہ جگدیش راٹھور اس کو اپنی بیٹی مان چکا ہے۔ ساری دنیا کے سامنے سویکار کرنا چاہتا ہے۔ بلا کسی شرکت کے اپنی ساری دولت اسے سونپنا چاہتا ہے تو پھر بھلا یہ پردیپ کیوں جلا جا رہا ہے؟ اس کے ذہن نے پلٹا کھایا۔ پردیپ نے انتہائی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنا موقف بیان کر دیا تھا جبکہ رنجنا کے دل میں بال آ گیا تھا۔ فی الفور تو پردیپ کی دلداری کی خاطر بولی۔

''چلو ٹھیک ہے اگر تم اس کھٹراگ میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے، ہو تو میں بھی سارے معاملے پر مٹی ڈالتی ہوں۔ لیکن پھر تمہارا دھنوان پریوار مجھے بہو بنا لے گا۔''

پردیپ نے پُراعتماد لہجے میں جواباً کہا۔ ''میرے پیرنٹس سلجھے ہوئے مزاج کے پڑھے لکھے اور اپنی سنتان کی خوشیوں کا خیال رکھنے والے لوگ ہیں۔ وشواس کرو تمہیں دیکھتے ہی وہ ہماری شادی کے لیے مان جائیں گے۔ تم اور تمہارے پتا جو یہ شطرنج کی چال چلنے کی سوچ رہے ہو نا... تو

یقین کرو منہ کے بل گرو گے۔''

پردیپ کے لہجے میں جو خوف کی رمق تھی، وہ رنجنا نے اچھی طرح محسوس کی۔ پل بھر کے لیے اسے بھی جھرجھری آ گئی لیکن پھر فوراً ہی دولت کی چکاچوند نے پردیپ اور اس کی نصیحتوں پر پانی پھیر دیا۔ پردیپ نے جب ڈی این اے کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کڑکڑاتی بجلی اس پر گر پڑی ہو۔ سارے تکل سپنوں کے پل میں مسمار ہو گئے۔ اس معاملے پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ پردیپ سے رخصت ہو کر اسی دہشت کے عالم میں جب وہ گھر پہنچی تو مرلی اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بیٹی کو دیکھتے ہی اس نے ہانک لگائی۔

''اری اور رنجنا کوئی توشبھ سماچار سنا۔''

رنجنا پہلے ہی ذہنی طور پر پریشان تھی۔ باپ کے جملے نے تازیانے کا کام کیا اور سارا غصہ باپ پر انڈیل دیا۔ اس نے بھی چلا کر جواب دیا۔ ''باپو! یہ وگیان (سائنس) کا دور ہے۔ اگر راٹھور نے میرے ڈی این اے کی ڈیمانڈ کر دی تو پھر سمجھ لے ہتھکڑیاں تیرے بھی ہاتھوں میں ہوں گی اور..... میں..... میں بھی کب بچوں گی۔ راٹھور ہم دونوں کو کچا چبا جائے گا۔''

مرلی کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے لیکن ہوش وحواس ٹھکانے پر تھے۔ بیٹی کا موڈ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ پریشان ہے۔ اس لیے اس وقت خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ دوسرے دن اس نے آہستگی کے ساتھ بیٹی سے استفسار کیا۔ ''رنجنا! تو کل انگریزی میں کیا گٹ پٹ کر رہی تھی۔ مجھے ذرا سمجھا دے میری پتر۔''

رنجنا بذاتِ خود پُر پیچ خیالوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر بولی۔ ''باپو کیا کہہ رہا ہے تو میں سمجھ نہیں پائی۔''

مرلی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ رنجنا نے ایک طویل سرد آہ بھری اور بولی۔ ''باپو! یہ ڈی این اے ہر پرانی (جاندار) کے شریر (جسم) میں ہوتا ہے۔ اس سے ایک پیڑی (نسل) سے دوسری پیڑی کی جان کاری (معلومات) ٹرانسفر ہوتی ہے۔ یہ منش کے شریر کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی لیبارٹری میں میرا ڈی این اے ہو گا، فوراً پتا چل جائے گا کہ میں جگدیش راٹھور کی بیٹی نہیں ہوں۔ دراصل یہ سب وگیان کا چمتکار (معجزہ) ہے۔ کون کس کی اولاد ہے اور اس کا..... کس پریوار سے سمبندھ ہے، اب کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہ سکتا۔''

یہ سب سن کر مرلی منوہر کی بولتی بند ہو گئی۔ آنکھوں میں چند دنوں سے جو حریصانہ چمک ناچ رہی تھی، وہ یکا یک ماند پڑ گئی۔ کچھ دیر تک تو الجھن آمیز نظروں سے بیٹی کو دیکھتا رہا پھر ذرا کھنکھارا اور بولا۔ ''ارے میری جان تو راٹھور کے سامنے تو جا۔ ماں کسم، تجھے دیکھ کر رچنا کی یادوں میں ایسا ڈوبے گا کہ اسے ابھرنا یاد ہی نہیں رہے گا۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے دونوں ٹوٹ کر چاہتے تھے ایک دوجے کو۔ تجھے دیکھ کر تو اسے نہ کوئی لیبارٹری یاد رہے گی اور نہ ہی کوئی ڈی این اے یاد رہے گا۔ تو میری مان اپنی کوشش جاری رکھ جیسے ہی ساری دولت ہماری مٹھی میں آتی ہے، اس کے بعد اس کا سب کچھ تو یہاں رہے گا مگر راٹھور نہیں رہے گا۔''

''باپو۔'' رنجنا زور سے چلائی۔ ''مت کیا کر ایسی باتیں۔ تو اپنی پاپ کی ناؤ سمیت خود بھی ڈوبے گا اور مجھے بھی لے ڈوبے گا۔ اتنا یاد رکھ باپو لنکا ڈھانے میں سب سے بڑا ہاتھ راون کے بھائی کا ہی تھا۔ اسی طرح میں بھی تیری ساری شاطرانہ چالوں کو ایک منٹ میں تہس نہس کر سکتی ہوں۔ جگدیش راٹھور کو اصل کہانی سنا دی نا... تو وہ تیرا نام ونشان ہی مٹا دے گا۔ اس طرح میری دادی، پھوپی اور ماں کی آتماؤں کو بھی شانتی مل جائے گی۔''

بیٹی کے خیالات اور اس کا منصوبہ سن کر مرلی کے بدن میں تھرتھراہٹ شروع ہو گئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔ چند روز دبے پاؤں گزر گئے۔ مرلی کی حرص وہوس نے پھر انگڑائی لی۔ کیونکہ اب وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا تھا۔ رنجنا نے بالکل ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ شراب نہ ملنے کی وجہ سے تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹی کے پیروں پر گر کر کئی دفعہ معافی تلافی کا ڈراما رچا چکا تھا۔ جیسے ہی رنجنا نرم پڑی اس نے پھر بیٹی کا برین واش کیا اور اسے یقین دلایا کہ راٹھور کا سارا مال پیسا صرف اور صرف اسی کا ہے۔ رنجنا نے بھی سارا ڈر، خوف اور وسوسے اپنے دل سے نکال پھینکے۔ اب اس کے قدم پھر راٹھور انٹر پرائز کی طرف اٹھ رہے تھے لیکن راٹھور اس روز شہر میں ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ فوراً ہی پلٹ گئی۔

☆☆☆

آنند سنہا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اپنے باپ مہندر سنہا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ڈیڈی جس لڑکی کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وہ میرے ساتھ آئی ہے۔ آپ ملنا پسند کریں گے۔''

ایڈووکیٹ مہندر سنہا نے اپنے مخصوص انداز میں ایک زوردار... قہقہہ لگایا اور خوشگوار لہجے میں بولے۔ ''ارے برخوردار، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اپنی ہونے والی بہو کو

ہم نہیں دیکھیں گے تو کون دیکھے گا۔ جلدی سے بلاؤ بھئی اس لڑکی کو آخر ہم بھی دیکھیں تمہاری پسند ہے کیسی۔''

آنند نے وہیں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ ''سنجنا اندر آجاؤ۔ ڈیڈی تمہارے منتظر ہیں۔''

حسین، شوخ سنجنا شرمائی لجائی اپنی ساڑی کا پلو سینے اور شانے پر درست کرتی ہوئی متوازن قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور مہندر سنہا کے قدموں میں جھک گئی اور جب کھڑی ہو کر اس نے پرنام کیا تو مہندر سنہا آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جسم کا سارا خون نچڑ کر چہرے پر عود کر آیا ہو۔ چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر آنند نے بے اختیار سوال کیا۔ ''ڈیڈی! کیا بات ہے سنجنا کو دیکھ کر آپ یوں چونکے جیسے اس سے پہلے بھی مل چکے ہوں؟''

مہندر سنہا نے بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور ایک کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔ ''ارے بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر بات ختم کر دی پھر سنجنا سے رسمی گفتگو کرتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا دل و دماغ کسی اور مسئلے میں الجھا ہوا اور مہمان کو وقت دے کر فارمیلٹی پوری کر رہے ہوں۔ اضطراری طور پر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ بالآخر ان سے رہا نہیں گیا اور کریدنے والے انداز میں سنجنا سے سوالات شروع کر دیے۔ آنند نے شرارتی نگاہوں سے سنجنا کو دیکھا اور شگفتہ لہجے میں بولا۔

''سنجنا! سنبھل جاؤ، اب یہ سمجھو کہ تم عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہو۔ جرح کرنے میں میری ڈیڈی کا کوئی ثانی نہیں۔ اب تو یہ تمہاری پیڑھی اور نسل کی ساری جان کاری لے کر رہیں گے تو ڈیڈی سے نمٹو میں رامو کاکا سے ریفریشمنٹ کا کہہ آؤں۔'' یہ کہہ کر آنند وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سنجنا اس کی بات سن کر ہلدی کی گانٹھ بن گئی ہے۔ وہ بری طرح نروس اور خوف زدہ تھی جبکہ مہندر سنہا غائر نظروں سے اس کا جائزہ بھی لے رہے تھے اور اس سے پوچھ گچھ بھی کر رہے تھے۔ سنجنا جوابات غیر معمولی احتیاط کے ساتھ دے رہی تھی اور گھبرائی ہوئی نگاہوں سے بار بار اس دروازے کو تک رہی تھی جہاں سے آنند کی آمد متوقع تھی۔ جوں ہی آنند واپس آیا وہ یکلخت اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور معذرت خواہانہ انداز میں مہندر سنہا سے بولی۔

''انکل! اجازت چاہتی ہوں۔ اچانک ایک ضروری کام یاد آگیا۔''

آنند نے حیران کن نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''ارے یہ کیا بات ہوئی تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ ڈنر تم میرے اور ڈیڈی کے ساتھ کرو گی۔''

سنجنا نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے جواباً کہا۔ ''مجھے اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن ابھی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جانے کے لیے جوں ہی قدم بڑھائے، آنند بھی ساتھ ہو لیا۔

مہندر سنہا دونوں کو جاتا دیکھتے رہے لیکن چہرے پر گہری تشویش اور تذبذب کے آثار تھے۔ دونوں کے جاتے ہی اپنا موبائل اٹھایا اور نمبر پنچ کیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی پُرجوش آواز میں بولے۔ ''جگدیش ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لیے۔ تمہاری جس بیٹی کو تم ابھی تک نہیں دیکھ پائے، وہ ابھی ابھی مجھ سے مل کر گئی ہے اور یقین کرو مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ بالکل رچنا بھابی کی کاپی ہے۔ تم دیکھو گے تو پلکیں جھپکانا ہی بھول جاؤ گے اور میرے دوست، مجھے ایک اور بھی سرپرائز دینا ہے تمہیں۔ بہت جلد ہماری دوستی رشتے داری میں تبدیل ہونے والی ہے۔ اب یقیناً تم پوچھو گے.....'' مہندر سنہا کی بات منہ کی منہ میں ہی رہ گئی۔

جگدیش راٹھور نے بات کاٹتے ہوئے پُرتجسس لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں رنجنا سے مل چکا ہوں۔ یہ بات بھی تم درست کہہ رہے ہو کہ وہ رچنا کی ہم شکل ہے لیکن وہ تم تک پہنچی کس طرح۔'' اب چونکنے کی باری مہندر سنہا کی تھی۔

وہ ہڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''رنجنا کون؟ میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ مجھے تو آج آنند نے اپنی ایک گرل فرینڈ سے ملوایا ہے جس کا نام سنجنا راٹھور ہے۔ ماں کا نام رچنا اور باپ کا نام جگدیش راٹھور بتایا ہے۔ اس کا بچپن ہی تھا جب ماں کا دیہانت ہو گیا۔ نانی نے اس کی پرورش کی لیکن اب نانی بھی سورگباشی ہو چکی ہے۔ تن تنہا کسی ہاسٹل میں رہتی ہے۔ آنند سے کس طرح ٹکرائی اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ بہرحال اب دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

مہندر سنہا نے جوں ہی اپنی بات پوری کی جگدیش نے ایک گہری سانس خارج کی اور پُرتفکر لہجے میں بولا۔ ''مہندر! میں اس وقت دلی میں ہوں۔ ایک اہم دفتری میٹنگ کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ واپسی تو مجھے دو روز بعد کرنا تھی لیکن جو معاملہ آن پڑا ہے اسے سلجھانا بھی ضروری ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک لڑکی مجھ سے ملتی ہے جو کہ اپنے آپ کو میری اور رچنا کی بیٹی ظاہر کرتی ہے۔ شکل بھی رچنا کی پرچھائیں ہے اور اس کی ہسٹری بھی سنجنا نامی لڑکی سے ملتی جلتی ہے۔ بہرحال فون پر تو میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں آج رات کی فلائٹ سے ہی

نکل رہا ہوں۔ کل سویرے ناشتا تمہارے ساتھ کروں گا اور ہم یہ سارا معاملہ ڈسکس کریں گے۔''

او کے کہتے ہوئے مہندر سنہا نے موبائل آف کردیا۔

☆☆☆

دوسری صبح جگدیش اور مہندر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ناشتا بھی کررہے تھے اور باہمی مشاورت بھی جاری تھی۔ جگدیش نے آخری نوالہ لیتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مہندر! میری پوری لائف تمہارے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میرا اور تمہارا بچپن کا ساتھ ہے۔ میں اپنی ہر خوشی اور غم تم سے ہی شیئر کرتا ہوں۔ تم سے میری کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے اور پھر.....؟''

مہندر نے درمیان میں جملہ اچک لیا اور بولا۔ ''زندگی کی سب سے بڑی خوشی یعنی شادی میں تم نے مجھے انوائٹ نہیں کیا۔ اس کا مجھے آج بھی شکوہ ہے۔ رچنا بھابی کو دلہن کے روپ میں دیکھ ہی نہیں پایا۔''

جگدیش کے چہرے پر ایک کربناک مسکراہٹ ابھری اور فوراً معدوم ہوگئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولا۔ ''مہندر تمہاری ناراضگی میں تو ہر بات ہے کہ اس وقت گھر اور باہر دونوں جگہ ہوا میرے مخالف چل رہی تھی۔ میرے پتا کا کرتا ہوا بزنس سنبھالنا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ تمام کارخانے اور فیکٹریوں پر تالے لگ چکے تھے۔ پتا جی دل کے عارضے میں مبتلا تھے جب ان پر دل کا پہلا دورہ پڑا اسی وقت ڈاکٹر نے مجھے وارن کردیا تھا کہ آپ انہیں باہر لے جائیں اور احتیاط کریں کہ نہ کوئی خوشی کی خبر انہیں فوراً سنائیں اور نہ کوئی غمناک بات ان کی سماعت سے ٹکرائے۔ اسی لیے میں نے اپنی اور رچنا کی پریم کہانی کو مخفیہ رکھا۔ ہاں البتہ ماں کو بتادیا تھا لیکن ماں رچنا کو بہو بنانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئیں کیونکہ میں اور میرے ماں باپ خالص برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جبکہ رچنا کی ماں کایستھ اور باپ شودر تھے۔ ماں کو میں نے اور میری بڑی بہن نے بہت سمجھایا لیکن ماں اپنی بات پر اڑی رہی۔ پھر دیدی نے مجھے اشارہ کیا کہ تم ماں کی نہیں مانو، چونکہ زندگی تمہیں گزارنی ہے اس لیے رچنا سے شادی کرلو اور میں نے یہی کیا۔ ہم دونوں نے خاموش سے شادی کرلی اسی دوران پتا جی کی اچانک طبیعت خراب ہوئی اور میں افراتفری میں پتا جی کو لے کر امریکا چلا گیا۔ چونکہ رچنا پریگننٹ ہوچکی تھی اس لیے وہ بہت پریشان تھی کہ اب دنیا والوں کو اور اپنے میکے والوں کو کیا جواب دے گی۔ کیونکہ وہ ابھی تک سب کے لیے کنواری کنیا تھی۔ اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں نے رچنا کو اپنی دیدی کے پاس چھوڑا۔ دیدی بے اولاد بھی تھی اور ودھوا تھی، اس لیے اپنے گھر میں تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ گھر میں سوائے ایک ملازمہ کے اور کوئی نہیں تھا۔ رچنا نے اپنا ہمراز اپنی ماں کو بنایا اور وہاں سے نکل کھڑی ہوئی اور میری دیدی کے ساتھ رہنے لگی۔ میں نے بزنس اور کاروبار کے سارے معاملات اپنے منیجر اشوک کو سونپے اور یہاں سے چلا گیا۔ ڈیڈی کا علاج جاری تھا کہ دیدی کے ذریعے مجھے خبر ملی کہ میں ایک خوب صورت بچی کا باپ بن چکا ہوں۔ میں بہت خوش تھا لیکن میری خوشی کو پتا جی کی موت کھا گئی۔ اسی دوران دیدی کے ایک خط نے میری ساری دنیا اتھل پتھل کردی۔ دیدی نے مجھے لکھا تھا کہ تمہاری بیوی اور بیٹی کو لینے کے لیے ایک شخص آیا تھا۔ وہ اپنا نام مرلی منوہر بتا رہا تھا اور اس نے رچنا کو بتایا کہ اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ ماں آخری بار اس سے ملنا چاہتی ہے۔ یہ سن کر رچنا پاگل ہوگئی۔ ذہنی طور پر وہ اتنی شاکڈ تھی کہ کوئی اتا پتا بتائے بغیر بچی کو گود میں لے کر بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ اب مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں گئی اور کس حال میں ہے۔ ان سب حالات کے پیشِ نظر میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ مجھے فوری ہندوستان جانا چاہیے۔ ادھر ماں بھی مجھ سے ملنے کے لیے جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دیدی بھی میری راہ تک رہی تھی۔ میں نے یہاں آتے ہی رچنا اور اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پتا جی کا جو بزنس خسارے میں چلا گیا تھا، اپنی محنت سے اسے پھر زندہ کیا۔ میری انتھک اور جان لیوا محنت سے بزنس پھر سانس لینے لگا لیکن میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی کہ مجھے اپنی بیوی اور بیٹی پھر نہیں مل سکے۔ دولت، عزت اور شہرت میرے قدم چوم رہے تھے لیکن میں اندر سے بالکل خالی تھا۔ میری زندگی کا سناٹا میرے دل کی تنہائیاں مجھے کھائے جارہی تھیں۔

''دیدی اشاروں کنایوں میں ماں کو سب کچھ بتا چکی تھی۔ ماں نے مجھ پر پریشر ڈالنا شروع کیا اور پھر میری شادی ترشنا سے کروادی۔ میں چونکہ اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس شادی میں بھی اپنے کسی دوست یا شناسا کو مدعو نہیں کیا۔ تمہاری شکایت غلط نہیں ہے۔ سچ مانو مہندر دوسری شادی کرکے بھی مجھے خوشی اور سکون نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ ترشنا بہت اچھی پتنی ثابت ہوئی لیکن میں اس کے ساتھ انصاف نہ کرسکا۔ اسے وہ محبت نہ دے سکا جو اس کا حق، اس کا ادھیکار تھا۔ وہ میرے پاسٹ سے بھی آگاہ تھی لیکن شکایت کا کوئی شبد اپنی زبان پر نہیں لائی۔ بلکہ اس کی اپنی بڑی خواہش تھی کہ

میری بیٹی مجھے مل جائے تاکہ بے اولادی کا ٹھپا جو میرے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ مٹ جائے۔ وہ ہر پریشانی، ہر کشمکش میں میری ہم قدم بن کر میرے ساتھ چلی لیکن پھر کینسر کی موذی بیماری نے اسے ہمیں کا نہیں چھوڑا۔ میں نے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن میری ماں کے بعد وہ بھی بہت جلد میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے بعد دیدی بھی پرلوک سدھاری۔ اب تو مہندر اکثر میں یہ سوچتا ہوں کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں۔ بارہا ایسے سوالات پر رونا آیا لیکن پھر اچانک میرے لیے ایک امید کی کرن جگمگائی۔ میں اس روز بہت خوش تھا۔ ٹی وی اور اخبارات نے جیسے ہی اس خبر کی تشہیر کی کہ میں سیاست سے ریٹائر ہو رہا ہوں اور اپنی بیٹی کی کھوج میں ہوں تاکہ ساری دھن دولت اس کے نام کر کے خود آرام کی نیند سو سکوں، اس خبر کو سنتے ہی رنجنا میرے دروازے تک پہنچ گئی۔ اسے دیکھتے ہی میں دنگ رہ گیا۔ رچنا میں اور اس میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ رنجنا کے مشورے پر ہی یہ بات ابھی تک میں نے ڈکلیئر نہیں کی۔ شاید اگر وہ نہ روکتی تو میں اپنے وکیل اور پریس کانفرنس بلوا کر سب کے سامنے رنجنا کو اپنی بیٹی گھوشت کرتے ہوئے قانونی طور پر اپنی ساری سمپتی اس کے نام کر چکا ہوتا لیکن اچانک تمہارے فون نے میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ رنجنا میری بیٹی ہے یا سنجنا۔ میری قوتِ فیصلہ تو جواب دے چکی۔''

مہندر سنہا نے ایک گہری استہزائیہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''سائنٹیفک دور میں جی رہے ہو اور اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ ارے جس لڑکی کا بھی ڈی این اے تم سے میچ ہو گیا سمجھو وہی تمہاری بیٹی ہے۔''

جگدیش نے متذبذب نگاہوں سے دوست کی جانب دیکھا اور متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کام میں کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں پچھلے کئی برسوں سے سیاست سے وابستہ رہا ہوں۔ اس فیلڈ سے جڑنے کے بعد ہماری اپنی کوئی پرائیویسی نہیں رہ جاتی۔ میڈیا کے ہاتھ ایک چٹخارے دار موضوع ہاتھ آئے گا۔ اس لیے ہم لوگ سانس بھی لیتے ہیں تو چوکنا چوکس رہتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہیں۔ نہیں مہندر مجھے محتاط رہ کر جانچ پڑتال کرنا ہوگی۔ بحیثیت دوست تم ہی مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔ یقیناً اس سارے کھیل کے پیچھے کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے میری پتنی رچنا اور میری بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہے اور میری دولت پر رال ٹپکائے بیٹھا ہے۔ اس ساری سازش کا کرتا دھرتا ہے کون؟ اب مجھے یہ جاننا ہے۔''

''ہوں۔'' مہندر سنہا نے ایک پُرجوش ہنکارا بھرا اور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اگر تم بُرا نہ مانو تو آنند کے ساتھ اس مسئلے کو شیئر کروں۔ وہ سنجنا کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ ضرور سنجنا سے اگلوانے کی کوشش کرے گا۔''

جگدیش نے بجائے کسی بحث و تکرار کے مہندر سنہا کو کھلی چھوٹ دے دی لیکن ساتھ ہی سختی کے ساتھ یہ بھی ہدایت کی کہ آنند سارا معاملہ اپنے تک محدود رکھے۔

اسی رات مہندر سنہا نے ڈنر کے بعد آنند کو اپنے کمرے میں بلا کر اس ساری کہانی کو مختصراً اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بیٹے سے مشورہ طلب کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، تاکہ اصل اور نقل کا پتا چل سکے۔ آنند کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ وہ نہایت ذہین، محنتی اور فرض شناس آفیسر تھا۔ بہت قلیل عرصے میں اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت اس نے اس محکمے میں اپنا مقام بنایا اور اس وقت وہ ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ مہندر سنہا بذاتِ خود ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ ریٹائرڈ ایڈووکیٹ تھے لیکن کسی پیچیدہ یا اہم مسئلے پر بیٹے سے مشاورت ضرور کرتے۔ آج بھی انہوں نے وہی کیا۔ آنند نے باپ کی بات نہایت توجہ اور انہماک سے سنی۔ اپنی سوجھ بوجھ کو بروئے کار لاتے ہوئے باپ سے کچھ سوالات بھی کیے، مکمل رازداری کا وعدہ بھی کیا اور پھر اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈی مجھے تھوڑی..... مہلت دیجیے معاملہ غور طلب ہے۔ میں کل آپ کو اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور بتاؤں گا۔ بلکہ ڈائریکٹ انکل جگدیش سے ہی بات کرلوں گا۔''

مہندر سنہا نے بیٹے کو ستائشی اور محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''اوکے مائی سن گڈ نائٹ، جاؤ آرام کرو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بھی اپنے بیڈ پر دراز ہو گئے۔

☆☆☆

جگدیش راٹھور کی محل نما کوٹھی پر رنجنا وقفے وقفے سے آتی رہی۔ جگدیش نے اپنے رویّے سے بھی اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ سارے معاملے نے کیا بل کھایا ہے۔ کس طرح ساری کہانی پٹری بدل کر کسی اور راستے پر نکل آئی۔ اس نے اپنے آپ کو حتی المقدور نارمل رکھا۔ رنجنا اس خوش فہمی میں رہی کہ جگدیش اس کے دامِ فریب میں مکمل طور پر پھنس چکا ہے۔ دشمن کو کمزور اور احمق سمجھنا ہی سب سے بڑی حماقت اور نادانی ہے۔ اب وہ مسلسل جگدیش پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ پراپرٹی اس کے نام ٹرانسفر کرنے کے بعد وہ ساری دنیا کے سامنے اسے اپنی بیٹی

تسلیم کرلیں لیکن جگدیش ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ رنجنا فوراً چوکنا ہوگئی اور اس نے اپنی رہائش ایک وومن ہاسٹل میں منتقل کرلی۔ باپ کو اچھی طرح سمجھا کر عارضی طور پر اس نے وہاں سے ہٹنے میں ہی بہتری جانی۔ ڈانٹ ڈپٹ کر باپ کو بھی خبردار کردیا تھا کہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ہمارا پلان بری طرح فلاپ ہوجائے گا۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب جگدیش پوری طرح چنگل میں آگیا تھا اور قانوناً اپنی بیٹی مان کر سارے مالکانہ حقوق اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار تھا لیکن مرلی اس کی جان کے ساتھ کانٹے کی طرح لگا ہوا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اتنی بڑی خوشی وہ ہضم نہ کرسکے گا اور سارے سنسار میں ڈھول بجا بجا کر بتائے گا کہ اب وہ دھنوان بن گیا ہے اور پھر جگدیش فوراً ایکشن میں آجائے گا۔ اس سے آگے سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی۔

اس کی روم پارٹنر روپا بہت دیر سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس نے اس کے قریب آکر اس کا کندھا ہلایا اور بولی۔

''کیا بات ہے، کون سے خیالات میں گم ہو۔''

رنجنا ہڑبڑا کر چونکی اور خفیف سا ہنستے ہوئے بولی۔

''ہم دفتر میں کام کرنے والی عورتوں کو بھی کتنے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی بولی بولتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ آج میرے ساتھ بھی ایک مہاشئے کی تو تو، میں میں ہوگئی۔ بس اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

روپا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''اوہو، میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ تم اتنی سیریس بیٹھی تھیں کہ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چلو باہر چلتے ہیں۔'' روپا اسے کھینچ کر کمرے سے لے گئی۔

☆☆☆

جگدیش راٹھور بے تابی دل کے ساتھ آنند کی کال کا منتظر تھا۔ کیونکہ مہندر سنہا اسے پہلے ہی مطلع کرچکا تھا کہ اس مسئلے پر آنند کل رات تم سے گفتگو کرے گا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا اس کا موبائل گنگنایا اور اس نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور اسکرین پر آنند کا نام دیکھ کر نہایت خوش دلی سے ہیلو کہا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کی رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر جگدیش فوراً اسے اصل موضوع پر لے آیا۔ آنند نے بھی اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے بات کو طول نہیں دیا، نہ کسی ہیر پھیر سے کام لیا۔ نہایت صاف گوئی اور اختصار سے کام لیتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

''انکل! ہم پولیس والے مجرموں سے ان کا جرم اگلوانے کے لیے ایک کرمنل ٹرم استعمال کرتے ہیں جسے ''دستک'' کہتے ہیں۔ مجرم کو باتوں میں اس طرح الجھاتے ہیں اور اس سے ایسے کاٹ دار اور چبھتے ہوئے سوالات کرتے ہیں کہ جواب دینا اسے لازمی ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ باتوں ہی باتوں میں کوئی ایسا راز اگل دیتا ہے جہاں وہ گرفت میں آجاتا ہے۔ اب یہ سب کچھ آپ پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ کو رنجنا اور سنجنا سے کس طرح اگلوانا ہے کہ دونوں کی حقیقت کیا ہے۔''

جگدیش نے پورے انہماک کے ساتھ آنند کی بات سنی اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''آنند تم تو ایک پولیس آفیسر ہو۔ کیا یہ کام تم نہیں کرسکتے؟''

آنند پوری قطعیت سے بولا۔ ''نہیں، ہرگز نہیں۔ نہ میں، نہ ڈیڈی۔ یہ کام صرف اور صرف آپ کو ہی کرنا ہے۔ کیونکہ دونوں میں سے جو بھی لڑکی آپ کی بیٹی ہے، وہ یقیناً رنجنا آنٹی کے قریب ضرور رہی ہوگی اور ماں اپنی اولاد سے اپنا کوئی ایسا راز ضرور شیئر کرتی ہے جس کا علم صرف اسے اور اس کے شوہر کو ہوتا ہے۔ آپ دوران گفتگو جیسے ہی کوئی اہم سوال کریں گے وہ دستک بن کر آپ کی بیٹی کے ذہن سے ٹکرائے گا اور وہ کھل کر آپ کے سامنے آجائے گی جبکہ جولڑکی جعلسازی کررہی ہے اس کی بھی قلعی کھل جائے گی۔ رنجنا تو آپ کے پاس آتی رہتی ہے پہلے آپ اس کا امتحان لیں۔ سنجنا سے ملاقات کا بندوبست میں کروادوں گا۔ انکوائری کمیشن اتنا سخت ہونا چاہیے کہ دونوں کو کہیں سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ اگر آپ صحیح طور پر دستک دینے میں کامیاب رہے تو نتیجہ آپ کی توقع کے عین مطابق ہوگا۔''

جگدیش راٹھور نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بات ختم کی اور موبائل رکھ دیا۔ اس کے چہرے... یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ کافی دیر تک وہ اس مسئلے پر سوچتا رہا پھر اس نے آنند کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو اختیار کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا۔

☆☆☆

جگدیش اپنے آفس میں اپنی مخصوص سیٹ پر متمکن تھا۔ رنجنا اس کے سامنے بیٹھی مسرت کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ چشم تصور سے اپنے آپ کو اس کرسی پر دیکھ رہی تھی جس پر جگدیش براجمان تھا۔ اس کی محویت اس وقت ٹوٹی جب جگدیش نے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''رنجنا ڈنر ہم آج باہر لیں گے۔ آر یو ریڈی مائی ڈاٹر؟''

''اوکے ڈیڈی۔'' رنجنا نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ آج وہ بہت خوش تھی کیونکہ وہ اب پتی جگدیش راٹھور کے ساتھ پہلی بار اس کی اپنی کار میں بیٹھ کر اس کی سنگت میں کھانا کھانے جارہی تھی۔ ہوٹل میں قدم رکھتے ہی اس پر نشہ

سا چھا گیا۔ زباں گنگ ہوگئی جبکہ جگدیش نے مینیو کارڈ اس کی جانب سرکاتے ہوئے اس کی پسند پوچھی لیکن اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ اپنی پسندیدہ ڈشز بتاتی۔ بہ مشکل اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا۔ ''ڈیڈی! آج کھانا میں آپ کی پسند کا کھاؤں گی۔ آپ کو جو منگوانا ہے اس کا آرڈر دے دیجیے۔''

کھانے کے دوران جگدیش کھا کم رہا تھا، بیٹی پر اپنا لاڈ دلار زیادہ نچھاور کررہا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے ہر چیز پہلے رنجنا کی پلیٹ میں نکالتا بعد میں خود لیتا۔ اس خاطر تواضع پر رنجنا کھلی جارہی تھی۔ وہ حقیقتاً اپنے آپ کو جگدیش کی بیٹی تصور کررہی تھی۔

جگدیش نے آئند کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے عجلت آمیزی سے کام نہیں لیا۔ کھانا کھانے کے بعد کافی پیتے..... ہوئے رنجنا کی جانب استفسارانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''رنجنا میری بچی تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری ماں کی موت کس طرح ہوئی؟ اس کے آخری دن کہاں اور کیسے گزرے؟ مجھے تو بس اس کی موت کی خبر ملی تھی۔ میرے یہاں سے جانے کے بعد اس پر کیا بیتی، اس بارے میں، میں بالکل لاعلم ہوں۔''

سوال اچانک اور غیر متوقع تھا۔ رنجنا یکلخت یوں گھبرائی جیسے جنگل میں شکاری کو دیکھ کر چرند پرند گھبراتے ہیں لیکن اپنی گھبراہٹ کو فوراً ایک جبری مسکراہٹ میں چھپا لیا اور بولی۔ ''دراصل ڈیڈی، ماما نے میری ماں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے اسے سن کر تو شاید پتھر بھی رو پڑے۔ ماں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ آنٹی ساوتری کے گھر سے بغیر کچھ بتائے وہاں سے نکل پڑی۔ ماما نے اپنے گھر لے جا کر اتنی کڑی نگرانی میں رکھا کہ وہ آپ کو یا ساوتری آنٹی کو وہاں سے فون بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان ہی دنوں میں پیدا ہوئی۔ اب ماما میرا دشمن بن گیا۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے میری نانی سمجھ گئیں کہ وہ ایک دن بہن اور بھانجی کو مار ڈالے گا۔ بس نانی کے کہنے پر ماں نے مجھے بغل میں دبایا اور تینوں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں اور پھر.....''

جگدیش راٹھور نے قطع کلامی کرتے ہوئے پھر سوال داغ دیا۔ ''رچنا نے دیدی کو فون کیوں نہیں کیا۔ مرلی کی قید سے نکلنے کے بعد تو وہ آزاد تھی؟''

رنجنا کی انسانہ طرازی اچانک تذبذب کا شکار ہوگئی لیکن پھر فوراً ہی سنبھالا لیا اور بولی۔ ''ڈیڈی دراصل ساوتری آنٹی کی زبان بہت چلتی تھی۔ وہ ماں کو دن رات ایسی ایسی بولیاں بولتیں کہ ان کے گھر رہنا بھی ماں کے لیے اجیرن ہو گیا تھا۔ آخر کب تک واہی تباہی سنتیں۔''

جگدیش راٹھور نے بری طرح چونکتے ہوئے استعجاب انگیز لہجے میں بولا۔ ''کیا..... کیا..... کیا کہہ رہی ہو تم؟ دیدی، رچنا کو برا بھلا کہتی تھیں؟''

رنجنا نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہاں ڈیڈی یہ بات مجھے ماں نے خود بتائی تھی کہ آنٹی ساوتری بہت تیز و تند مزاج کی عورت تھیں اور چونکہ آپ کی لو میرج تھی اس لیے وہ ماں کو پسند نہیں کرتیں اور اپنی قینچی کی طرح چلنے والی زبان سے ماں کو ٹارچر کرتی تھیں۔''

جگدیش نے کافی کا خالی مگ میز پر پٹخا۔ بیرے کو بھاری ٹپ دی۔ بل ادا کیا اور رنجنا سے کرخت لہجے میں بولا۔ ''چلو اٹھو۔'' جگدیش کے چہرے کے بدلتے رنگوں نے رنجنا کو خبردار کردیا تھا کہ اس کا کھیل بگڑ چکا ہے اور اس کا دشمن بے خبر اور بے وقوف نہیں ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اس ساری گفتگو میں اس نے کہاں دھوکا کھایا ہے۔ وہ ان ہی پریشان سوچوں میں غلطاں تھی کہ جگدیش اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی رنجنا بھی بکھری بکھری سی اس کے ساتھ چلتی رہی جبکہ جگدیش متوازن قدموں سے چل رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں تیز چمک لہرا رہی تھی۔ باہر آکر اس نے رنجنا سے بغیر کسی پس و پیش کے انتہائی روکھے انداز میں کہا۔ ''تم کسی رکشے یا ٹیکسی سے جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ مجھے اپنے ایک فرینڈ سے ملاقات کرنی ہے۔''

رنجنا نے مغموم انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور ٹیکسی کی تلاش میں سڑک کے کنارے آن کھڑی ہوئی۔

جگدیش راٹھور اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی قیمتی گاڑی میں بیٹھا اور ڈرائیور برق رفتاری سے گاڑی لے اڑا۔ رنجنا کی عقل میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اچانک جگدیش کے برتاؤ میں اکھڑ پن، کرختگی اور اشتعال کیوں آگیا۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی لیکن یہ پہیلی وہ بوجھ نہیں پا رہی تھی۔ ان ہی سوچوں میں مستغرق تھی کہ اس کے قریب ایک رکشا آکر رکا۔ رکشے میں بیٹھ کر اس نے جو پتا بتایا وہ اس کے اپنے گھر کا تھا۔ کیونکہ یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ ناٹک اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے اور اس نے منہ کی کھائی ہے۔ اس لیے اب ہاسٹل میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ پھر سے غریبی اور تنگدستی کی دلدل میں اترنے کا جاں گسل احساس اسے مارے ڈال رہا تھا پوری طاقت سے اس نے اپنے پھیپھڑوں سے سانس خارج کی اور آنکھوں کی نمی کو ٹشو پیپر سے صاف کرنے لگی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی مرلی نے اس پر سوالات

کی بوچھاڑ کر دی۔

رنجنا کا ذہن سن ہو رہا تھا۔ اس لیے ہاں ہوں کہہ کر ٹالتی رہی لیکن مرلی جیسا گھاگ اور مکار فوراً سمجھ گیا کہ آج اس طرح اچانک رنجنا کی آمد خالی از علت نہیں۔ بیٹی کا اداس اور پھٹکار زدہ چہرہ ایک نئی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ تو خوش خبری کا منتظر تھا کہ بیٹی آتے ہی اس سے لپٹ جائے گی اور کہے گی۔ ”باپو! ہمارے بُرے دن گزر گئے اب ہم ہیں اور جگدیش راٹھور کی نہ ختم ہونے والی دولت کا سمندر ہے۔“ بیٹی کا اس نے اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑا جب تک رنجنا نے جگدیش اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ باپ کے کانوں میں نہیں انڈیل دیا۔

جب رنجنا اس جملے پر پہنچی۔ ”آنٹی ساوتری کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور طعنے بازی کر کے اس نے ماں کا جینا حرام کر دیا تھا۔“

تو یکا یک زمین پر لیٹا ہوا مرلی سیدھا کھڑا ہو گیا اور حلق کے بل چیخا۔ ”اری کم بخت، نصیبوں جلی، عقل کی اندھی، کیا تیری بدھی بالکل ہی بھشٹ ہو گئی تھی۔ یہ کہنے کی تجھے کیا ضرورت تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور شراب کے نشے میں دھت باہر چلا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی محلے کے کچھ لوگوں کا ہجوم رنجنا کے دروازے پر آیا کہ اس کا باپ کھلے گٹر کے مین ہول میں لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ رنجنا دیوانہ وار باپ کی محبت میں دوڑی۔ جب اسے باہر نکالا گیا تو اس کی سانسیں ختم ہو چکی تھیں۔ باپ کو چتا میں جلانے کے بعد بھی رنجنا یہی سوچتی رہی کہ اس جملے کو سننے کے بعد ہی جگدیش کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا تھا اور باپو...... باپو نے تو یہ سن کر جان ہی دے دی۔ بہت سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ باپ کا انتم سنسکار کرنے کے بعد اس نے پردیپ کو فون کیا کہ وہ شادی کے لیے تیار ہے۔ پردیپ اس کی زبان سے شادی کا اقرار سنتے ہی خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ اس کے شرابی جواری باپ کی موت کا سن کر وہ مزید پُرسکون اور مطمئن ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس عادی شرابی کو نہ اس کے والدین پسند کرتے تھے اور نہ وہ خود اسے اچھی نظروں سے دیکھتا تھا۔

☆☆☆

بارش برسی اور جم کر برسی، سارے شہر کو جل تھل کر گئی اور جب تھمی تو کئی منچلے موسم کو انجوائے کرنے نکل پڑے۔ ان ہی میں آنند اور سنجنا بھی شامل تھے۔ دونوں لانگ ڈرائیو پر نکل پڑے۔ آنند کو اس کے موبائل نے متوجہ کیا جس پر مسلسل رنگ آ رہی تھی۔ آنند موبائل اٹھاتے ہوئے سنجنا سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ”ڈیڈی کی کال آ رہی ہے۔“ بات کرنے کے بعد وہ پھر سنجنا سے بولا۔ ”آج ڈیڈی نے ہم دونوں کو ہوٹل ”شیش محل“ میں انوائٹ کیا ہے، چلو گی؟“

اس کے استفسار پر سنجنا بری طرح چونک پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ مہندر سنہا کا یہ بلاوا خالی از علت نہیں۔ اب یقیناً پوچھ گچھ کا سارا پروگرام ہوٹل میں ترتیب دیا جائے گا۔ آنند کی موجودگی میں اسے سوالات کے جوابات دینے ہوں گے۔

اسے خاموش دیکھ کر آنند نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولا۔ ”کیا بات ہے، تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا دعوت قبول نہیں؟“

سنجنا ہڑبڑا کر بولی۔ ”نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... میں تیار ہوں لیکن ابھی تو ڈنر میں کافی ٹائم ہے، تھوڑا اسڑکوں کو اور ناپ لیتے ہیں۔“

آنند نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی رفتا مزید تیز کر دی لیکن گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گاہے بگا سنجنا کے رخ روشن پر بھی نظر ڈال لیتا۔ جہاں اب تفکرات پر چھائیاں لرزاں تھیں۔ خوشی اور اطمینان غائب ہو چکا تھا۔

گزری بارش نے ”شیش محل“ کا حسن دوبالا کر دیا تھ یہ شہر کا مصروف ترین علاقہ تھا۔ جو رنگ برنگی روشنیوں سے جگ رہا تھا۔ آنند اور سنجنا ہوٹل میں داخل ہوئے تو متلاشی نظر سے مہندر سنہا کو کھوجتے رہے لیکن مہندر سنہا کا دور دور تک نہ تھا۔ مایوس ہو کر آنند نے فوری رابطہ قائم کیا اور بولا۔ ”ڈیڈ آپ کہاں رہ گئے۔ ہم دونوں آپ کے منتظر ہیں۔“

پھر بھویں اچکاتے ہوئے حیرانی سے بولا۔ ”کیو کیوں نہیں آسکتے آپ؟“

جواب میں مہندر سنہا نے وجہ بیان کرتے ہوئے معذرت بھی طلب کی کیونکہ آنند نے فوراً کہا۔ ”کوئی بات ڈیڈی، آپ اپنے مہمانوں کو وقت دیجیے، او کے بعد میں ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سنجنا بولا۔ ”ڈیڈی کے کوئی پرانے ملاقاتی اچانک آ گئے ہیں۔ لیے وہ نہیں آسکتے۔“

سنجنا نے ایک پُرسکون سانس لی۔ اس کی ساری ریلیز ہو گئی۔ بھوک بھی چمک اٹھی۔ لیکن یکا یک آنند مس انگیز لہجے میں بولا۔ ”ارے انکل جگدیش...... وہاٹ سرپرائز...... ونڈرفل۔“

جگدیش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی خوش د ساتھ اس کی طرف بڑھا اور آنند کو گرم جوشی سے گلے ہوئے اس کی پیشانی چومی اور پھر سنجنا کی طرف دیکھتے

بولا۔ ''اوہ! اکیلے نہیں ہو..... چلو تو بچو آپ لوگ کھل کے انجوائے کرو۔ میں اپنی عمر کی کمپنی تلاش کرتا ہوں۔''

اسی دوران بیرے نے آکر آنند سے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''سر! آپ لوگوں کی ٹیبل اس طرف بک ہے۔''

آنند نے جگدیش کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ ''انکل! آج دراصل ہم دونوں کو ڈیڈی نے یہاں انوائٹ کیا تھا لیکن اچانک ان کے کچھ گیسٹ آگئے ہیں۔ چلیں وہ نہ سہی آپ تو ہیں۔ آپ ہمیں کمپنی دیں گے تو کھانے کا مزہ دوبالا ہوجائے گا۔''

جگدیش نے شفقت آمیز نظروں سے آنند کو دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔ ''ویلکم مائی بوائے لیکن ایک شرط ہے، بل میں پے کروں گا۔''

تھوڑی سی رد و کد کے بعد آنند نے اس کی پیشکش منظور کرلی۔

جگدیش اور آنند تو کھلے دل کے ساتھ کھانے کے ساتھ انصاف کررہے تھے لیکن سنجنا بے رغبتی سے نوالے گن گن کر اٹھا رہی تھی۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین تھی۔ اس بات کو نہ صرف آنند نے بلکہ جگدیش نے بھی نوٹ کیا۔ کھانا ختم ہوتے ہی جگدیش نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے میری وجہ سے تم لوگ ڈسٹرب ہوگئے ہو۔''

آنند نے معنی خیز انداز میں سنجنا کو گھور کر دیکھا۔ سنجنا نے بوکھلا کر جگدیش کی طرف دیکھا اور سٹپٹاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں..... نہیں انکل ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ میں خالص ویجیٹیرین ہوں۔ نان ویج میرے حلق سے نہیں اترتا۔ اس لیے میں کھانا برابر نہیں کھا سکی۔''

جگدیش نے سوری کہتے ہوئے مینیو اس کے سامنے سرکاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''اپنی پسند کی ویجیٹیرین ڈشز منگوالو بیٹی، واقعی میں اچھا میزبان نہیں ہوں۔''

سنجنا پر پھر بوکھلاہٹ کا دورہ پڑا۔ جگدیش کی موجودگی سے بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اس وقت جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ وقت تمام اس نے اپنے حواس قابو میں کیے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بس اب تو جو کچھ کھانا تھا کھالیا۔ ویسے بھی میں ڈنر لائٹ ہی لیتی ہوں۔ بس آپ اچھی سی کافی پلادیں۔''

''اوکے!'' کہتے ہوئے جگدیش نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

سنجنا نے بھی اپنا سرد رویہ بالائے طاق رکھا اور ماحول کو خوشگوار بناتے ہوئے ہنسنے بولنے لگی۔ اسی اثنا میں آنند کا موبائل پکار اٹھا۔ آنند اسکرین پر نام دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہو..... سکھ دیو ہے۔ بہت عرصے بعد یاد کیا ہے۔''

پھر وہ جگدیش اور سنجنا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''انکل! سنجنا نے مون برت (چپ کا روزہ) توڑ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ اس کی سنگت میں بور نہیں ہوں گے۔ میں ذرا اپنے اس بچھڑے یار سے چند باتیں کرکے ابھی آتا ہوں۔''

جگدیش نے معنی خیز انداز میں زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وائے ناٹ مائی سن، یو کین گو۔''

آنند لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلتا بنا۔ سنجنا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح گھبرائی گھبرائی نظروں سے آنند کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جگدیش نے اپنا سنہرا چشمہ اتار کر سنجنا کی طرف دیکھا تو وہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے باہر کی گہما گہمی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس کی ساری زندگی جنگل بیابان میں گزری ہے اور پہلی دفعہ دنیا کے میلوں ٹھیلوں کا نظارہ کررہی ہے۔

جگدیش نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے سنجنا کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ سنجنا نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے مضطرب انداز میں جگدیش کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔ جگدیش نے اس تناؤ والے ماحول اور طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ آنند کی فرینڈ ہیں۔ اس بات کا تو مجھے علم ہے لیکن آنند نے مکمل طور پر آپ کا... تعارف نہیں کروایا۔ آپ پڑھتی ہیں؟''

سنجنا نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔ ''پڑھتی نہیں، پڑھاتی ہوں۔ گرلز کالج میں کیمسٹری کی لیکچرار ہوں اور..... اور کچھ مزید انٹروڈکشن چاہتے ہیں آپ تو میں علی الاعلان بالکل کھلم کھلا وہ بھی دے دوں گی۔ مسٹر جگدیش راٹھور چونکہ آج کا ترتیب کیا ہوا سارا ناٹک میری سمجھ میں آگیا ہے۔ آج آپ سے یہاں ملاقات اتفاقی نہیں بلکہ سوچے سمجھے پلان کے مطابق تھی۔ اس روز مہندر سنہا نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کی تھی۔ آج آپ ان کے قائم مقام ہیں۔ دراصل آنند مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے مہندر سنہا نے یہ ذمے داری آپ کو سونپی ہے کہ آپ میرے ماں باپ، خاندان اور ذات پات کی مکمل چھان بین کریں اور پھر بھلا آپ سے کیا چھپانا، میری ماں رچنا رائے کو تو آپ بہت اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ اس دنیا میں آتے ہی اپنی ماں کی زبان سے میں نے آپ کا ہی نام تو سنا تھا۔ بہت چاہتی تھی وہ آپ کو، بہت پیار کرتی تھی لیکن

آپ نے بدلے میں اسے کیا دیا۔ کچھ بھی نہیں دیا۔ وہ روز مانگ میں آپ کے نام کا سیندور سجاتی، کروا چوتھ کا برت رکھتی لیکن آپ نے اپنا نام تک نہ دیا اسے، نہ ماں کے ساتھ پوترا اگنی کے پھیرے لیے نہ پنڈت نے اشلوک پڑھے، نہ بابل کی دعائیں لیں اور نہ ہی سسرال کی دہلیز پھلانگی۔ بس میری شکل میں ایک اولاد دی اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس ابلا (مظلوم) پر کیا گزری۔ مرتے سے بھی اس کے ہونٹوں پر صرف اور صرف آپ کا نام تھا۔ پھر میری نانی نے کتنی کڑی دھوپ اور کٹھنائیوں کا سامنا کر کے مجھے پالا پوسا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ آپ اجازت دیں تو وہ بھی سنا دوں۔ ویسے میرا خیال ہے میں اپنا مکمل تعارف آپ کو دے چکی۔ اب آپ میرا مکمل بائیوڈیٹا اس قانون دان میرا مطلب مہندر سنہا کو دے سکتے ہیں۔ پھر وہ یقیناً اپنے بیٹے کو میرے قریب پھٹکنے بھی نہیں دے گا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔ میں نے پیار کیا ہے۔ آخری سانس تک کرتی رہوں گی۔ مان مریادا بڑے لوگ دیکھتے ہیں، ہم نردھن تو جس سے پیار کرتے ہیں اس کے لیے اپنی ساری زندگی ارپن کر دیتے ہیں۔ میرا اور میری ماں کا کچا چٹھا تو آپ کھلے عام بیان کر سکتے ہیں لیکن اپنے چہرے پر کون سا ماسک چڑھانا ہے اور کس طرح اپنے آپ کو اندھکار میں رکھنا ہے۔ یہ سب آپ جیسے بدھی مان اور سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان کے لیے آسان کام ہے۔ آنند تک میرا یہ میسیج ضرور پہنچا دیجیے گا کہ شاید میں اس سے کبھی نہ مل سکوں لیکن میرا پریم سچا ہے۔ میں کبھی اسے بھول بھی نہ سکوں گی اور نہ اس کے علاوہ کسی سے بیاہ کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لاؤں گی۔''

ملک کا مہان نیتا مہان صنعت کار اس وقت پتھر کا بت بنا ہوا تھا۔ زبان مفلوج ہو چکی تھی۔ ندامت اور پشیمانی سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ پسینے کے قطرے پیشانی پر چمک رہے تھے لیکن ہاتھ میں سکت نہیں تھی کہ رومال یا ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ صاف کر لیتا۔ اَن گنت سوالات کا پینڈورا باکس کھولنا چاہتا تھا لیکن اس وقت ساری کہنی سنی بھول گیا تھا۔ آہنی اعصاب پل بھر میں چکنا چور ہو گئے تھے۔ سجنا بپھری ہوئی شیرنی کے مانند خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ باپ بیٹی روبرو بیٹھے تھے لیکن دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ سجنا کے آنسوؤں سے اس کے گال تربتر ہو رہے تھے۔ اپنے گالوں کو صاف کرتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی۔ جگدیش نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور قدرے توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میری بچی، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ ساری زندگی تم سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا۔ بہت بڑا دوشی (مجرم) ہوں۔ جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ میں اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ تمہارا کہا ہوا ایک ایک شبد سچا ہے لیکن میری جان، میری بچی جذبات کی رو میں بہہ کر تم غلط نتیج پر سوچ رہی ہو۔ جان بوجھ کر میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ اوپر والے کی طرف سے حالات نے ہی کچھ ایسا موڑ لیا کہ میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ امریکا سے واپس آ کر میں نے رچنا اور تمہیں تلاش کرنے کی جان توڑ کوشش کی لیکن تم دونوں کا مجھے کوئی اتا پتا نہ ملا۔ تم دونوں کا غم مجھے گھن کی طرح کھاتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہم لوگوں کی ملی بھگت تھی کہ تمہاری اصلیت کی جانکاری حاصل کریں۔ کوئی ایسا ثبوت مل جائے کہ حقیقت میں تم میری ہی بیٹی ہو اور..... پھر..... تم نے میرے منہ پر ایسا ثبوت پھینک کر مارا کہ میرا دل چاہا یہ دھرتی پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ یہ تلخ اور زہریلا راز تمہیں یقیناً تمہاری ماں نے بتایا ہوگا؟'' جگدیش نے استفسار کیا۔

''جی ہاں، ماں نے مرتے ہوئے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ راز اس نے میری نانی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ نانی بھی آخر تک یہی سمجھتی رہی کہ آپ اور ماں خاموشی سے شادی کر چکے ہیں۔'' سجنا کے لہجے میں ابھی تک غیظ و غضب کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

جگدیش نے شفقت سے سجنا کی پشت تھپتھپائی اور بولا۔ ''میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ جیون کے اس گہوارے میں یہ اونچ نیچ جھکو لے ہم انسانوں کا مقدر ہے لیکن مجھے ایک بات کی خوشی اور اطمینان ہے کہ میری تلاش آج پوری ہوئی اور میری بیٹی مجھے مل گئی۔ میں اپنی دھن سمپتی، اپنا نام سب تمہارے نام کر کے سکون کی سانس لے سکوں گا۔ اب تم اکیلی اور تنہا نہیں ہو تمہارا باپ تمہارے ساتھ ہے۔ تم بھی اسی وقت میرے ساتھ چلو گی اور مہندر سنہا کے بارے میں جو شکوک اور خدشات تمہارے دل و دماغ میں پل رہے ہیں اسے جڑ سمیت نکال پھینکو۔ مجھے مہندر نے یا آنند نے تمہارے پاس نہیں بھیجا بلکہ میں خود کھوج کرتے ہوئے تم تک پہنچا تھا اور اپنی زبان پر ہمیشہ تالا لگائے رکھنا۔ دونوں باپ بیٹے کو کسی بات کی سن گن بھی نہ لگنے پائے۔ یہ میری تم سے ریکویسٹ ہے۔'' جگدیش کے لہجے میں التجا اور عاجزی کا عنصر شامل تھا۔

''آنند کا باپ میرا جگری دوست ہے لیکن پھر بھی میں ایک مخصوص حد بندی کا قائل ہوں اور یہی امید میں تم سے بھی رکھتا ہوں کہ اپنے گزرے ہوئے کل کو کسی کے سامنے ایکسپوز کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اشکوں کے بہاؤ نے سجنا کے دل کی ساری کثافتیں اور کدورتیں دور کردی تھیں۔ باپ کی محبت اور شفقت نے سارا غصہ اور طنطنہ ہوا میں تحلیل کر دیا تھا۔ آنکھوں میں طمانیت اور مسرت جگمگا رہی تھی۔ اس کا پیاسا سا وجود باپ کے سینے سے لپٹ کر سارے جیون کی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور ''پاپا'' کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو چوم لیا۔ جگدیش نے بھی ''میری بیٹی میری جان'' کہتے ہوئے انتہائی پیار بھرے انداز میں اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر پھیرا۔ کالے سیاہ بادل چھٹ چکے تھے۔ موسم نکھر اُنکھرا تھا۔ دونوں باپ بیٹی کے چہروں پر ست رنگی دھنک کے رنگ لہرا رہے تھے۔

☆☆☆

سجنا اپنے پُرتعیش اور ویل ڈیکوریٹڈ بیڈروم میں نرم گرم بستر میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی اور اپنی خواب گاہ میں جگدیش موبائل پر آنند سے محوِ گفتگو تھا۔ جگدیش کہہ رہا تھا۔ ''مجھے سو فیصد یقین تھا کہ رزلٹ جاننے کے لیے تم بہت زیادہ بے چین اور بے قرار ہو گے۔''

آنند کی خفیف سی ہنسی کی آواز گونجی اور وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ارے انکل شوقِ تجسس مارے ڈال رہا ہے۔ اب پلیز آپ بھی فوراً سسپنس ختم کر کے بتایئے کہ آپ کی بیٹی رنجنا ہے یا سجنا؟''

جگدیش نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی اور بولا۔ ''تمہاری حکمتِ عملی نے ایک ہی جھٹکے میں رنجنا کے چہرے سے ملمع اتار دیا اور اسے بھاگتے ہی بنی اور پھر.....''

آنند نے بات کاٹتے ہوئے پھر استفسار کیا۔ انداز کریدنے والا تھا۔ ''انکل یہ تو بتایئے رنجنا کی کون سی بات پر آپ کو محسوس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے؟''

جگدیش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''صرف ایک جملے پر میں چونکا۔ جب اس نے کہا کہ میری بڑی بہن، وچنا کے ساتھ بدزبانی کرتی تھی۔''

آنند نے چڑنے والے انداز میں ترش لب و لہجہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل ہمارے سماج میں ساس بہو اور نند بھاوج کے جھگڑے کوئی نئی بات نہیں۔ محض اس معمولی سی بات پر آپ نے اصل اور نقل میں کس طرح شناخت کی؟''

جگدیش نے اداس اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواباً کہا۔ ''میرے بچے شاید تمہارے علم میں یہ بات نہیں کہ میری ویدی پیدائشی گونگی تھیں۔''

''اوہ، آئی سی۔'' کہتے ہوئے آنند نے اپنے ہونٹوں کو گولائی میں سکیڑ لیا اور کچھ لمحوں کے لیے چپ ہو گیا۔ جب ذرا حواس درست ہوئے تو معذرت خواہانہ انداز میں سٹپٹاتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجیے گا انکل یہ بات ابھی تک میری نالج میں نہیں تھی۔''

جگدیش نے بات کو ٹالتے ہوئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جو کہ غموں کے سمندر کو چیرتا ہوا ہونٹوں تک آیا تھا۔ ''نہیں میرے بچے کوئی بات نہیں، اب تو سارے الجھے دھاگے سلجھ چکے ہیں۔''

آنند فوراً دوبارہ مستفسر ہوا۔ ''اور انکل سجنا کی اصلیت کس طرح سامنے آئی۔ اسے آپ نے کس طرح پہچانا کہ حقیقتاً وہی آپ کی بیٹی ہے؟''

چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ آنند کو محسوس ہوا رابطہ منقطع ہو گیا، اس نے زوردار آواز میں ہیلو ہیلو کی گردان شروع کر دی۔

جگدیش نے ہڑبڑا کر جواباً کہا۔ ''ہاں، ہاں میں سن رہا ہوں۔ بس بیٹا میرا خون تھا میں نے خوشبو سے پہچان لیا اور دستک کی آواز نے کس طرح دل و دماغ کو جھنجوڑا۔ اٹز اے پرسنل میٹر۔''

''اوکے، اوکے انکل، بہت بہت بدھائی، بیٹی کے ملن پر میری شبھ کامنائیں آپ کے ساتھ ہیں لیکن میرے مشورے کی فیس وہ کدھر گئی؟''

اس بار جگدیش کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میری پریوں جیسی بیٹی اپنے ساتھ دولت کی لکشمی بھی تو تمہارے گھر لا رہی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟''

آنند نے پوری خوش دلی سے جواب دیا۔ ''آپ کی دعائیں بھی تو چاہئیں۔''

جگدیش نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''صرف میری نہیں بلکہ رچنا کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''رچنا! آج تم بہت یاد آ رہی ہو۔ آج دونوں بچوں کو میں اپنی وفائیں دیتا ہوں، جو اپنے لیے سوچی تھیں کبھی وہ ساری دعائیں دیتا ہوں۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ غزالہ ریاض.....پنڈی

پھیلی ہوئی ہے یاد کی گلیوں میں چاندنی
اک خواب اک خیال کا مہماں ہے خواب خواب
دل، دشت کے سفر پہ چلا ہے دیار سے
ہنگامۂ امیدِ بہاراں ہے خواب خواب

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

نہ جانے کون سا آسیب دل میں بسا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

❁ عاصم علی.....کراچی

آیا ہی تھا خیال کہ آنکھیں چھلک پڑیں
آنسو کسی کی یاد کے کتنے قریب تھے

❁ اقبال حسین.....منڈی بہاؤالدین

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

❁ پرویز احمد.....مظفر آباد

یہ تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے

❁ نیاز خان.....سرگودھا

یہ کیسی آب و ہوا ہے یہ کیسا موسم ہے
کہ پھول بھی ہمیں بے رنگ و بُو نظر آئے

❁ ارم طاہر.....سکھر

کتنے ظالم ہیں جو یہ کہتے ہیں
توڑ لو پھول، پھول چھوڑو مت
باغباں ہم تو اس خیال کے ہیں
دیکھ لو پھول، پھول توڑو مت

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

ہمارے زخم تمنا پرانے ہوگئے ہیں
کہ اس گلی میں گئے اب زمانے ہوگئے ہیں
جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہوگئے ہیں

❁ یاور علی.....میر پور خاص

اس کو بھی مجھ سے ہی گلہ باوفا نہیں
دو گام بھی خلوص سے جو کہ نہیں چلا

❁ عنبر علی.....فیصل آباد

آتا بھی ہے کوئی تو میں کہتا ہوں تُو نہیں
اب تُو مرے خیال میں تنہا درست ہے

❁ نازش خان.....مری

کم ظرف ہی کرسکتا ہے تشہیر وفا کی
دل والا کبھی کوئی دکھاوا نہیں کرتا

❁ سحرش خان.....کوئٹہ

نادیدہ راہ لوگ ہوئے محملوں پہ بار
منزل شناس لوگ قطاروں کے ساتھ ہیں
ہم کو مٹا نہ دیں یہ زمانے کی مشکلیں
لیکن یہ مشکلیں تو ہزاروں کے ساتھ ہیں

❁ یمنیٰ علی.....سبی

لاتا ہے ہر اک لمحہ نئی ایک صعوبت
ہر طور ہی بدحالی کے سامان رہے ہیں
حصے میں سبھی درد و الم اپنے ہیں آئے
محرومی و ناکامی کی پہچان رہے ہیں

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

دل کو گرماتی ہے یہ شوخ نگاہی تیری
جو میرے جذبۂ الفت کو جلادیتی ہے

❁ محمد نواز.....بٹلی (آزاد کشمیر)

دل کہ جو شدتِ احساس سے معمور نہیں
کیا سمجھ پائے گا وہ درد کی لذت کیا ہے

❁ حنظلہ شاہد.....کراچی

ہوں زندہ اس کی محبت کے سائبان میں، میں
اگرچہ سہنی پڑی ہیں رقابتیں کیا کیا

❁ فہیم ڈوگر.....اسلام آباد

کب تلک کھیلے گا جذبات سے میرے وہ یونہی
حربے اس کے سبھی ناکام ہوئے جاتے ہیں
بے ثمر کر دیے حالات نے سب جوہر و فن
اتنی ارزانی کہ بے دام ہوئے جاتے ہیں

❁ احمد یار خان.....کوٹ لکھپت

ہم ایک دن نکل آئے تھے خواب سے باہر
سو ہم نے رنج اٹھائے حساب سے باہر

❁ امتیاز احمد.....چیچہ وطنی

تیرا وصال، خیر اب اک واقعہ ہوا
اب اپنے آپ سے بھی ملے دیر ہوگئی
صدیوں کی ریت ڈھانپ کر آسودہ ہوگئے
سر کو ہمارے تن سے کٹے دیر ہوگئی

❁ شاہانہ شیخ.....لاڑکانہ

ابھی سے مجھ کو بتادے اگر بچھڑنا ہے
نئی نئی ہے محبت تجھے بھلادوں گا

❁ جنید ملک.....کراچی

اک چاند آتے آتے افق تک پلٹ گیا
پھر آسمان دامنِ شب سے لپٹ گیا
کروٹ بدل کے سوگئی دل میں کسی کی یاد
پل بھر میں ایک رنگ سا پھیلا سمٹ گیا

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

بس اپنی لگن ہی میں پھرتے رہے
گزارے ہیں دن اسی طرح دہر میں

❁ صبا سحر.....کراچی

وہ کھڑکیاں مدت سے یوں ہی دیکھ رہا ہوں
پردے سے سرکتے تھے، سرکتے ہیں ابھی تک

❁ ملک مظفر.....تلہ گنگ

مصروف زندگی میں یہ سوچتے ہیں اکثر
فرصت ملے تو چل کر روٹھے ہوئے منائیں
یہ کہہ رہی ہے کونپل موسم بھی ہیں پلٹتے
آؤ نا ہم بھی مل کر اجڑا نگر بسائیں

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

میں اس کا ہوکے رہا سب گمان ہوتے ہوئے
وہ میرے ساتھ رہا بھی تو فاصلے سے رہا

❁ طاہر مجاہد.....پھالیہ

ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے
کرنی ہے تو کھل کے کرو، انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

❁ سلیم قادر.....میانوالی رانجھا

عجیب شے ہے محبت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہوئے

❁ نوشتہ گلزار.....بھکر

اس لمحے کے جادو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی، وہ چیز وہیں پر ہے

❁ منیر شگفتہ.....وہاڑی

کاجل آنکھ میں پھیلا کیوں ہے آنچل سر سے کیوں ڈھلکا
کیوں بیری پر پتھر آئے، آنگن میں کیا رکھا ہے
جب بھی انسانوں کو پرکھا، مجھ کو یہ احساس ہوا
تن من ان کا زہر بھرا ہے، ناگن میں کیا رکھا ہے

❁ عباس علی.....چنیوٹ

ہے اپنے حسن پہ ناز اگر تو روپ نگر میں بس جاؤ
یہ چاند پرستی چھوڑ کے تم خود چاند کا ہالا بن جاؤ
دل ہنس کر ہر دکھ سہہ لے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ

❁ سیما جاوید.....کراچی

ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک
بہت ہیں مرحلے باقی ابھی زنجیر کرنے تک
ہمارے ہجر کے قصے سمیٹو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک

❁ شاہ عالم زمرد.....پنڈی

ہل جائیں گے اک بار تو عرشوں کے در و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن

❁ نادیہ ریاض.....نواب شاہ

دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ جھمیلے میں رہیں گے

❁ ریاض احمد انصاری.....لاہور

لمحوں کی پہچان یہی ہے، اڑتے جاتے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھہر گیا، وہ پل!

❁ طیب شاہین.....کٹھیالہ شیخاں

اک سمت پاسِ عشق تھا، اک سمت اپنا مان
کیسے گریز کرتے! کوئی راستہ نہ تھا!

❁ سائرہ نواب.....پشاور

کچھ اس کو دیکھ کے کھلتا نہ تھا کہ کیا ہے وہ
فریب دیتی ہوئی یا فریب کھائی ہوئی

❁ نعیم احمد.....بہاولپور

خواہشوں کے بیچ میں اور سازشوں کے درمیاں
لکھ رہا ہے آسماں بھی اک عجیب داستاں

❁ صبا حمید.....ٹنڈوالہیار

کوئی نہ اپنا ساتھی ہو تو سنگت کس سے ہم جوڑیں
چاروں سمت ہو ویرانی تو راہ کو اپنی کیا موڑیں

❁ عاصم خان.....کراچی

تلقین وفا کی کرتا تھا ہر محفل میں وہ شیریں سخن
جب اس پہ وفا کی شرط لگی تو عشق سے وہ غافل نکلا

❁ عمران شیروانی.....لاہور

جیت سکے نہ دل کی دنیا عیاری، مکاری سے
نام ہوئے ہیں جن کے روشن دنیا کی تسخیروں میں

❁ داؤد اشفاق.....اوکاڑہ

مری سوچوں میں کیوں تالاب کی صورت وہ ٹھہرے ہیں
ان آنکھوں سے بھی دریا بن کے بہہ جاتے تو اچھا تھا

❁ وسیم اکرم.....خانیوال

ساون کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے

❁ آذین رضوان.....کراچی

خوابوں کی راہ گزر میں، جذبوں کے امتحاں میں
ہم جی رہے ہیں لوگو! اس شہرِ بدگماں میں

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ

بے نام اداسی میں دیکھے ہیں کئی چہرے
ہر چہرہ حقیقت میں پُردرد کہانی ہے
موسم کے تغیر نے تقدیر سے پوچھا ہے
ان خانہ بدوشوں نے کیوں کوچ کی ٹھانی ہے

❁ احسن جمال.....اسلام آباد

یہ حیرت ہے کہ تم جیتے، مگر ہو پھر بھی افسردہ
تمہارا وار ادھورا تھا کہ میری مات ادھوری ہے

❁ سنبل.....گلگت

رقابتوں کے شہر میں عداوتوں کا دور ہے
دھواں دھواں ہوئے بدن قیامتوں کا دور ہے

❁ رداجاوید.....بلہ ہزارہ

کیا سناؤں اپنی وفاؤں کی کہانی تم کو
سمندر کا رکھوالا تھا اور ساری عمر پیاسا رہا

❁ رانا کلیم.....کراچی

کرو پھر سے کوئی وعدہ کبھی نہ پھر بچھڑنے کا
تمہیں کیا فرق پڑتا ہے چلو پھر سے مکر جانا

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ اکتوبر 2020

نام : _____

پتا : _____

بیس سال

انجم فاروق ساحلی

لمحے گزر جاتے ہیں مگر... کچھ عبرتناک لمحوں میں قید ہو کر ماضی پل پل انتقام پر اکساتا رہتا ہے... وہ بھی مسلسل ایک سائے کے مانند اپنے مجرم کی بُو سونگھتا پھرتا تھا اور بالآخر اسے اشارہ مل گیا... پھر دیکھتے ہی دیکھتے بازی الٹ گئی۔ بیس سال پرانا منظر تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے تھا...

انصاف کے دو پلڑوں کے مابین توازن کھو دینے والے ایک قابل انسان کا انجام.....

''تمہاری چالیں جارحانہ اور دلیری پر مبنی ہیں۔'' جج احمد علی نے اپنے نئے دوست عمران علی سے پٹنے والے مہرے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بہادر اور دلیر ہوں لیکن پولیس یا فوج میں نہ جا سکا۔'' جج کے دوست عمران نے جواب دیا۔

''خیر عام زندگی میں بھی بہادری اور دلیری کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ انسان ناکام اور نامراد رہتا ہے۔'' جج احمد علی نے اس کے کسرتی جسم اور آنکھوں میں بسی دہانت

کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر قبل ہی دوست بنے تھے۔ جج احمد علی ٹھوکر نیاز بیگ سے بائیں جانب پارک میں بننے والے شطرنج کلب میں باقاعدگی سے آرہا تھا، وہ پچھلے دس سال سے اس کھیل سے اپنا دل بہلا رہا تھا۔ اس کی بیوی راشدہ فوت ہو چکی تھی اور وہ بے اولاد تھا۔ خوب صورت اور ہنستے کھیلتے، گول مٹول، شرارت سے اچھل کود کرتے بچے کو دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس ہو جاتیں اور اسے اپنا بچپن بھی یاد آجاتا۔ بچوں کے نانا اور دادا کو دیکھ کر بھی اس کی باطنی اداسی اور ویرانی بڑھ جاتی۔

جج احمد علی کی پچھلی بازی کمزور تھی پھر اس کے ہاتھ سے نہ جانے کیوں ایک مہرہ گر کر لڑھک گیا جسے قریب آنے والے عمران علی نے جھک کر فرش پر سے اٹھایا اور جج صاحب کو تھما کر ایک ماہرانہ مشورہ بھی دے ڈالا۔ مقابل جج شوکت مرزا نے ناک بھوں چڑھا کر عمران علی کو ڈانٹا۔ ''دخل مت دو۔''

''بس میں رہ نہ سکا۔'' عمران علی نے عاجزی سے سر خم کرتے ہوئے کہا۔ احمد علی، عمران کے مشورے کی بنا پر بازی جیت گیا۔

جج شوکت مرزا جھنجلا کر اٹھا اور کھا جانے والی نظروں سے عمران علی کو دیکھ کر بولا۔ ''مجھے ایک ضروری کام ہے، ورنہ شطرنج میں تمہاری کال کھینچتا۔''

''میری کھال اتنی کمزور نہیں ہے۔'' عمران علی نے دھیرے سے کہا۔

شوکت مرزا اسے قہر بار نظروں سے گھورتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

احمد علی مسکرایا اور اس کے لیے لیمن جوس کا ایک گلاس منگوایا۔ پھر ڈرائی فروٹ اور چائے کا بھی آرڈر دے دیا۔

''بہت خوب، تمہاری چال نے تو پانسا ہی پلٹ دیا۔''

''مجھے بیس برس ہو گئے ہیں یہ ذہنی ورزش کرتے ہوئے۔'' عمران علی اشارہ پا کر احمد علی کے سامنے بیٹھ گیا اور اسٹرا سے جوس پینے لگا۔

''دیکھنے میں اسمارٹ اور خوب صورت ہو، کیا مشغلہ و مصروفیت ہے؟'' احمد علی نے استفسار کیا۔

''حضور والا! آپ معزز جج ہیں اور میں محض گارڈ کی نوکری کرتا رہا ہوں۔ میں بیس برس قبل کراچی میں تھا۔ وہاں میں امیر لوگوں کو دشمنوں سے بچانے کے لیے محافظ کی نوکری کرتا رہا ہوں پھر میری محبوبہ گم ہو گئی اور میں اسے ڈھونڈنے کے لیے لاہور آگیا لیکن اب تک اس کا سراغ نہیں پا سکا۔ میں نے شادی نہیں کی۔ آج کل فارغ ہی ہوں۔ شاید کوئی ملازمت مل جائے۔''

''لو ملازمت تمہیں مل گئی۔'' احمد علی نے اس کے سراپا پر ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کس قسم کی؟'' عمران علی نے استفسار کیا۔

''وہی تمہاری پسندیدہ گارڈ سروس۔''

''واقعی؟'' عمران علی خوشی سے گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ کو بھی کسی سے خطرہ ہے؟'' عمران علی نے چونک کر استفسار کیا۔

احمد علی چند لمحے نظریں جھکائے کسی سوچ میں گم رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''ہاں، مجھے خطرہ ہے کسی نادیدہ دشمن سے، شاید مجھ سے کوئی غلطی یا کوتاہی عدالتی فیصلوں میں ہوئی ہے جس نے کسی شخص کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔ وہ میری بو سونگھتا پھرتا ہے، مجھے ختم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔''

''ذرا وضاحت سے بتایئے تاکہ میں کوئی اندازہ قائم کروں۔'' عمران علی نے اپنی نظریں احمد علی پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

احمد علی ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا خلا میں گھورتا رہا پھر بولا۔

''میں کراچی میں جج تھا جب میں ریٹائر ہوا تو کراچی سے لاہور اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں آبسا۔ بس وہیں پر ایک سیاہ نقاب والا لمبا آدمی میرا دشمن بن گیا۔ میں وہ کوٹھی چھوڑ کر چپکے سے اپنی آبائی حویلی میں آٹھہرا۔ میں نے اپنے حلیے میں تبدیلی کر لی اور اپنا اصل نام پرویز علی بھی کسی کو نہیں بتایا لیکن وہ خطرناک آدمی یہاں بھی آپہنچا ہے۔ اس نے دو تین بار میری حویلی میں گھسنے کی کوشش کی لیکن میرے حفاظتی کتوں اور الارم سسٹم سے بوکھلا کر بھاگ نکلا۔''

یہاں تک کہہ کر احمد علی خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ ہراساں، بجھا، بجھا اور اپنی عمر سے بڑا دکھائی دینے لگا۔ عمران علی کا اندازہ تھا کہ احمد علی کی عمر پچاس برس کے قریب ہے اور اسے حیرت تھی کہ جج ساٹھ برس میں ریٹائر ہوتے ہیں یہ اتنی جلدی کس طرح فارغ ہو گئے۔ سوال اس کے ہونٹوں پر آگیا۔

''آپ کی عمر کیا ہوگی؟''

''تقریباً پچاس برس۔''

''آپ اتنی جلدی کیسے ریٹائر ہوئے؟''

''بس کیا بتاؤں ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا جب تندرست ہوا تو دوبارہ بحال نہ ہو سکا۔ چنانچہ مجھے

ریٹائر کر دیا گیا۔ مجھے آدھی پنشن ملتی ہے۔ باقی خاندانی طور پر پیسے کی کمی نہیں۔''

عمران علی، جج احمد علی کا قیمتی لباس، بیش قیمت گھڑی اور انگلیوں میں چمکتی انگوٹھیاں دیکھنے لگا۔ جن میں جڑے ہیروں سے بھی انھی خوشنما کرنیں پھوٹ کر ایک حسین منظر کو جنم دے رہی تھیں۔

احمد علی نے اسے پیسوں کی اچھی آفر دے دی۔ عمران علی نے ملازمت قبول کر لی۔ وہ اس کے پیچھے قدم اٹھاتا ہوا اس کی سیاہ مرسیڈیز کار کی طرف بڑھنے لگا جس کو ایک لڑکا کپڑے سے صاف کرنے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

احمد علی کی لمبی سیاہ کار سبز گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ عمران نے نظر اٹھا کر ماحول کا جائزہ لیا، گیٹ سے شروع ہونے والی سڑک دو طرفہ باغیچے سے گزر کر آگے پورٹیکو میں جا رہی تھی جہاں دو گاڑیاں اور ایک موٹر سائیکل پہلے سے موجود تھیں۔ محرابی جھروکوں والے برآمدے مزید گھومتے ہوئے پیچھے کی طرف نکل گئے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ کچھ حصے روشن اور کچھ تاریک تھے۔ احمد علی کی اوپری خواب گاہ کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ شیشے چمک رہے تھے۔ محافظ دروازہ بند کر کے اپنی چوکی میں بیٹھ گیا۔ احمد علی کے کار سے باہر نکلتے ہی دو لمبے چوڑے اور خونخوار بلڈاگ کتے اپنے جبڑے کھول کر احمد علی کا استقبال کرنے لگے۔ اس نے پیار سے چکارا۔ وہ قدموں میں لوٹ کر باغیچے کی طرف نکل گئے۔ عمران علی کی گھومتی ہوئی نگاہ نے دیکھا۔ حویلی کی دیواروں پر خاردار تار لگے ہوئے تھے جن میں شاید کرنٹ دوڑ رہا تھا کیونکہ کچھ مُردہ پرندوں کے وجود کہیں کہیں جھولتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دو مسلح محافظ باغیچے میں اور ایک چھت پر ٹہل رہا تھا۔ حفاظتی انتظامات کے باوجود احمد علی خوف زدہ تھا۔

''اس نے کیا کارروائیاں کیں؟'' عمران علی نے خواب گاہ سے ملحقہ بیٹھک میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

احمد علی خوف زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر کھڑکیوں سے باہر جھانک کر بولا۔ ''سب سے پہلے اس نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں صرف یہ لکھا تھا کہ..... ''تم سانپ ہو، تمہارا سر کچلنا میرا فرض ہے۔'' پھر میری کار کی سیٹ پر ایک مُردہ سانپ ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد ایک نقاب پوش نے دن کے وقت متعدد بار میرا تعاقب کیا۔ دو بار میں گولی کا نشانہ بنتے بنتے بچا۔ ایک بار گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میرا پاؤں کیلے کے چھلکے سے پھسل گیا تھا، کیلے کے چھلکے کا اچھا نتیجہ پہلی مرتبہ میرے سامنے آیا۔ میں اس حویلی میں آ گیا تو وہ بھی سراغ لگاتے ہوئے آ گیا اور دو بار حویلی میں آ گھسا لیکن کامیاب نہ ہوا اور بھاگ گیا۔'' احمد علی کا سانس پھول گیا اور اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ''اب میں آ گیا ہوں، دشمن کو آپ تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' محافظ عمران علی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ اس وقت سرد ہوا کے تیز جھونکے دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرانے لگے۔ ماحول پر دہشت سی طاری ہو گئی۔

☆☆☆

رات کے وقت ڈائننگ ٹیبل پر عمران علی کی ملاقات وردی میں ملبوس انسپکٹر کامران علی سے ہوئی۔ وہ ابھی ابھی حیدر آباد سے اپنے بھائی احمد علی کے ہاں آیا تھا۔ وہ پولیس

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا شمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

انسپکٹر تھا اور اپنے بھائی کے نامعلوم دشمن کو پکڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ کھانے کے بعد احمد علی نے اپنے بھائی اور اپنے دوست جلیل صدیقی کو درپیش خطرے سے آگاہ کیا۔ جلیل صدیقی صاحب، احمد علی کے بچپن کے دوست تھے۔ وہ کراچی سے لاہور کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئے تھے۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہی ادھر چلے آئے۔

جلیل صدیقی اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرم جوشی سے انسپکٹر کامران علی اور عمران علی سے مصافحہ کیا اور اس خطرناک آدمی کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، میرے پیارے دوست سے اسے کیا دشمنی ہے؟ وہ کیوں اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟''

''ہوسکتا ہے بھائی صاحب نے کوئی ایسا فیصلہ دوران سروس سنایا ہو جو اسے پسند نہ آیا ہو۔'' انسپکٹر نے ٹہلتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ ''بعض لوگ انتہا پسندانہ جذبات کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں۔ بہرحال اب میں ان کی حفاظت کے لیے چھٹی لے کر یہاں آگیا ہوں اور یہ صاحب، عمران علی بھی گارڈ کی حیثیت سے فریضہ انجام دیں گے۔ چہرے سے ہوشیار اور دلیر معلوم ہوتے ہیں۔''

انسپکٹر کامران انہیں لے کر عقبی باغ کے وسط میں واقع سوئمنگ پول کے قریب گھنے درختوں کے پاس لے آیا۔ ''یہاں نشانہ بازی کی مشق کی جاسکتی ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے لائسنس والے ریوالور سے فائر کر کے ایک سیب کو زمین پر گرادیا۔ انسپکٹر کامران کی کارروائی دیکھ کر عمران علی مسکرایا اور زمین پر بیٹھ کر گارڈ ریوالور والتھر اسکاٹ سے مسلسل فائر کرتے ہوئے نصف دائرے کی صورت میں گھوم گیا۔ درختوں کی شاخوں سے کئی سیب زمین پر گر کر لڑھک گئے۔ احمد علی حیرت زدہ نگاہوں سے عمران علی کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی مہارت سے محظوظ ہوا۔ انسپکٹر کامران نے بھی پُرتحسین نگاہوں سے عمران علی کو سراہا۔

اس وقت جلیل صدیقی صاحب آگے بڑھے اور درختوں کے قریب جا کر زمین پر بکھرے سیب اٹھانے لگے پھر واپس ہوئے اور تالاب کے کنارے لگی میز پر رکھی باسکٹ سے چاقو اور پلیٹیں نکالنے لگے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سرخ سرخ لذیذ سیب کاٹتے ہوئے ٹکڑے پلیٹوں میں سجا دیے۔ ''آیئے حضرات۔'' صدیقی صاحب نے بازو گھماتے ہوئے کہا۔ وہ شغل کے موڈ میں تھے۔ وہ لوگ بھی ریلیکس ہو کر میز کی طرف بڑھنے لگے۔

عمران علی بھی مسرور ہو کر میز پر بیٹھا۔ احمد علی نے ٹکڑا اٹھاتے ہی انہوں نے بھی آغاز کیا۔

اچانک عمران علی کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا ہاتھ رک گیا اور وہ پلیٹ میں رکھے زرد رنگ سیب کے ٹکڑے نکالنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سرخ سرخ دھبے سے جم گئے۔

☆☆☆

سیبوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد احمد علی نے مینگو جوس کے ڈبے منگوائے۔ اب وہ لوگ اپنے آپ کو اور زیادہ فریش محسوس کررہے تھے پھر ایک الو کی منحوس آواز سن کر انسپکٹر کامران اور عمران علی اٹھ کھڑے ہوئے اور حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے چکر کاٹنے لگے۔ حفاظتی انتظامات تسلی بخش تھے۔ حویلی کے دروازے، راہداریوں اور اہم مقامات پر سی سی ٹی وی فوٹیج کیمرے بھی نصب تھے۔ حفاظتی کتے بھی اپنی عمدہ غذا کھانے کے بعد بڑی ہوشیاری سے عقبی باغ میں گھومتے پھر رہے تھے۔

اس طرح دو دن گزر گئے۔ وہ لمبا سیاہ پوش ادھر کا رخ نہ کر سکا لیکن تیسرے دن عقبی باغ میں صورتِ حال خطرناک ہوگئی۔ رات کا وقت تھا۔ احمد علی گیسٹرک السر کی وجہ سے بے چینی محسوس کرتے ہوئے بستر سے اٹھ کر باغ میں سوئمنگ پول کے کنارے رہائشی کیبن میں ٹھہر کر مینگو جوس پینے لگا۔ وہ اپنے آپ کو چہل قدمی کے بعد کچھ تھکا ہوا محسوس کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ بس اسی وقت باہر آگ بھڑک اٹھی۔ احمد علی کو اونگھ سی آگئی تھی رات کا وقت تھا، آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

عین اسی وقت گارڈ عمران علی نے کیبن کے اردگرد سلگتی جھاڑیوں اور تختوں کو جلتا دیکھ کر وہاں سے بھاگنے والے طویل القامت ڈرائیور سلطان کا تعاقب شروع کردیا لیکن ایک جگہ ٹھوکر لگنے سے پیچھے رہ گیا۔

انسپکٹر کامران بوکھلاہٹ، غصے اور اضطراب کے عالم میں کیبن کے سامنے پہنچا تو اللہ کی رحمت ہوئی۔ آسمان پر پھیلے سیاہ بادل نے برس کر آگ کے شعلے بجھا دیے۔ وہ اپنے بھائی کو کیبن سے نکال کر اوپری منزل کی خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی تیز نگاہیں ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے ماحول کا جائزہ برابر لے رہی تھیں۔

جیسے ہی انسپکٹر کامران احمد علی کو خواب گاہ میں بند کر کے اپنے سوائے اس کے کسی اور کے لیے دروازہ نہ کھولنے کی ہدایت کر کے راہداری میں زینے کی طرف بڑھا، عمارت

روشنی بجھ گئی۔ دشمن متحرک تو ہو ہی چکا تھا۔ کیبن کے گرد آگ دانستہ بھڑکائی گئی تھی۔ اچانک وہ کھٹکا سن کر چونک اٹھا۔

☆☆☆

جلیل صدیقی صاحب نے موبائل فون پر اپنے دوست احمد علی سے رابطے کی مسلسل کوشش کی لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا۔ حویلی میں ہونے والے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کھڑکی سے کیبن میں لگی آگ دیکھ کر وہ فون پر اپنے دوست کو پکارنے لگے لیکن ان کا فون بند تھا۔ وہ خواب گاہ کی طرف آ کے دروازہ کھٹکھٹانے لگے لیکن دروازہ نہ کھلا۔ احمد علی خوف زدہ تھا۔ اس نے دروازہ نہ کھولا۔ آگ کے شعلے اسے اب بھی اپنے اردگرد بھڑکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ باہر کی ہر آہٹ پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگتی تھی۔ جلیل صدیقی صاحب مایوس ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆☆☆

کچھ دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی اس کے بھائی انسپکٹر کامران کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔ ''میرے بھائی! خواب گاہ سے باہر نکل آؤ۔ میں تمہیں حویلی کے تہ خانے میں چھپا دوں۔ خطرناک دشمن خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ وہ اس طرف آ رہا ہے۔''

بھائی کی آواز سن کر وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا.... باہر اندھیرا تھا۔ صرف کھڑکیوں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ بھائی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اچانک راہداری کے ایک کھلے دروازے سے اس کے بھائی نے ہاتھ تھام کر اسے اندر دھکا دے دیا۔ اندر گیس لیمپ جل رہا تھا۔ احمد علی حیرت اور خوف سے اچھل پڑا پھر جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

کمرے میں دروازے کے سامنے اس کا بھائی انسپکٹر کامران فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ غصے اور اضطراب سے ساتھ لانے والے کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گارڈ عمران علی تھا جو کامران کی آواز میں بول کر اسے خواب گاہ سے نکالتے ہوئے یہاں لے آیا تھا۔ دروازے سے باہر وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا پھر وہ آگے آگے چلنے لگا۔ احمد علی اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ ''کون ہو تم؟ تم نے کیوں دھوکے سے مجھے خواب گاہ سے نکالا اور میرا بھائی کیوں زخمی بے ہوش پڑا ہے؟''

''ذرا صبر سے کام لو، ابھی بتاتا ہوں۔'' گارڈ عمران علی نے تیزی سے بیرونی دروازہ بند کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ اس وقت احمد علی چونک اٹھا۔ یہ کمرا گارڈ عمران علی کو دیا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر لگی تصاویر دیکھ کر احمد علی حیرت اور خوف سے لرز اٹھا۔

''تت.....تم.....تم.....کون ہو؟'' وہ ہکلا کر بولا۔

''احمد علی! ان تصاویر کو پہچانو، یہ میری بہن فرزانہ کی تصویریں ہیں۔'' احمد علی پھٹی، پھٹی نظروں سے تصاویر کو گھورنے لگا۔ اس کا سر جھک گیا۔

''میں بدنصیب فرزانہ کا بھائی عمران علی ہوں۔ ہم لوگ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ وہاں ساتھ والے کرائے کے گھر میں آ کر ٹھہرے۔ میری بہن تمہارے عشق کے چکر میں پھنس گئی۔ تم نے اس پر نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا۔ وہ دیوانی ہو رہی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ احمد علی جو بظاہر خوب صورت اور اسمارٹ نوجوان ہے بہت سی لڑکیوں کو چکر دے کر برباد کر چکا ہے تو اس نے تمہیں دھوکا دینے پر ذلیل کیا۔ تم نے غصے کے عالم میں اسے پھل کاٹنے والے چاقو سے ہلاک کر دیا۔ جب میں گھر پہنچا تو اس کی خون آلود لاش ڈائننگ ٹیبل پر پڑی تھی اور اس کے خون آلود ہاتھوں سے گرنے والے خون سے باسکٹ کے زرد سیب سرخ دکھائی دے رہے تھے۔ اس لیے میں باغ میں سرخ سیب دیکھ کر خائف ہو گیا تھا اور زرد سیب کھایا تھا۔

''تم حیدرآباد سے بھاگ کر کراچی چلے گئے۔ حلیہ بدل کر وکالت کی کلاسیں اٹینڈ کرنے لگے، پھر جج بنے، پھر ایک حادثے کے باعث جلد ہی ریٹائر ہو کر لاہور آ بسے۔ میں مسلسل تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔ لاہور میں، میں نے تمہارا سراغ لگا لیا۔ کراچی میں تم میرے ہاتھ سے بچ نکلے تھے۔ کیبن کے گرد آگ میں نے بھڑکائی لیکن تم اتفاقاً بچ نکلے۔ احمد علی! میں نے تمہیں بیس برس تک تلاش کیا ہے، اب پوری بیس گولیاں تمہارے جسم میں اتاروں گا۔'' ان الفاظ کے ساتھ عمران علی نے فائر کھول دیا۔ ایک گولی احمد علی کی پیشانی پر لگی، دوسری چھاتی پر، تیسری بازو پر، احمد علی چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ پھر مزید گولیاں لگتی چلی گئیں۔ عمران نے کئی بار ریوالور لوڈ کیا۔ انسپکٹر کامران کو ہوش نہ آ سکا۔ سر کی چوٹ گہری تھی۔

احمد علی کی لاش بیس گولیاں لگنے سے انتہائی بھیانک حالت میں خون اگل رہی تھی۔ عمران علی باہر نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

⌘⌘⌘

ساشا

عمر عبداللہ

چھٹا حصہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں سنہرے خواب تھے جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

''کیا ہم کسی تفریحی دورے پر جارہے ہیں؟'' نظریں ایک رخ پر جمائے بولتے ہوئے اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی برہمی تھی۔

''امیرِ محترم کی خصوصی ہدایات پر انہیں قافلے میں شامل کیا گیا ہے۔'' سلیمان جو اس کی نظروں کا زاویہ دیکھ چکا تھا، کہاروں کے شانوں پر موجود پالکیوں کی موجودگی پر دھیمی آواز میں وضاحت دینے والے انداز میں بولا۔

''ان پالکیوں میں کون ہے؟'' اس کے لیے یہ صورتِ حال اتنی ناگوار تھی کہ امیر کا حوالہ سننے کے باوجود اپنے لہجے میں تبدیلی نہ لاسکا۔

''امیرِ محترم کی چہیتی زوجہ ارسلہ خاتون اور امیر زادی حورم۔'' سلیمان نے اس کے سوال کا جواب دیا اور مزید تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''میری اطلاع کے مطابق امیر زادی حورم کے بے حد اصرار پر امیر نے انہیں اس مہم پر ساتھ لے جانے کی حامی بھری ہے۔ پہلوٹی کی اولاد ہونے کے سبب امیر زادی حورم ان کی بہت چہیتی اور لاڈلی اولاد ہیں۔ امیر کو معلوم ہے کہ لوئیس والے معاملے میں امیر زادی کی سخت دل آزاری ہوئی ہے۔ ایسے میں یقیناً ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مسلسل سیاہ ماتمی لباس اپنا لینے والی اپنی عزیز بیٹی کی خواہش کو رد کر سکیں، اس لیے انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اجازت دے دی۔''

''اور ارسلہ خاتون.....؟'' وضاحت طلب کرتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

''ان کے اور امیر زادی کے درمیان ہمیشہ مسابقت جاری رہتی ہے۔ ایک کو لاڈلی بیٹی ہونے پر ناز ہے تو دوسری کو محبوب بیوی ہونے کا زعم۔ چنانچہ دونوں ہی کسی نہ کسی طور امیرِ محترم سے اپنی بات منوانے میں کامیاب رہتی ہیں۔'' سلیمان نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تمہیں مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے سلیمان کہ ہمیں ایک طویل سفر بہت تیزی سے طے کرنا ہے۔ ایسے میں یہ پالکی سوار خواتین ہماری رفتار کے لیے مسئلہ بن جائیں گی۔'' اس بار اس نے قدرے تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں خواتین کو گھڑ سواری کی بھی مہارت حاصل ہے۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئی، یہ خواتین پالکیاں چھوڑ کر گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوجائیں گی۔'' سلیمان کی دی گئی تسلی کے بعد اس کے پاس گنجائش نہیں تھی کہ وہ مزید اعتراض اٹھاتا، اس لیے ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے امیر ارغل سمیت پورا قافلہ روانہ ہوگیا۔ روانہ ہونے والے قافلے کے ساتھ سلیمان بھی موجود تھا۔ البتہ ساشا اور اس کے چند ساتھیوں پر مشتمل ایک چھوٹے قافلے نے ذرا توقف کے بعد سفر کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ موجود ساتھیوں میں امیر سالک کے مکان پر حملہ کرنے والا سردار سیف الدین بھی شامل تھا۔ اسی نے سب سے زیادہ ساشا کی اس تجویز کی حمایت کی تھی کہ ایک چھوٹا دستہ اصل قافلے سے ذرا ہٹ کر چلے تاکہ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے نمٹنے میں آسانی رہے۔ کچھ لوگوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے دلیل دی تھی کہ قافلے کے بیشتر افراد فنونِ حرب سے آشنا اور بہادر مرد ہیں اس لیے ایسی کسی احتیاطی تدبیر کی چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن ان کا یہ اختلاف امیر کی حمایت کے باعث موثر ثابت نہیں ہوسکا تھا۔ مختصر عرصے میں اپنی اہلیت ثابت کردینے والے ساشا کی تجویز کو رد کردینا امیر کے لیے ممکن نہیں ہوسکا تھا اور اب وہ اپنے دستے کے ساتھ اصل قافلے سے فاصلہ رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت جلد قافلہ صحرا میں داخل ہوگیا اور بے ساختہ ہی اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اپنی جان کے دشمنوں سے بچنے کی خاطر اس ظالم صحرا میں تن تنہا پھنس گیا تھا۔ ابوبکیٰ کے آدمیوں کا اسے وہاں سے گرفتار کرکے قصر پہنچانا اس کی زندگی کا چلن بدلنے کا سبب بن گیا تھا۔ بہرحال... ساشا کی بہادری، چستی اور ذہانت کو شکست دینا آسان نہیں تھا۔

''تم خوش قسمت انسان ہو دوست کہ اجنبی ہونے کے باوجود امیر کے دل میں اتنی تیزی سے جگہ بنانے میں کامیاب رہے ہو۔ تمہاری ترقی کی رفتار حیرت انگیز ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ گزرے کل میں تم میری سربراہی میں امیر سالک کے مکان پر حملہ کرنے والے دستے کا حصہ تھے اور آج میں تمہاری سربراہی میں سفر کرنے والا ایک ماتحت ہوں۔'' ان کی رفتار اصل قافلے کی نسبت سست تھی اس لیے سیف الدین کو اس کے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتے ہوئے گفتگو کا موقع مل گیا۔

''یہ صرف خوش قسمتی نہیں، اہلیت کا معاملہ ہے۔ میں نے امیرِ محترم کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کرکے ان کے دل میں مقام بنایا ہے۔'' اس نے اپنی مخصوص بے نیازی سے جواب دیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں لیکن ہر کوئی اس بات کو تسلیم

کرلے، یہ ضروری نہیں۔ کئی ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے تمہاری اس ترقی پر حسد محسوس کیا ہوگا۔''

''تم تو ان حاسدین میں شامل نہیں ہو نا؟'' اس نے غیر سنجیدہ لہجے میں سیف الدین سے دریافت کیا۔

''بالکل نہیں۔ وقت پڑنے پر تم آزما سکتے ہو۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا۔

لیکن ساشا اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نظریں کہیں بہت دور بھٹک رہی تھیں اور حواس یوں چوکنا تھے جیسے کوئی جانور اپنے اردگرد خطرے کی آہٹ پاکر چوکنا ہوگیا ہو۔ اس نے بے ساختہ ہی اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے رکنے پر مجبور کردیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم میرے ساتھ آؤ'' اس نے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور سیف الدین کو ہدایت دے کر دوڑتا ہوا قریب موجود ایک بلند ٹیلے کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے وہ بندروں کی سی پھرتی سے ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ سیف الدین نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ معمولی سے فرق سے وہ دونوں ٹیلے کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔

''اوہ میرے خدایا! یہ تو لگتا ہے کسی نے ہمارے قافلے پر حملہ کردیا ہے۔'' اس کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑاتے سیف الدین کی آنکھوں نے بالآخر اس منظر کو پالیا جس کے خدشے نے ساشا کو ٹیلے پر چڑھایا تھا۔

''ہمیں فوری طور پر مدد کے لیے پہنچنا ہوگا۔'' وہ جتنی تیزی سے ٹیلے پر چڑھا تھا، اس سے دگنی تیزی سے نیچے اترا۔ اگلے ہی لمحے وہ گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ سواروں کی خواہش جان کر ان کی رانوں کے نیچے دبے گھوڑوں نے بھی مستعدی کا ثبوت دیا اور ایسی برق رفتاری سے جھڑپ کے مقام پر پہنچے کہ حملہ آوروں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا اور وہ اس کے ساتھیوں کے تیروں کی بارش کی زد میں آگئے۔ ان تیروں میں کچھ تیر ایسے بھی تھے جن کے سروں پر شعلے لپک رہے تھے۔ یہ تیر ہلاکت سے زیادہ دہشت پھیلا رہے تھے اور اپنے ہدف کو آگ کا گولہ بنا کر رکھ دینے کی خصوصیت کے باعث بہت زیادہ موثر تھے۔ حملہ آور بہت جلد بدحواس ہوگئے اور ان کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ساشا اور اس کے ساتھیوں کی پھرتی اور حکمتِ عملی انہیں اس کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہونے دے رہی تھی۔ دوسری طرف اہلِ قافلہ کو بھی مدد مل جانے سے سنبھالا لینے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ تلواریں سونت کر بھاگتے ہوئے حملہ آوروں پر پل پڑے تھے۔ ساشا اور اس کے ساتھیوں نے بھی اب تیر کمان کے بجائے تلواریں سنبھال لی تھیں۔ یہ تلواریں گاجر مولی کی طرح حملہ آوروں کو کاٹ رہی تھیں۔ صاف نظر آرہا تھا کہ حملہ آوروں کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ انہیں اس حال تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرنے والا ساشا کسی شیر کی طرح بڑھ چڑھ کر حملے کرنے کے ساتھ ساتھ پورے منظر کو اپنی عقابی نظروں میں بھی رکھے ہوئے تھا، چنانچہ وہ چھوٹی سی ٹولی فوراً اس کی نظروں میں آگئی جو سپاہیوں کو چھوڑ کر اس جانب بڑھ رہی تھی جہاں خواتین کی پالکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کا مقصد بھانپ گیا۔ مردوں کے ہاتھوں زک اٹھانے کے بعد حملہ آور خواتین کو یرغمال بنا کر ہاری ہوئی بازی کا پانسا پلٹنا چاہتے تھے۔ ان کی اس مکاری پر دانت کچکچاتے ہوئے اس نے اپنے گھوڑے کا رخ بدلا اور سب سے کنی کتراتا ہوا اس مقام پر پہنچا۔

اتنی سی دیر میں حملہ آور ٹولی پالکیوں کے گرد پہرا دینے والے دو افراد کو پچھاڑ چکی تھی البتہ حورم کا خاص خدمت گار خواجہ سرا سنبل اب بھی پوری طرح ڈٹا ہوا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ حورم کی پالکی کے قریب جاسکے، البتہ ارسلہ خاتون کی پالکی ان کے گھیرے میں آچکی تھی۔ وہ برق کی طرح پالکی کو گھیرے میں لیے ہوئے افراد کی طرف لپکا۔ اس کی تلوار کو بیک وقت تین تلواروں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا لیکن وہ کسی طور ان کے مقابلے میں کمزور محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک طرف اس کی تلوار کسی تلوار سے ٹکراتی تھی تو دوسری طرف وہ ڈھال پر کسی وار کو روکتا تھا۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں اور مقابلین کے للکارے دہشت ناک محسوس ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ تو جیسے کھیلوں کے کسی مقابلے میں شامل تھا۔

کھیل ہی کھیل میں اچانک اس کی تلوار برق کی طرح کوندی اور اس پر حملہ کرنے والا اپنے ہاتھ کو تلوار سمیت نیچے گرتا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کی حیرت کا یہ عالم تھا کہ فطری ردعمل دینا بھی بھول گیا تھا۔ ساشا نے اس کے چیخنے کی آواز اس وقت سنی جب وہ خود کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے حملہ آور کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ ایک کے ناکارہ ہوجانے کے بعد اس پر سے دباؤ نسبتاً کم ہوگیا تھا اور اب اس کے مقابل دو تلواریں تھیں۔ شمشیر زن اپنے ساتھی کا حال دیکھ کر

اشتعال میں آگئے تھے یا پھر انہیں اپنی جان کے لالے پڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے جو ان کے حملوں میں مزید شدت آگئی تھی۔ وہ بڑی مہارت سے خود کو ان کے واروں سے بچاتا ان کے مقابل ڈٹا ہوا تھا۔ اسی کی طرح خواجہ سرا سنبل بھی استقامت کا مظاہرہ کررہا تھا اور اس نے اپنے حریف کی یہ خوش فہمی دور کردی تھی کہ وہ ایک خواجہ سرا کو آسانی سے شکست دے دے گا۔ ان کے چہرے صحرائی خاک سے اٹ چکے تھے اور منہ سے وحشت ناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

دوسری طرف لڑائی کا نقشہ بالکل بدل چکا تھا۔ حملہ آور یہ بھانپنے کے بعد کہ لڑائی جاری رکھنا تو دور کی بات، ان کے پاس فرار کی گنجائش بھی نہیں رہی، سفید جھنڈے لہرانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی تلواریں بھی پھینک دیں۔ یہ صورت حال ساشا اور سنبل کے مقابل ڈٹے افراد کے لیے مایوس کن تھی۔ انہوں نے بھی تلواریں پھینک دیں۔ اب لڑائی جاری رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔

امیر ارغل کی طرف سے حکم جاری ہوا اور ساشا سمیت سب نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ تاہم وہ شکست خوردہ حملہ آوروں کے گرد اس طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے کہ ان میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ فرار یا کسی غلط جنبش کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ جلد ہی ان کی پھینکی گئی تلواروں کو اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ایسی ہر شے سے محروم کرکے، جو کسی بھی طرح ہتھیار کے زمرے میں آتی تھی، ایک قطار میں کھڑا کردیا گیا۔

امیر ارغل دونوں ہاتھ پشت پر باندھے قطار میں کھڑے افراد کا جائزہ لینے کے لیے دائیں سے بائیں حرکت کرنے لگا۔ ان جھکی ہوئی نظروں والے چہروں میں سے کئی چہروں کو وہ شناخت کرسکتا تھا۔ یہ سارے وہ نمک حرام تھے جو اس سے تنخواہیں وصول کرکے ابوبکیٰ سے وفاداری نباہتے رہے تھے اور اب ان میں حوصلہ نہیں تھا کہ اس کے سامنے نظریں اٹھا سکیں۔ ان افراد سے ہٹ کر غیر شناسا چہروں پر سجی آنکھوں میں بھی خوف و ہراس کی کیفیت تھی اور وہ شکست کے بعد کے انجام کی فکر میں مبتلا نظر آتے تھے۔ یہ امیر سفیان کے ساتھی تھے۔

''ابوبکیٰ کہاں ہے؟'' اسے ان دونوں طرح کے افراد سے زیادہ جس فرد واحد سے دلچسپی تھی اس کی دید کی بے تابی نے اسے اپنا جائزہ مکمل نہیں کرنے دیا اور گونجتی ہوئی آواز میں بے چینی سے استفسار کیا۔ اس استفسار پر پچھلی قطار میں کھڑے ایک بھاری چہرے اور چھوٹی آنکھوں والے شخص نے خود کو اپنے آگے کھڑے دراز قد آدمی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔ قیدیوں کی پشت پر ٹہلتے سیف الدین نے اس کی اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور اس کی گردن کو اپنے مضبوط ہاتھ میں دبوچ کر اتنی قوت سے امیر کے آگے دھکیلا کہ وہ جو پہلے ہی خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا، اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور امیر کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔

''معاف کردیں امیر محترم! بخش دیں میری خطا۔''

وہ فوراً ہی امیر کے جوتوں پر اپنا سر رگڑتا معافی کے لیے آہ و بکا کرنے لگا۔

''کیا تجھے لگتا ہے کہ تیرا گناہ قابل معافی ہے؟'' امیر ارغل قہر ناک لہجے میں بولا اور پاؤں کی زوردار ٹھوکر اس کے سر پر رسید کی۔

''مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے امیر محترم! میں بھٹک گیا تھا۔ میری آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔'' ٹھوکر کھانے کے باوجود اس نے امیر کے قدموں سے دور ہٹنے کی کوشش نہیں کی اور بلکتے ہوئے فریاد کرنے لگا۔

''میں نے مانا کہ میں خطا کار و گناہ گار ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میری جاں بخشی کردیں گے کہ میں آپ کے قدموں میں گرا اعتراف کررہا ہوں کہ میں اپنی ہر غلطی پر آپ کے سامنے نادم اور شرمسار ہوں۔'' خاک آلود چہرے اور سر کے ساتھ امیر کے قدموں میں جاں بخشی کے لیے لوٹتا وہ شخص ابوبکیٰ لگتا ہی نہیں تھا جو کبھی پورے کروفر سے اپنی مسند پر بیٹھا کرتا تھا اور اس کے ایک اشارۂ ابرو پر لوگوں کی زندگی و موت کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔

''تو ایک نہایت عیار و مکار، غدار ہے اور تیرے جیسے شخص کے لیے ہمارے پاس فقط اپنی تلوار کا یہ وار ہے۔'' امیر ارغل نے یکدم ہی اپنی نیام سے تلوار نکال کر ابوبکیٰ کی گردن پر وار کردیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ سر تن سے جدا ہوگیا۔ ابوبکیٰ کی کٹی ہوئی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور امیر کے جوتوں کو بھگو گیا۔ آس پاس کھڑے لوگ دم بخود ظالم، مغرور اور جابر ابوبکیٰ کے خون اگلتے سر اور دھڑ کو دیکھتے رہے۔ وہ جو کبھی امیر کی ناک کا بال ہوا کرتا تھا، اتنا ارزاں ہوچکا تھا کہ اس کا خون ریت میں ملتے دیکھ کر بھی امیر کے چہرے پر تاسف کا کوئی رنگ نہ تھا۔

''غدار ہر صورت میں ناقابل معافی ہے۔'' ابوبکیٰ کا پھڑکتا جسم ساکت ہوا تو امیر نے اس پر تھوکتے ہوئے نفرت

سے کہا اور باقی قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان سب کے سامنے ابویحییٰ کا انجام تھا۔ امیر کی ایک نظر سے ہی ان کی روح فنا ہونے لگی۔ وہ روتے بلکتے رحم کے لیے درخواست گزار ہوئے لیکن امیر کے چہرے پر نرمی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ ساشا دور کھڑا اس صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس موقع پر وہ حرکت میں آیا اور امیر کے سامنے جا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ امیر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر ناگوارِ خاطر نہ گزرے تو میں امیر محترم کے حضور ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت امیر کا مزاج کس قدر برہم ہے، اس لیے بہت احتیاط سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اجازت ہے۔“ مزاج کس قدر بھی برہم سہی، درخواست کرنے والا ساشا تھا جس کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف ایک طرف، شخصیت کی سحر انگیزی بھی ناقابلِ انکار تھی اور امیر کو بھی یہ سحر انگیزی متاثر کرتی تھی۔

اجازت ملنے پر وہ اپنے اور امیر کے درمیان باقی چند قدم کا فاصلہ پاٹ کر اس کے قریب پہنچا اور سرگوشی میں اس سے کوئی بات کہی۔ امیر نے ایک نظر گرفتار شدگان کی طرف دیکھا اور جواب میں اس سے کچھ کہا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان مزید بھی مکالمہ ہوا۔ دونوں ہی کی آوازیں اتنی دھیمی تھیں کہ کسی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قیدیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ آخر کار گفتگو کا یہ سلسلہ ختم ہوا اور ساشا دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے پیچھے ہٹنے کے بعد امیر نے ایک بار پھر اپنا رخ قیدیوں کی طرف کیا اور بلند آواز میں بولا۔

”اب سے کچھ لمحے پہلے ہم تم سب کی موت کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے لیکن ہمارے نوجوان سپاہی کے ایک مشورے نے تمہارے لیے یہ موقع پیدا کر دیا ہے کہ تم چاہو تو اپنی زندگیاں بچا سکتے ہو۔“

”ہم یہ موقع ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہیں گے۔“ امیر ارغل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ان میں سے کئی بیک وقت چلا اٹھے۔

”یہ قیمت تمہیں ایک عہد کی صورت ادا کرنی ہوگی۔“

”ہم ہر عہد دینے کو تیار ہیں۔“ زندگی کی امید پیدا ہوتے ہی وہ سب پُرجوش ہو گئے تھے۔

”تو پھر تیار ہو جاؤ۔ آج ہم اپنے آباء و اجداد کی تاریخ کو دہرانے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے درمیان ایک نہایت قدیم رسم انجام دی جائے گی اور ہم جانتے ہیں کہ بھلے سے ہمارے درمیان یہ رسم ترک ہو چکی ہے لیکن اس خطے کا ہر فرد اس رسم کی اہمیت کو جانتا اور مانتا ہے۔“ امیر کی سنجیدگی میں کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ جو ایک قہرناکی سی اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی، وہ کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ایک ذاتی خادم کو حکم دیا کہ چینی کا بڑا سا پیالہ حاضر کیا جائے۔ پیالہ آنے تک وہ قیدیوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔ کسی چہرے پر مکمل آمادگی تھی، تو کوئی متذبذب نظر آتا تھا۔ ایک آدھ کے چہرے پر انکار بھی لکھا تھا۔ آخر ایک سلگتی آنکھوں والا جوان آگے بڑھا۔ ضبط اور لہجے کو مؤدبانہ رکھنے کی کوشش کے باوجود ایک دبا دبا سا غصہ تھا جو اس کے الفاظ میں اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ امیر محترم اپنی پیش کی گئی تجویز پر نظرِ ثانی کریں۔ امیرِ محترم خود اعتراف کر چکے ہیں کہ ہمارے درمیان اب یہ رسم ترک ہو چکی ہے اور اس کی وجہ بھی امیر محترم خوب جانتے ہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ......“

”خاموش۔“ نوجوان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی امیر کا ہاتھ بلند ہوا اور اس کی گرجتی ہوئی آواز وہاں موجود ہر شخص نے سنی۔

”ہم یہاں مذہب کی نہیں، رسم و رواج کی بات کر رہے ہیں اور کچھ رسم و رواج ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق مذہب سے زیادہ خطۂ زمین سے ہوتا ہے۔ اس خطۂ زمین کا کوئی بیٹا اس رسم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ جسے انکار ہے اسے اجازت ہے کہ وہ اس میں حصہ نہ لے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھے کہ پھر اس کے بعد ہمارے پاس اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہے گی اور ہم اس کے لیے ہر فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔“

امیر کے اس جواب کے بعد نوجوان کے لیے مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کی آنکھوں کی سلگتی ہوئی کیفیت برقرار تھی۔ نوجوان کے پیچھے ہٹنے کے بعد امیر نے رسم کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے سب سے عمر رسیدہ قیدی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ قیدی جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور پیالے کے اوپر رکھا خنجر اٹھا کر اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ہلکا سا چیرا لگایا۔ انگوٹھے سے خون کے قطرے بہنے لگے۔ وہ ان بہتے قطروں کو پیالے میں گرانے لگا۔ خون کی کچھ مقدار پیالے میں جمع ہونے کے بعد وہ انگوٹھے کے زخم کو دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے دبا کر خون کا بہاؤ روکتے ہوئے مؤدبانہ پیچھے

ہٹ گیا۔ اس کے بعد سارے قیدی ایک کے بعد ایک آگے آتے رہے اور باری باری اس عمل کو دہرا کر پیچھے ہٹتے رہے۔ اعتراض کرنے والے نوجوان نے اس عمل میں حصہ نہیں لیا اور ایک جانب بے نیازی سے کھڑا رہا۔ آخری قیدی کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد امیر ارغل نے بہ نظرِ غائر اس نوجوان کو دیکھا اور اسے آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہ پا کر بظاہر اس پر سے توجہ ہٹالی۔

اب وہ چینی کے اس پیالے کی طرف متوجہ تھا جو نصف سے زائد تازہ انسانی خون سے بھر چکا تھا۔ پیالے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بھی قیدیوں کی طرح خنجر اٹھا کر اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو زخمی کیا اور خون پیالے میں گرانے لگا۔ خون کی کچھ مقدار پیالے میں گرا کر وہ پیچھے ہٹا اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس شخص نے دونوں ہاتھوں سے بہ احتیاط پیالہ تھاما اور ایک قطار میں کھڑے قیدیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے پیالہ قطار میں کھڑے پہلے قیدی کے ہونٹوں سے لگایا۔ انسانی خون کی بو کو محسوس کر کے اسے بے ساختہ ہی ابکائی آئی لیکن پھر کسی نہ کسی طرح اس نے طبیعت پر جبر کر کے پیالے سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھر لیا کہ اسے معلوم تھا دوسری صورت میں اس کے پاس موت واحد انتخاب رہ جائے گا۔ دوسرے قیدی بھی طوعاً و کرہاً اس مرحلے سے گزر گئے۔ رسم میں حصہ نہ لینے والا نوجوان چہرے پر حقارت لیے طنزیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھتا رہا۔ اب وہ سب اپنا ایک ایک ہاتھ بلند کیے بہ آوازِ بلند حلف اٹھا رہے تھے۔

''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے خون میں شامل ہو جانے والے امیر ارغل کے خون سے ہمیشہ وفاداری نبھائیں گے۔ خون کا یہ رشتہ دوسرے ہر تعلق اور مفاد پر حاوی رہے گا۔ ہم ہمیشہ امیر ارغل کے فرمانبردار رہیں گے اور ان کے پسینے پر اپنا خون بہانے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے۔ امیر کی جان و عزت ہماری جان و عزت پر مقدم ہوگی۔''

اس عہد کے بعد ایک بار پھر وہ باری باری آگے آئے اور امیر ارغل کی قدم بوسی کر کے پیچھے ہٹتے رہے۔ اب وہ ایک بار پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور نظریں جھکا کے قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ رسم میں حصہ نہ لینے والا نوجوان ان سب سے الگ سر اور نظریں دونوں اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔

''تمہارے ساتھیوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زندگیاں محفوظ کر لیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم ہم سے اپنی بے وقوفی کا کیا صلہ چاہتے ہو؟'' امیر ارغل جو اس رسم کی ادائیگی کے بعد بہت خوش نظر آتا تھا اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے نخوت سے پوچھنے لگا۔

''موت زندگی کی وہ حقیقت ہے جس سے کسی صورت مفر ممکن نہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک نہ ایک دن ہر ذی روح کو موت سے گلے ملنا ہوگا اس لیے میں ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینا بے وقوفی نہیں، مردانگی سمجھتا ہوں۔'' نوجوان نے جس بے باکی سے امیر ارغل کی بات کا جواب دیا، وہ بے باکی ساشا کے دل کو چھو گئی اور اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ کر لیا۔

''تم جانتے ہو کہ ہم چاہیں تو تمہیں تمہاری اس گستاخی کی سزا دینے کے لیے تمہارے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں تمہاری تکا بوٹی کروا ڈالیں؟'' نوجوان کی جس بے باکی نے ساشا کے دل کو چھوا تھا، وہ امیر کے نزدیک انتہائی درجے کی گستاخی تھی چنانچہ اس کا لہجہ قہر ناک ہو گیا۔ اس سے قبل کہ پانی سر سے اونچا ہو جاتا، ساشا نے دخل اندازی کا فیصلہ کیا اور امیر کے سامنے کھڑا ہو کر مؤدبانہ بولا۔

''اگر امیرِ محترم اجازت دیں تو میں انہیں ایک مشورے سے نوازنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں نہیں۔ ہم تمہارے مشورے کے منتظر ہیں۔'' وہ ساشا کا پہلا مشورہ مان کر فائدے میں رہا تھا اس لیے دوسرے کے لیے کھلے دل سے اجازت دے ڈالی۔

''میرے حساب سے کسی کو ایک وار میں قتل کر کے زندگی کی قید سے نجات دلا دینا کوئی سخت سزا نہیں۔ آپ سے وفاداری کا عہد نہ کرنے والا یہ نوجوان تو ویسے بھی موت کا تمنائی نظر آتا ہے۔ اسے موت کی سزا دے کر آپ الٹا اس پر احسان کریں گے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اسے سزائے موت دینے کے بجائے غلام بنا کر زندہ رکھا جائے اور اس ذلت سے گزارا جائے جس کے خوف سے یہ اپنے ساتھیوں کی صف میں شامل نہیں ہوا۔''

''بہت خوب! ہمیں تمہارا مشورہ پسند آیا۔'' امیر نے ساشا کے مشورے کو سراہا اور نہایت فیاضی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''ہمارے خیال میں اس سرکش نوجوان کی سرکشی کو قابو میں رکھنے کے لیے تم سے زیادہ مناسب آدمی کوئی نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم اسے تمہاری غلامی میں دیتے ہیں۔''

''میں اس مہربانی کے لیے امیر کا شکر گزار ہوں۔''

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے یوں شکریے کے الفاظ ادا کیے کہ وہ کہیں سے امیر کا احسان مند نظر نہ آتا تھا اور یوں لگ رہا تھا گویا اپنی برابری کی سطح کے کسی شخص سے تحفہ وصول کر کے محض شکریے کی رسم ادا کر رہا ہو۔ یہ انداز اس کی شعوری کوشش نہیں بلکہ حکمرانی کی اس عادت کی دین تھا جو ایک سردار زادے اور پھر سردار کی حیثیت سے اس کی شخصیت میں رچ بس چکا تھا۔

''غلام کے گلے میں طوق ڈال کر اس کے پیر بیڑیوں سے باندھ دیے جائیں۔'' امیر نے حکم جاری کیا اور پلٹ کر اس عارضی خیمے کی طرف چلا گیا جو لڑائی ختم ہوتے ہی اس کے خدمت گاروں نے نصب کر دیا تھا اور فی الوقت اس میں طبیب شمس الدین آرام فرما رہے تھے۔

اس مقام پر قیام ان کے منصوبے میں شامل نہیں تھا لیکن ٹکراؤ کی وجہ سے جو صورتِ حال پیش آئی تھی، اس سے نمٹنے کے لیے مختصر قیام ضروری ہو گیا تھا۔ مرنے والوں اور زخمیوں کے سلسلے میں ضروری اقدامات انجام دینے تھے۔ عہد کی زنجیر سے قید کیے گئے قیدی اس موقع پر خوب کام آئے۔ ان قیدیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصے میں وہ قیدی تھے جنہیں قافلے کے ساتھ شامل ہو کر مُردہ اور زخمی افراد کی جگہ لینی تھی۔ یہ نسبتاً زیادہ طاقتور اور مضبوط کاٹھی کے افراد تھے جبکہ دوسرے حصے میں شامل افراد کو مرنے والوں کی تدفین اور زخمیوں کو واپس قصر پہنچانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ ان افراد کی نگرانی کے لیے امیر کے ایک قابلِ اعتماد شخص کو مقرر کیا گیا تھا جسے واپس قصر پہنچنے کے بعد بھی منتظمِ قصر کے ساتھ مل کر فیصلے کرنے تھے۔

سب کے ساتھ مل کر مختلف فرائض انجام دیتا ساشا غیر محسوس طور پر اس مقام کے قریب ہوتا چلا گیا جہاں اس کو بخشا گیا قیدی نوجوان پابہ زنجیر کھڑا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے نوجوان کے چہرے سے برستی نفرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''غلام کے نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی بھی نام سے پکارو، وہ غلام ہی رہتا ہے، تو پھر بہتر ہے کہ تم مجھے غلام کہہ کر ہی پکارا کرو۔'' اس نے اکھڑ لہجے میں ساشا کو جواب دیا۔

''غلام کو فلسفہ گھارنے اور آقا سے حجت بازی کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی، اس لیے بہتر ہے کہ تم یہ سب کرنے کے بجائے مجھے میرے سوال کا سیدھا سیدھا جواب دو۔'' اس نے جوابی غصے کا مظاہرہ کرنے کے بجائے معتدل لہجے میں اسے مشورہ دیا تو وہ چونک گیا اور ایک لمحے تک اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد آہستہ سے بولا۔

''میرا نام محمد صالح ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس نام کو حقارت سے پکارا جائے۔''

''اگر تمہیں ایسا کوئی خوف ہے تو تمہارا نام بدل دیتے ہیں۔ آج سے تمہیں فیرس کہہ کر پکارا جائے گا۔'' اس نے گویا چٹکی بجاتے مسئلہ حل کر دیا۔

''اس نام کا کیا مطلب ہے؟'' وہ متجسس ہوا۔

''اس کا مطلب فولاد ہے اور تمہارے لیے یہ نام اس لیے مناسب ہے کہ تم دیکھنے ہی میں نہیں، ہمت کے اعتبار سے بھی فولاد کی طرح مضبوط ہو۔''

''اس تعریف کے لیے غلام، آقا کا شکر گزار ہے۔'' اس کی سلگتی آنکھوں کا تاثر پہلی بار تبدیل ہوا اور وہاں ہلکی سی حیرت دکھائی دی۔

''غلام اگر اپنی اہلیت ثابت کرتا رہے تو آقا کی طرف سے محض زبانی کلامی تعریف ہی نہیں، انعام و اکرام بھی وصول کر سکتا ہے۔'' اس کا انداز امید افزا تھا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔'' محمد صالح اپنے لبوں سے پھسلنے والے اس بے ساختہ جواب پر خود بھی حیران رہ گیا۔ کچھ زیادہ دیر تو نہیں گزری تھی جب وہ غلام بنائے جانے کی تجویز سن کر اس شخص سے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا۔ وہ نفرت چند مکالموں پر مشتمل گفتگو سے کیسے اڑن چھو ہوئی تھی، اسے خود بھی یہ بات سمجھ نہیں آسکی تھی۔

''شاباش! میں تم سے یہی جواب سننا چاہتا تھا۔ میری مانتے رہے تو نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔'' اس نے صالح کا شانہ تھپکا، پھر لہجے کو قدرے تحکمانہ بناتے ہوئے بولا۔

''خواجہ سرا سنبل کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میں نے تمہیں امیر زادی حورم کی پالکی اٹھانے والے کہاروں میں شامل ہونے کی ہدایت کی ہے۔ اسے یہ بھی بتا دینا کہ میں نے تمہارا نام فیرس تجویز کیا ہے۔''

''جو حکم۔'' اس نے ساشا کی آنکھوں میں ایسا کچھ پالیا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ذلت محسوس نہیں کی اور اسی وقت چل پڑا۔ پیروں میں پڑی بیڑیوں کی وجہ سے اسے قدم اٹھانے میں مشکل پیش آرہی تھی لیکن یہ بیڑیاں ہی تو تھیں جو اس کی زندگی کی ضمانت بنی تھیں۔ اس لیے ساشا نے انہیں اتروانا ضروری نہیں سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی رفتار کو بڑھانے کے لیے بعد میں سنبل خود ان

بیڑیوں کو ڈھیلا کروادے گا۔ اسے تو بس یہ سوچنا تھا کہ جس محمد صالح کو اس نے موت کے منہ سے نکال کر اپنا غلام فیرس بنایا ہے، وہ اس کے لیے کتنا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں بیل گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ بیل گاڑی پر سوار سفید لباس والی راہباؤں کے ہچکولے کھاتے وجودوں پر ایک سہمی ہوئی سی کیفیت طاری تھی۔ انہیں ہر آن یہی لگ رہا تھا کہ اندھیرے کی چادر پھاڑ کر اچانک ہی کوئی مصیبت ان پر نازل ہوگی اور بقا کی تلاش میں نکلے ان کے وجود فنا ہوجائیں گے۔ اس مصیبت اور آفت کو ٹالنے کے لیے ان کے لب خاموشی سے دعائیہ کلمات ادا کرنے میں مصروف تھے اور آنکھیں بار بار آسمان کی طرف یوں اٹھتی تھیں جیسے وہاں سے اپنے لیے رحم طلب کررہی ہوں۔ ان خوف زدہ اور ہراساں راہباؤں کے درمیان واحد گنجی راہبہ تھی جو یہ سب کرنے کے بجائے گھٹنوں میں سر دیے چپکے چپکے روئے جارہی تھی اور اس کا جسم صرف بیل گاڑی کی حرکت ہی کی وجہ سے نہیں، اپنی ہچکیوں کی وجہ سے بھی ہل رہا تھا۔ سارہ نے کچھ دیر اس صورتِ حال کو برداشت کیا، پھر اس کے قریب کھسک کر نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''صبر کرو۔ صبر کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں لیکن یہ میرے بس میں نہیں ہے۔''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیا وہ تم سے بہت قریب تھی؟'' سارہ کو معلوم تھا کہ وہ اس عورت کے لیے رو رہی ہے جسے وہ پیچھے مُردہ حالت میں چھوڑ آئے تھے۔

''وہ میری بچپن کی سہیلی تھی۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''واقعی.....'' سارہ حیران ہوئی۔ ''کیا تم دونوں سہیلیوں نے بیک وقت راہبہ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا؟''

''نہیں۔ اس کی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ صرف مجھے بچانے کی خاطر اس مصیبت میں پھنسی تھی۔'' اس کے ہونٹوں سے ایک زوردار سسکی نکلی۔

''کیا تم مجھے یہ سب ذرا تفصیل سے بتاسکتی ہو؟''

سارہ نے بیل گاڑی کے دائیں بائیں دوڑتے گھوڑوں پر ایک نظر ڈالی۔ بیل گاڑی اور گھوڑے جس رفتار سے دوڑے چلے جارہے تھے، اسے دیکھتے ہوئے اسے یقین تھا کہ ان کی منزل کہیں قریب نہیں ہے اور ابھی انہیں خاصا سفر طے کرنا ہے۔ ظاہر ہے داؤد کی خواہش ہوگی کہ خانقاہ میں پیش آنے والے واقعات کا علم کسی کو ہونے تک وہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرلیں تاکہ تصادم کی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ لوگ وہاں سے نکلتے ہوئے راہباؤں والے کمرے کے دروازے کے علاوہ تہ خانے کا راستہ بھی بند کرآئے تھے۔ اس کے علاوہ سارے محافظوں اور خدمت گاروں کو بھی بندشوں میں جکڑ دیا گیا تھا اس لیے اس بات کا امکان تو بہت کم تھا کہ وہ لوگ خود باہر نکل کر کسی کو اس بارے میں اطلاع دے سکیں۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد یہ بات چھپی نہیں رہے گی اور فادر سے عقیدت رکھنے والے اور اس کے پشت پناہ ان کا تعاقب کرکے فادر کا انتقام لینے کے ساتھ ساتھ فرار ہوجانے والی راہباؤں کو واپس لے جانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔

''تم وہ سب سن کر کیا کروگی۔ تم تو اس بات پر شکر ادا کرو کہ اس دنیا میں تمہارے ایسے خیر خواہ موجود ہیں جنہیں تمہاری سلامتی اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے اور ان خیر خواہوں کی وجہ سے تم صرف ایک چھوٹی سی تکلیف سہنے کے بعد آزاد ہوگئی ہو۔'' اس عورت کے لہجے میں عجیب حسرت سی تھی۔

''شکر گزار تو میں واقعی ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ تمہاری داستان سن کر شکر گزاری کی اس کیفیت میں مزید اضافہ ہوجائے۔ ویسے بھی ابھی ہمیں خاصا طویل سفر طے کرنا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس طویل سفر کو تنہا رو رو کر گزارنے کے بجائے مجھ سے اپنا غم بانٹ کر گزار لو۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ بانٹنے سے غم ہلکا ہوجاتا ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ کوئی شے میرے غم کو ہلکا کرسکتی ہے لیکن میں تمہارے اصرار کو بھی رد نہیں کرسکتی، اس لیے تمہیں اپنی اور اپنی انجی کی کہانی سنا دیتی ہوں۔'' اس کا لہجہ اب بھی غمزدہ تھا لیکن آنسو رک چکے تھے یعنی کسی نہ کسی طور غم سے سنبھالا مل ہی رہا تھا۔

''اچھا تو تمہاری سہیلی کا نام انجی تھا اور خود تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''میں ماریا ہوں۔ میں اور انجی بچپن کی سہیلیاں تھیں لیکن ہماری یہ دوستی میرے والدین کو پسند نہیں تھی۔ اس ناپسندیدگی کے پیچھے طبقاتی فرق تھا۔ انجی میری آیا کی بیٹی تھی جس نے میری پرورش کی تھی۔ ملازمت پر آنے کے بعد آیا کے پیچھے اس کے گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں ہوتا تھا جو انجی کو سنبھال سکے، اس لیے آیا نے میرے والدین سے انجی کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت لے رکھی تھی۔

''بظاہر میرے والدین بہت مہذب، مہربان اور

ہمدرد لوگ تھے اس لیے انہوں نے آیا کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے اسے انجی کو ساتھ لانے کی اجازت دے دی تھی اور اپنے ظاہری تاثر ہی کی وجہ سے بعد میں بھی اس پر انجی کے سلسلے میں کوئی قدغن نہیں لگائی لیکن ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے نسلی امتیاز اور مرتبے کو فراموش کر کے میری ایک معمولی لڑکی سے دوستی کو آسانی سے قبول کر لیتے۔ وہ اس سلسلے میں مسلسل مجھے نصیحتیں کرتے رہتے تھے لیکن ایک فرمانبردار بیٹی ہونے کے باوجود میں کبھی ان کی اس نصیحت پر عمل نہیں کر سکی۔

''بچپن کے وہ خوبصورت اور فکرات سے پاک دن بہت تیزی سے گزر گئے اور میں اور انجی نوجوانی کی دہلیز پر جا پہنچے۔ عمر کے اس انوکھے موڑ پر جب دل کسی خوش رنگ تتلی کی طرح اڑنے کے لیے مچلتا ہے، مجھے ایک اندوہناک سانحے سے گزرنا پڑا۔ ایک سفر سے واپس آتے ہوئے میرے والدین اور چھوٹا بھائی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ پل پار کرتے ہوئے ان کی بکھی ایسے خطرناک دریا میں جا گری تھی کہ ان کی لاشیں بھی نہ مل سکیں۔ ان حالات میں ایک دور کے چچا اور ان کے خاندان نے مجھے بڑا جذباتی سہارا دیا اور میرے والد کی جائداد کا نظام بھی بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ والدین اور اکلوتے بھائی کی موت کا صدمہ معمولی نہیں تھا لیکن چچا کے بیٹے جوزف نے کچھ اس طور میری دلجوئی کی کہ غم سے سنبھلتے سنبھلتے میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

''یہ میری زندگی کا وہ دور تھا جب میں پہلی بار انجی سے زیادہ کسی اور کو اپنے قریب دیکھ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو ان دنوں انجی کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی اور جو کچھ تھا بس وہ جوزف تھا۔ جوزف کی محبت کی وہ پٹی اس وقت میری آنکھوں پر سے ہٹی جب میں نے اتفاقاً اس کے اور اس کے والدین کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ اس گفتگو سے مجھے علم ہوا کہ وہ لوگ نہ صرف میرے والدین اور بھائی کی موت کے ذمے دار ہیں بلکہ جوزف سے میری شادی کر کے اسے میری جائداد کا حق دار بنانے کے بعد ایک دن مجھے بھی موت سے ہمکنار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' بہت روانی سے ساری داستان سناتی وہ اس مقام پر آ کر کھو سی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت کی تکلیف نے اب بھی اسے گھیر لیا ہو اور وہ خود کو مزید کچھ کہنے سے قاصر پا رہی ہو۔ سارہ نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے ایک خاموش تسلی دی۔ اس تسلی پر اس نے ایک آہِ سرد بھری اور نمی زدہ لہجے میں گفتگو کو آگے بڑھایا۔

''ایک کم عمر اور بزدل سی لڑکی اتنے بڑے بڑے انکشافات کا بوجھ کیسے اٹھا سکتی تھی۔ محبوب کو اپنے پیاروں کے قاتل کے روپ میں دیکھنا ایسا صدمہ تھا کہ ہر رشتے پر اپنا بھروسا کھو بیٹھی اور میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ اپنی اسی کیفیت کے زیر اثر میں نے خاموشی سے اپنا گھر اور قصبہ چھوڑ دیا اور کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہاں سے نکل کر بھٹکتی بھٹکتی اس خانقاہ تک پہنچ گئی جہاں تمہاری ہم سے ملاقات ہوئی تھی۔ شاید تم اندازہ نہ لگا سکو کہ اس وقت میری ذہنی، جسمانی اور جذباتی حالت کتنی تباہ تھی۔ ایسی صورت میں جب فادر اور سسٹر میری نے مجھ سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا تو میرے لیے ان سے بڑھ کر کوئی قابلِ بھروسا انسان نہیں رہا۔ ان دونوں کی ترغیب پر ہی میں نے راہبہ بننا قبول کر لیا اور وہ سب کچھ مانتی چلی گئی جو ان دونوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے مان لیا کہ میں پیدائشی گناہ گار ہوں اور اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں نے ترکِ دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی خوبصورتی سے محروم ہونا بھی قبول کر لیا۔ فادر کے حکم پر میرے لمبے بال، بھویں اور پلکیں مونڈ دی گئیں۔

''مجھے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اپنی اس ہیئت کذائی پر کوئی افسوس بھی نہیں ہوا اور دل و جان سے اپنا وقت عبادات اور مراقبات میں گزارنے لگی۔ میں اپنے آپ میں اتنی مگن تھی کہ مجھے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کی خبر بھی نہ پروا، لیکن یہ سب کب تک برقرار رہتا۔ جب مجھ پر اصل مصیبت ٹوٹی تو میں نے جانا کہ ایک بار پھر میری معصومیت سے فائدہ اٹھا کر میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی۔ اس بار میں جذباتی ہی نہیں، جسمانی استحصال سے بھی گزری اور خانقاہ کے کرتا دھرتاؤں میں سے ایک نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔ میں نے اس ظلم کے خلاف فادر سے شکایت کی تو اس نے مجھے فلسفوں میں الجھانے کی کوشش کی اور قائل کرنا چاہا کہ خدا کے گھر کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے والوں کی ضروریات پوری کرنا بھی ثواب کا کام ہے اور ایک راہبہ کو ثواب کے سوا کیا چاہیے۔

''میں لاکھ بے وقوف سہی لیکن اس دلیل کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے بدکاری اور خدمت کے درمیان کا فرق معلوم تھا۔ اس لیے میں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے جرم میں مجھے مسلسل تین دن تک بھوکا رکھا گیا اور ساتھ ہی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر میں نے شور مچایا یا ان سے اختلاف کیا تو میری زبان کاٹنے کے ساتھ ساتھ مجھے

ہاتھ پیروں سے بھی معذور کر دیا جائے گا۔ بے بسی سے پُر ان دنوں میں جبکہ میں اپنی نجات کے لیے خودکشی کی کوئی راہ تلاش کر رہی تھی، انجی روشنی کی کرن بن کر وہاں چلی آئی۔''

''کیا وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچی تھی؟''

سارہ نے بے ساختہ سوال کیا۔

''ہاں......'' ماریا نے ایک بار پھر سرد آہ کھینچی۔

''میں نے حالات کے گرداب میں پھنس کر جس دوست کو فراموش کر دیا تھا، اس دوست نے مجھے نہیں بھلایا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ دیوانہ وار مجھے تلاش کرتی ہوئی اس زندان میں پہنچ گئی تھی جہاں میں اور مجھ جیسی بے سہارا لڑکیاں سسک سسک کر زندگی گزار رہی تھیں۔''

''انجی نے تمہیں وہاں سے نکالنے کے لیے کیا کیا؟''

سارہ نے تجسس سے پوچھا۔

''حماقت۔'' ماریا کے لہجے میں شدید تاسف تھا۔

''حماقت......؟'' سارہ حیران ہوئی۔

''اس زندان میں خود آ پھنسنا حماقت نہیں تو اور کیا تھی۔ وہ راہبہ کے روپ میں وہاں آئی اور مجھے امید دلائی کہ کسی نہ کسی طرح مجھے وہاں سے فرار کروا دے گی لیکن اس کی اور میری بدقسمتی تھی کہ سسٹر میری کو اس کے ارادوں اور ہمارے تعلق کی خبر ہوگئی۔ ایسی صورت میں انجی تو میرے کس کام آتی، الٹا مجھے ہی اس کی وجہ سے دباؤ میں آ کر وہ سب کچھ کرنے پر راضی ہونا پڑا جس کے لیے میں نے فاقہ کشی کی سزا کے باوجود اس وقت تک ہامی نہیں بھری تھی۔ مجھے راضی کرنے کے لیے انہوں نے انجی کو ایسے غیر انسانی تشدد سے گزارا کہ میری روح لرز گئی اور میں نے ان ظالموں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔''

''کیا ہر بار تمہارے مزاحمت کرنے پر وہ انجی کو تشدد کا نشانہ بناتے تھے؟'' اسے پنجرے نما الماری میں بند عورت کی ابتر حالت یاد تھی۔ اسے جس قدر تشدد اور اذیت کا نشانہ بنایا گیا تھا، وہ سب کچھ اگر ایک بار میں کیا گیا ہوتا تو یقینی طور پر وہ تکلیف کی شدت سے ہی مر جاتی۔ اسے یقیناً مرحلہ وار اس تشدد سے گزارا گیا تھا، جب ہی تو وہ مر مر کے جیتی رہی تھی۔

''میں نے تو ایک بار ہتھیار ڈالنے کے بعد دوبارہ مزاحمت کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میری محبت میں دیوانی انجی بار بار یہ حماقت کرتی رہی تھی۔ وہ شور مچاتی تھی۔ ان لوگوں کو گالیوں اور بددعاؤں سے نوازتی تھی۔ ایک دفعہ تو اس نے کمال ہی کر دیا تھا۔ ایک خاص موقع پر وہ کسی طرح قید سے نکل آئی تھی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کے سامنے فادر اور اس کے ساتھیوں کا کچا چٹھا کھولنے کی کوشش کی تھی۔ سب لوگ اس کی اس طرح اچانک آمد اور ہر باتوں کو سن کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ سسٹر میری کا تو حال دیکھنے والا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔'' اسے گویا آج بھی وہ وقت یاد تھا۔

''انجی کی اس جسارت کا کچھ تو فائدہ ہوا ہوگا؟ کوئی تو ہوگا جس نے اس کی باتوں پر کان دھرے ہوں گے؟''

''نہیں......'' اس نے زور سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''فادر بہت کائیاں انسان تھا۔ اس نے بات بنا دی کہ انجی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دورے کی حالت میں ایسی ہی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اگلے دن اس نے مجھ سمیت تمام راہباؤں سے چند معززین کے سامنے حلفیہ بیان بھی دلوا دیا تھا۔''

''تم نے وہ بیان کیوں دیا؟ تمہیں ایک موقع ملا تھا، تم اس سے فائدہ اٹھاتیں اور ان معززین کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتیں تو شاید بہت پہلے ہی تمہاری آزادی کی راہ ہموار ہو جاتی۔'' اس نے افسوس سے پوچھتے ہوئے اس کی حماقت کی نشاندہی کی۔

''میرے پاس سچ بولنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ جب مجھ سے یہ بیان دلوایا جا رہا تھا تو انجی کی گردن میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوا تھا اور وہ ایک تختے پر کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اگر میرے بیان میں ایک بھی لفظ ان کی مرضی کے خلاف ہوا تو انجی کے پیروں تلے رکھا ہوا تختہ کھینچ لیا جائے گا۔ میں اس کی موت کے بدلے اپنے لیے زندگی کی خوشیاں حاصل نہیں کر سکتی تھی اس لیے ایک بار پھر مجبور ہوگئی۔''

''لیکن حاصل تو کچھ نہ ہوا۔ تم نے اس کے لیے جو زندگی حاصل کی، وہ موت سے بدتر تھی۔'' وہ پنجرے نما الماری سے نکلنے والی عورت کا حال مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ انسانی بربریت کا ایسا شاہکار تھی کہ جس کے سامنے شیطان بھی شرما جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس واقعے کے بعد بطور سزا انجی کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور اس کے بعد بھی بہانے بہانے سے اسے سخت سزائیں دی جاتی رہی تھیں۔ اصل میں انہوں نے دل میں باغیانہ جذبات رکھنے والی راہباؤں کے لیے انجی کو بطور مثال زندہ رکھا ہوا تھا اور آئے دن اس پر نیا ستم توڑ کر باقیوں کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ ان کی حکم عدولی کرنے والوں کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ

انہوں نے اتنے برسوں میں قطرہ قطرہ کر کے میری انجی کی رگوں سے زندگی کو نچوڑا اور میں بزدل اس کے لیے دعاؤں سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکی۔ آج جبکہ وہ اس زندان میں اپنی زندگی کی آخری سانس لے چکی ہے اور میں آزاد فضا میں موجود ہوں تو مجھے میری ہر سانس بوجھ معلوم ہو رہی ہے۔''

وہ جو داستان سنانے کے دوران رونا فراموش کر چکی تھی، ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''اس طرح مت سوچو پیاری بلکہ یہ سوچو کہ انجی نے جس مقصد کے حصول کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں، آج اس کا وہ مقصد پورا ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں آزاد فضاؤں میں سانس لیتا دیکھ کر انجی کی روح خوش ہو گی۔'' سارہ نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے کر تسلی دی۔

''میں بھی خود کو اسی طرح کے دلاسے دے کر بہلا رہی ہوں۔ اگر انجی کی خواہش کا خیال نہیں ہوتا تو میرے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی لاش وہیں چھوڑ کر تم لوگوں کے ساتھ چلی آتی۔ میں وہاں رک کر انجی کی اتنے برسوں کی ریاضت برباد نہیں کر سکتی تھی، اسی لیے آج میں تمہارے ساتھ ہوں، پر اس حال میں کہ میرا رواں رواں انجی کی محبت کا مقروض ہے اور میرا دل شرمندہ ہے کہ میں اپنے لیے اتنا کچھ کرنے والی سہیلی کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔''

اس کا دکھ اتنی آسانی سے کم نہیں ہونے والا تھا۔ سارہ نے تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے رخساروں پر بہتے آنسو دیکھے اور خود بھی ایک سرد آہ بھر کے رہ گئی۔ واقعی کچھ غم لاعلاج ہوتے ہیں۔

''تم نے بتایا تھا کہ انجی اپنی ماں کے ساتھ تمہیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔ اس کی ماں کا کیا ہوا؟ کیا اس نے اپنی بیٹی کے غیاب پر شور نہیں مچایا؟''

''وہ بے چاری انجی کو ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی تھی لیکن اسے بتایا گیا کہ اس کی بیٹی کی ناپاک روح نے اسے راہبہ کی پاک زندگی نہیں گزارنے دی اور وہ ایک دن چپکے سے وہاں سے فرار ہو گئی۔ اب وہ بے چاری نہ جانے کہاں کہاں اپنی بیٹی کو ڈھونڈتی پھرتی ہو گی۔ خدا جانے زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔'' ماریا کا جواب ایک الگ داستانِ الم کے باب کھولتا تھا۔ ایک ماں جس نے جواں عمری کی بیوگی کو اکلوتی بیٹی کے سہارے گزارا تھا، اس اکلوتی بیٹی کے غیاب پر کیسے کیسے تڑپی ہو گی اور اس کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکی ہو گی..... یہ بس کوئی صاحبِ دل ہی محسوس کر سکتا تھا۔ ان کے درمیان بھی بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ باقی راہباؤں میں سے تو ویسے بھی کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کچھ بولتیں اس لیے ان کے خاموش ہوتے ہی گھوڑے کی ٹاپوں اور بیل گاڑی کے پہیوں کی چوں چوں ماحول پر حاوی محسوس ہونے لگی۔

اندھیرا اب پہلے جتنا دبیز نہیں رہا تھا اور مناظر ذرا ذرا ظاہر ہونے لگے تھے لیکن ویران آنکھوں اور خوف زدہ ذہنوں میں اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ کسی منظر کو دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کرتے۔ ہر منظر اُن دیکھا ہی پیچھے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ صبح کے تارے نے مسافروں کی یہ بے دلی دیکھی تو خود بھی اپنی جھلک دکھا کر جلد رخصت ہو گیا۔ شاہِ خاور نے بھی ان عجلت پسند مسافروں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی اور بادلوں کی اوٹ سے ذرا ذرا اپنی جھلک دکھلاتا رہا۔ آخر کار جب سواری کے جانور ہانپ ہانپ کر گرنے کو ہو گئے اور ان کے پیروں میں مزید چلنے کی سکت نہیں رہی تو مسافروں نے خود کو ایک پڑاؤ کے سامنے پایا۔ پڑاؤ والے بھی جیسے ان کے انتظار میں ہی ٹکٹکی باندھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دوڑ کر چابکدستی سے سواری کے جانوروں اور تھکے ہوئے مسافروں کو سنبھالا۔ سارہ نے دوڑ کر اپنے گلے آ لگنے والی ہستی کو دیکھا تو وفورِ مسرت سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''ثریا.....''

''اللہ کا شکر ہے سارہ کہ اس نے تمہیں دوبارہ ہم سے ملوا دیا۔'' ثریا کے لہجے میں جتنی خوشی تھی، اس خوشی نے اسے اپنی گزشتہ ساری کلفتیں بھلا دیں، ورقابلِ اعتبار لوگوں کے درمیان پہنچ جانے کے جاں فزا احساس نے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑنا شروع کر دیا۔ اعصاب کا تناؤ کم ہوتے ہی بدن میں تھکن کا احساس جاگنے لگا۔

''مجھے بہت نیند آ رہی ہے ثریا!'' اس نے بچوں کی طرح ٹھنک کر ثریا کو بتایا۔

''خیمے میں تمہارا بستر تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔'' ثریا نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

وہ ثریا کے خیمے میں اپنے لیے بچھائے گئے بستر پر لیٹی تو نیند اس پر آسمان سے اتاری گئی کسی نعمت کی طرح مہربان ہو گئی۔ چند لمحوں میں ہی وہ کسی معصوم بچے کی طرح بے خبر اور پُرسکون نیند سو رہی تھی۔

☆☆☆

''اخی تمہاری خواہش کے احترام میں تمہیں عیسائیوں کی اس خانقاہ تک چھوڑ تو آئے تھے لیکن یہ اطمینان کیے بغیر کہ تم صحیح ہاتھوں میں ہو، تم سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے قافلے کو اگلے پڑاؤ کے بارے میں ہدایات

دے کر کوچ کا حکم دے دیا اور خود چند ساتھیوں کے ساتھ چھپ کر وہیں رک گئے۔

''خانقاہ کے بارے میں اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کرنے پر انہیں کوئی قابلِ ذکر بات معلوم نہیں ہوئی لیکن بقول ان کے ان کا اپنا دل پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس لیے انہوں نے اِدھر اُدھر کی معلومات پر اکتفا کرنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ کچھ عرصہ وہیں ٹھہر کر حالات کا جائزہ لیں اور تمہیں ماحول کو سمجھنے کا موقع دے کر تم سے یہ تصدیق کرلیں کہ تم اس مقام کو اپنے لیے موزوں سمجھ رہی ہو یا نہیں۔'' چند گھنٹوں کی بھرپور نیند لے کر جاگنے کے بعد جب وہ تازہ دم ہو کر ثریا کا فراہم کردہ سادہ سا کھانا مزے سے کھا رہی تھی تو ثریا نے اس کے استفسار پر اسے داؤد کے خانقاہ پہنچنے اور کارروائی کرنے کی ساری روداد سنانی شروع کی۔ داؤد کی اتنی خیال داری پر اس کا دل اس کے احسان کے بوجھ تلے مزید دب گیا۔ پہلی ملاقات سے لے کر اب تک وہ اس کے لیے بہت مہربان ثابت ہوا تھا اور کسی صلے کی طمع کے بغیر اس کے لیے وہ کچھ کرتا رہا تھا جس کی وہ خود کو حق دار بھی نہیں سمجھتی تھی۔

''اخی کا خیال تھا کہ وہ اگلی صبح تم سے ملاقات کر کے تمہارا احوال دریافت کریں گے لیکن پھر وہ رات میں ہی کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگی چنانچہ انہوں نے رات میں ہی خانقاہ کا رخ کیا اور فادر سے ملاقات کر کے تم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فادر کا ردعمل ان کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ اس نے سختی سے اخی کی خواہش کو رد کر دیا اور انہیں بتایا کہ رہبانیت اختیار کرنے کے بعد سارہ کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ خصوصاً اس بات کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اسے ایک مسلمان مرد سے ملنے کی اجازت دے دے۔ اخی کو اس کے انکار سے زیادہ متعصبانہ و مغرورانہ انداز نے کھٹکا دیا۔ وہ بظاہر تو خاموشی سے وہاں سے پلٹ گئے لیکن اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ آج رات ہی تم سے ملاقات ضرور کریں گے۔ اس غرض سے چند ساعتوں کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خانقاہ پہنچے۔ شب کی تاریکی میں پہرے داروں کو بے بس کر کے خانقاہ کے تہ خانے تک رسائی حاصل کرنا ان کے اور ان کے ساتھیوں جیسے بہادر اور ذہین لوگوں کے لیے کوئی کارِ دشوار نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے اندر پہنچتے ہی ان کی ماریانا نامی راہبہ سے مڈبھیڑ ہوگئی اور اس نے یہ جان کر کہ وہ آج ہی خانقاہ میں آنے والی نئی راہبہ سارہ کی خیریت معلوم کرنے آئے ہیں، از خود ہی ان کے ساتھ تعاون شروع کر دیا۔ اس نے مختصراً اخی کو بتایا کہ خانقاہ کی بیشتر راہباؤں کی طرح تمہارے لیے بھی وہاں سنگین خطرات موجود ہیں۔ اس نے اس عقوبت خانے کی جہاں اس وقت تم موجود تھیں، نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ تہ خانے کے اندر موجود رہنے والے محافظین کی بھی نشاندہی کی۔ یوں اخی اور ان کے ساتھیوں کا کام آسان ہوگیا اور وہ تمہیں اور ان راہباؤں کو وہاں سے بہ خیریت نکال لانے میں کامیاب رہے۔'' ثریا نے اس کی آزادی کی جدوجہد کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے اپنی بات ختم کی تو اسے اپنے ساتھ آنے والی ماریا اور دیگر راہباؤں کا خیال آیا اور اس نے ثریا سے ان کے بارے میں استفسار کیا۔

''وہ سب ایک قریبی خیمے میں موجود ہیں۔ انہیں بھی چند گھنٹے آرام کا موقع دیا گیا تھا لیکن میرے خیال میں انہوں نے اس موقع کا زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ بے حد خوف زدہ اور ڈری سہمی ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ فادر کے حواری کسی بھی وقت ان کی تلاش میں ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس ڈر کی وجہ سے نہ تو وہ ڈھنگ سے سو سکی ہیں اور نہ ہی انہوں نے رغبت سے کھانا کھایا ہے۔'' ثریا نے اسے آگاہ کیا۔

''ہم ان کے اس اندیشے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ خانقاہ سے راہباؤں کا فرار یقیناً ایک بڑا سانحہ سمجھا جائے گا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس واقعے میں فادر اور اس کی چہیتی سسٹر میری مارے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عوام کے ساتھ ساتھ سرکردہ افراد بھی اس موقع پر غم و غصے کا شکار ہوں گے اور ذمے داران کو سزا دلوانے کے لیے خانقاہ والوں کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ اس لیے ہمیں خطرے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں بھی تشویش کے سائے لہرانے لگے اور ہاتھ خود بخود ہی کھانے سے کھنچ گئے۔

''اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ اخی نے کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ کسی بھی خطرے کے پیشِ نظر راستے کی نگرانی کے لیے پہرے دار مقرر کر دیے گئے ہیں۔ بالفرض کسی نے ہماری راہ پا بھی لی تو بے خبری میں ہمیں نشانہ بنانا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری احتیاطی تدبیر کے طور پر طالب اور اخی ایسی کسی بستی کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ انہیں امید ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اس موقع پر ہمیں پناہ ضرور دیں گے۔'' ثریا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے ہی شوق چڑھا تھا کہ اپنے مرے ہوئے ماں باپ کا دین اختیار کروں اور نیکی کی راہ اختیار کرکے گزشتہ تمام گناہوں کے بوجھ سے نجات حاصل کرلوں لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میں جسے فلاح کی راہ سمجھ رہی ہوں، اس پر میرے لیے بربادی ہی بربادی لکھی ہے اور میرے ماں باپ کا دین ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔'' وہ یکدم ہی گہری مایوسی کا شکار دکھائی دینے لگی۔

''یہاں میں تم سے اختلاف کروں گی۔ چند لوگوں کے طرزِ عمل پر کسی دین کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کرنا سراسر زیادتی ہے۔ ہر قوم اور مذہب میں تمہیں کچھ ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو اپنے رویّے میں اتنے انتہا پسند ہوتے ہیں کہ اپنے مذہب اور اقدار کی بنیادی روح کو کچل ڈالتے ہیں۔ یہ انتہا پسند اور جنونی لوگ کسی قوم یا مذہب کا اصل چہرہ نہیں ہوتے۔ اس لیے ان لوگوں کو قابلِ توجہ نہیں سمجھنا چاہیے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے بے بسی کی کیفیت میں خود کو سمجھانے کی کوشش کرتی ثریا سے پوچھا۔

''اپنی آنکھیں اور کان کھول کر عقل و فہم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیے۔ تم نے عیسائیت کو اس لیے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا کہ وہ تمہارے ماں باپ کا مذہب تھا۔ اب میرا تمہیں مشورہ ہے کہ فی الحال کسی بھی مذہب کو اپنانے کی کوشش نہ کرو اور کھلے دل و دماغ سے ہر چیز کا جائزہ لیتی رہو۔ ایک دن تمہارے دل و دماغ ضرور ایک نکتے پر جمع ہو جائیں گے اور تم اپنے لیے درست فیصلہ کرسکو گی۔''

ثریا نے اسے نہایت حلاوت سے سمجھایا تو اس نے سر کی اثباتی جنبش سے اس کی تائید کی پھر فوراً ہی اس آواز کی طرف متوجہ ہوگئی جو کوچ کے اعلان کے لیے مخصوص تھی۔

''چلو بھئی اٹھ جاؤ۔ اب سستی کی کوئی گنجائش نہیں۔''

ثریا نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سارہ نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کی طرح قافلے کے دوسرے افراد بھی کوچ کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ قافلہ روانہ ہونے ہی کو تھا کہ پہرے پر موجود نوجوانوں کے ساتھ پانچ افراد گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان افراد کی آنکھوں میں خشونت اور تیوریوں پر بل تھے۔ داؤد نے اپنی فکرمندی کو چھپاتے ہوئے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔

''ہم اپنے حاکم قابوس کی طرف سے ایک اہم پیغام لے کر آئے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے اس پیغام کا مثبت جواب دیا تو تم سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور تمہارے قافلے کو آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت ہوگی، لیکن اگر تم نے اس پیغام کو نظر انداز کردیا تو اپنے لیے تباہی کے دروازے کھول دو گے۔'' آنے والے مہمانوں سے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا گیا تو سب سے آگے موجود شخص نے پُررعونت لہجے میں بولتے ہوئے ایک مکتوب داؤد کی طرف بڑھایا۔

''ہم خود سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کیے جانا پسند نہیں کرتے۔ موت ہمارے لیے کوئی انوکھی شے نہیں ہے، اس لیے تمہارا حاکم ہمیں کسی تباہی سے نہیں ڈرا سکتا۔ میں تمہارے حاکم کا بھیجا گیا مکتوب صرف اور صرف اس وجہ سے پڑھنا قبول کررہا ہوں کہ مجھے تجسس ہے کہ ایک اجنبی علاقے کے اجنبی حاکم کو مجھ سے ایسی کیا تکلیف پہنچی ہے کہ وہ مجھ سے اس انداز میں مخاطب ہے۔'' داؤد نے اپنے ماتھے پر جوابی بل ڈالے اور اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتے ہوئے وہ مکتوب تھام لیا۔ لکھا تھا۔

''خوارزم کے مہاجرو!

تم ایک بڑی جنگ سے اپنا دامن چھڑا کر آئے ہو اور امن کی تلاش میں کرۂ ارض پر بھٹکتے پھر رہے ہو لیکن تمہاری حرکتیں بتاتی ہیں کہ تم خود امن و سکون کے دشمن ہو اور اپنے لیے مصائب کو دعوت دیتے ہو جب ہی تو تم نے ہمارے مقدس مذہبی باپ اور پاک راہبہ کے قتل جیسے سنگین جرائم کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ راہباؤں کو بھٹکانے کی قبیح حرکت کی اور انہیں ان کی پاک زندگی سے نکال کر گناہ آلود زندگی کی طرف لے گئے۔

تمہارے یہ جرائم اتنے سنگین ہیں کہ تمہارے قافلے پر بنا اطلاع کے حملہ کرڈالنا بھی غیر اخلاقی نہیں سمجھا جاسکتا لیکن قافلے میں عورتوں اور بچوں کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے فی الحال اس ابتدائی قدم سے گریز کیا جارہا ہے اور تمہیں تنبیہ کی جاتی ہے کہ قتل و غارت میں ملوث افراد کے ساتھ مفرور راہباؤں کو فوری طور پر ہمارے حوالے کردیا جائے۔ اگر تمہاری جانب سے ہمارے اس واحد مطالبے کو قبول کرلیا جائے تو ہمیں باقی قافلے سے کوئی غرض نہیں ہوگی اور تم لوگ بنا کسی رکاوٹ کے اپنا سفر جاری رکھ سکو گے۔ انکار یا حیلہ سازی کی صورت میں ہم تم پر قہر بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔''

خط کے الفاظ توہین آمیز ہونے کے باوجود داؤد نے خود کو قابو میں رکھا اور خط حاطب کی طرف بڑھا کر نہایت پُرسکون انداز میں اسے لانے والے کی جانب متوجہ ہوا۔

''تمہیں اس بات کا اتنا یقین کیوں ہے کہ جس قتل و غارت کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں اہلِ قافلہ ملوث ہیں؟'' اس کے پُرسکون لہجے میں بھی ایسی سرد کاٹ تھی کہ وہ شخص لمحہ

بھر کو گڑبڑا گیا پھر خود کو سنبھال کر بولا۔

''ہمارے کھوجیوں نے کھرا اٹھایا ہے۔ جانوروں اور انسانوں کے پیروں کے نشان ہمارے علاقے سے نکل کر سیدھے اسی پڑاؤ تک آرہے ہیں۔''

''ظاہر ہے، ہم لوگ وہاں سے سفر کر کے یہاں تک آئے ہیں تو کھوجیوں کو ہمارے اور ہماری سواریوں کے قدموں کے نشانات تو ملنے ہی ہیں۔ ہم کوئی ہوا میں اڑ کر تو نہیں آئے تھے جو ہمارے قدموں کے نشان نہیں بنیں گے۔'' داؤد کی دلیل نے اسے ایک بار پھر گڑبڑا دیا۔ اپنی اس گڑبڑاہٹ نے اسے مشتعل کر دیا اور غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بولا۔

''تمہارے اس عدم تعاون کو تمہارا انکار سمجھا جائے گا۔''

''ایک بے بنیاد الزام کے لیے میں کیسے اقرار کر سکتا ہوں۔'' داؤد نے دوبدو جواب دیا، پھر ذرا چونکنے والے انداز میں تیوری چڑھا کر بولا۔

''کل میں اپنے قافلے کے ساتھ سفر کرنے والی ایک خاتون کو ان کی خواہش پر اس خانقاہ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ ان خاتون کے بارے میں تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟''

''ہمیں یقین ہے کہ اس خاتون کے ساتھ ساتھ خانقاہ سے فرار ہونے والی پانچوں راہبائیں بھی تمہارے قافلے میں چھپی ہوئی ہیں۔'' اس نے خشونت بھری نظروں سے داؤد کو گھورا۔

''تم اپنے شک کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس دلیل دینے میں ناکام رہے ہو اس لیے بار بار اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے سختی سے قابوس کے ایلچی کو ٹوکا۔

''اگر تم ہمیں اپنے قافلے کا جائزہ لینے کی اجازت دے دو تو ہمارا لگایا الزام ثابت ہو جائے گا۔''

''بس......'' داؤد دہاڑا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم ہم سے یہ بے ہودہ مطالبہ کر سکو۔ مانا کہ ہم اپنا بہت کچھ لٹا کر یہاں تک آئے ہیں لیکن ہم نے اپنی غیرت و حمیت کو نہیں کھویا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ گمشدہ راہباؤں کی تلاش کے بہانے تم ہماری ان باپردہ عورتوں کی شکلیں دیکھ سکو گے جن کے پیر کے ناخن تک کبھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھے۔''

شدید غصے کے عالم میں بولتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر جا ٹھہرا تھا۔ اس کے پہلو میں خاموشی سے کھڑے حاطب نے اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر اسے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور خود تحمل پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایلچی سے مخاطب ہوا۔

''بہتر ہے کہ تم لوگ اس بات کو مزید بڑھائے بغیر واپس چلے جاؤ۔ ہم مسافر ہیں اور اپنے لیے مناسب ٹھکانے کی تلاش میں ہیں۔ ہم اس قسم کے معاملات میں الجھ کر اپنے مسائل بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ جس خاتون کو ہم نے تمہاری عبادت گاہ میں چھوڑا تھا، وہ ہماری ساتھی نہیں تھی۔ وہ ہمیں راستے میں ملی تھی اور اس نے کسی مناسب مقام پر پہنچنے تک ہمارے ساتھ رہنے کی درخواست کی تھی۔ ہمارے لیے ایک تنہا اور بے آسرا خاتون کو انکار کرنا ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ اس انسانی ہمدردی سے بڑھ کر ہمارا اس خاتون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اس خاتون کی کسی سازش کا شکار ہوئے ہو تو ہم تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار تو ضرور کر سکتے ہیں لیکن تمہاری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔'' بوڑھے حاطب کا لہجہ نرم ہونے کے باوجود انداز دوٹوک تھا۔ ایلچی قائل تو نہ ہوا لیکن اس کے پاس بحث کی گنجائش بھی نہیں رہی۔ بے بسی بھرے غصے کا اظہار کرتے ہوئے فقط اتنا بولا۔

''تمہیں بہت جلد اپنے اس رویے کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔'' اس دھمکی کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے ساتھیوں سمیت واپس پلٹ گیا۔

''اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ صرف خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔'' حاطب نے ان کے گھوڑوں کی اڑتی دھول کو دیکھتے ہوئے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''یقیناً وہ خاموش نہیں رہیں گے۔ خانقاہ کے خدمت گاروں نے ہمارے مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا کر اس معاملے کو مذہبی غیرت و حمیت کا رنگ دے دیا ہوگا اور عام لوگ بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ ہمارے لیے تسلی کا بس ایک پہلو ہے کہ ان کے علاقے سے ہٹ کر ان کے ہم مذہب افراد کی کثرت کا کوئی امکان نہیں۔ اگر ہم اپنے مسلمان بھائیوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو ان سے بہ آسانی نمٹ لیں گے۔'' حاطب کی تائید کرتے ہوئے اس نے ایک مثبت پہلو بھی تلاش کر لیا۔

''تمہارا تجزیہ غلط نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس موقع پر انہوں نے ہندوؤں سے ساز باز کر لی تو وہ ہماری قوم سے نفرت کے باعث ہمارے مقابلے میں ان کا ساتھ دیں گے۔'' حاطب اس کے مقابلے میں حقائق کا زیادہ بہتر تجزیہ کرنے کا اہل تھا۔

''جو بھی ہو۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اپنی پناہ میں آئی ہوئی مظلوم عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے

ان بھیڑیوں کے حوالے کردیں۔ اس بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے کے مقابلے میں میرے لیے اپنی جان دے دینا زیادہ آسان ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے دیگر ساتھیوں کے بھی یہی نظریات ہوں گے۔'' اس نے اپنے اردگرد اجمع ہونے والے اہلِ قافلہ پر ایک پُریقین نظر ڈالی۔ جواب میں فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی۔ آگ کے دریا کو پار کر کے آنے والی اپنی قوم کے افراد کا یہ جذبہ اور حوصلہ دیکھ کر داؤد کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے ایک نئے عزم سے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اگر موت آئی بھی تو وہ شیروں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

☆☆☆

امیر ارغل کا قافلہ اپنی پوری رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ ابوبیکیٰ اور اس کے حامیوں سے نمٹنے میں جو وقت ضائع ہوا تھا، اس کی تلافی کے لیے قافلے کی رفتار مزید تیز کر دی گئی تھی۔ اس تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے لیے امیر زادی حورم اور ارسلہ خاتون بھی پالکیاں چھوڑ کر گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو گئی تھیں اور بلاشک وشبہ وہ گھڑ سواری میں خوب مہارت رکھتی تھیں۔ ان کے گھوڑوں پر سوار ہونے کے باعث محمد صالح، ساشا کی ہدایت کے مطابق امیر زادی کی پالکی اٹھانے والے کہاروں میں شامل نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کی کوشش تھی کہ خود کو حتی الامکان اس سے قریب رکھے۔ اپنی فطری ذہانت کے باعث اس نے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ اسے حورم کے قریب رکھنے کے پیچھے ساشا کی یہ خواہش کارفرما ہے کہ وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باخبر رہنا چاہتا ہے۔ کیوں.....؟ یہ بات وہ نہیں سمجھ سکا تھا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ ساشا کی خوشنودی حاصل کر کے وہ خود فائدے میں رہے گا اس لیے پہلی کے بعد دوسری ہدایت نہ ملنے کے باوجود بھی اپنے طور پر سونپا گیا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش ساشا کی نظروں میں تھی اور وہ خوش تھا کہ اس نے ایک صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کے تھک کر چور ہو جانے کے بعد ان کے قافلے نے پڑاؤ ڈالا تو کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جاگ سکے۔ امیر کے چند خدمت گاروں اور قیدیوں کو جبراً پڑاؤ پر پہرے داری کی ذمے داری سونپی گئی۔ تھکے ماندے پہرے دار کچھ دیر تو جمائیاں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان کی ہمت ٹوٹنے لگی۔ جیسے ہی امیر کے اپنے ملازمین کی آنکھیں بند ہوئیں، قیدیوں نے بھی موقع کا فائدہ اٹھا کر سونا شروع کر دیا۔ جانوروں وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لیے پڑاؤ کے گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جلائے گئے الاؤ کے علاوہ صرف ایک پہرے دار تھا جو تھکن کے باوجود اب بھی خود کو سونپا گیا فریضہ انجام دینے کے لیے جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن بھر کی شدید تھکن اور بے آرامی کا بار اس کی پلکوں کو بھی بوجھل کیے ہوئے تھا لیکن اپنی انتہائی کوشش سے وہ پلکوں کو آپس میں جڑنے سے روکے ہوئے تھا۔

نیند اور ذمے داری کی اس آنکھ مچولی کے درمیان اس نے ایک ہیولے کو خیموں کے درمیان چلتے ہوئے دیکھا تو بُری طرح چونک گیا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل کر اس ہیولے پر ٹک گئیں۔ وہ جس انداز سے چل رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا تعلق اس قافلے سے نہیں ہے اور وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود ہے۔ اس نے فوری طور پر اسے چھیڑنے کے بجائے خاموشی سے اس کا جائزہ لیتے رہنا مناسب سمجھا۔ جب وہ ہیولا چلتے چلتے امیر زادی حورم کے خیمے کے سامنے رکا تو وہ ایک بار پھر چونک گیا۔ اسے شک گزرا کہ کہیں وہ شخص حورم کو نقصان پہنچانے نہ آیا ہو۔ اس نے نہایت احتیاط سے اس ہیولے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ ہیولے نے خیمے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس انداز میں باہر رکا ہوا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ اسے یہ بھی ٹھیک لگا کہ اس ہیولے نے کسی کو پکارا ہے۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ الفاظ کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔

''سنبل..... سنبل.....'' وہ درمیانی فاصلہ مزید کم کرنے میں کامیاب ہوا تو الفاظ سمجھ آنے لگے۔ اسی وقت اس نے دیا ہاتھ میں لیے خواجہ سرا سنبل کو خیمے کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود دیے کی روشنی نے پکارنے والے کا چہرہ نمایاں کر دیا۔ وہ اس چہرے کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ امیر سفیان کے ملازمین میں سے ایک تھا۔

''خلیل! تم اور یہاں.....؟'' سنبل کو بھی اس شخص کو دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا۔

''تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے ہاتھ میں ہتھیار نہیں ہے، اس لیے مجھے امید ہے کہ میری درخواست پر تم اس دیے کو گل کرنا منظور کر لو گے۔'' آنے والے نے عاجزانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ وہ حورم کے خیمے سے اپنا فاصلہ اتنا کم کر چکا

تھا کہ توجہ مرکوز کرنے پر سرگوشیوں میں کی جانے والی گفتگو بھی اسے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ کچھ رات کا سناٹا بھی اس کا مددگار تھا۔

''میں تمہاری یہاں آمد کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' سنبل نے اس کی درخواست پر دیا بجھایا تو نہیں لیکن اس کی لَو مدھم کرکے ہاتھ ذرا نیچے کرلیا۔ اب روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھی اس لیے ایک بار پھر وہ ایک بے شناخت ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔

''میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر امیر زادی حورم کو بس ایک اہم پیغام دینے آیا ہوں۔ تم یہ پیغام وصول کرکے ان تک پہنچا دو تو میری ذمے داری پوری ہوجائے گی۔'' اس شخص نے اپنے لباس کو یوں ٹٹولا جیسے اس میں سے کوئی خط وغیرہ نکالنے لگا ہو۔ اس موقع پر الجھن میں مبتلا خواجہ سرا سنبل بے حد چوکنا دکھائی دینے لگا۔ دیا اس کے بائیں ہاتھ میں تھا، دایاں ہاتھ اس نے اپنی تلوار کے قبضے پر جمالیا۔

''امیر سالک کی بیوہ صفیہ بیگم کا یہ مکتوب پڑھنے کے بعد اگر امیر زادی ان سے رابطہ کرنا پسند فرمائیں تو کل رات اسی پہر آسمان پر دو ہوائیاں چھوڑ دینا۔ باقی تفصیلات تحریری شکل میں موجود ہیں۔'' خلیل نامی پیامبر نے سنبل کے ہاتھ میں وہ مکتوب تھمایا اور خود تیزی سے پلٹ گیا۔

وہ خلیل کا پیچھا کرنا چاہتا تھا لیکن اپنے پیروں میں موجود بیڑیوں کی وجہ سے اس کے لیے اس کی رفتار کا ساتھ دینا ممکن نہیں تھا۔ عالمِ اضطراب میں اس نے اپنا رخ پھیرا تو اپنے بے حد قریب کھڑے اس شخص کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے اس شخص کو شناخت کرلیا تھا۔ وہ اسے موت کے پنجوں سے واپس کھینچ کر لانے والا اس کا آقا ساشا تھا۔ غلام فیرس کا آقا ساشا.....

ساشا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کے شانے پر ایک تھپکی دے کر اس سمت بڑھ گیا جس سمت خلیل گیا تھا۔ محمد صالح سے غلام فیرس بن جانے والے نے اس کے آنکھوں سے اوجھل ہوجانے کے بعد ایک گہری سانس لی اور امیر زادی حورم کے خیمے کی طرف دیکھا۔ خیمے کے در پر سنبل موجود نہیں تھا۔ وہ خلیل کے روانہ ہوتے ہی واپس اندر چلا گیا تھا اور اب یقیناً کئی حصوں پر مشتمل اس وسیع خیمے میں اپنے لیے مخصوص حصے میں موجود اس بات پر غور کررہا تھا کہ پیغام کو فوری طور پر امیر زادی تک پہنچایا جائے یا اس کی نیند پوری ہونے تک اس معاملے کو مؤخر کردیا جائے۔

غلام فیرس کو اگر اس پیغام سے دلچسپی تھی بھی تو اس کے لیے امیر زادی کے خیمے کے اندر تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ وہ آہستہ سے وہاں سے پلٹ گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانے کے بعد اس شخص کو جگانے لگا جسے اس کی جگہ پہرے داری کی ذمے داری سنبھالنی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر ارغل کے ملازمین میں شامل یہ شخص جب جاگنے کے بعد باقی پہرے داروں کو سوتا ہوا دیکھے گا تو سونے والوں کی خیر نہیں ہوگی۔ وہ اپنے دل میں ان لوگوں کے لیے جن میں سے اکثر اس کے ہم قوم ہی تھے، کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا۔ زندگی کی چاہ میں غیرت اور ایمان کو داؤ پر لگا دینے والوں کے لیے اس کے دل میں قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ ان کے انجام سے بے نیاز اپنے حصے کی ذمے داری پوری کرکے اطمینان کی نیند سو گیا۔

☆☆☆

ابھی سورج نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں کہ امیر ارغل کے پڑاؤ میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ کوچ کے لیے تیار آسمان پر ٹنکے تاروں نے حیرت سے ان انسانوں کو دیکھا جن کی آنکھوں میں ابھی نیند کا خمار باقی تھا لیکن وہ تعمیلِ حکم میں اپنے گھوڑوں پر زین ڈالنا شروع کرچکے تھے۔ رات کے پہلے حصے میں اپنے فرض سے غفلت برتنے والوں کو پہلے پہل یہ گمان ہوا تھا کہ شاید انہیں سزا دینے کے لیے ایک جگہ جمع کیا جارہا ہے لیکن جب انہوں نے دیگر لوگوں کو بھی اپنے ارگرد دیکھا تو ان کا یہ اندیشہ دور ہوگیا۔ احکامات اور تیاریوں سے بھی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں کوئی معرکہ درپیش ہے۔ آپس میں قیاس آرائیاں کرتے وہ پھرتی سے اپنا کام کرتے رہے۔

اپنے خیمے میں آرام دہ بستر پر محوِ استراحت امیر زادی حورم کی نیند میں اس ہلچل نے خلل ڈالا تو اپنی نامکمل نیند کے باعث پہلے تو وہ لیٹے لیٹے ہی اس ہلچل کے متعلق اندازے لگاتی رہی۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید صبح ہوگئی ہے اور اہلِ قافلہ کوچ کی تیاری کررہے ہیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایسی صورت میں سنبل نے اسے جگایا کیوں نہیں؟

''سنبل!'' اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی سنبل کو آواز دی اور خود ذرا سی سلمندی کے ساتھ بستر چھوڑ کر خیمے کی اس دیوار تک آئی جس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا تو تاروں بھرا آسمان اس کے سامنے آگیا۔

''سنبل.....!'' اس بار اس کی پکار خاصی بلند تھی۔ پکار بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی اور اس نے اپنے لیے مخصوص

مرحبا
SINCE 1975
قدرت کی حکمت
مرحبا مشروبات
قطرہ قطرہ خالص اجزاء کا احساس
الائچی
بزوری
شربت
گل بہار
صندل
100 فیصد خالص مشروبات
MARHABA
NATURAL PRODUCTS
/MarhabaLaboratoriespk
UAN: 111-152-152
www.marhaba.com.p

خیمے کے باہر آہٹ سنی۔ آہٹ پر اس نے سنبل کی آمد کی امید میں راستے پر نظریں جما دیں لیکن حسب توقع سنبل کے اندر آنے کے بجائے ایک نوعمر غلام کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر ہی کھڑا کہہ رہا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں امیر زادی صاحبہ! سنبل فی الحال یہاں موجود نہیں ہے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم فرمائیے۔"

"سنبل ہم سے اجازت لیے بغیر اس وقت کہاں گیا ہے؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"کوئی شخص امیر محترم کی طرف سے فوری ملاقات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ سنبل نے شاید آپ کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا اس لیے بغیر بتائے چلے گئے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسی کیا افتاد ٹوٹ پڑی ہے کہ قبل از صبح اتنی ہلچل مچی ہوئی ہے؟" غلام کی وضاحت کے باوجود امیر زادی کا مزاج برہم تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ مجھے وجہ کا علم نہیں لیکن شاید کوئی سنجیدہ نوعیت ہی کا مسئلہ ہے۔ سنبل بھی خاصی دیر سے گئے ہوئے ہیں اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی۔" غلام نے سہمے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"تم سب ناکارہ ہو۔ جاؤ جا کر سنبل کو تلاش کر کے ہماری خدمت میں پیش کرو۔ اسے یقیناً حالات کے بارے میں علم ہوگا۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے حکم صادر کیا اور غلام کے "جی بہت بہتر" کہنے سے قبل ہی پلٹ کر اپنے بستر پر آ بیٹھی۔

سنبل کی تلاش میں قافلے میں مارے مارے پھرتے غلام کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ وہ اس بات کی تصدیق بھی حاصل نہیں کر سکا کہ سنبل کو امیر ارغل نے ہی طلب کیا تھا۔ سنبل کے لیے طلبی کا پیغام لے کر آنے والے شخص کی خود اس نے صرف آواز سنی تھی۔ وہ شخص کون تھا؟ نیند کے خمار میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ حقیقتاً اس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ طلبی کا پیغام لے کر آنے والا شخص کون تھا۔ اس وقت اسے اندازہ ہی کہاں تھا کہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے لیکن اب جبکہ وہ سنبل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا تو اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔

نوعمر غلام کی پہنچ سے دور سنبل اس وقت ایک خیمے کے اندر اس حال میں پڑا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس خیمے کے باہر ساشا کا غلام فیرس پہرا دے رہا تھا۔ مختصر نیند لینے کے بعد اس وقت وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ گھوڑے پر سوار ساشا اس کے قریب آ کر رکا تو وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہماری روانگی کے تقریباً گھنٹا بھر بعد اسے آزاد کر دینا اور رہا کرنے سے پہلے ایک بار پھر یہ باور کروا دینا کہ کسی سے اس واقعے کا ذکر کرنا خود اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ سب سے پہلے تو اس سے امیر زادی کی محافظت کی ذمے داری چھین لی جائے گی کہ جو شخص اپنی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ اتنی اہم ذمے داری سنبھالنے کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے۔ دوسرے میں امیر کے سامنے گواہی دوں گا کہ وہ اس کے مخالفین کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ ثبوت کے لیے ایک خطرناک خط پیش کر دینا میرے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا۔"

"میں آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کروں گا۔" فیرس نے توجہ سے اس کا ہر لفظ سنا اور اسے یقین دہانی کروائی۔ اس یقین دہانی کے بعد وہ بنا ایک لفظ کہے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں رت جگے کی ہلکی سی سرخی اور تیوری پر فکرمندی کی نشانی کا ایک بل تھا۔ رات اس نے خاصی بھاگ دوڑ کی تھی۔

رات جب وہ اپنے خیمے میں سویا ہوا تھا تو خیمے کے باہر پہرا دیتے فیرس کی بیڑیوں کی معمولی کھڑکھڑاہٹ نے اسے جگا دیا تھا۔ اپنی فطری احتیاط پسندی کے باعث اس نے اس آواز کو نظر انداز کرنے کے بجائے بستر چھوڑ کر خیمے سے باہر جھانکا تھا اور فیرس کو حورم کے خیمے کی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ پھر فوراً ہی وجہ اس کے سامنے آ گئی تھی اور دبے قدموں فیرس کے پیچھے پہنچ کر اس نے بھی وہ سب کچھ سن لیا تھا جو خلیل نے سنبل سے کہا تھا۔ وہ سب سننے کے بعد اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ خلیل کا پیچھا نہ کرتا۔ وہ اس کے پیچھے گیا تھا اور پڑاؤ سے کافی فاصلے پر اسے ایک چھوٹے پڑاؤ میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموشی سے لوٹ آیا تھا۔ اس پڑاؤ کو دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ ابو یحییٰ کی موت اور اپنے ساتھیوں کے ہتھیار ڈال دینے کے باوجود امیر سفیان نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور اب شاید وہ براہ راست تصادم کے بجائے چھپ کر تعاقب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کوشش کا مقصد تو واضح تھا کہ امیر سفیان بھی اس خزانے تک پہنچنے کا خواہش مند تھا جس کی تلاش میں امیر ارغل نے یہ سفر اختیار کیا تھا لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ امیر سالک کی بیوہ صفیہ نے حورم سے خفیہ خط کتابت کی

ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ اس خط کتابت میں وہ اپنے لیے خطرے کی بو سونگھ رہا تھا اس لیے پڑاؤ میں واپس پہنچتے ہی اس خط کے حصول کے لیے سنبل کو دھوکے سے باہر بلوالیا۔ سنبل کے کچھ سمجھنے یا سنبھلنے سے قبل اس پر قابو پالینا اس کے لیے ذرا دشوار نہیں تھا لیکن اس وقت اسے شدید طیش کو برداشت کرنا پڑا جب سنبل نے اس کے مطالبے پر نہایت شرافت سے اپنے لباس کی اندرونی جیب سے وہ خط نکالا اور پھر اسے اس کے حوالے کرنے کے بجائے پھرتی سے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس نے زبردستی سنبل کا منہ چیر کر اس کے منہ سے وہ ٹکڑے نکالنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش کامیاب ہونے سے قبل ہی سنبل کئی ٹکڑے نگل چکا تھا۔ بچے کھچے ٹکڑوں پر موجود چند الفاظ کی مدد سے مربوط تحریر نہیں بن سکی تھی۔ اس لیے اس پر خط کا مفہوم بھی واضح نہیں ہوا تھا۔ اس نے سنبل کو زدوکوب کرکے اس سے خط کی عبارت جاننی چاہی تو انکشاف ہوا کہ خود سنبل نے بھی وہ خط کھول کر نہیں پڑھا تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ امیرزادی اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔

سنبل سے مایوس ہونے کے بعد وہ اسے باندھ کر فیرس کو اس کی نگرانی کے لیے مقرر کرکے خود امیر کی خدمت میں جا پہنچا تھا۔ امیر کی نیند میں خلل ڈال کر حاضری کی اجازت حاصل کرنا آسان نہیں تھا لیکن اس نے کچھ اس طرح سے زور دیا کہ پہرے دار کو اس کا مطالبہ ماننا پڑا۔ امیر سے ملاقات میں بھی اس نے پیچھے موجود پڑاؤ کے بارے میں اندیشوں اور خدشات کا اظہار کرنے میں اپنا سارا زور بیان خرچ کرڈالا۔ آخر امیر کو قائل ہونا پڑا کہ اس کے ساتھ مخلص اور بے حد فرض شناس ساشا جو رات کے اس پہر آرام کرنے کے بجائے اتنی اہم معلومات لے کر آیا ہے، اس کی نیند خراب کرنے میں حق بجانب ہے اور اب اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے اس وفادار کی تجویز سے اتفاق کرے۔ امیر کے متفق ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت وہ گھڑسواروں کے ساتھ اس چھوٹے سے پڑاؤ کی طرف اڑا جارہا تھا۔

ایک مخصوص فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو گھوڑے روکنے کا اشارہ کیا اور چھلانگ لگا کر اپنے گھوڑے سے نیچے کود گیا۔ باقی افراد نے بھی اس کی پیروی کی۔

''ہمارے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں رات کے سناٹے میں ان کے کانوں تک پہنچ کر انہیں ہوشیار کردیں گی، اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم اپنے گھوڑے یہاں باندھ کر چھوڑ دیں اور خود خاموشی سے پیدل آگے بڑھیں۔'' وہ ایک بار پھر اس حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا جو اس سے قبل ابوبیکیٰ کے چھپائے ہوئے ہتھیاروں کے حصول کے لیے اختیار کرچکا تھا۔

گھوڑے دو ساتھیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ آخر کار ان کی نگاہوں نے اپنے مطلوبہ پڑاؤ کو پالیا۔ پڑاؤ کے اطراف میں جلتے الاؤ بجھنے لگے تھے لیکن پہرے دار جاگتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ساشا نے رک کر اپنے ساتھیوں کو چند ہدایات دیں جس کے بعد وہ دو دو کی ٹولیوں میں منقسم ہوکر پڑاؤ کے اطراف میں پھیل کر اسے گھیرے میں لینے لگے۔

حسبِ منصوبہ پہلا تیر اس نے خود چلایا۔ یہ وہی مہلک تیر تھا جو اپنے ہدف تک پہنچ کر اسے شعلوں کی نذر کردیتا تھا۔ اس تیر کے چلتے ہی باقی افراد نے بھی کارروائی شروع کردی۔ ہر ٹولی کے افراد میں سے ایک آگ برساتے تیروں سے خیموں کو نشانہ بنا رہا تھا اور دوسرا عام تیروں سے انسانوں کے جسموں کو چھیدنے کے لیے کوشاں تھا۔ لمحوں میں ہی وہاں محشر برپا ہوگیا۔ آگ اور تیروں کی بارش میں بے بس انسان اپنی بقا کے لیے روتے چلاتے بھاگ دوڑ کرنے لگے لیکن لگتا یہی تھا کہ ان کی ساری بھاگ دوڑ اکارت جائے گی اور وہ اپنے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔

کسی عقاب کی طرح پورے منظر کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیے وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایات جاری کررہا تھا کہ اس نے کچھ افراد کو گروہ کی شکل میں اس طرح فرار ہونے کی کوشش کرتے دیکھا کہ لگتا تھا کہ وہ اپنے جسموں کو ڈھال بنائے کسی کو وہاں سے بحفاظت فرار کروانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو پکارا اور خود بھی اس طرف دوڑا۔ ان کے چلائے گئے تیروں نے کئی بھاگتے قدموں کو لڑکھڑا کر گرنے پر مجبور کردیا لیکن کوئی تھا جو تعاقب میں آتی موت کو جل دے کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور نہایت پھرتی سے ایک گھوڑے کی پشت پر سوار ہوکر آگے نکلتا چلا گیا۔ اس کے برق رفتار گھوڑے نے اپنے تعاقب میں آنے والے تیروں کو بھی جل دے دیا۔ گھوڑوں کی عدم موجودگی کے باعث ساشا اور اس کے ساتھیوں کے پاس ہاتھ ملتے رہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جب تک پلٹ کر اپنے گھوڑوں تک پہنچے، سوار ان کی نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔

کچھ دیر ادھر اُدھر گھوڑے دوڑا کر اسے تلاش کرنے کے بعد وہ ناکام واپس پلٹ آئے اور فاتح کی حیثیت سے اس پڑاؤ کا جائزہ لینے لگے جس میں بھڑکنے والی آگ کسی

خون آشام بلا کی طرح ہر جاندار اور بے جان شے کو نگلتی چلی جارہی تھی۔ اس آگ نے اس واحد سوار کے علاوہ کسی کو اپنے پنجوں سے نکلنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ واحد سوار اپنے پڑاؤ کی طرف جاتے ہوئے بھی مسلسل ساشا کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ اس لیے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان نعروں میں بھی شریک نہیں ہوسکا تھا جو وہ فتح کی خوشی میں لگاتے پڑاؤ میں داخل ہوئے تھے۔ پڑاؤ میں موجود افراد نے جوابی نعرے لگا کر ان کا استقبال کیا۔ جو افراد نعرے بازی میں شامل نہیں تھے وہ بھی آس پاس کھڑے پُرشوق نظروں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ سورج کی روشنی نمودار ہوجانے کے باعث وہ ہر چہرے اور اس پر موجود تاثر کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ خلافِ توقع و معمول، امیر ارغل کامیاب مہم جوئی سے واپس لوٹنے والوں کے استقبال کے لیے اپنے خیمے سے باہر نہیں نکلا تھا اور اس کی چھٹی حس نے فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجانی شروع کردی تھی۔

''آقا.....!'' وہ وجہ کھوجنے کے لیے غور و فکر میں مصروف تھا کہ اس پکار نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ فیرس اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے اپنی سوالیہ نظریں اس کے کچھ کہتے چہرے پر گاڑ دیں۔

''کچھ دیر قبل ایک سوار یہاں پہنچا ہے اور اس وقت امیر ارغل کے خیمے میں موجود ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں ساشا کو ایک تشویش ناک اطلاع دی۔

''کون ہے وہ سوار؟'' اس نے بے ساختہ ہی سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

''میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی عورت تھی اور یقیناً کسی خاص اہمیت کی حامل تھی کہ اسے فوراً ہی امیر کے حضور باریابی کی اجازت مل گئی۔'' فیرس کی دی ہوئی اطلاع نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور فوراً ہی اس کے دماغ میں ایک نام گونجا۔

''امیر سالک کی بیوہ صفیہ بیگم!''

وہ غصے اور بے بسی سے اپنی جگہ بل کھا کر رہ گیا۔ اس کے لیے اب یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ پڑاؤ سے فرار ہونے میں کامیاب رہنے والی واحد فرد صفیہ تھی۔ صفیہ کے نام کے ساتھ ہی اس کے سر پر ایک خطرہ منڈلانے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اسے کھینچ کر امیر ارغل کے خیمے سے باہر نکالے اور سالک کی طرح اس قصے سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لے لیکن فی الحال وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔ اپنے محدود اختیارات کے ساتھ اس کے لیے عملی قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

''میرے لیے کسی طور ممکن نہیں کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد سے انکار کرسکوں۔ تم لوگ اس علاقے کی زمین پر قدم رکھتے ہی خود بخود میری پناہ میں آگئے ہو اور کسی کی مجال نہیں کہ میری پناہ میں آئے ہوئے افراد کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔'' اپنی مسند پر بڑی تمکنت سے براجمان اس ادھیڑ عمر سردار کے الفاظ نے داؤد سمیت اس کے تمام ساتھیوں کے چہروں پر رونق دوڑا دی۔ وہ اس امید کے ساتھ یہاں آئے تھے کہ ایک مسلمان سردار اس مشکل وقت میں ان کی کوئی نہ کوئی مدد ضرور کرے گا۔ ان کی یہ امید توقع سے بھی بڑھ کر پوری ہوئی تھی اور سردار کی طرف سے مکمل حمایت اور تحفظ کے اعلان نے انہیں خوشی سے نہال کردیا تھا۔

''میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں سردار کہ آپ نے ہماری توقع سے بڑھ کر مہربانی کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے اس رویّے نے صرف موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میرے حوصلے بلند نہیں کیے بلکہ مجھے یہ امید بھی دلا دی ہے کہ میں نے جن مقاصد اور امنگوں کے تحت اس سرزمین پر قدم رکھا ہے وہ رائگاں نہیں جائیں گے۔ اپنے بہت سے مسلمان بھائیوں سے مایوس ہوجانے والے میرے دل میں آج امید کے نئے دیے روشن ہوگئے ہیں۔'' سردار کا جواب سن کر داؤد اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور نہایت جذباتی انداز میں اس کے لیے شکر گزاری کا مظاہرہ کرنے لگا۔

''کیا میں اپنے نوجوان دوست کے مقاصد کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟'' سردار نے دلچسپی سے داؤد کو دیکھا۔ وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر اندازہ لگا سکتا تھا کہ بہت سے عمر رسیدہ افراد کی موجودگی کے باوجود امیر قافلہ کا اعزاز رکھنے والا یہ نوجوان غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے، اس لیے اس میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔

''ایک غیرت مند مسلمان کی اس سے بڑھ کر کیا خواہش ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی سرزمین کو روندنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے سروں کے مینار تعمیر کرنے والے وحشیوں کو ان کے عبرت ناک انجام تک پہنچتا دیکھے۔ بہت سے مسائل اور کمزوریوں کے باعث آج ہم ایک شکست خوردہ قوم ضرور ہیں لیکن میں اور میرے جیسے چند سر پھرے یہ امید رکھتے ہیں کہ جب ہم اپنے یہاں بسنے والے بھائیوں کو اپنے ساتھ بیتے مظالم کی داستان سنائیں گے تو ان کی غیرت جاگے بغیر نہیں رہ سکے گی اور ایک دن یہ آسمان دیکھے

گا کہ الگ الگ ملکوں میں بسنے والے کیسے دین کے نام پر ایک دوسرے کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوں گے۔'' داؤد کا جوش مزید بڑھ گیا۔

''شاندار.....'' سردار سراہنے والے انداز میں پکار اٹھا۔ ''آج عرصے بعد میں نے ایک ایسا نوجوان دیکھا ہے جس کے سینے میں شیر کا دل ہے۔ میں اس شیر دل نوجوان کو پیشکش کرتا ہوں کہ وہ چاہے تو اپنے پورے قافلے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے یہاں قیام کرسکتا ہے۔ ہمارے وسائل اگرچہ محدود ہیں لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں کسی تنگی کا احساس نہیں ہوگا۔''

''میں اس فراخ دلی کے لیے سردار کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں لیکن میری منزل یہاں سے آگے ہے۔ اس چھوٹے سے علاقے میں میرے لیے اپنے مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ میں پائے تخت تک جا کر اپنے مسلمان بھائیوں کو خواب غفلت سے جگانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میرے ساتھیوں کو بھی نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کے لیے زیادہ وسعت کی حاجت ہوگی۔'' اس نے سلیقے سے سردار کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کیا۔

''جس میں تمہاری خوشی۔'' مزید اصرار نہ کرکے سردار نے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میری طرف سے تم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے گا لیکن میں اتنی وضاحت کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم یہاں اقلیت میں ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ آس پاس کے سارے علاقوں میں کوئی بھی ایک قوم کثرت سے آباد نہیں، اس لیے اصولی طور پر ہر جگہ طاقت کا توازن یکساں ہونا چاہیے لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ کسی بھی معاملے میں دوسری اقوام کے لوگ بہت زیادہ آسانی سے متحد ہوجاتے ہیں اور اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے درمیان موجود چند شرپسند عناصر ان کا آلۂ کار بننے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے اس لیے ہم اکثر طاقت کے توازن میں بہت نیچے چلے جاتے ہیں۔'' بااخلاق سردار یہ حقائق بیان کرتے ہوئے کچھ شرمندہ سا نظر آتا تھا۔

''اگر ہمارا ساتھ دینے میں آپ کے لیے کسی سخت آزمائش کا اندیشہ ہے تو ہم اپنی پناہ کی درخواست واپس لے سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز بھی گوارا نہیں ہوگی کہ آپ ہماری وجہ سے کسی تکلیف میں مبتلا ہوں۔'' داؤد کے چہرے پر سنجیدگی کے بادل چھاگئے۔

''نہیں، نہیں۔'' سردار مضطرب ہوا۔ ''تم میری بات کا غلط مفہوم سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں صرف صورتِ حال سے آگاہ کررہا ہوں تاکہ اگر کسی موقع پر ہم کمزور پڑ جائیں تو تم اپنے دل میں ہمارے لیے شکایت محسوس نہ کرو۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے محسنوں کو شرمندہ کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

''اعتماد کے لیے شکریہ۔ میرے خیال میں اب تم لوگوں کو آرام کرنا چاہیے۔ میرے لوگ تم لوگوں کو قیام و طعام کی مکمل سہولت دینے کی کوشش کریں گے لیکن اگر کوئی کمی محسوس ہو تو براہِ راست مجھے مطلع کرنے سے جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سردار نے اپنی بات کے اختتام کے ساتھ ہی محفل برخاست ہونے کا اشارہ کیا۔ داؤد اور اس کے ساتھی اپنے چند میزبانوں کی راہنمائی میں چل پڑے۔

سردار کے قول کے مطابق واقعی انہیں شاندار سہولیات فراہم کی گئیں اور ایک طویل عرصے بعد انہوں نے خود کو مسافر محسوس کرنے کے بجائے یوں محسوس کیا جیسے وہ اپنے گھر میں ہی ہوں۔ شاید یہ ذہنی سکون ہی کا نتیجہ تھا کہ اس رات انہیں بہت گہری نیند آئی۔

گہری نیند میں ہی داؤد نے محسوس کیا کہ کہیں قریب میں ہی ہنگامہ بپا ہے۔ وہ اس ہنگامے کی نوعیت جاننے کے لیے اٹھنا چاہتا تھا لیکن پلکیں تھیں کہ منوں بوجھ سے بند ہوئی جارہی تھیں اور اس کے لیے اٹھنا تو دور کی بات، آنکھیں کھولنا بھی ممکن نہیں ہورہا تھا۔ اسی کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کا بازو ہلا کر اسے جگانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولیں لیکن آنکھوں کے سامنے موجود ساری شکلیں آپس میں گڈمڈ ہورہی تھیں اور وہ کسی ایک بھی چہرے کو شناخت کرنے میں ناکام تھا۔ یکایک کسی نے اس کے اوپر ڈھیروں پانی انڈیل دیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کے جسم میں کپکپاہٹ پیدا کردی لیکن ساتھ ہی یہ فائدہ ہوا کہ اسے نیند کے غلبے سے نجات مل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا۔ پانی نے اس کے کپڑوں کے ساتھ بستر کو بھی اچھا خاصا گیلا کردیا تھا لیکن اس وقت اسے اس بات کی اتنی فکر نہیں تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے اس طرح کس نے اور کیوں جگایا ہے؟ سامنے نظر آتے سارہ کے چہرے نے اس کے پہلے سوال کا جواب تو خود ہی دے دیا۔ دوسرے سوال کے لیے وہ لب کشائی کرتا اس سے قبل ہی سارہ کی طنز میں ڈوبی آواز نے اس کے اعصاب کو جھنجلا کر رکھ دیا۔

''اچھے امیر قافلہ ہیں کہ آپ کے قافلے پر قیامت ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی لیکن آپ کی نیند نہ ٹوٹی۔''

''بہتر ہوگا کہ تم مجھے سیدھے سادے لفظوں میں بتادو کہ کیا مسئلہ ہے؟'' اس کا لہجہ گراں گزرنے کے باوجود اس نے کوشش کی کہ خود معتدل لہجے میں گفتگو کرے۔

''پہلا مسئلہ تو یہی ہے کہ آپ سمیت ہمارے قافلے کے بیشتر لوگ اتنی گہری نیند کیوں سو رہے ہیں کہ اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہونے کے باوجود کسی کی آنکھ تک نہیں کھلی۔'' اب اس کے لہجے میں تلخی سے زیادہ پریشانی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو سارہ؟ کون سا ہنگامہ؟'' وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ نتیجتاً اس کا سر زور سے چکرایا لیکن اس نے فوراً ہی اس کیفیت پر قابو پالیا۔

''ہمارے اردگرد کچھ بہت ہی غلط ہو رہا ہے داؤد! شاید ہم کسی دھوکے اور سازش کا شکار ہوگئے ہیں۔'' اس بار وہ واضح طور پر گھبرائی ہوئی تھی۔

''مجھے تفصیل سے سب بتاؤ سارہ!'' وہ مضطرب ہوا لیکن پھر گھوڑوں کی ٹاپوں نے اس کی توجہ بانٹ لی۔ اس نے فوراً ہی تلوار ہاتھ میں لے کر باہر کا رخ کیا لیکن اس کے لیے یہ امر پریشان کن تھا کہ تلوار پر اس کی گرفت ہمیشہ جتنی مضبوط نہیں تھی۔

''ہم سردار مراد کے آدمی ہیں اور آپ لوگوں کی خیریت دریافت کرنے آئے ہیں۔ ہم نے کچھ دیر قبل یہاں شور سا سنا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہے؟'' ان چار گھڑسواروں میں سے سب سے آگے والے شخص نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے اپنے پیچھے ہی باہر آجانے والی سارہ کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''ہم آپ کی پناہ میں ہونے کی وجہ سے بے خبری کی نیند سو رہے تھے اور آپ ہیں کہ اب جاکر ہماری خیریت پوچھنے آرہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہونے سے بچے ہیں؟'' وہ وضاحت پیش کرنے کے بجائے غصے سے اس شخص پر چڑھ دوڑی۔

''ہم ہرگز بھی غافل نہیں تھے۔ ہمارے پہرے دار آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے یہاں موجود تھے۔'' اس نے وضاحت دینی چاہی۔

''پہرے دار موجود ہیں تو پھر ہمیں نظر کیوں نہیں آرہے؟ کیا انہوں نے کوئی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے؟'' اس کے لہجے کا طیش کم نہ ہوا۔

''جاکر دیکھو کہ پہرے دار کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے اس بار کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور ان کے حکم کی تعمیل کے لیے حرکت میں آنے کے بعد نرمی سے بولا۔

''بہتر ہوگا کہ آپ تفصیل سے مجھے سب کچھ بتائیں تاکہ میں حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکوں۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں سارہ! آؤ اندر چل کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' داؤد نے، جو خود بھی حالات سے واقفیت کا خواہاں تھا، اس شخص کی تائید کی تو اس بار اس نے بھی بے چون و چرا اندر کا رخ کیا۔ یہ جھونپڑے نما مگر آرام دہ گھر تھا۔ وہ تینوں اندر آکر زمین پر بچھی دری پر بیٹھ گئے۔

''جی اب فرمائیے کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

''ہم سب خواتین گہری نیند میں سو رہی تھیں کہ آہٹوں پر میری آنکھ کھل گئی۔ شدید تھکن کی وجہ سے میرے لیے فوری طور پر بستر چھوڑنا ممکن نہیں ہوا اور میں اپنی جگہ لیٹے لیٹے ان آہٹوں کے متعلق اندازہ لگانے لگی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مکان میں چل پھر رہے ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرے ساتھ مکان میں ٹھہری ہوئی خواتین جو میری ہی طرح طویل سفر اور نیند کی کمی کے باعث نڈھال ہیں، آخر اس وقت جاگ کر کیا کر رہی ہیں۔ میں آواز دے کر اس سلسلے میں استفسار کرنے ہی والی تھی کہ میں نے نیم تاریکی میں ایک ڈھاٹا پوش کو اندر آتے دیکھا۔ وہ جتنی رازداری سے اندر آیا تھا، اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی غلط ارادے سے ہی آیا ہے۔ میں فوراً سوتی بن گئی لیکن آنکھوں کی جھری سے اس کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی۔

''دروازے کے قریب سب سے پہلا بستر ثریا کا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی شکل دیکھی، پھر اسے چھوڑ کر دوسرے بستر کی طرف آیا۔ اس بستر پر ماریا سو رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ماریا کو شانے پر ڈالا اور باہر نکل گیا۔ مجھے صورت حال سمجھنے میں ایک لمحے سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ یقینی طور پر انہی لوگوں میں سے تھا جو ماریا سمیت تمام راہباؤں کو واپس لے جانا چاہتے تھے اور اب ہماری بے خبری کا فائدہ اٹھا کر یہ کام کرنے آگئے تھے۔ آہٹوں اور قدموں کی آوازوں سے میں یہ اندازہ بھی لگا چکی تھی کہ مکان میں کم سے کم چار پانچ افراد موجود ہیں اور میرے لیے تنہا انہیں روکنا یا ان سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں چپکے سے اپنے بستر سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر کود کر ان مکانات کی طرف دوڑی جہاں ہمارے قافلے کے

مردوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔

''تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے ساتھ ہی میں نے چلّانا اور اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا تھا لیکن پہرے داروں اور میرے ساتھیوں، دونوں ہی کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا البتہ مکان میں گھسنے والوں کا ایک ساتھی میرے پیچھے لگ گیا اور چاہا کہ دبوچ کر میرا منہ بند کر دے لیکن میں اپنی تلوار اپنے ساتھ لے کر نکلی تھی۔ مجھے تلوار بازی پر آمادہ دیکھ کر اس شخص نے بھی اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی۔ اس سے قبل کہ ہماری تلواریں آپس میں ٹکراتیں، ایک سفید پوش سوار وہاں آ گیا اور میرے مقابل کو للکارتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے بازوؤں میں اتنا ہی دم ہے تو ایک عورت کے بجائے مرد سے زور آزمائی کرو۔'' ان دونوں کے درمیان خطرناک لڑائی چھڑ گئی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے مزید آٹھ دس لوگ وہاں آ نکلے۔ آنے والے سب سفید پوش تھے اور ان کے انداز سے ان کی بہادری اور بے باکی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے چند لمحوں میں ہی سیاہ ڈھاٹا پوشوں کو ایسا سبق سکھایا کہ وہ خالی ہاتھ محض اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد میں نے سفید پوشوں میں سے ایک کی ہدایت پر اپنی ساتھیوں کو جگانے کی کوشش کی لیکن ثریا سمیت کسی پر میری کوشش کا اثر نہیں ہوا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سب کسی خواب آور دوا کے زیر اثر ہوں۔ میری ناکامی کے بعد اسی سفید پوش نے مجھے ہدایت دی کہ میں جا کر اپنے امیر قافلہ کو بلاؤں۔ میں اس مقصد کے لیے یہاں آئی تو معلوم ہوا کہ یہ بھی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں ان پر پانی ڈال کر انہیں جگانے میں کامیاب ہوئی ہی تھی کہ آپ لوگ چلے آئے۔ اب آپ ہی دیکھیں کہ یہ سب کیا تھا اور کس نے کیا؟'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے بے نیازی سے شانے جھٹکے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے مجھے جا کر اپنی ساتھیوں کو دیکھنا چاہیے۔ وہ بے ہوش ہیں اور ایسے میں کسی کا ان کی خبر گیری کے لیے ان کے قریب رہنا ضروری ہے۔''

''ٹھہرو سارہ! میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔ میں اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' داؤد نے اسے پکارا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلوں گا۔ میرا ان لوگوں سے مل کر صورتِ حال کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔'' سردار مراد کا ملازم بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

مردوں کے رہائشی جھونپڑوں سے کچھ فاصلے پر ہی وہ جھونپڑے موجود تھے جہاں عورتوں اور بچوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ سارہ، ثریا اور مفرور راہبائیں ایک ہی جھونپڑے میں ٹھہرائی گئی تھیں۔ وہ لوگ چلتے ہوئے اس جھونپڑے تک پہنچے تو داؤد نے اِدھر اُدھر نظریں گھما کر دیکھا اور بولا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ لوگ کہاں چلے گئے؟''

''میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلے گئے۔'' سارہ حیران تھی۔ داؤد جو آتے ہوئے دیوار میں نصب ایک جلتی ہوئی مشعل اتار کر اپنے ساتھ لایا تھا، آگے بڑھ کر اس کی روشنی میں زمین کا جائزہ لینے لگا۔

''یہاں بہت سے گھوڑوں اور انسانوں کے پیروں کے نشانات ہیں اور آثار بتا رہے ہیں کہ ان کا نشانہ صرف یہی جھونپڑا تھا جس میں سارہ، ثریا اور راہبائیں موجود تھیں۔'' ذہین وزیرک داؤد کو نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی۔

''وہ جس طرح چہرے دیکھ دیکھ کر راہباؤں کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آئے تھے۔'' سارہ نے ایک بار پھر وہ بات دہرائی جو وہ پہلے بھی بتا چکی تھی۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے راہباؤں کو اغوا ہونے سے بچایا، کہاں چلے گئے۔ انہوں نے آپ کو امیر قافلہ کو بلوانے کے لیے بھیجا تھا تو اصولاً انہیں یہاں ٹھہر کر انتظار بھی کرنا چاہیے تھا۔'' سردار مراد کا آدمی الگ پریشانی میں مبتلا تھا۔

''مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔'' داؤد نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اے ادھر آؤ.....'' سردار مراد کے ملازم نے قریب سے گزرتے اپنے ایک گھڑسوار ساتھی کو پکارا۔

''میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا جناب!'' وہ شخص فوراً ہی قریب چلا آیا اور گھوڑے سے اتر کر مؤدبانہ بولا۔

''تم نے یہاں کسی کو دیکھا ہے؟ کوئی سفید پوش لوگ؟''

''نہیں جناب! میں کسی کو نہیں دیکھ سکا۔ یہاں سوئے ہوئے افراد کے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں۔ قافلے کے سارے مرد و زن، بچے اور ہمارے پہرے دار..... سب سوئے پڑے ہیں۔'' وہ حیران و پریشان تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن کر وہ سفید پوش لوگ جان بوجھ کر یہاں سے چلے گئے۔ پتا نہیں کون تھے وہ لوگ.....؟''

''آپ عجیب انسان ہیں۔ یہاں پورا کا پورا قافلہ مع پہرے داروں کے سویا پڑا ہے اور میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری ساتھی راہباؤں کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن آپ کو صرف اس بات کی فکر ہے کہ ہماری مدد کرنے والے وہ سفید پوش کون تھے؟ حالانکہ ان کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ وہ جو بھی تھے، دوست تھے۔ اصولاً اس موقع پر آپ کو دوستوں سے زیادہ دشمنوں کا کھوج لگانے کی فکر ہونی چاہیے۔'' سارہ سے سردار مراد کے ملازم کا رویہ برداشت نہیں ہوا تو اسے ٹوک بیٹھی۔

''مجھے بھی ان سب باتوں کی فکر ہے جن کی طرف آپ میری توجہ مبذول کروانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں دوستوں کی کھوج بھی اس لیے لگا رہا ہوں کہ ممکن ہے ان سے دشمنوں کا پتا چل جائے۔ ان میں سے کسی نے تو کسی نہ کسی حملہ آور کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ اگر ایک کی بھی شناخت ہو جائے تو باقیوں تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا۔'' اس نے بظاہر نرم لہجے میں سارہ کے اعتراض کا جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں سے برہمی چھلک رہی تھی۔

''میرے خیال میں آپ کو اپنے اندر سے سازش کے سرے تلاش کرنے ہوں گے۔ اہلِ قافلہ سمیت تمام پہرے داروں کا بے ہوش پایا جانا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہم سب کو کھانے پینے کی اشیاء میں ملا کر کوئی نشہ آور دوا وافر مقدار میں دی گئی ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ وہ سب کی بے خبری میں راہباؤں کو خاموشی سے اغوا کر کے لے جائیں۔ تمام افراد کی بے ہوشی اور ان کی صرف ایک مخصوص جھونپڑے تک آمد سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی اندر کا آدمی اس سازش میں ان کا ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ جاسوسی کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔ آپ کو اس جاسوس کو ڈھونڈنا ہوگا۔'' اس بار داؤد نے بھی سارہ کی تائید میں دلائل دیے۔

''بے فکر رہیے جناب! کوئی بھی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم لوگ چوکنے رہو اور بے ہوش پہرے داروں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں واپس جا کر سردار کو حالات سے باخبر کرتا ہوں۔'' اپنے ساتھی کو ہدایات دینے کے بعد وہ ایک لمحہ بھی رکے بغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھی نے بھی اس کی پیروی کی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ شخص ہمیں تسلی کے بجائے دھمکی دے کر گیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔'' اس کے جانے کے بعد سارہ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی چھوڑو۔ تم میری طرف دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے اب تک پوری بات نہیں بتائی ہے اور کچھ نہ کچھ چھپا رہی ہو؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے داؤد! ایک بات ایسی تھی کہ میں نے اسے اس چرخ کے سامنے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔'' اس کا اشارہ یقینی طور پر سردار مراد کے اس آدمی کی طرف ہی تھا جس کا نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سردار کے خاص ملازمین میں سے ہے۔

''آخر ایسی کیا خاص بات تھی؟'' داؤد مستفسر ہوا۔

''مجھ سے اس سفید پوش نے کہا تھا کہ اگر تم اپنے امیرِ قافلہ کو ملاقات کے لیے نہ لا سکو تو ان سے کہنا کل عشا کی نماز کے بعد مسجد میں ہی رکے رہیں۔ ہماری طرف سے خود ملاقات کا انتظام کر لیا جائے گا۔''

''ہم یہاں سردار مراد کے مہمان ہیں۔ اس نے ہمیں پناہ دے کر ہمارے اوپر احسان کیا ہے۔ یہ نہ ہو کہ نادانستگی میں کسی سازشی ٹولے کا مہرہ بن جائیں۔'' اس پیغام نے داؤد کو مضطرب و متفکر کر دیا۔ سردار نے اسے پناہ دیتے وقت ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کے اطراف میں کچھ سازشی عناصر پائے جاتے ہیں۔

''ہم سردار پر اندھا بھروسا بھی تو نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ ہمیں اپنے احسان کے جال میں پھنسا کر سردار خود ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہو۔ آج جو کچھ ہوا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے کھانے میں نشہ آور دوا سردار کے حکم پر ہی ملائی گئی ہو۔ وہ ڈھاٹا پوش اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو ہم ان راہباؤں کی واپسی کے لیے کیا کر سکتے تھے؟ مانا کہ آپ اور آپ کے ساتھی بہت بہادر ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تعداد اور وسائل کے اعتبار سے آپ لوگ بہت کمزور ہیں۔ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے مجھے اور دیگر راہباؤں کو خانقاہ سے نکال لانا الگ بات تھی لیکن اب جبکہ وہ لوگ پوری طرح چوکنے ہیں، آپ کس طرح ان کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے تھے؟ مجھے یقین ہے کہ ایسے نازک وقت میں سردار مراد بھی آپ کی مدد سے انکار کر دیتا۔ وہ پہلے ہی اپنے اقلیت میں ہونے اور دوسرے معاملات کا رونا رو چکا ہے۔'' سارہ نے اس کو حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''یعنی تمہارا مشورہ ہے کہ میں کل ان پراسرار لوگوں سے ملاقات کے لیے ضرور جاؤں؟'' داؤد نے اس سے مشورہ چاہا۔

''ملاقات میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آنکھیں بند کر کے کسی پر بھی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔''

''اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم کل ہی یہاں سے کوچ کر جائیں۔''

''میرے خیال میں یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے کھانے میں ملائی جانے والی دوا بہت زود اثر تھی۔ اس دوا کے اثر سے اکثر لوگ کل دن چڑھے تک سوئے رہیں گے اور جب جاگیں گے تو بھی ان کی طبیعت پر سستی اور کسلمندی طاری ہوگی۔ ایسے میں ان سے سفر کی توقع رکھنا بہت مشکل ہے۔'' اس نے ناامیدی کا اظہار کیا۔ داؤد اس کی بات سے اتفاق کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے زبردستی جگانے پر وہ جاگ تو گیا تھا لیکن اسے خود اپنے ہاتھ پیروں میں سستی کا احساس ہو رہا تھا۔

''تم پر اس دوا کا اثر کیوں نہیں ہوا؟ کیا تم نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا؟'' اس نے بہت دیر سے دل میں اٹھتے سوال کو زبان دی۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔ جسمانی اور ذہنی تھکن نے مجھے کچھ اس طرح نڈھال کر دیا تھا کہ کھانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں نے صرف کھانے کے ساتھ موجود پھل ہی چکھنے پر اکتفا کیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر بتایا تو داؤد، جس کے ہاتھ میں موجود مشعل کی روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اپنی نظروں کو ساکت ہونے سے نہیں روک سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا ہر نقش قاتل تھا لیکن مسکراہٹ تو گویا قیامت ہی ڈھا دیتی تھی۔ اس قیامت سے بچ نکلنے کا گر کئی فنون کا ماہر ہونے کے باوجود داؤد کو نہیں آتا تھا۔

''میں ثریا کو جا کر دیکھتی ہوں۔ اس نے بھی رات زیادہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ ممکن ہے اسے جلدی ہوش آجائے۔ وہ ہوش میں آجائے تو اس کے ساتھ مل کر بے چاری راہباؤں کو سنبھالتی ہوں۔ بھاگ دوڑ اور چھینا جھپٹی میں وہ بے چاریاں بے حال اور بے ٹھکانا پڑی ہیں۔'' داؤد کی نظروں کا سکوت اس کے لیے باعثِ اضطراب تھا چنانچہ جلدی جلدی الٹا سیدھا بول کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ داؤد بھی ایک گہری سانس لے کر پلٹ گیا۔ اس کی جان کو جو غم لاحق تھے ان کی موجودگی میں بھلا غمِ جاناں کی گنجائش کہاں نکلتی تھی۔

☆☆☆

''آؤ ساشا! مبارک ہو۔ سنا ہے کہ تم اپنی مہم میں کامیاب لوٹے ہو؟'' وہ امیر ارغل کے بلاوے پر اس کے خیمے میں گیا تھا اور امیر نے اس کے اندر قدم رکھتے ہی اسے مبارک باد دی تھی لیکن جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ امیر کے لہجے میں وہ گرم جوشی نہیں ہے جو خوشی سے جنم لیتی ہے۔

''امیر محترم نے درست سنا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس خطرے کو مٹا آیا ہوں جو امیر محترم کی راہ میں روڑے اٹکا سکتا تھا۔'' وہ وہاں چند پردہ نشین خواتین کی موجودگی کو محسوس کر چکا تھا اس لیے اس کی نظریں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''ہمیں افسوس ہے کہ تمہاری کوششوں کے باوجود ایک روڑا اڑتا ہوا یہاں آپہنچا ہے۔'' امیر کے لہجے میں ہلکے سے طنز کی آمیزش تھی۔ فیس سے ملنے والی اطلاع کے باعث وہ اس طنز کو سمجھ سکتا تھا پھر بھی انجان بن گیا اور چونکنے کی اداکاری کرتا ہوا حیرت سے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ امیر کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''ہمارے مرحوم بھائی کی بیوہ صفیہ بیگم اس وقت یہاں موجود ہیں اور انہوں نے تمہارے متعلق کچھ اہم انکشافات کیے ہیں۔'' اسے اندازہ تھا کہ امیر سمیت دوسرے افراد کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس نے سوائے حیرت کے کوئی تاثر اپنے چہرے سے جھلکنے نہ دیا اور حیرت آمیز سکون سے بولا۔

''میرا نہیں خیال کہ میرا ان خاتون سے زندگی میں کبھی واسطہ پڑا ہے۔ ایسی صورت میں خاتون میرے متعلق کون سے انکشافات کر سکتی ہیں؟''

''انکشافات تو بہت دلچسپ ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ معلومات انہیں تمہارے ایک ایسے سابقہ ساتھی نے پہنچائی تھیں جو اب تمہاری جان کے دشمنوں کے ساتھ ہے، بلکہ تھا..... شب ان کے پڑاؤ میں جو آگ بھڑکی تھی اس میں وہ شخص بھی چل بسا۔''

''پھر تو ان کی کسی بات میں کوئی وزن ہی نہیں رہا۔ ایک مرا ہوا انسان ان کے کہنے کی تردید یا تصدیق کیسے کرے گا۔ بہرحال..... میں سننا چاہوں گا کہ خاتون نے میرے متعلق کون سے دلچسپ انکشافات کیے ہیں؟'' اس نے اپنے سکون میں فرق نہ آنے دیا۔

''ان کا دعویٰ ہے کہ تم کوئی تاجر نہیں بلکہ ڈاکو اور لٹیرے ہو۔'' امیر ارغل نے اپنے تئیں کوئی دھماکا کیا۔

''اکثر لوگ ہم تاجروں پر الزام دھرتے ہیں کہ ہم اپنی چکنی چپڑی باتوں سے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اگر خاتون نے معنوی اعتبار سے مجھ پر لٹیرے اور ڈاکو ہونے کا الزام لگایا ہے تو میں زیادہ بُرا نہیں مانوں گا لیکن اگر یہ سچ مچ ایک سنجیدہ الزام ہے تو خاتون کو اس کا ثبوت دینا ہوگا۔'' نرمی سے بولتے بولتے اس کا لہجہ اچانک سخت ہوگیا۔

''ثبوت تم دو کہ تم ایک ڈاکو نہیں بلکہ تاجر ہو۔'' اس کے ہاتھوں ناقابل تلافی نقصانات اٹھانے والی صفیہ غصے کی شدت سے چیخ پڑی۔ اس موقع پر ساشا نے پہلی بار اپنی نظریں زمین سے اوپر اٹھائیں اور مہین نقاب کے پیچھے سے جھانکتی صفیہ کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''قاعدے کے مطابق ثبوت الزام لگانے والے کو پیش کرنے پڑتے ہیں۔ میں تو اپنی صفائی میں صرف یہی بول سکتا ہوں کہ آپ کسی زبردست غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

''کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔'' صفیہ ایک بار پھر چیخی۔ ''یہ صرف میری بدقسمتی ہے کہ جس شخص کو میں گواہی کے لیے پیش کرسکتی تھی وہ آگ میں جل کر بھسم ہوگیا۔''

''آپ مجھے خاصی ذہین خاتون لگتی ہیں۔ یقیناً یہ خیال آپ کو اپنے تمام ساتھیوں کے مرنے کے بعد ہی سوجھا ہوگا۔ بے چارے مُردوں سے کوئی بھی کہانی منسوب کردو وہ کون سا سچ یا جھوٹ کی تصدیق کرسکتے ہیں۔'' اس کا لہجہ سلگانے والا تھا۔

''کوئی تاجر اس درندگی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا جس کا مظاہرہ تم نے کل شب کیا۔ تمہاری وجہ سے کل کئی انسان زندہ جل کر راکھ ہوگئے۔ کیا جواز ہے تمہارے پاس ان بے گناہوں کی دردناک موت کا؟'' صفیہ ہیجان کا شکار نظر آتی تھی۔

''میں نے جو کچھ کیا وہ امیر محترم کی اجازت سے اور ان کے مفادات کے تحفظ میں کیا۔ آپ لوگ جو چپکے چپکے ہمارا پیچھا کررہے تھے اگر اچانک شب خون مار کر ہمیں قتل کردیتے تو ہم کیا کرسکتے تھے؟ آپ کو یقیناً اصل دکھ اس بات کا ہے کہ آپ سے پہلے ہمارا داؤ چل گیا۔'' اسے اپنی صفیہ سے بحث لطف دے رہی تھی۔

''میرا ہرگز بھی ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں صرف امیر محترم سے معافی مانگ کر پناہ طلب کرنے اور تمہارے متعلق سچ بتانے کا ارادہ رکھتی تھی۔''

''اور کتنی معصوم ہیں آپ کہ اس مقصد کے لیے امیر سفیان کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں؟'' اس نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔

''وہ ایک مجبوری تھی۔ امیر سالک کی موت کے بعد مجھے مجبوراً امیر سفیان کے پاس پناہ لینی پڑی تھی لیکن میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ میرا امیر محترم کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں خود چل کر یہاں تک نہ آتی۔'' صفیہ نے اپنے حق میں دلیل دی۔

''اپنے حواریوں کی موت کے بعد یہاں آکر پناہ طلب کرنا آپ کی مجبوری تھی۔ آپ جانتی ہیں کہ ایک تنہا عورت کے لیے ان ویرانوں میں سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔'' وہ اسے دوبدو جواب دے رہا تھا۔

''تم مجھ پر غلط الزام لگا رہے ہو۔ میری صاف نیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کل رات میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے حورم کو خط بھیج کر اسے تمام حقائق سے آگاہ کردیا تھا۔ امیر محترم ثبوت کے طور پر حورم کو بلوا کر اس خط کی بابت دریافت کرسکتے ہیں۔''

''حورم کو حاضر کیا جائے۔'' امیر ارغل نے فوراً ہی حکم صادر کیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

''کیا گزشتہ شب تمہیں اپنی چچی صفیہ کی جانب سے کوئی خط موصول ہوا تھا؟'' حسبِ معمول سیاہ لباس میں ملبوس حورم نے دربار میں حاضری دی تو امیر ارغل نے خود اس سے دریافت کیا۔

''خط..... چچی صفیہ کی جانب سے؟'' حورم الجھی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''اگر کوئی خط بھیجا گیا تھا تو ممکن ہے ابھی تک سنبل کے پاس ہو۔ سنبل باہر ہی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اسے بلوا کر تصدیق کرسکتے ہیں۔'' فوراً ہی سنبل کو اندر بلوایا گیا۔ خلافِ معمول اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

''سنبل.....! کیا گزشتہ شب خلیل نامی شخص حورم کے لیے کوئی خط تمہارے حوالے کرگیا تھا؟'' امیر کے سوال پر سنبل کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔

پُرخطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

سزائے موت

ایم الیاس

کبھی کبھی اتفاقیہ طور پر بھی لوگ جرم کی راہ پر چل پڑتے ہیں مگر وہ زندگی بھر محض ایک ایسے لمحے کا انتظار بھی کرتے ہیں جب ان کے خلاف انتقامی کارروائی کے بجائے انہیں معاف کردیا جائے... ان کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے اور پھر انہوں نے ثابت کردیا کہ فقط اسی ایک لمحے نے ان کی زندگی کو کس طرح بدل ڈالا...

لندن کے ایک عدالتی فیصلے کی دلچسپ کارروائی اور اس کا انجام

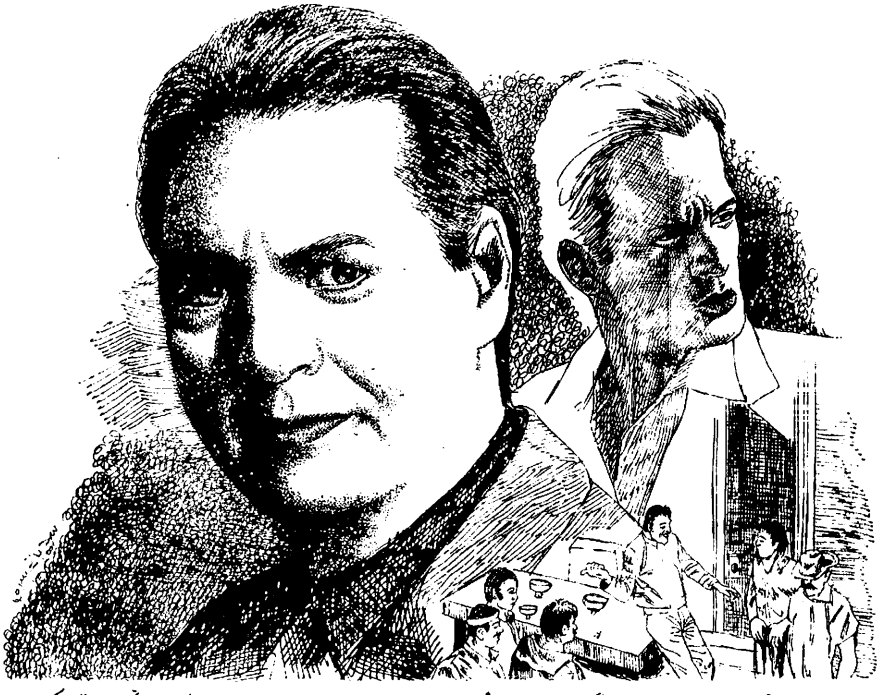

تاریخ میں ایسے ایسے حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم واقعات بھرے پڑے ہیں کہ جن کا یقین نہیں آتا.....! اسے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے ہی واقعات میں یہ ایک سرگزشت بھی ہے جو شاید اب تک آپ کی نظروں سے نہ گزری ہو۔

1848ء میں لندن کی ایک عدالت میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس نے تہلکہ مچادیا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عدالت کے باہر لوگوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ ان میں صرف مرد اور وکلاء ہی نہیں تھے بلکہ عورتوں کی بڑی تعداد کے علاوہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی موجود تھے۔ ایک تجسس تھا جس نے انہیں عدالت کے باہر جمع ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ اس لیے تاحدِ نظر لوگوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مقدمہ کس قدر سنگین نوعیت کا ہے۔

جبکہ کمرائے عدالت میں جج صاحبان، ملک کے

مشیروں، سرکاری اور غیر سرکاری وکیلوں کے علاوہ فوج اور پولیس کے اعلیٰ سے اعلیٰ افسران اور اہلکار بھی موجود تھے۔ وی آئی پی اور امرا کا طبقہ بھی موجود تھا۔

مقدمہ کیا تھا؟ بغاوت کا..... بغاوت کے جرم میں آئرلینڈ کے سات نوجوان لیڈرز پر مقدمہ چل رہا تھا۔ بغاوت کے جرم کی سزا موت تھی۔ اس سزا میں کسی نرمی اور رعایت کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عدالت کا کمرا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ تک نہیں تھی۔ جج نے کمرے کے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے باغیوں سے کہا۔

''پیٹرک، چارلس، ٹامس، جان، ٹیرنس، مائیکل اور رچرڈ! تمہیں صفائی کا پورا پورا موقع دیا گیا..... پھر بھی تم سلطنتِ برطانیہ سے بغاوت کرنے کے مجرم پائے گئے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ عدالت سزا کا حکم سنائے، کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

نوجوانوں نے اپنی نمائندگی کے لیے ٹامس کو منتخب کیا ہوا تھا جو ہر لحاظ سے قابل اور باصلاحیت بھی تھا۔ اس نے کمرے میں موجود لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر دوسرے لمحے اس نے کمرے کے باہر کھڑے مجمعے کو دیکھا پھر اس نے اپنی گرجتی ہوئی آواز میں اس لیے کہا کہ باہر کے لوگ بھی نہ صرف اس کی آواز سن سکیں بلکہ ایک ایک لفظ صاف سن لیں۔

''جنابِ والا.....! ہم اب تک جو کہتے آئے ہیں، اس پر ہنوز قائم ہیں اور اپنے عزم کو دہراتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ موقع ملا جس کی ہمیں پوری امید ہے اور ہم اسے کسی قیمت پر جانے نہیں دیں گے اور ہم اپنے عزم کو دہراتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ زیادہ بہتر طریقے سے جرم کا ارتکاب کریں گے۔ ایسی بہتر منصوبہ بندی جس کے کسی پہلو میں بھی کوئی عیب اور ذرّہ بھر خامی اور جھول نہیں ہوگا۔ ہم سے ایسی کوئی حماقت اور غلطی سرزد نہیں ہوگی کہ ہمیں دوبارہ گرفتار کیا جاسکے۔ کوشش شرط ہوگی۔''

عدالت کے باہر لوگوں نے بڑے قہقہے لگائے اور دیر تک زور زور سے داد دیتے رہے اور پُرجوش انداز سے تالیاں بجا بجا کر اس بیان کا خیر مقدم کرتے رہے۔ کمرے میں موجود افراد بھی ہنسے اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

جج کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے بس اور اختیار میں ہوتا اور اس کے پاس پستول ہوتا تو وہ اسے بھون دیتا۔ وہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا۔ صرف سزا سنا سکتا تھا۔ اس نے ان سب کو پھانسی پر چڑھانے کا حکم صادر کردیا۔

پھانسی کے اس حکم پر یورپ، برطانیہ میں نہ صرف صدائے احتجاج بلند ہوا بلکہ ملکہ کی شان میں گستاخیاں بھی کی گئیں۔ جج اور ملکہ برطانیہ کے کارٹون اخبارات کئی دنوں تک چھاپتے رہے۔ نفرت اور غم و غصے کا ایک ایسا طوفان آیا کہ لوگوں نے اس کے اظہار کے لیے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں اور یہ سلسلہ دراز ہونے لگا۔ جلوس بھی نکالے گئے۔ ہائیڈ پارک کے علاوہ عوامی تفریح گاہوں، مقامات اور سرکاری تقریبات میں حکومت کے خلاف زبردست تقریریں کی گئیں۔ نفرت، غم و غصے کا لاوا تھا کہ ابلتا ہی جارہا تھا۔ یہ جو نفرت کا آتش فشاں پھٹا تھا کہ اس نے پورے برطانیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

جب ملکۂ وکٹوریا نے یہ دیکھا کہ عوام میں نفرت روز بہ روز شدید ہوتی جارہی ہے اور صورتِ حال ایسی خطرناک اور بدترین ہوتی جارہی ہے کہ قابو میں نہ آسکے گی..... ساری دنیا میں الگ رسوائی اور بدنامی ہورہی ہے تو اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے سزائے موت معاف کرکے ساتوں نوجوانوں کو آسٹریلیا کے جنگلات میں ملک بدر کردیا۔ اس زمانے میں آسٹریلیا کے جنگلات کی حیثیت وہی تھی جو ہندوستان میں جزائر انڈمان کی تھی جنہیں عرفِ عام میں کالا پانی کہا جاتا تھا اور مجرم اس کا نام سن کر ہی تھرا جاتے تھے۔

محبِ وطن اور بے خوف نوجوان زیادہ دنوں تک جنگلات میں محبوس نہیں رہے۔ ان کے نزدیک یہ زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ اپنا مستقبل مثالی اور شاندار بنانا چاہتے تھے۔

جان امریکا چلا گیا اور اس نے اس سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد وہاں کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنا ایسا مقام بنایا کہ لوگ اش اش کر اٹھے۔ اس نے امریکا پہنچتے ہی ایک مقامی دوشیزہ سے شادی کرلی۔ اس کا جو بیٹا ہوا تھا، وہ مستقبل میں نیویارک کا میئر منتخب ہوگیا۔ ٹیرنس کینیڈا کے دارالعلوم کا پُرجوش ممبر بن گیا۔ اسے دوبار وزارت کی پیشکش ہوئی لیکن اس نے قبول نہیں کی۔ ٹامس سول وار کے دوران یونین آرمی کا بریگیڈیئر جنرل بنا جبکہ رچرڈ کو نیو فاؤنڈ لینڈ کا گورنر جنرل منتخب کیا گیا۔ مائیکل مونٹانا کا گورنر بن گیا۔ پیٹرک نے آسٹریلیا کے اٹارنی جنرل کے فرائض انجام دیے۔

1871ء میں ملکۂ وکٹوریا آسٹریلیا کے سرکاری دورے پر گئیں تو انہیں وہاں کے وزیراعظم مسٹر چارلس نے بڑی گرمجوشی اور تپاک سے خوش آمدید کہا۔ ملکۂ وکٹوریا تحیر زدہ بھی ہوئیں اور بے حد مسرور بھی کہ سزائے موت معاف کرکے انہوں نے انسانیت کی خدمت انجام دی۔

⌘⌘⌘

دنیا کے اربوں کھربوں سال کے مقابلے میں مطیع اللہ کی زندگی کے باسٹھ تریسٹھ برس کتنی قلیل مدت تھی...... جیسے بیکراں سمندر کے مقابل اک قطرۂ آب......! مگر اس مختصر عرصۂ حیات میں مطیع اللہ نے دنیا کو رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

گھر کی چار دیواری میں عزت اور سکون سے بیٹھی عورت ترقی نسواں کی نعرہ زن ہوتی مرد کے شانہ بشانہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ کہاں کی حیا، کہاں کا پردہ...... روایتی مشرقی ملبوسات کی تراش خراش میں جدت اور اختراع آنے

کروفر اور گھمنڈ میں ڈوبے انسانوں کی بے وقعتی کا اظہار

خدا اور امید

ناہید سلطانہ اختر

دوسرا اور آخری حصہ

کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی تیز رفتاری سے دوڑتی بھاگتی زندگی محض ایک ننھے وائرس کے خوف سے یوں تھم جائے گی ... ترقی پذیر ممالک ہی نہیں بلکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی زہرناکی کا شکار ہوجائیں گے ... جب جب مخلوق اپنے خالق سے دور ہوئی ... اس شانِ کریمی نے کسی نہ کسی حوالے سے اپنے ہونے کا یقین دلایا اور سوئے ہوئے ذہنوں پر دستک دی کہ اس کائنات کو چلانے والا اوپر بیٹھا ہے۔

لگی تھی۔ لڑکیاں جو مردوں کو دیکھ کر سمٹ جایا کرتی تھیں، مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتیں اور بے حجابانہ ٹھٹھے لگاتیں۔ مطیع اللہ کی نوعمری میں گھر سے باہر خال خال دکھائی دینے والی عورتوں کے پرے کے پرے گھر سے باہر سڑکوں، بس اسٹاپوں اور بازاروں میں دکھائی دیتے۔ مرد کی ہم دوش ہونے کی خواہاں عورت معاشی دوڑ میں شریک ہوئی تو مرد اس کی اور بچوں کی کفالت سے بھی بتدریج بے نیاز ہوگیا۔

مطیع اللہ کی بڑی بہن بتاتی تھی کہ ان دنوں جب انڈوں کی فراہمی کے لیے گھروں میں مرغیاں اور دودھ کے لیے بکریاں پالنے کا دستور عام تھا اور مرغی کا سالن شاہانہ ڈش سمجھی جاتی تھی، ایک روز جب ان کے ہمسائے میں رہنے والی خالہ نے اپنے اور ان کے گھر کی مشترکہ دیوار سے اپنا ہاتھ بلند کر کے اس کی ماں کو دودھیا انڈا دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپا ذرا دیکھنا تو..... مشینی مرغی کے مشینی انڈے بھی آنے لگے ہیں بازار میں۔'' تو گھر کے صحن میں اس کی ماں نے پڑوسن کی انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان دبے انڈے کو اپنا ہاتھ اونچا کر کے پڑوسن کے ہاتھ سے لیا اور اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ارے حمیدہ! قربِ قیامت ہے۔ ابھی تو اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑے گا..... اپنے میاں سے کہنا مشینی مرغی بھی لا کر دکھائے کسی روز۔'' پڑوسن نے اپنا ہاتھ جھکا کر انڈا واپس لیتے ہوئے کہا۔

''کہہ دوں گی آپا۔''

رفتہ رفتہ سب وہی انڈے..... اور انہی مرغیوں کا گوشت کھانے کے عادی ہوگئے تھے۔ مرغی جو کبھی امیروں کے دسترخوان کی شان سمجھی جاتی تھی، رفتہ رفتہ غریبوں کی جان بن گئی تھی۔

بائیس خاندانوں کے سیکڑوں، ہزاروں خاندانوں کے قالب میں ڈھل جانے اور مطیع اللہ کی دنیا کے تارکِ وطن افراد کی ترسیلِ زر کا نتیجہ تکبر، تصنع، آسائش طلبی، آرام پسندی اور دکھاوے کی صورت نکلا تھا۔ پیسے کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر خاندانوں میں غیر معمولی معاشرتی تفاوت رونما ہوا۔ نئے سسرالی رشتے جو کبھی حسب نسب اور شرافت کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے، معاشی بنیادوں پر استوار ہونے لگے۔ خاندانی مگر غریب گھرانوں کی بیٹیاں ماں باپ کے گھر میں بیٹھی بوڑھی ہونے لگیں۔

ابا کہا کرتے تھے، تعلیم کا مقصد روزی کمانا نہیں، مقصدِ حیات سمجھنا اور اچھا انسان بننا ہے مگر مطیع اللہ کی دنیا میں تو اچھے انسان کم ہوتے اور سائے بڑھتے گئے۔ تعلیم کا مقصد روزی کمانا قرار پایا۔ مطیع اللہ کو آج بھی یاد تھا اس کی دادی کے دور دراز رشتے داروں میں کسی عورت کو طلاق ہوجانے کی خبر پر اس کے گھر میں بڑوں نے ایسے ردعمل کا اظہار کیا تھا جیسے دنیا میں اس سے بڑا سانحہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دادی ہاتھ مل مل کر، کلیجا تھام تھام کر ملال کا اظہار کرتی رہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ طلاق گویا کھیل بن گئی۔ کیا عورت، کیا مرد، برداشت جاتی رہی۔ ذرا ذرا سی بات پر گھر ٹوٹنے اور مطلقہ عورت ہی نہیں اس کی اولاد بھی دربدر ہونے لگی۔

مطیع اللہ کی دنیا میں پیسے کی چاہ اور آسائشوں کی طلب پہلے باپ کو اولاد سے دور کھینچ لے گئی تھی۔ صورتِ معکوس میں یہی چاہ اور طلب اولاد کو جو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا چین، امید، خوشی اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے، ان سے دور لے جانے لگی۔ امریکا، یورپ اور کینیڈا کا ویزا پروانۂ جنت ملنے کے مترادف سمجھا جاتا جس کے لیے نئی نسل اپنے ایمان ہی نہیں، جان کو بھی داؤ پر لگانے کو تیار رہتی۔ کوئی گمراہ ہو کر اپنا عقیدہ بدل کر یورپ جاتا، کوئی انسانی اسمگلر کے ہتھے چڑھ کر پُرخطر راہِ سفر اختیار کرنے پر جان گنواتا۔ اپنی دنیا سے نکل کر اجنبی دنیاؤں میں جا بسنے والے لوگوں کا کچھ ہی عرصے میں مزاج بدل جاتا، تیور بدل جاتے، اسٹیٹس کچھ سے کچھ ہوجاتا۔ اجنبی دنیاؤں کی شہریت ملتے ہی دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے۔ انہیں اپنی اصل اور حقیقی دنیا بہت چھوٹی، پسماندہ، غیر مہذب اور حقیر لگتی۔ ان کے بچے اس دنیا کے باسیوں کو نہایت نخوت اور حقارت سے دیکھتے۔

مطیع اللہ کے عہدِ جوانی کا ایک دوست جو کبھی مطیع اللہ کی دنیا میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا اور مطیع اللہ جیسوں سے دوستی کو اپنے لیے فخر و اعزاز سمجھتا تھا، سوئے اتفاق اپنے ایک عزیز کی کرم فرمائی سے امریکا چلا گیا تھا۔ وہیں محنت مزدوری کر کے اس نے اپنی پرانی دنیا میں کروڑوں کی مالیت کی کوٹھی بنالی تھی۔ جس رشتے دار کی اعانت سے امریکا گیا تھا، اسی کی بیٹی سے شادی کرلی تھی۔ چار بچے تھے۔ چاروں بقول اس کے ویل سیٹلڈ تھے اور اس کا اپنا اثر رسوخ اب پرانی دنیا کے ہائی فائی لوگوں میں تھا کیونکہ جب یہ ہائی فائی لوگ امریکا جاتے تو وہی ان کا میزبان ہوتا۔ مطیع اللہ جیسوں کو تو وہ اب ترحم سے دیکھتا اور بے چارہ سمجھتا تھا۔

تقریباً دو سال پہلے جب وہ اپنی سابقہ دنیا میں اپنی بیوی اور ایک بیٹے کے ساتھ وزٹ پر آیا تو مطیع اللہ نے اسے ٹٹولنے کو اس سے پوچھا۔

''بچوں کے رشتوں کا بھی کچھ سوچا تم نے؟'' اس نے ایک نظر مطیع اللہ کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے اسے جتانا چاہتا ہو کہ اس سے اس قسم کا سوال کرنے کا نہ اسے حق تھا، نہ اس کی اوقات، پھر تکبر سے بولا۔

''یہاں میں جس سے کہوں ہاتھ باندھ کر میرے بچوں کو رشتہ دینے کو تیار ہوگا مگر میرے بچے امریکا سے باہر شادی کا خیال بھی نہیں کرنا چاہتے..... بچوں کے رشتے اپنے برابر کے لوگوں میں ہونے چاہئیں۔'' مطیع اللہ شرمندہ ہو کر رہ گیا کہ بات کر کے کھوئی۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں مطیع اللہ نے اپنی دنیا میں دورِ جدید کی ایجاد کمپیوٹر کو رسا ہوتے دیکھا۔ کمپیوٹر نے دیرینہ انسانی مہارتوں پر اپنا تسلط ایسے جمایا کہ قدیم ٹائپ رائٹرز پر اپنی انگلیوں کی مہارت سے روزی کمانے والے بہت سے لوگ یا تو بے روزگار ہو گئے یا پرانے ٹائپ رائٹرز ٹھکانے لگا کر استعمال شدہ کمپیوٹر خریدنے اور اس کا استعمال سیکھنے پر مجبور ہوئے۔

مطیع اللہ کو یاد تھا اس کے گھر میں ماں اور دادی اس کی بہنوں کو اٹھتے بیٹھتے قمیص کا آگے پیچھے سے خیال رکھنے، شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے رکھنے اور دوپٹا ہمیشہ سر پر اوڑھے رکھنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ کنواری لڑکیوں کے ہار سنگھار کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تقریبات یا تہواروں پر غرارہ بھی پہننے کا رواج تھا۔ لباس میں بے حجابی کا تو سوال ہی نہ تھا۔ ایسا کوئی پہناوا جس میں بدن کے نشیب و فراز نمایاں ہوں، بے حیائی اور گناہ سمجھا جاتا۔ دادی اور ماں اس کی بہنوں کو چپکے چپکے سمجھاتیں کہ اچھی بچیاں خود کو اوڑھ لپیٹ کر رکھتی ہیں۔ بلند آہنگی سے نہ ہنسنے اور آپس میں بات کرتے ہوئے آواز اتنی نیچی رکھنے کہ گھر سے باہر آواز نہ جائے، کی ہدایت بھی کی جاتی تھی۔ ذرا اس کی کسی بہن کی آواز اونچی ہوئی، ماں تنبیہہ کرتی۔ ''آہستہ..... گلی میں جاتے لوگ نہ سنیں۔''

وقت کے ساتھ یہ سارے ہی قرینے بدل گئے تھے۔ جدت پسند امیر گھرانوں کی خواتین تو مغربی طرز کے ملبوسات کی دلدادہ تھیں ہی، وقت کے ساتھ یہ رجحان متوسط اور نچلے متوسط طبقات کی خواتین میں بھی نمو پاتا چلا گیا۔ مطیع اللہ نے کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی دنیا میں متوسط اور نچلے متوسط گھرانوں کی لڑکیاں بھی جینز اور ٹاپ پہنیں گی۔ جسم کے ایک ایک نشیب و فراز کو نمائش کی حد تک نمایاں کر دینے والی ٹائٹس اور بلاؤز پہن کر اترائیں گی۔ دوپٹا سر سے گدھے کے سر سے سینگ کے مانند غائب ہو جائے گا۔ عام گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں بھی نت نئے ملبوسات اور آرائشِ حسن کی مصنوعات کی اس حد تک دلدادہ ہو جائیں گی کہ دن رات بازاروں میں گھومتی پھریں گی۔

مطیع اللہ کو آج بھی یاد تھا کہ اس کی دادی کے پاس صرف دو جوڑے کپڑوں کے ہوا کرتے تھے۔ سفید وائل کا ڈھیلا کرتہ، لٹھے کا تنگ پاجامہ اور ململ کا بڑا سا دوپٹا..... دادی ایک جوڑا پہنتی، دوسرا دھو کر، سکھا کر، تہ لگا کر اپنے پرانے سے بکسے میں رکھ دیتی تھی اور مطیع اللہ کی ماں کی قناعت پسندی کا بھی کم و بیش یہی عالم تھا۔ ماں کہتی بندے کو سال میں چار جوڑے چاہیے ہوتے ہیں، دو گرمیوں کے، دو سردی کے۔

مطیع اللہ کی دادی کا تو یہ حال تھا کہ نماز کے لیے وضو بھی نلکے کے سامنے بیٹھ کر نہ کرتی تھی۔ لوٹے میں پانی بھر کر گھر کے کسی بچے کو پکڑا دیتی اور پانی کی دھار مقرر کرا کے پانی ڈالتے رہنے کو کہتی۔ دھار ذرا تیز ہو جاتی تو دادی گھبرا کر کہتی۔ ''ماں صدقے! تھوڑا پانی..... زیادہ پانی بہانے کا حساب دینا مشکل ہوگا اپنے اللہ کو۔'' دادی ہر معاملے میں حساب کتاب کے خوف سے ایسی ہی احتیاط کا مظاہرہ کرتی۔

اور اب یہ حال تھا کہ مطیع اللہ گھر تو گھر، مساجد میں بھی پانی کا غیر معمولی زیاں دیکھتا تھا۔ دانتوں کی صفائی کرتے ہوئے لوگ نلکا ہی بند کرنا بھول جاتے۔ مسجد میں نمازی وضو کرنے کے لیے موٹی دھار سے پانی بہاتے۔ مطیع اللہ کو تو دادی کی بات یاد رہتی۔ ''زیادہ پانی بہانے کا حساب دینا مشکل ہوگا اپنے اللہ کو۔''

پھر ایک نئی سہولت مطیع اللہ کی دنیا میں وارد ہوئی، بلکہ کہنا چاہیے مطیع اللہ کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

ماں کی آخری علالت کے دنوں میں وہ گھر سے کہیں باہر کسی ایسی جگہ پر ہوتے ہوئے جہاں ٹیلی فون دستیاب نہ ہوتا، سوچا کرتا تھا..... کاش! ایسا ہو کہ انسان ایک ٹیلی فون اپنے ساتھ لیے پھرے..... جہاں ماں کی طبیعت کا خیال ستائے، فوراً نمبر ملا کر حال چال پوچھ لیا کرے..... ماں کی حیات میں تو اس کی یہ خواہش محض خیال ہی رہی مگر ماں کی موت کے چند برسوں بعد سیلولر فون کی صورت ایسی سہولت ترقی یافتہ ممالک سے مطیع اللہ کی دنیا میں بھی در آئی جو آدمی کو ہر حال، ہر لمحہ اپنے پیاروں سے رابطے میں رکھ سکتی تھی..... بلکہ پیاروں ہی سے کیا دوست، دشمن، اپنوں، پرایوں سب سے۔

ابتدا میں لوگ اسے حیرت اور لالچ ہٹ سے بس دیکھ ہی سکتے تھے لیکن چند ہی برسوں میں موبائل فون کا حجم بھی کم ہوگیا اور قیمت بھی عام آدمی کی رسائی میں آگئی۔ مطیع اللہ کے کرتے کی جیب میں سما جانے والی دورِ جدید کی یہ سہولت توٹی وی اور کمپیوٹر کو بھی مات کر گئی..... فاصلے سمٹ گئے..... قربتیں بڑھ گئیں۔

مطیع اللہ کو ٹی وی کے سامنے دیر تک بیٹھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ بس خبرنامہ یا کبھی کوئی ڈراما..... کمپیوٹر کے استعمال کی اسے ضرورت نہ تھی لیکن موبائل فون اس کی ضرورت بن گیا۔ موبائل فون سے مطیع اللہ کو اپنی زندگی میں غیر معمولی سہولت کا احساس ہوتا۔

تاہم وقت کے ساتھ موبائل فون کی کچھ قباحتیں بھی سامنے آنے لگیں۔ پہلے وہ گھر سے نکلتا تھا تو ایک واضح پروگرام کے ساتھ اور یکسوئی سے اپنے تمام امور حسب پروگرام نمٹا کر شام کو گھر لوٹتا تھا۔ موبائل فون نے اس کے امور کو منضبط نہ رہنے دیا۔ کام پر جاتے ہوئے اسے گھر سے بیوی کا فون آجاتا کہ گاؤں سے آیا ہوا کوئی مہمان گھر پر اس کا منتظر تھا، اسے آدھے راستے سے گھر واپس لوٹنا پڑتا یا پھر کسی ضروری کام سے جاتے ہوئے موٹر مکینک کا فون آجاتا کہ گاڑی اگر شام کو تیار چاہیے تو فلاں پرزہ کہیں سے بھی لازماً ڈھونڈ کر لادے ورنہ گاڑی نہیں بن سکتی۔ لمبی خواری کے بعد پرزہ لے کر ورکشاپ پہنچتا تو مکینک کسی اور کی گاڑی میں جتا ہوتا۔ اس کی فراغت کے انتظار میں دن ڈھل جاتا۔

وقت گزرنے اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے ساتھ موبائل فون نامی جادوئی ڈبیا میں نت نئے در وا ہوتے گئے۔ امیر، غریب، بچے، بوڑھے، جوان ..... موبائل ہر ایک کا نشہ بن گیا۔ گھر میں لگے لینڈ لائن فون کے استعمال کی اب شاذ ہی نوبت آتی۔ بے چارہ بے اعتنائی کا شکار ایک کونے میں خاموش پڑا رہتا۔

مطیع اللہ کو اس امر کا ہمیشہ قلق رہا کہ فکرِ معاش نے اپنے اپنے گھریلو معاملات پر توجہ دینے اور بیوی بچوں کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کی فرصت نہ دی تھی جیسا کہ ان کا حق بنتا تھا۔ بیوی بھی تو تعلیم یافتہ مگر تعلیم یافتہ اور بابصیرت ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مطیع اللہ کی اپنی ماں دنیاوی تعلیم سے نابلد تھی مگر مطیع اللہ اس کی بصیرت کو سلام کرتا تھا۔ آج کی ڈگری یافتہ مائیں اولاد کی کیا تربیت کرتی ہوں گی جو اس چٹی ان پڑھ ماں نے کی تھی۔ کیا وژن تھا اس کا! گھر کی چہار دیواری کے درمیان بیٹھ کر وہ باہر کی دنیا کا علم رکھتی تھی۔ مطیع اللہ کو اخلاقِ حمیدہ اور سب سے بڑھ کر ہر حال میں اللہ سے اپنا تعلق جوڑے رکھنے کا درس ماں ہی نے دیا تھا۔ ماں نے ہی اسے نفس پر قابو رکھنا اور دنیاوی آلائشوں سے اپنا دامن حتی الامکان بچائے رکھنا سکھایا تھا۔ آج جب وہ اپنی دنیا میں ساس بہو کی منافرت، عداوت اور لڑائی جھگڑے دیکھتا تو سوچتا اس کی دادی اور ماں کس مٹی کی بنی عورتیں تھیں جنہوں نے ساس بہو ہو کر ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اس گھر کو امن وسکون کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔

ماں کا کوئی ایک احسان تھا، مطیع اللہ کو تو لگتا اس کی ساری زندگی ماں کے احسانات تلے دبی ہوئی تھی۔ اچھے عمل کے بدلے جنت اور برے عمل کے بدلے دوزخ کا جو تصور ماں نے اس کے ذہن میں بٹھایا تھا، وہ آج بھی اس کے لیے لگام بنا ہوا تھا۔ کاروبار ذریعۂ روزگار رکھتے ہوئے بھی وہ کاروباری برادری کی اکثریت کی طرح خودغرض، دھوکے باز اور غیر ضروری منافع خور نہ تھا۔ اس کے ساتھ کے لوگ زیادہ منافع کی ہوس میں طرح طرح سے بے ایمانی کرتے مگر وہ زیادہ منافع کی ہوس نہ کرتا۔ اس کے بچے ماں سے کہتے۔ ''بابا کے ساتھ کے لوگوں نے پلازے کھڑے کر لیے ہیں ..... بابا وہیں کھڑے ہیں جہاں اس وقت کھڑے تھے جب ہم چھوٹے تھے۔'' مطیع اللہ کو کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ اس کا دل مطمئن تھا۔

مطیع اللہ شکر ادا کرتا کہ اللہ نے اسے آخری نبی محمد ﷺ کی امت میں پیدا کیا تھا۔ وہ اس دین کے پیروؤں میں شامل تھا جس کے لیے خالقِ کائنات نے آخری الہامی کتاب قرآن مجید میں خود فرمایا۔ ''آج میں تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا۔'' مطیع اللہ کہتا، ہم مسلمان تو اپنے مسلمان ہونے پر پیشانی کے بجائے آنکھوں سے سجدے کریں تو بھی مسلمان ہونے پر اپنے رب کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔

مطیع اللہ نے اپنے دادا اور باپ دونوں سے نبی ﷺ کا یہ فرمان سنا تھا۔ ''ہر دور کے بعد آنے والا دور بدتر ہوگا۔'' پیارے نبی ﷺ کی عظمت و بصیرت کو سلام! آپ ﷺ کی دور اندیشی حیات کے ہر گوشے پر منطبق دکھائی دیتی تھی۔

دنیا جیسی ماضی میں تھی، حال میں ویسی نہیں رہی تھی۔ خود مطیع اللہ گزری کل سے یکسر مختلف ہوگیا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا تو آئینہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا..... چٹے بالوں والا یہ بابا کون تھا جو آئینے کے سامنے کھڑا خود کو

مطیع اللہ کہہ رہا تھا...... مطیع اللہ شناخت نہ ملنے پر گھٹی گھٹی ایک سرد آہ بھرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وقت اسے اپنے قدموں تلے روندتا اور اس کے نقوش بگاڑتا گزر گیا تھا۔

معاشرتی طور پر بھی حال، ماضی سے بدتر تھا۔ رشتے ناتے کمزور، خود غرضی عروج پر، خونی رشتوں میں چپقلش، ہمسایہ ہمسائے سے بے خبر، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کی دلداری مفقود۔ مطیع اللہ کے اپنے گھر میں اس کے بچے اس کے سامنے ٹانگیں پسارے بستر پر لیٹے رہتے تھے۔ اسے یاد تھا اس کے بچپن میں گھر مہمان آئی اس کی ایک پھوپی نے اس پلنگ پر لیٹنے سے معذرت کرلی تھی جس کی پائینتی مطیع اللہ کے باپ کے پلنگ کے سرہانے کے رخ پر تھی۔ ایسا برا دور آلگا تھا کہ ماں باپ اولاد کی ناخلفی سے ڈرتے تھے۔ مطیع اللہ کے گھر میں اس کی اپنی بیوی بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے اس لیے گریز کرتی تھی کہ وہ ایک کہتی تو بچے دو بدو جواب دیتے۔ بے چاری صبح سے شام تک پھرکی کی طرح گھومتی تھی۔ ابھی ایک کو یونیورسٹی کے لیے رخصت کرنا ہے تو ابھی دوسرے کو باہر جانے سے پہلے ناشتا دینا ہے۔ کبھی ایک بیٹے کی آواز پر لپکتی تو کبھی بیٹی کو بارش یا دھوپ سے بچنے کے لیے چھتری پکڑاتی۔

گھر سے باہر بھی دورِ حاضر، دورِ گزشتہ سے بدتر تھا۔ تہذیب، خلوص اور رواداری ناپید ہو چکی تھی۔ گویا...... برداشت کی جگہ عدم برداشت نے لے لی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لیتے، تو تکار اور گالم گلوچ کرنے لگتے، کتوں کی طرح ایک دوسرے پر غراتے اور کبھی ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے بھی لگتے۔ اس وحشت ناکی کا انجام کبھی خونِ ناحق بھی ہوتا۔ مقتول جان گنواتا اور قاتل کٹہرے میں کھڑا ہو کر جج سے کہتا، غلطی ہوگئی صاحب! سڑکوں پر ہر شخص دوسرے کو روند کر آگے بڑھنا چاہتا۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے ڈرائیورز زیادہ سواریاں اٹھانے کے چکر میں پاگلوں کی طرح گاڑیاں دوڑاتے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دھن میں پیدل چلتے اور سڑک کنارے کھڑے لوگوں پر گاڑیاں چڑھا دیتے۔ وحشی، خونی ڈرائیور یا تو مفرور ہو جاتا اور اگر پکڑا بھی جاتا تو دو چار دن بعد ہی ضمانت پر ہنستا کھیلتا، سینہ تانتا انسانی زندگی کا فاتح بنا پھر کسی نئے شکار کے خون سے اپنے دانت رنگنے باہر نکل آتا۔

مطیع اللہ کو یاد تھا اس کے لڑکپن میں محلے کا ایک ٹریفک کانسٹیبل اپنی ڈیوٹی کے دوران چوراہے پر ایک ٹرک کی ٹکر سے ہلاک ہو گیا تھا۔ دنوں محلے کی فضا سوگوار رہی تھی۔ مطیع اللہ کی ایک بہن تو متوفی کے کفن کو بھی خون آلود دیکھ کر اتنی وحشت زدہ ہوئی تھی کہ کئی راتوں تک وہ رات کو سوتے سے اٹھ کر خوفزدہ ہو کر رونے لگتی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اس حادثے کو بھلا پائی تھی۔

بے حسی دورِ حاضر میں اتنی ہوگئی تھی کہ الاماں! اور آقائے نامدار کا یہ فرمانِ حق کہ آنے والا دور گزشتہ سے بدتر! مطیع اللہ ان دنوں دس سال کا ہوگا۔ اسکول جانے کے لیے اسے بس میں سفر کرنا پڑتا۔ ایک روز وہ بس اسٹاپ پر بس سے اترا تو پیچھے سے آنے والی ایک ٹیکسی نے اسے اچھال کر سڑک کنارے پھینک دیا۔ معجزہ ہی تھا کہ وہ بچ گیا۔ خراش تک نہ آئی، مگر سڑک پر ٹریفک رک گئی۔ کسی نے اسے سنبھالا اٹھایا اور جسم ٹٹولا۔ کسی نے اس کا بستہ اٹھایا۔ لوگوں کے ہجوم نے ٹیکسی والے کو کھینچ کر باہر نکالا، برا بھلا کہا، ہاتھ بھی جڑ دیے۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے معافی مانگتا رہا۔ کسی نے مطیع اللہ کے کپڑے جھاڑے، کسی نے چمکارا پھر ٹیکسی والے سے کہا گیا کہ وہ بچے کو اس کے اسکول پہنچائے۔ مطیع اللہ کی حفاظت کی خاطر ایک رحم دل شخص پہلے سے ٹیکسی میں بیٹھی سواری کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مطیع اللہ کو اسکول کے گیٹ پر پہنچا کر چونی ٹیکسی ڈرائیور نے دی۔ دونی ٹیکسی میں بیٹھی سواری نے اور ساتھ آنے والا شخص مطیع اللہ کو اسکول کے اندر تک ہیڈ ماسٹر صاحب کو ساری روداد سنا کر چھوڑ کے گیا اور اب یہ حال تھا کہ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ سڑکوں پر حادثات میں مارے جاتے، کتنے گھروں کے چراغ گل ہوتے، زخمی جسم سڑکوں پر پڑے تڑپتے، سسکتے رہتے، پولیس کی پوچھ گچھ کے ڈر سے لوگ دور دور سے دیکھتے اور گزر جاتے۔ بعض من چلے موبائل سے ویڈیو بنانے لگتے۔

کاروباری دنیا کا احوال بھی نبی ﷺ کے فرمان سے چنداں مختلف نہ تھا...... بڑے سوداگر کسانوں اور محنت کشوں کا استحصال کرتے، ذخیرہ اندوز کھڑی فصلوں کا سودا کر لیتے جبکہ نبی ﷺ کا فرمان کہ غلہ ناپ تول کے بغیر فروخت نہ کیا جائے۔ بڑے اور چھوٹے کارخانے دار ملاوٹ اور مالِ ناقص کے علمبردار، بازاروں میں بیٹھے آڑھتی، منافع خور، چھوٹے دکاندار گاہکوں کو الٹی چھری سے ذبح کرنے کو تیار...... دام اپنی مرضی کے لیتے مگر مال گاہک کی مرضی سے نہ دیتے...... دکھاتے کچھ، دیتے کچھ...... ناپ تول میں کمی شعار...... روزی سے برکت اٹھتی ہوئی...... گھر میں کوئی بیمار، کوئی مبتلائے آزار...... پھر بھی عبرت نہ پکڑتے۔ اعمالِ قبیح پر نظر نہ کرتے، مہنگائی دن دگنی رات چوگنی...... عام صارف

دکانداروں سے مہنگائی کا گلہ کرتے تو جواب ملتا۔ ''کیا کریں جی، پیچھے سے مہنگائی ہے''...... اس پر اسرار ''پیچھے'' نے ساری قوم ہی کو پیچھے کر دیا تھا...... مطیع اللہ کو کاروباری طبقے میں ہوتے ہوئے قدم قدم پر خوفِ خدا رہتا۔ منافع صرف اتنا جو عزت سے گزر بسر ہو جائے۔ اس کے ساتھی آئے روز اپنی مصنوعات کی قیمت بڑھا دیتے۔ جب پیارے نبی ﷺ نے فرمایا کہ دنیا اس طرح بسر کرو جیسے کوئی پردیسی ہو یا راستے چلتا ہوا مسافر، تو اس مسافرت میں زیادہ اسباب کی ہوس کیوں؟...... غیر ضروری اسباب تو مسافرت کو دشوار بنا دیتا ہے...... مطیع اللہ کو سب سے زیادہ قلق اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کی دنیا میں اوپر سے نیچے تک ساری معیشت سود میں ڈوبی ہوئی تھی...... حکمِ ربی کہ سود ترک کر دو ورنہ اللہ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، مطیع اللہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا...... معاذ اللہ! اللہ سے جنگ! اللہ سے جنگ کون کر سکتا ہے؟

ثقافت الگ تنزلی کا شکار تھی۔ بے حیائی اور بے حجابی اوپر سے متوسط اور نچلے متوسط طبقات میں بھی در آئی تھی۔ ہمسایہ ملک کی فلموں اور فحش گانوں کا جو اثر تھا سو تھا، رہی سہی کسر مطیع اللہ کی اپنی دنیا میں ٹی وی چینلز کی اخلاق باختگی نے پوری کر دی تھی۔ یہ چینلز اپنے شوز میں مسلمان عورت کا تصور مسخ کرتے۔ ان ناچنے والیوں میں عریانی کی دوڑ لگ گئی۔ بازو عریاں، پیٹ عریاں، پیٹھ عریاں، ٹانگیں عریاں۔ شوبز سیلبریٹیز نے محل نما آئینہ خانے بنا لیے تھے جن میں وہ شاہانہ زندگی بسر کرنے میں دورِ گزشتہ کے فلمی اداکاروں کو بھی مات کرتیں۔ ان کے اسٹائل اور ٹھاٹ باٹ کی چاہ میں غریب اور متوسط طبقات کی بہت سی عاقبت نااندیش لڑکیاں تاریک راہوں میں اپنا آپ گنوا بیٹھتیں۔

مطیع اللہ کی دنیا میں ایک نئی وبا سوشل میڈیا کی پھوٹی تھی۔ جب تک مطیع اللہ کے پاس سادہ موبائل فون رہا، بس اتنا ہی ہوا کہ کبھی کبھار کسی انجانے نمبر سے کال آ جاتی، کبھی کوئی مرد ہوتا، کبھی خاتون...... کوئی اپنا دکھڑا بیان کر کے مالی مدد کی طلب گار ہوتی، کوئی مطیع اللہ کو مائل بہ گناہ کرنے لگتی ...... ''سر! لڑکی چاہیے؟'' مطیع اللہ لاحول پڑھتے ہوئے رابطہ منقطع بلکہ کبھی تو اپنا فون ہی بند کر دیتا۔

اسمارٹ فون کے فوائد سن کر مطیع اللہ نے سادہ موبائل کی جگہ اسمارٹ فون استعمال کرنا شروع کیا تو اس پر سوشل میڈیا کی افادیت کے ساتھ اس کی ہولناکی کا اندازہ بھی ہوا۔ بلا قصد و ارادہ ایسے ایسے بے ہودہ عنوانات اور موضوعات سامنے آ جاتے کہ مطیع اللہ کو لاحول ولا قوۃ پڑھتے ہوئے ان عنوانات اور خرافات سے صرفِ نظر کر کے آگے بڑھنا پڑتا لیکن وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ تو عمر کے اس دور میں تھا جہاں انسان کو تجسس سے زیادہ اپنی عاقبت عزیز ہو جاتی ہے۔ نوجوانوں کو ان کا فطری تجسس کن آلائشوں میں کھینچ لے جاتا ہوگا۔ اسے اپنے بچوں کے ہاتھوں میں ہمہ وقت اسمارٹ فون ٹائم بم دکھائی دیتے۔ خدا جانے کیا کچھ دیکھتے ہوں گے وہ! چھٹکارے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ مطیع اللہ اپنی ذات کے داخلی حالات پر اکثر نہایت دل گرفتہ ہو جاتا اور سوچتا، اللہ مہربان و رحیم نے تو اپنے بندوں کو بہت ستھری، منظم اور فتنوں سے مبرا زندگی دی تھی۔ شیطانی قوتوں نے ستھری اور سادہ زندگی کا نقشہ بگاڑ کر اسے آلودہ کر دیا تھا۔

اللہ کے بندوں پر زندگی مطیع اللہ کی دنیا میں بھی تنگ کر دی گئی تھی اور بیرونی دنیا میں بھی...... ظلم کا بازار گرم...... طاقتور، کمزوروں کے درپے...... مسلمان ریاستیں حیلے بہانوں سے تاخت و تاراج...... ہزاروں لاپتا...... لاکھوں مظلوم دربدر...... بے گناہ مارے جانے والے بے شمار...... ان گنت بچے یتیم...... عورتیں بے حرمت...... کڑیل جوانوں کے لاشے...... بوڑھے ماتم کناں...... کہیں مائیں، بہنیں جوان بیٹوں اور بھائیوں کے جنازوں پر ماتم کرتیں ...... کہیں نوجوان بیوائیں اپنے سر سے چھنی چادروں پر نوحہ گر ہوتیں...... کہیں بے گور و کفن معصوم لاشوں کی کھلی آنکھیں آسمان سے فریاد کناں...... کہیں حکمرانوں کو پابندِ قفس کر کے تصویرِ عبرت بنا دینے کا زعم...... انسانیت سوز مظالم کے خلاف مزاحمت کرنے والے دہشت گرد قرار...... مجاہدین عقوبت خانوں میں بہیمانہ سلوک کا شکار...... ناتواں اور نہتی مسلمان عورت کو اوسط انسانی عمر سے زیادہ سزا کا فرمان...... اللہ کے گھر مسمار...... انسانی آبادیوں پر بہیمانہ فضائی حملے...... مقبوضہ وادیٔ جنت نظیر میں مکمل لاک ڈاؤن! باہر کی دنیا خاموش تماشائی!

دنیا کیسی بے حس ہو گئی تھی!

مطیع اللہ دل ہی دل میں کڑھتا۔ انسانی اقدار کی زوال پذیری اسے اندر ہی اندر دکھی کرتی۔ دنیا بے سمت مسافر بنی بس دوڑے ہی چلی جا رہی تھی۔

مطیع [illegible] دنیا کی یہ روش نہایت دکھی کرتی...... یہ کیسا سفر تھا...... برق رفتار...... مگر بے سمت...... دنیا انسانوں سے بھری پڑی تھی...... مگر قحط الرجال تھا۔

ہر بندۂ خدا کی طرح مطیع اللہ کو بھی دنیا کے بگڑے حالات پر خدا کی ناراضگی کا دھڑکا فکرمند رکھتا۔ بے شک اللہ رب العزت کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ رحمت کا ہے۔ بندوں پر اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ بندے گناہ در گناہ کرتے رہتے ہیں اور اللہ انہیں اپنی رحمت کے سبب انہیں ڈھیل دیے جاتا ہے۔ وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر شفقت رکھتا ہے لیکن ان کی سرکشی اور سرتابی پر ایک معین حد تک انہیں ڈھیل دیتا ہے، سو جب وہ میعاد معین آپہنچے اور بندے اپنی روش نہ بدلیں تو اس کا غضب شروع ہوجاتا ہے۔

مطیع اللہ قرآن پاک میں گزشتہ اقوام کی بے اعتدالیوں اور سرتابی پر ان کا عبرت ناک انجام پڑھ کر کانپ جایا کرتا تھا..... شرک گناہِ کبیرہ..... جن اقوام نے شرک کیا، ذلت اور رسوائی اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئیں۔ مطیع اللہ دیکھتا تھا، باہر کی دنیا تو کیا، اس کی اپنی دنیا میں لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود شرک کی مختلف صورتیں اپنا رکھی تھیں ..... حاجت برآری کے لیے قبر پرستی..... بندوں کو حاجت روا قرار دینا..... گمراہ کن عقائد اور چڑھاوے ..... یہ سب شرک کی صورتیں ہی تھیں۔ جاہل، کم علم اور گمراہ بندے بنا کسی ثبوت اور تحقیق جھوٹی باتیں، جھوٹے فرمان اللہ رب العزت کی ذات سے منسوب کردیتے۔ سوشل میڈیا نے اس رجحان کو زیادہ ہوا دی تھی۔ مطیع اللہ سوشل میڈیا پر ایسی ایسی پوسٹیں دیکھتا جو شرک پر مبنی ہوتیں۔ افسوس کہ علم، تحقیق اور مستند حوالوں کے بغیر لوگ جھوٹے فرمان کو ذاتِ الٰہی کے احکام قرار دے دیتے۔

فحاشی اور بے حیائی اللہ پاک کی ناراضگی کا بڑا سبب ..... قوم لوط اسی برائی کے باعث اللہ کے عذابوں سے دوچار ہوئی۔ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''جب بھی کسی قوم میں اعلانیہ فحاشی ہونے لگتی ہے تو اس میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے بزرگوں میں نہیں ہوتی تھیں۔'' مطیع اللہ دیکھتا تھا باہر کی دنیا تو اللہ پاک کی ناراضگی کے اس سبب میں عرصۂ دراز سے اعلانیہ ڈوبی ہوئی ہی تھی۔ یہ زہر اسلامی معاشرت میں بھی نفوذ کررہا تھا۔ کچھ عرصے سے اس کی اپنی دنیا بھی گوڈوں گوڈوں اس گند میں ڈوبی جارہی تھی۔ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا اس برائی کو دن بہ دن بڑھاوا دے رہے تھے۔ مسلمان عورت جس کے لیے حجاب اس کی آبرو تھی، دن بہ دن عریاں سے عریاں ہوئے جارہی تھی۔

ناپ تول میں کمی نے قوم شعیب علیہ السلام کو المناک عذاب سے دوچار کیا۔ مطیع اللہ کو دکھ تھا کہ اس کی اپنی دنیا میں یہ برائی باہر کی دنیا سے بھی سوا ہوئی جارہی تھی۔ اس ایک برائی کی کوکھ سے بے شمار برائیوں نے جنم لیا تھا۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، مہنگائی، منافع خوری..... لین دین کے پیمانے مختلف ..... ناقص مال کو حیلے بہانوں سے عمدہ ظاہر کرکے فروخت کیا جاتا۔ کبھی کلیئرنگ سیل کے عنوان سے کبھی مالک کی بیرون ملک نقل مکانی یا کاروبار میں تبدیلی کے بہانے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا۔ ''جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، اس کو قحط سالی، روزگار میں تنگی اور بادشاہ کے ظلم کے ذریعے سزا دی جاتی ہے۔''

مطیع اللہ کو اپنی دنیا میں سودی نظام کاروبار پر رنج ہی نہیں تشویش بھی ہوتی۔ عوام وخواص ہر سطح پر کیسی عاقبت نااندیشی اور دیدہ دلیری تھی کہ رب کے اس واضح اعلامیہ کے باوجود کہ سود کھانے والا اللہ رب العزت سے جنگ کا مرتکب ہوتا ہے، مطیع اللہ کی دنیا اسی دلدل میں ڈوبی جارہی تھی۔ اللہ سے جنگ کرکے کون جیتا ہے بھلا..... بندوں کی کج روی کسی ناگہانی کو دعوت دے رہی تھی۔ کورونا وائرس کی آماجگاہ کچھ بھی سہی جس طبقۂ فکر کا مطیع اللہ حامی وہمنوا تھا، اس کا ماننا تھا کہ جس کائنات میں اذنِ ربی کے بنا پرندہ پر نہیں مار سکتا، پتا ہل نہیں سکتا، وہاں رب کی مشیت کے بغیر کورونا وائرس کیسے دم مار سکتا تھا!

☆☆☆

عبدالواسع ہاؤس جاب کے لیے چلا گیا تھا۔ ریحانہ اداس تھی۔ بچے ایک ایک کرکے گھر سے دور جارہے تھے..... پہلے عبداللہ اور اب عبدالواسع۔ گھر میں اب چار نفوس رہ گئے تھے۔ مطیع اللہ، ریحانہ، مومنہ اور عبدالمعز۔ دونوں بچے رات بھر جاگتے، صبح نماز کے بعد سوجاتے۔ آن لائن کلاس ہوتی تو موبائل پر الارم بجتے ہی اٹھ جاتے۔ کلاس کے بعد پھر سوجاتے اور دوپہر کے وقت ہی اٹھتے۔ کلاس نہ ہوتی تو نماز کے بعد سوجاتے اور دن چڑھے اٹھتے۔ ریحانہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ مطیع اللہ بھی مصروف رہنے کی کوشش کرتا۔ کاروبار بند تھا۔ صرف اسی کا کیا بہت سوں کا..... فون پر کاروباری احباب سے بات چیت ہوتی تو ہر شخص مایوس اور متفکر محسوس ہوتا۔ روزمرہ

اشیائے صرف کی دکانوں اور اسٹورز کے مالکان البتہ مطمئن تھے کہ ان کا کاروبار چل رہا تھا۔ نجی شعبے میں آجر دھڑا دھڑ اپنے ملازمین کو فارغ کررہے تھے۔ کام بند تھا، ملازمین کو تنخواہیں کہاں سے دیتے بلکہ کرائے کی جگہوں پر کاروبار کرنے والے تو کرایہ اور دیگر مدوں میں اخراجات سے بچنے کے لیے کرائے کی جگہیں بھی یا تو خالی یا انہیں مختصر کررہے تھے۔ اس ابتر معاشی صورتِ حال میں محفوظ تھا تو سرکاری تنخواہ دار طبقہ یا پنشنرز..... ڈرے سہمے ہوئے وہ بھی تھے کہ خدا جانے کب کیا ہوجائے۔

''توبہ توبہ! وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔'' ریحانہ نے پُرملال لہجے میں کہا۔

''امی! ایسا تو اینڈ آف دی ڈیز پڑھنے والوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔'' مومنہ بولی۔

''وہ کیا ہے بیٹا؟'' ریحانہ نے پوچھا۔

''ایک کتاب ہے امی..... کسی امریکی مصنفہ نے کئی سال پہلے لکھی تھی جس میں اس نے سن دو ہزار بیس کے لگ بھگ دنیا میں ایسی ہی وبا پھیلنے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا جس تیزی سے یہ وبا پھیلے گی، اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہوجائے گی.....''

''اللہ کرے جلدی ختم ہو۔'' ریحانہ کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''مگر امی! اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ دس سال بعد یہ وبا دوبارہ پھیلے گی اور اپنے دوبارہ پھیلاؤ کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔''

''یار! میں تو اپنے دوستوں سے ملنے کو ترس گیا ہوں۔'' عبدالمعز کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

مطیع اللہ دھیرے سے کھنکھارا اور ریحانہ کو اچٹتی نظر سے دیکھ کر بولا۔ ''شاید تمہیں یاد ہو ریحانہ..... میں نے اس وبا کے آغاز ہی میں کہہ دیا تھا..... یہ ابتدا ہے، آگے دیکھتی جاؤ..... حالات سنبھلیں گے نہیں، وقت گزرنے کے ساتھ بگڑتے چلے جائیں گے۔''

ریحانہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ ''ہاں..... مجھے یاد ہے..... آپ نے یہی کہا تھا..... مگر کیسے.....؟ کیا غیب کا علم ہوگیا تھا آپ کو؟''

''غیب کا حال تو صرف پروردگار ہی جانتا ہے ریحانہ..... دنیا کے حالات بتا رہے تھے کہ کچھ غیر معمولی ہوگا۔'' مطیع اللہ نے توقف کیا اور دونوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! یہ سلسلہ دور تک جائے گا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ریحانہ گھبرا کر بولی۔ ''اب تو دل گھبرا گیا ہے..... عبداللہ اور عبدالواسع کی طرف دھیان جاتا ہے تو ہول آنے لگتا ہے..... عبدالواسع بتا رہا تھا کہ اس کے ہاسپٹل میں کورونا وارڈ بھی ہے..... یہ لوگ اس طرف نہیں جاتے مگر سنا ہے اب تو کورونا ہوا میں بھی آگیا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔'' مطیع اللہ نے ریحانہ کو تسلی دی۔

''ووہان میں یہ بیماری دسمبر دو ہزار انیس میں شروع ہوئی تھی۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے جنوری دو ہزار بیس میں اسے دنیا بھر کے لیے ایمرجنسی ڈیکلیئر کیا اور..... مارچ دو ہزار بیس میں اسے عالمی وبا قرار دے دیا..... ہمارے ہاں فروری دو ہزار بیس میں دوسرے ملک سے آنے والے ایک شخص میں کورونا کی تشخیص ہوئی اور مارچ تک کورونا کی وبا سارے ملک میں پھیل گئی..... لاک ڈاؤن اپریل میں شروع ہوا اور تب سے اب تک ہم لوگ گھر ہی میں ہیں۔'' عبدالمعز بولا۔

''آئی ایم ریئلی فیڈ اپ۔'' مومنہ روہانسی دکھائی دینے لگی۔ ''کیا ملا ان لوگوں کو جنہوں نے وائرس بنا کر فضا میں داخل کیا اور دنیا کو عذاب میں ڈال دیا۔''

''یہ معلوم کیسے ہو کہ کس کی شرارت تھی؟'' عبدالمعز نے کہا۔

''بیٹا! فرض کرو ہم اسے بڑی طاقتوں کی شرارت سمجھ بھی لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا باقی دنیا ایسی بے خبر تھی کہ کرنے والے اپنا کام کر گزرے اور باقی دنیا سوتی رہے..... انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دورِ عروج میں دنیا اتنی بے خبری نہیں دکھا سکتی..... کلوننگ بہت غیر معمولی سائنسی تجربہ تھا۔ ڈولی نامی بھیڑ کلوننگ ہی کے ذریعے وجود میں آئی تھی لیکن دنیا نے کلوننگ کو مسترد کردیا کیونکہ اس سے انسانی معاشرے میں بہت بگاڑ پیدا ہوجانے کا اندیشہ تھا..... سوچو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ عالمی قوتوں میں سے کوئی ایک، دوسرے کی تباہی کا سامان کررہی ہو اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دورِ عروج میں باقی دنیا خاموش تماشائی بنی اپنی بھی تباہی کا سامان ہوتے دیکھتی رہی ہوگی۔'' مطیع اللہ نے بچوں کو اپنا نکتۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔

''بابا! کہیں سے تو آیا ہے نا یہ وائرس..... کوئی تو اس کے پھیلاؤ کا ذمے دار ہے۔'' عبدالمعز نے جرح کی۔

''بابا! روایتی جنگوں کا تصور پرانا ہورہا ہے..... دنیا اب جراثیمی ہتھیاروں کی طرف جارہی ہے۔'' مومنہ بولی۔

''مان لیتے ہیں بیٹی۔'' مطیع اللہ نے توقف کیا، پھر

کہا۔ ''دنیا بھر کی تجربہ گاہوں میں روزانہ نہ جانے کتنے اور کون کون سے سائنسی تجربات کیے جاتے ہیں..... ملین، بلین ڈالرز کے تجربات اگر اللہ کی مشیت نہ ہو، آناً فاناً خاک میں مل جاتے ہیں..... ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔''

''بابا! شیطانی قوتیں بھی تو انسانی تجربات کو ناکامی سے دوچار کرسکتی ہیں۔'' عبدالمعز بولا۔

مطیع اللہ نے بیٹے کو تادیبی نظروں سے دیکھا۔ ''ایک بات یاد رکھنا بیٹے..... شیطانی قوت ہمیشہ رب رحمان کے راستے کی ضد میں چلتی ہے..... سو انسانی تجربات اور کوششیں وہی ناکام ہوتی ہیں جن میں رب کی مشیت نہیں ہوتی۔''

''آپ کا مطلب ہے کورونا اللہ کی مرضی سے آیا ہے؟'' عبدالمعز نے باپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''اول دن سے یہی کہہ رہا ہوں میں فرض کریں انسانی کاوش کا نتیجہ ہی سہی کورونا مگر جان تو اللہ کی مرضی پڑی۔''

''استغفر اللہ، میاں جی..... میرا پروردگار اپنے بندوں پر اتنا بے رحم نہیں ہوسکتا..... وہ تو رحمان اور رحیم ہے۔'' ریحانہ جو اتنی دیر سے چپ چاپ شوہر اور بچوں کی باتیں سن رہی تھی، خاموش نہ رہ سکی۔

''وہ جبار و قہار بھی ہے، ریحانہ۔'' مطیع اللہ نے برجستہ کہا۔

''سنا ہے رمضان اور عید کی وجہ سے لاک ڈاؤن میں کچھ نرمی کرنے والے ہیں۔'' ریحانہ نے کہا۔

''سن تو رہے ہیں مگر لوگوں کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔''

''احتیاط!'' عبدالمعز کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''احتیاط اور ہمارے لوگ! غصہ آتا ہے لوگوں کی بے احتیاطی پر۔''

''ٹھیک کہتے ہو لیکن ہیں تو ہمارے ہی..... انہیں آگہی دینے کی ضرورت ہے۔'' مطیع اللہ نے کہا۔

''بیٹا... نصیحت اسے کی جائے جو اس کو سمجھے اور عمل کرے..... بندر کو نصیحت کرنا بچے کا گھر برباد کروانا ہے۔''

''بے کیا ہوتا ہے، امی؟''

''بیا ایک پرندہ ہوتا ہے جس کا گھر بنانا بڑا مشہور ہے۔''

''بابا! یہ اپنے لوگ بھی عجیب ہیں..... کل امی نے سبزی اور فروٹ لینے کے لیے بھیجا تو قیمتیں آسمان پر چڑھی ہوئی تھیں..... ہونا تو یہ چاہیے کہ لوگ لاک ڈاؤن اور آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے خریداری کم کررہے ہیں..... فروٹ ایکسپورٹ بھی نہیں کیا جارہا ہے..... اسٹوریج کی بھی ایک حد ہی ہوگی..... ضائع ہونے سے بہتر ہے کہ قیمت کم کردی جائے تاکہ کھانے پینے کی چیزیں تو کم از کم عام آدمی کی پہنچ میں رہیں..... رمضان آیا نہیں اور کیلا تین سو روپے درجن، ادرک لہسن سو روپے پاؤ۔'' عبدالواسع کے جانے کے بعد روزمرہ سودا سلف لانا عبدالمعز کی ذمے داری ہوگئی تھی۔

''بیٹا! یہی تو افسوس کی بات ہے..... ہماری خود غرضیوں نے ہماری زندگی سے برکت اٹھالی ہے..... پہلے وقتوں میں ایک آدمی کماتا تھا، سارا کنبہ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ آج گھر کا ہر فرد روزی کے چکر میں گھر سے نکل پڑا ہے مگر برکت نہیں رہی۔''

''لاک ڈاؤن نے تو بیزار کردیا ہے۔'' مومنہ نے پھر بیزاری ظاہر کی۔

''بیٹی! اس سے پہلے آزاد پنچھی بنے اڑتے بھی تو رہے ہیں برسوں..... بندے کو ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

''جی بابا۔'' مومنہ جھینپ گئی۔

''لاک ڈاؤن میں کتنے بہت سے کام کیے ہم لوگوں نے۔''

''جی بابا..... آپ کے کہنے پر میں تھیسس پر کام کرتی رہی، اپنے سپروائزر سے بھی مسلسل رابطے میں ہوں۔ جب تھیسس جمع کرانے کو کہیں گے، کرادوں گی۔''

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو اس مشکل وقت میں باعمل رہے گا، آگے مزے میں رہے گا۔''

''بابا! سب سے زیادہ مزہ تو ہمیں آپ کے بچپن اور جوانی کے قصے سننے میں آیا..... امی سے آپ کی شادی کا قصہ سنتے ہوئے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم سن نہیں رہے، مووی دیکھ رہے ہوں۔'' عبدالمعز بولا۔ ''ویسے بابا..... یہ حقیقت ہے کہ لاک ڈاؤن نہ ہوتا اور ہم سب کو پہلی بار اتنے دن اس طرح دن رات اکٹھے رہنے کا موقع نہ ملا ہوتا تو ہم آپ کے بارے میں بہت سی باتیں کبھی جان ہی نہ پاتے۔''

مطیع اللہ نے ایک گہری سانس کھینچی، پھر بولا۔ ''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے بیٹا۔ فکر معاش میں، میں تم لوگوں کو اتنا وقت نہیں دے سکا جتنا تمہارا حق بنتا تھا۔''

''وقت نہیں دے سکے تو کیا باقی تو سب کچھ دیا۔'' ریحانہ نے مطیع اللہ کی وکالت کی۔

''ریحانہ! والدین کو اپنے بچوں کو وقت بھی دینا چاہیے..... کوالٹی ٹائم..... جو ماں باپ کے جانے کے بعد بھی اولاد کی یادوں میں رہے۔''

''چلیں..... اب تو دے رہے ہیں..... جو وقت گزر گیا سو گزر گیا۔''

''وقت گزرنے ہی کے لیے ہے، ریحانہ۔''

''بابا! میرے ایک دوست نے جو کشمیر سے تعلق رکھتا ہے، اپنے واٹس ایپ پر یہ اسٹیٹس ڈال رکھا ہے..... کشمیر میں لاک ڈاؤن پر آنکھیں بند کر لینے والی دنیا کا لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

''بہت برمحل!'' مطیع اللہ پھڑک اٹھا۔

''بھابی صنوبر کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں..... زندگی جیسے سیل ختم ہو جانے والی گھڑی کی سوئیوں کی طرح ایک ہی جگہ پر اٹک کر رہ گئی ہے۔ اس کمبخت کورونا کی وجہ سے انہیں بیٹی کی شادی ملتوی کرنا پڑی۔''

صنوبر، ریحانہ کے پھوپی زاد بھائی افتخار احمد کی بیوی تھیں۔

''کیوں ملتوی کی..... کر دیتیں۔''

''کورونا میں!''

''ہاں، تو جب باقی سب معاملاتِ زندگی جاری ہیں تو شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟''

''ایک ہی بیٹی ہے اس کی۔ شادی وہ خوب دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہیں۔''

''جسے تم دھوم دھام کہہ رہی ہو، وہ اسراف ہوتا ہے ریحانہ..... اور اسراف اللہ کو پسند نہیں۔''

''جب اللہ دے تو بندہ اپنے بچوں کی خوشیوں پر بخل کیوں دکھائے۔ افتخار بھائی کو خوب دے رکھا ہے اللہ نے۔''

''شکرانِ نعمت یہ ہے ریحانہ کہ اللہ رب العزت جب بندے کو فراخی عطا فرمائیں تو وہ محض دکھاوے کو لاکھوں کروڑوں لٹانے کے بجائے ضرورت مندوں کو دے ..... رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جس شادی میں دکھاوا ہو اس میں برکت نہیں رہتی۔''

''یعنی بابا آپ ہم تینوں بھائیوں اور مومنہ کو یونہی ٹرخا دیں گے۔'' عبدالمعز کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

مطیع اللہ کے لیے اس کی ظرافت اور بے باکی کوئی اچنبھا نہ تھا۔ اچنبھا اسے عبدالمعز کی سنجیدہ بات پر ہوتا۔

''میرے اور تمہارے زمانے میں یہی فرق ہے۔'' مطیع اللہ نے عبدالمعز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بابا؟''

''جب تمہاری امی سے میری شادی کی بات چیت چل رہی تھی اور گھر کے بڑے اس سلسلے میں گفتگو کر رہے ہوتے تو میں اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا۔''

''میاں! آج کے دور کے بچے تو اپنی پسند ہم ماں باپ کے سامنے لا کر کھڑی کر دیتے ہیں کہ اس سے شادی کرنی ہے۔'' ریحانہ نے مطیع اللہ کی بات اچک لی۔

''اس میں کوئی حرج تو نہیں اماں۔'' عبدالمعز بولا۔

''بیٹا حرج تو نہیں مگر بات اقدار کی ہے۔''

☆☆☆

لاک ڈاؤن کھل گیا تھا اور لوگ عید کی تیاری کے لیے دیوانہ وار گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ غریبوں کی زندگی میں سال میں عید، بقرعید کے دو تہوار ہی مسرت کے پیامبر بن کر آتے ہیں۔ بعض بے چارے تو ان دو تہواروں پر بنے دو جوڑوں میں ہی پورا سال گزارتے ہیں۔ گو اس بار کورونا وبا کی وجہ سے عید منانے کے لیے ہر سال جیسا جوش اور ولولہ تو نہ تھا مگر پھر بھی..... عید آ تو رہی تھی نا۔

لاک ڈاؤن کھلتے ہی لوگ گھروں سے نکل پڑے۔ امیروں کو عید کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔ ان کے لیے تو ہر دن ہی عید کا دن ہوتا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوران بھی مزے کرتے رہے تھے۔ ادھر آرڈر دیا پیزا منگوا لیا، ادھر آرڈر دیا، پسند کا کھانا منگوا لیا۔ شاپنگ کو جی چاہا، آن لائن شاپنگ کر لی..... چار آنے کی چیز آٹھ آنے میں ..... آن لائن بزنس کرنے والوں کا دھندا بھی ان دنوں خاصا چمکا ہوا تھا۔ شامت بے چارے غریبوں کی تھی..... تیز دھوپ..... گرمی ..... ٹرانسپورٹ ایسی کہ اندر سانس لینا محال ..... روزہ ..... بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہوا..... خاصی عدم توازن کی کیفیت تھی ..... بہرحال عید تو منانا تھی..... ادھر شوق کا یہ عالم..... اُدھر ڈاکٹرز دہائیاں دے رہے..... بے احتیاطی نہ رکی تو عید کے بعد کورونا کی ہلاکت خیزی سے نمٹنا مشکل ہوگا.....

مطیع اللہ کا گھرانا بھی تو اسی بے ہنگم معاشرے کی ایک اینٹ تھی۔ ریحانہ بھی مومنہ اور عبدالمعز کے ساتھ عید کی شاپنگ کو نکل کھڑی ہوئی۔ اپنی دانست میں احتیاطی تدابیر تو سبھی اختیار کیں۔ ہینڈ سینی ٹائزر، دستانے، ماسک ..... بازار میں دوسروں سے مناسب فاصلہ رکھنے کا بھی خیال کیا۔ تینوں ہی لوگوں سے یوں بچتے بچاتے رہے جیسے چھو گئے تو پتھر کے بن کر جہاں کے تہاں کھڑے رہ جائیں گے..... کہیں عید کی شاپنگ لوگوں کی بداحتیاطی کی وجہ سے مہنگی نہ پڑ جائے..... کورونا مریضوں کی تعداد میں پہلے ہی خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔

بازار سے واپس لوٹتے ہی تینوں نہائے، کپڑے تبدیل کیے، استعمال شدہ کپڑوں کو جراثیم کش محلول ملے پانی میں ڈبویا، دھویا اور سوکھنے کے لیے الگنی پر ڈال دیے۔

''اف بابا! اتنا رش تھا بازار میں کہ کیا بتاؤں۔''
مومنہ نے باپ کو بتایا۔
''نہ ماسک، نہ گلوز، لوگ ہاتھوں پر سینی ٹائزر لگوانے سے بھی انکار کررہے تھے۔'' عبدالمعز بولا۔
''بیٹا! یہ کم علمی اور بے احتیاطی ہمیں لے ڈوبے گی۔ کورونا واقعی خطرناک ہے۔ ڈاکٹرز اور سوشل ورکرز خوامخواہ پریشان نہیں..... اپنی آنکھوں سے کورونا کی ہلاکت خیزی دیکھ رہے ہیں۔ مریضوں کی تکلیف محسوس کررہے ہیں۔ بار بار کہہ رہے ہیں بے احتیاطی کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔''
''میں نے تو عبدالمعز اور مومنہ سے کہا..... جو لینا ہے لو اور جلدی سے یہاں سے نکلو۔'' ریحانہ نے کہا۔
''یہی ہونا چاہیے..... بلامقصد اور دیر تک بازاروں میں گھومنا عام حالات میں بھی اچھا نہیں اور..... آج کل تو بالکل بھی نہیں۔'' مطیع اللہ بولا۔ ''عبدالواسع سے سنتی نہیں ہو، اسپتالوں میں آج کل کیا حالات ہیں؟ ڈاکٹرز، نرسیں اور دیگر عملہ بھی وبا سے محفوظ نہیں..... کتنے تو اللہ کو پیارے ہوچکے۔''
''ہوگا کیا!'' ریحانہ خاصے تفکر سے بولی۔
''ویکسین آنے تک دنیا کو کورونا کے ساتھ ہی جینا ہوگا، ریحانہ۔''
''اور ویکسین کب تک آئے گی؟''
''دیکھو..... دنیا بھر کے ماہر دماغ سر تو جوڑے بیٹھے ہیں..... کوششیں جاری ہیں..... اللہ کے بندے انسانی کوششوں کے معترف ہونے کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس دن رب کی مشیت ہوگی، ویکسین کی تیاری کے لیے انسانی کوششیں بارآور ہوجائیں گی..... رب کی کائنات کا نسخہ کن فیکون میں مضمر ہے۔ رب کائنات جس امر کا ہونا چاہتا ہے وہ کہتا ہے کن یعنی ہوجا اور وہ کام ہوجاتا ہے۔''
''بابا! باہر کے ملکوں میں تو لاک ڈاؤن میں آہستہ آہستہ نرمی آرہی ہے۔'' عبدالمعز نے کہا۔
''انشاءاللہ ایسے ہاں بھی حالات بہتر ہوجائیں گے، بیٹا۔''
''مگر وہاں لوگ احتیاط بھی تو کتنی کررہے ہیں۔'' ریحانہ بولی۔ ''میرا بچہ عبداللہ کل ہی تو فون پر بتا رہا تھا کہ وہاں لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔'' ریحانہ نے پل بھر کو توقف کیا، پھر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''موت کا خوف بہت برا ہوتا ہے۔''
''موت سے وہ ڈرتے ہیں ریحانہ، جن کا اللہ کی مشیت پر یقین یا تو نعوذ باللہ ہوتا نہیں یا کمزور ہوتا ہے..... پروردگار نے ہر ذی روح کی زندگی اور موت کا وقت متعین کر رکھا ہے۔ وہ جسے جب تک چاہے زندہ رکھے، جب چاہے واپس بلا لے۔ مومن امرِ ربی کے لیے ہر لمحہ تیار رہتا ہے..... کورونا سے سو سو سال سے بھی زائد عمر کے بوڑھے بیمار ہونے کے بعد صحت یاب ہورہے ہیں۔ کورونا کے مرض کی شکار عورتیں نئی زندگیوں کو جنم دے رہی ہیں اور اچھے بھلے کڑیل جوان جارہے ہیں..... رب کی مرضی، وہ جسے چاہے زندگی دے، جسے چاہے اٹھالے۔''
''اللہ سب کو اپنی عافیت میں رکھے۔'' ریحانہ نے کہا۔
''ہاں..... دعا یہی ہونی چاہیے..... لیکن اس کڑے وقت میں ہم انسانوں کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ جو زندگی اللہ رب العزت نے ہم بندوں کو اپنی امانت کے طور پر دی ہے، ہم اس کی کس حد تک حفاظت کررہے ہیں۔ کہیں اس میں خیانت کے مرتکب تو نہیں ہورہے..... اس امانت کی حفاظت کی صورت یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی جاری کردہ ایس او پیز کے مطابق گزاری جائے.....''
''اللہ تعالیٰ کی ایس او پیز!'' عبدالمعز نے باپ کے الفاظ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دہرائے۔
''ہاں۔'' مطیع اللہ نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔
''اللہ تعالیٰ بھی ایس او پیز جاری کرتے ہیں، بابا؟'' مومنہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔
''ہاں نا..... قرآنِ حکیم اللہ پاک کے احکامات کا مجموعہ ہے..... ہم انسانوں کے لیے مکمل لائحہ عمل ہے..... یہ کرو، یہ نہ کرو..... امتِ مسلمہ خوش نصیب ہے کہ اسے اللہ کی رضا اور ناراضگی سے باخبر ہونے کے لیے اندھیروں میں بھٹکنا نہیں پڑا..... خالق ارض وسما نے خاتم النبیین محمد مصطفی ﷺ کے وسیلے سے ہمیں مکمل راہنمائی فراہم کردی..... قرآن حکیم نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہلِ عالم کے لیے ایک ایس او پی ہے..... جو اس ایس او پی سے انحراف کرے گا، ایسے ہی قعرِ مذلت میں جا گرے گا جیسے اس وقت دنیا کورونا کے عذاب میں گھر گئی ہے۔''
''بابا! دنیا کورونا کے بارے میں اپنی اپنی تھیوریز لا چکی ہے اور لا رہی ہے مگر آپ شروع ہی سے اسے اللہ کا عذاب کہہ رہے ہیں۔'' عبدالمعز کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے باپ کی تھیوری سے اب بھی اختلاف تھا۔
''بیٹا! میں اکیلا ہوتا تو تم مجھے احمق یا دیوانہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتے، مگر میں اکیلا نہیں ہوں..... دنیا کے طول وعرض میں ان گنت بندگانِ خدا ایسے ہیں جو اس وبا کو

عذابِ خداوندی سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے، انہیں بھی بالآخر ماننا پڑے گا۔''

''سوری بابا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عبدالمعز شرمندہ سا ہوگیا۔

''تمہارا جو بھی مطلب ہو۔'' مطیع اللہ نے ایک پل کو توقف کیا، پھر بولا۔ ''بیٹے! میں تمہیں اور تمہارے سارے بہن بھائیوں کو یقین کے اس درجے پر دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں جہاں وہ بچہ تھا جو بارش نہ ہونے پر نمازِ استسقاء کے لیے جمع ہونے والی جماعت کی طرف جاتے ہوئے اپنے سر پر چھتری تانے ہوئے تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا، ابھی تو بارش کے لیے دعا مانگنے جارہے ہیں، دور دور تک بارش کے آثار نہیں۔ تم نے اپنے سر پر کھلی چھتری کیوں تان رکھی ہے..... جانتے ہو اس بچے نے کیا جواب دیا تھا.....''

عبدالمعز نے نفی میں سر ہلایا۔ مومنہ اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولی۔ ''میں بتاؤں بابا؟''

مطیع اللہ نے سر کی ہلکی سی جنبش سے مومنہ کو بولنے کی اجازت دی۔

''بابا! اس نے کہا تھا..... جب آپ لوگ اللہ میاں سے دعا مانگیں گے تو بارش ضرور ہوگی۔''

مطیع اللہ خوش ہوا۔

''یہ ہوتا ہے یقین کا اعلیٰ درجہ!'' مطیع اللہ کی نگاہیں عبدالمعز کی جانب تھیں۔

☆☆☆

عید پر افراتفری اور مہنگائی کا وہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ توبہ ہی بھلی۔ مطیع اللہ کی دنیا کے لوگوں کو نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔ وقتی فائدوں اور دنیا پرستی میں ایسے گرفتار تھے کہ انجام اور آخرت کو بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے۔ عید الفطر سے قبل رمضان المبارک کے آخری دنوں میں آٹے کی چیز روپیہ میں فروخت ہوتی دکھائی دی۔ خریدار بے چارے مجبور تھے۔ کسی نہ کسی طور عید تو منانی ہی تھی..... منافع خوروں کی بھینٹ چڑھ کر ہی سہی..... گوداموں سے ناقص اشیاء نکال کر منہ مانگے داموں بیچی گئیں۔

انتیسویں روزے کو عبدالواسع بھی گھر آگیا۔ اسپتال میں مریضوں، متعلقین اور طبی و غیر طبی عملے کے آنکھوں دیکھے حالات پر دیر تک گھر والوں سے باتیں کرتا رہا۔ مجموعی زبوں حالی پر بہت دل گرفتہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کورونا وبا سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹرز، نرسیں اور پیرا میڈیکل عملہ درکار سہولتوں کی کمیابی بلکہ بعض اوقات عدم دستیابی کے باوجود جس تندہی، جانفشانی اور فرض شناسی سے خدمات سرانجام دے رہے تھے، اس پر خراجِ تحسین پیش کرنا ان کا حق بنتا تھا۔

عبدالواسع کا کہنا تھا۔ کورونا وبا ایک حقیقت تھی اور کتنی تلخ، اس کا اندازہ مریض اور معالجین ہی کرسکتے تھے۔ عبدالواسع کو دکھ تھا کہ عام لوگ اس وبا کے خلاف احتیاط تو کجا، تکلیف دہ حد تک بے احتیاطی کررہے تھے۔

''بابا! ہمارے ہاں لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک ماسک خرید لیتے ہیں اور کئی کئی دن اسی ایک ماسک کو استعمال کیے جاتے ہیں..... سفید ماسک مٹیالا ہوجاتا ہے۔''

''بیٹا! تم کئی کئی دن ایک ہی ماسک استعمال کیے جانے کی بات کررہے ہو، میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ سڑکوں کے کنارے ماسک فروخت کرنے والے استعمال شدہ ماسک کچرے سے نکال کر دوبارہ دھو کر بھی فروخت کررہے ہیں۔'' ریحانہ بولی۔

''شاید ایسا نہ ہو۔'' مطیع اللہ نے فوراً کہا پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''بات یہ ہے کہ ہماری عوام کی اکثریت دہاڑی دار طبقہ ہے..... ہر گھر سے ایک نہیں کئی کئی افراد مختلف ضرورتوں کے تحت گھر سے باہر نکلتے ہیں..... روزانہ ماسک بھلا کون خریدے..... افسوس ناک بات یہ ہے کہ جو ماسک اس وبا سے قبل چار پانچ روپے کا مل جایا کرتا تھا، اب بیس روپے میں فروخت ہورہا ہے۔ عام لوگ بے چارے پہلے بھوک سے نمٹیں یا ماسک خریدیں۔''

''ہمارا کاروباری طبقہ بہت خودغرض ہے بابا۔'' عبدالمعز جو نہ جانے کس ضبط کے ساتھ اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، بولا۔

''اور عوام کو اپنی ترجیحات کا شعور نہیں۔'' عبدالواسع نے کہا۔

''نہیں بیٹا..... نہ کاروباری طبقہ خودغرض ہے، نہ عوام اپنی ترجیحات سے لاعلم۔ اللہ کی مہربانی ہے کہ ہماری قوم کے ہر طبقے میں غیر معمولی سمجھ بوجھ اور عمدہ صلاحیتیں ہیں۔'' مطیع اللہ نے توقف کیا، پھر نہایت دلسوزی سے بولا۔ ''جو قوم رفاہی اور فلاحی کاموں میں اپنی مثال آپ ہو..... جس ملک کے شہری مجموعی قومی پیداوار کا ایک فی صد فلاحی کاموں میں صرف کردیتے ہوں، سالانہ مجموعاً دو ارب ڈالرز مالیت کے عطیات دیتے ہوں..... وہاں نہ کاروباری طبقے کو خودغرض قرار دیا جاسکتا ہے، نہ عوام کو بے شعور..... افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس قوم کو وہ دردمند راہنما نہیں ملے جو اسے منظم کرتے..... قوم کے مختلف طبقات کی صلاحیتوں کو سمت

دیتے..... انہیں ستاروں پر کمندیں ڈالنے پر ابھارتے..... ہم اپنے اسکول کے زمانے میں معاشرتی علوم کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے کہ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے..... ہمارے راہنماؤں نے عام آدمی کو صرف زراعت ہی پر لگا دیا ہوتا تو آج نہ صرف ہماری عوام کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا بلکہ ہم اپنی ضرورت سے زائد اجناس باقی دنیا کو فروخت کر کے اپنی تمام احتیاجات خود پوری کر رہے ہوتے..... جب آدمی کی تمام احتیاجات پوری ہو رہی ہوں نا بیٹے، تو خود غرضی دل سے جاتی رہتی ہے۔''

''بابا! زراعت تو ہمارے ہاں اب بھی کی جاتی ہے۔'' مومنہ بولی۔

''اس پیمانے پر نہیں بیٹی، جتنا یہاں کی زمین اور کاشت کار دونوں میں پوٹینشل ہے..... ملک کے طول و عرض میں سونا اگلنے والی بے شمار اراضی جوہر شناسوں کی منتظر ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقی پروگرام یعنی یو این ڈی پی کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر کے ممالک میں پاکستان وہ خوش قسمت ملک ہے جو اپنی کل آبادی میں نوجوانوں کی تعداد کے اعتبار سے سب سے آگے ہے۔ غیر استعمال شدہ زرعی اراضی اگر قوم کے بے روزگار نوجوانوں کو تحقیقاً تقسیم کر کے انہیں زراعت کی بنیادی تربیت دے کر ان زمینوں پر کاشت کاری پر لگا دیا جائے تو زیادہ نہیں، صرف چند برسوں میں اس ملک کے نوجوانوں اور بحیثیت مجموعی قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے..... بے روزگاری دور ہوگی اور عوام خوش حال۔''

''زبردست آئیڈیا ہے، بابا۔'' مومنہ باپ کی بات کی ستائش میں اول رہی۔

''بیٹی! عمل کرنے اور کروانے والے لوگ کریں تو بات ہے ناں۔''

''بابا! جب پڑھے لکھے بے روزگار نوجوان اس میدان میں آئیں گے تو شاید استحصالی طبقہ ان کا اتنی آسانی سے استحصال بھی نہ کر سکے جیسا کہ اب سادہ لوح کسانوں کا استحصال کر لیا جاتا ہے۔'' عبدالواسع گویا ہوا۔

''شاید نہیں..... یقیناً بیٹا!'' مطیع اللہ نے اس کے خیال کی تائید کی۔

''اور جب ہر گھر میں غلہ، سبزی، ترکاری اور پھل فروٹ موجود ہوں گے تو حکومت کو کورونا کنٹرول کرنے کے لیے بار بار لاک ڈاؤن کرنے اور بار بار کھولنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔'' عبدالمعز نے یہ بات حسب عادت اپنی دانست میں مذاقاً ہی کی تھی مگر بہت گہری بات تھی۔

''ٹھیک کہتے ہو بیٹا!'' مطیع اللہ نے تائید کی۔ ''جب حکومت کو یہ اطمینان ہو کہ عوام اپنے گھر میں بھوکی نہیں بیٹھی ہے تو کبھی لاک ڈاؤن کرنے اور کبھی کھولنے کی ضرورت کیوں ہوگی بھلا۔ آدمی کو بھوک ہی گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔''

''اماں! آج آخری روزہ ہے..... بھائی بھی اتنے دنوں بعد گھر آئے ہیں..... آج تو افطار میں کچھ اچھا ہو جائے۔'' عبدالمعز نے ریحانہ سے کہا۔

''کچھ اچھا!'' ریحانہ نے اسے آنکھیں دکھائیں، پھر مطیع اللہ سے شکایتی لہجے میں بولی۔ ''سن رہے ہیں آپ بیٹے کی بات..... اٹھائیس افطاریاں گزر گئیں، کس دن کچھ اچھا نہیں تھا؟''

''الحمدللہ! ہر روز اللہ رب العزت نے ہم گناہ گاروں کو ہماری اوقات سے بہت بڑھ کر اچھا کھلایا پلایا۔''

''بابا! میں تو بھائی کی وجہ سے کہہ رہا تھا کہ آج گھر میں ان کی پہلی افطار ہوگی۔ کچھ اچھا ہو جائے۔''

''تمہیں بھائی کا اتنا خیال کب سے ہونے لگا؟'' ریحانہ نے عبدالمعز کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

''جب سے کورونا آیا ہے۔'' عبدالمعز نے برجستہ کہا اور ریحانہ سمیت سب اہل خانہ مسکرا دیے۔

''آئی ریئلی لو ہم، بابا!'' عبدالمعز نے عبدالواسع کو دیکھتے ہوئے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

''آئی لو بیٹا..... میں جانتا ہوں تمہیں بھائی سے بہت پیار ہے۔''

''امی کو پتا نہیں کیوں..... یقین نہیں آتا۔'' عبدالمعز منہ بسور کر بولا۔

''یقین تو ہے بیٹا..... بس تمہیں ذرا چھیڑتی ہیں۔''

''بابا! آج چاند ہوگا کہ نہیں؟'' مومنہ نے نیا موضوع چھیڑ دیا۔

''اللہ پاک بہتر جانتے ہیں، بیٹی۔''

''بابا! ہم کیسے لوگ ہیں..... عید کے چاند کو بھی تنازعہ بنا لیتے ہیں۔''

''عبدالواسع! بیٹا ہم وہ خوش قسمت امت ہیں جسے اللہ رب العزت سردی، گرمی، خزاں، بہار..... سال کے چاروں موسموں میں عید کی خوشی دکھاتے ہیں..... چند سال گرمی میں تو چند برس سردی میں..... کبھی بہار کے موسم میں تو کبھی خزاں میں بہار بن کر آتی ہے۔''

''اوہ بابا! آپ بھی کیسی کیسی باتوں پر نظر رکھتے

ہیں۔'' مومنہ پھڑک کر بولی۔ ''ہم نے تو اس سے پہلے یہ بات کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔''

''سوچا کرو بیٹی..... غور وفکر میں بہت قوت، بڑی طاقت ہے..... دین اسلام ہمیں بار بار تدبر اور تفکر کی تلقین کرتا ہے۔''

عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔ کورونا وائرس کو بھلا کر لوگ جوق در جوق بازاروں میں نکل پڑے تھے۔ زندگی ایک ہی نہج پر چلتی کسے اچھی لگتی ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے بس ایک ہی صدا تھی..... کورونا! کورونا! کورونا! اور اس صدا کے نتیجے میں بے شمار انسانی المیوں نے جنم لیا تھا..... کرۂ ارض کی گزشتہ سو سالہ تاریخ کا بدترین بحران جس نے انسانی معاشرت، نفسیات، اقتصادیات..... زندگی کے ہر شعبے کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

عید گزشتہ برسوں کی عیدوں سے بہت مختلف تھی..... آئی..... اور تھوڑی سی گہما گہمی دکھا کر گزر گئی..... نہ ملنا ملانا..... نہ گلے لگانا..... نہ دعوتیں..... نہ ضیافتیں۔

عید کے تیسرے دن ریحانہ کے پھوپی زاد بھائی افتخار احمد اور ان کی بیوی احتیاطی تدابیر اپنائے بیٹی کی شادی کی دعوت دینے آ پہنچے۔ نہ دعوت نامہ، نہ مایوں اور مہندی کی تقریبات کا ذکر..... فقط ایک فرد کو شرکت کی دعوت دی۔

''کورونا کا کچھ پتا نہیں کب تک چلے..... بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا بھی ضروری ہے..... کتنا ٹالتے..... میں نے گھر والوں سے کہا، بس اب انہی حالات میں بچی کو رخصت کرو..... رخصتی گھر ہی سے ہوگی..... قریبی رشتے دار گھرانوں سے فی گھر ایک فرد کو مدعو کر لیا ہے..... سادگی سے بچی کو رخصت کر رہے ہیں۔'' افتخار احمد نے کہا۔

''میری تو خواہش تھی کہ میں اپنی بچی کو دھوم دھام سے بیاہتی مگر حالات ہی ایسے ہو گئے..... اب ان حالات میں کیا کرتے۔'' افتخار احمد کی بیوی دل گیر دکھائی دیں۔

''بھابی صاحبہ! آپ دل چھوٹا نہ کریں..... کورونا تو محض اتفاق ہے وگرنہ اسلامی طریقہ یہی ہے کہ شادی سادگی سے کی جائے..... انشاء اللہ بہت برکت ہوگی۔''

''مائنڈ نہ کرنا مطیع اللہ بھائی کہ ایک فرد کو کیوں بلا رہے ہیں۔ اصل میں مہمانوں کو فاصلے سے بٹھانا چاہتا ہوں تاکہ کل کوئی یہ نہ کہے کہ افتخار کی بیٹی کی رخصتی میں گئے تھے، وہاں بے احتیاطی سے کورونا لگ گیا۔'' افتخار احمد کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''مائنڈ کرنے کی کیا بات، افتخار بھائی..... میں تو خوش ہوا ہوں کہ آپ اپنے گھر کی خوشی میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھ رہے ہیں..... دوسری بات یہ کہ آج مجھے بہت پرانا زمانہ یاد آ گیا..... ہمارے بچپن میں شادیاں گھروں میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ نہ میرج ہالز ہوتے تھے، نہ جگمگاتی مارکیز اور فی گھر اسی طرح ایک فرد کو شرکت کا بلاوا دیا جاتا تھا جیسے آج آپ دے رہے ہیں۔''

''آیئے گا ضرور۔'' صنوبر بولیں۔

''انشاء اللہ۔''

''ولیمے میں انہوں نے صرف پچیس افراد لانے کو کہا ہے..... ریحانہ تم چلو گی؟'' صنوبر کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مروتاً پوچھ رہی تھیں۔

''ضرور چلتی صنوبر بھابی! مگر مجھے معلوم ہے آپ کا تو ماشاء اللہ میکا ہی کافی بڑا ہے..... پھر افتخار بھائی کے بہن بھائی..... فی گھر ایک ایک فرد کو بھی پوچھیں گی تو پچیس سے زیادہ ہی ہو جائیں گے..... اللہ خیر رکھے۔ بچی اپنے گھر جائے گی تو شادی کے بعد اس کی زندگی میں خوشی کے اور بہت سے موقعے بھی آئیں گے..... میں ان میں شریک ہو جاؤں گی۔''

''ریحانہ! تمہاری یہی باتیں تو دل موہ لیتی ہیں۔'' صنوبر اپنی جگہ سے سرک کر ریحانہ کو فرطِ جذبات سے گلے لگانے کے درپے ہوئیں مگر افتخار احمد نے تنبیہہ کی۔ ''ہیں! ہیں! فاصلہ..... فاصلہ۔''

''پیڑا غرق ہو اس کورونا کا۔'' صنوبر یہ کہتی پیچھے ہٹ گئیں۔ مطیع اللہ، افتخار احمد اور مطیع اللہ کے تینوں بچے جو سب کے سب ایک دوسرے سے دور دور بیٹھے تھے، بے اختیار مسکرا دیے۔

''سویٹ!'' مومنہ نے گھر آئی مہمان کو پیار سے دیکھا، پھر بولی۔ ''صنوبر آنٹی! کورونا نہ ہوتا تو میں ربا کی مایوں، مہندی، شادی، ولیمہ کچھ بھی مس نہ کرتی۔''

''بس بیٹا، اللہ کی مرضی..... دل تو یہ تھا کہ میں اپنی بچی کا ہر ارمان پورا کرتی مگر اب تو اس کی سہیلیوں کو بھی نہیں بلا پا رہے۔''

''بہن! اسی میں اللہ پاک کی کچھ مصلحت سمجھیے۔'' مطیع اللہ نے کہا۔

''حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔''

''بے شک!'' افتخار احمد نے مطیع اللہ کی بات پر اثبات میں سر ہلایا۔

''آنٹی! شادی اور ولیمے کی تصویریں ضرور بھجوا دیجیے گا، میرے یا امی کے واٹس ایپ پر۔'' مومنہ بولی۔

''انشاء اللہ بیٹا، ضرور بھجواؤں گی۔''

''اب اجازت؟'' افتخار احمد نے اٹھنے کا قصد کیا۔

''ہاں ..... ایک دو جگہوں پر اور بھی جانا ہے۔'' صنوبر بولیں۔

مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے کی رسم فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ادا کی گئی۔

☆☆☆

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ رمضان المبارک اور عید الفطر کے ایام میں لوگوں کی بے احتیاطی نے رنگ دکھایا۔ کورونا مریضوں کی تعداد اور اموات میں اضافہ ہوگیا۔ کورونا کو غیر ملکی امداد کے لیے ڈراما سمجھنے اور یہ کہنے والوں کو کہ ان کے قریبی لوگوں میں تو کسی کو کورونا نہیں ہوا..... قریبی لوگوں کے بھی کورونا سے متاثر ہونے اور کورونا سے مرنے والوں کی خبریں ملنے لگیں ..... آج ایک تو کل کوئی دوسرا، افتخار احمد کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے بعد ریحانہ کے سگے بڑے بھائی کو تیز بخار کے ساتھ کھانسی شروع ہوئی اور اتنی بڑھی کہ سانس لینا دشوار ہوگیا۔ وینٹی لیٹر پر ڈالنا پڑا۔ چوبیس گھنٹے بھی نہ نکال پائے، انتقال کر گئے۔ تکفین و تدفین حفاظتی اقدامات کے تحت کی گئی۔ ریحانہ کے لیے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا۔ ماں جائے کی موت اور وہ بھی کورونا سے..... حفاظتی اقدامات کے پیش نظر لواحقین میت کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ ریحانہ جب یاد کرتی، بھائی اسے چلتا پھرتا، بولتا چالتا اور ہنستا مسکراتا ہی یاد آتا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسی دردناک موت ہوگی۔

بھائی کی موت نے ریحانہ کو ایسا دل گرفتہ کیا کہ ہنسنا، مسکرانا تو جیسے بھول ہی گئی۔ آنکھیں ہر وقت آنسوؤں میں ڈوبی رہتیں۔ مطیع اللہ اس کی دلجوئی کرتا، اسے سمجھاتا۔ ''اللہ کی امانت تھی ریحانہ، اس نے واپس لے لی۔''

''ابھی سے کیوں لے لی ..... چار جوان بیٹیاں گھر میں بیٹھی ہیں۔ بھائی کو کتنی فکر تھی ان کی۔''

''بھائی سے زیادہ فکر کرنے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔'' مطیع اللہ نے تسلی دی۔

''اللہ انہیں کچھ تو مہلت دیتا ..... چاروں کو نہ سہی ایک دو کو تو گھر بار کا کر دیتے۔''

''رب اپنی مصلحتیں خود جانتا ہے۔''

''اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے رب کی کہ چار جوان بیٹیوں کا باپ جوان کے رشتوں کی فکر میں تھا، اچانک دنیا سے چلا گیا۔'' ریحانہ رونے لگی۔

''اللہ مالک ہے۔'' مطیع اللہ نے ریحانہ کو دلاسا دیا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''ابھی تم کسی سے ذکر مت کرنا..... الحمدللہ پروردگار نے تین بیٹے دیے ہیں ہمیں، تمہارے بھائی کی ایک دو بچیاں ہم اپنے بچوں سے لے لیں گے۔''

ریحانہ چونک کر قدرے بے یقینی سے میاں کو دیکھنے لگی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' مطیع اللہ بولا۔

''بھائی تو کئی برس سے بے روزگار تھے۔ بڑی بیٹی کی نوکری سے گھر چل رہا تھا۔ آپ سے تو کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ..... بھابی کے پاس بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کو کچھ بھی نہ ہوگا۔''

''ہوتا بھی تو ہم نہ لیتے ..... بیٹی سے زیادہ قیمتی چیز بھی کوئی ہو سکتی ہے..... جس نے بیٹی دے دی اس نے اپنے جگر کا ٹکڑا دے دیا..... تم فکر نہ کرو..... انشاء اللہ یہ وقت گزر جائے گا..... وبا بھی ختم ہو جائے گی..... عبداللہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اور عبدالواسع ہاؤس جاب کی تکمیل کے بعد گھر آجائیں گے..... مجھے یقین ہے ہمارے بچے ہماری مرضی کے آگے سر جھکا دیں گے۔''

ریحانہ سسک سسک کر رونے لگی۔

''اب کیا ہوا؟'' مطیع اللہ نے پوچھا۔

''آپ نے ..... بھائی کی موت کا دکھ ..... میرے دل سے آدھا کر دیا..... آپ آدمی نہیں ..... فرشتہ ہیں۔'' ریحانہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

''کیوں گناہ گار کرتی ہو، ریحانہ..... نہایت حقیر..... پُرتقصیر آدمی ہوں ..... فرشتہ ہونا تو دور کی بات ..... آدمی کو میسر نہیں انسان ہونا..... بہرحال فی الحال یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہے اور جب تک مناسب وقت نہیں آجاتا، ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیے..... بچوں کو بھی بھنک نہ ملے..... ٹھیک ہے نا؟''

ریحانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی سسکیاں اور آنسو تھم گئے تھے۔

☆☆☆

مطیع اللہ کا کاروبار آنکھ مچولی میں چل رہا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوران تو بالکل ہی بند رہا۔ اسمارٹ لاک ڈاؤن کے بعد کھلا تو مگر مندی تھی۔ کاروبار کی نوعیت ایسی تھی کہ مقامی خریداروں سے زیادہ غیر ملکی سیاحوں کی دلچسپی رہتی۔

بیرون ممالک پاکستانی دستکاریوں کی خاصی مانگ تھی۔ غیر ملکی سیاح پاکستان آتے تو احباب کو بطور سوغات دینے اور کاروباری غرض سے بھی اکثر منہ مانگے دام دے کر دستکاریاں خرید کر لے جاتے۔ مطیع اللہ دستکاریوں کی خرید و فروخت سے منسلک دیگر کاروباری افراد کی طرح زائد منافع لینے سے گریز کرتا۔ بس اتنا، جتنا کہ حق بنتا تھا، نتیجتاً جو خریدار اس کے پاس ایک دفعہ آجاتا دوبارہ بھی آتا بلکہ بار بار آتا۔ گاہکوں کے ساتھ مطیع اللہ نہایت مروت اور فیاضی سے پیش آتا۔ اپنے کاروباری بھائیوں کو تبلیغ کے لیے اس نے شوروم میں دو طغروں پر علیحدہ علیحدہ یہ احادیث نہایت خوش نمائی سے لکھوا کر لگوا رکھی تھیں۔

خاتم النبیین محمد ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو بیچتے وقت اور خریدتے وقت اور تقاضا کرتے وقت نرمی اور فیاضی سے کام لے۔''

دوسری حدیث یہ تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ آدمی کو اس بات کی کچھ بھی پروانہ ہوگی کہ حلال طریقے سے مال حاصل کیا ہے یا حرام طریقے سے۔''

کورونا کی وجہ سے ایک مطیع اللہ ہی کیا، بیشتر کاروبار خسارے میں تھے ماسوا روزمرہ اشیائے ضرورت کے اور وہ بھی مقررہ اوقات کے دوران۔ کاروباری طبقہ نڈھال ہوا جارہا تھا..... فکریں ہی فکریں تھیں اور اندیشے ہی اندیشے ..... نہ جانے کورونا کی وبا کتنا عرصہ جاری رہنی تھی۔ حکومت کاروباری طبقے کو بلز کے سلسلے میں تو کچھ مراعات دے رہی تھی مگر دیگر مسائل تو ہراساں کردینے کو کافی تھے۔ تنخواہ دار ملازموں کو فارغ کردینے سے بے روزگاری عروج پر تھی۔ آجر اپنے جس ملازم کو ملازمت سے فارغ کرتا، اس کی آدھی جان تو اسی وقت نکل جاتی۔ ایسے ٹوٹے قدموں سے جاتا کہ رحم آتا۔

مطیع اللہ کے پاس تین ملازم تھے۔ دو سیلز مین، ایک صفائی ستھرائی اور اوپر کے کام والا لڑکا۔ اس نے تینوں کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ پہلی دوسری کو آکر تینوں اپنی اپنی تنخواہ لے جاتے اور مطیع اللہ کے نہایت ممنون ہوتے۔

''اس کا شکر ادا کرو۔'' مطیع اللہ انگلی سے اوپر اشارہ کرتا۔ ''اس کی دی توفیق سے میں تم لوگوں کو تنخواہ دے پاتا ہوں۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ریحانہ بھی متفکر ہونے لگی تھی۔ ''میاں! ایسے کب تک چلے گا..... کبھی لاک ڈاؤن میں نرمی کبھی مکمل بند..... ملازموں کو آپ کب تک اپنی جیب سے تنخواہیں دیے جائیں گے۔''

''جب تک اللہ نے توفیق دی..... ساری دنیا پر یہ وقت پڑا ہے..... انشاءاللہ گزر جائے گا۔''

''پتا نہیں کب گزرے گا؟'' ریحانہ مایوسی سے بولی۔

''اللہ پر بھروسا رکھو..... انسان کو کسی بھی حال میں اللہ پاک کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے..... کورونا کی وبا دنیا کے لیے بہت سے مسائل، مصائب اور نقصانات کے ساتھ بعض فوائد بھی تو لائی ہے..... متکبروں کے سر جھک گئے ہیں۔ سرکش بندے اللہ کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ گھروں میں کنبے کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزارنے اور ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہ ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ جن رشتے داروں اور دوستوں سے مہینوں بات نہ ہوتی تھی، اب فون پر ہی سہی ان کی خیر خبر لینے کی توفیق مل رہی ہے۔ باہر آمد و رفت کم ہونے سے پیٹرول کا خرچہ کم ہوگیا ہے، بازار کم جانے سے بلاضرورت چیزیں نہیں خریدی جارہیں۔ شادیاں لاک ڈاؤن میں سادگی سے ہو رہی ہیں، والدین عافیت میں ہیں۔ ہمارے بچوں نے تفسیر قرآن پڑھی، سیرت حبیب پاک پڑھی۔ الحمد للہ نماز کے پابند ہوگئے ہیں۔ گھر سے بہت سا فالتو سامان نکل گیا۔ تمہارا گمشدہ ہار مل گیا اور کام والی کو اس کا کھویا ہوا وقار..... اور بھی بہت سے فائدے، ریحانہ۔''

''پتا نہیں اس سال حج بھی ہوگا کہ نہیں۔'' ریحانہ کو حج یاد آگیا۔

''انشاءاللہ محدود پیمانے پر ہی سہی..... ضرور ہوگا..... اللہ پاک ہم انسانوں کی بداعمالیوں سے خفا سہی مگر اپنے گھر کا دروازہ بندوں پر بالکل بند نہیں کریں گے..... ہم نے اللہ کو ناراض کرنے میں کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی..... باقی دنیا کا تو ذکر ہی کیا، امت مسلمہ شخصی آزادی اور مذہبی رواداری کے خودساختہ نعروں کی آڑ میں تنزلی کی دلدل میں اتری جارہی تھی..... بے پردگی، مخلوط محفلیں، امراء کی عیش پرستی، حکمرانوں کی عیاشیاں، غریبوں اور کمزوروں کے لیے جبر شداد..... اللہ ناراض نہ ہوتا تو ہم انسان کہاں سنبھلنے والے تھے۔''

''بہت سے اب بھی نہیں سنبھلیں گے، میاں۔''

''ٹھیک کہتی ہو..... نہیں سنبھلیں گے تو پھر ٹھوکر کھائیں گے..... بھگتیں گے، ریحانہ۔''

''اللہ معاف کرے..... نادانوں کو سنبھلنے کی توفیق دے۔''

''آمین!''

☆☆☆

کرۂ ارض پر آباد ترقی یافتہ ممالک آہستہ آہستہ لاک ڈاؤن سے نکلنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ خبریں آ رہی تھیں..... آج یہاں نرمی، کل وہاں ..... مگر کورونا وبا کے خلاف احتیاطی تدابیر کے ساتھ! ترقی یافتہ ملکوں میں کروڑوں افراد کو بے روزگاری کا سامنا تھا..... کرۂ ارض کی گزشتہ سو سالہ تاریخ کا بدترین بحران..... امریکا میں تیل منفی سینتیس ڈالر فی بیرل فروخت ہونے کی خبر تھی۔ بظاہر حیران کن مگر باطن نہایت دانش مندانہ اپروچ! پہیا چلے ہی سے زندگی کو آگے بڑھنا تھا، سو عوام کو ملنے والی یہ چھوٹ امریکی اقتصادیات کی بہترین حکمتِ عملی کہی جا سکتی تھی۔

سعودی حکومت نے محدود تعداد حجاج کے ساتھ حج کی ادائیگی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ مطیع اللہ اس خبر سے بہت نہال تھا۔ اس نے ریحانہ کو جتایا۔ ''میں نے کہا تھا نا تم سے..... اللہ رب العزت ہم انسانوں کی بداعمالیوں سے کتنے ہی خفا سہی مگر اپنے گھر کا دروازہ بندوں پر بالکل بند نہیں کریں گے۔''

ریحانہ بے ساختہ چونک کر اسے مرعوبیت سے دیکھنے لگی۔ ''ہاں..... کہا تو تھا آپ نے..... مگر کیسے!..... کیسے کر جاتے ہیں آپ ایسی بڑی بڑی پیش گوئیاں!''

''ہاں بابا..... آج بتا ہی دیں۔'' عبدالمعز بولا۔

''بتائیں نا، بابا۔'' مومنہ ٹھنکی۔

مطیع اللہ دھیرے سے مسکرایا، پھر گویا ہوا۔ ''میں وہ بچہ ہوں جو نمازِ استسقا کے لیے کھلے آسمان کے نیچے لوگوں کے جمع ہوتے وقت چھتری سر پر تانے اس یقین کے ساتھ میدان میں آیا تھا کہ جب بندے اپنے رب سے بارش کی دعا مانگیں گے تو بارش ضرور ہوگی ..... مجھے یقین تھا کہ اللہ پاک حج کو موقوف نہیں ہونے دیں گے..... شکر ہے میرے رب نے ہم جیسے گناہ گاروں کا مان رکھا۔'' مطیع اللہ نے توقف کیا، پھر عبدالمعز اور مومنہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رب پر یقین اور بھروسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، بیٹا۔''

مطیع اللہ کے اپنے دیس میں مساجد میں بچوں اور پچاس سال عمر سے زائد افراد کا داخلہ ہنوز ممنوع تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن یہ پابندی بھی ختم ہو جائے گی اور پانچوں نمازوں کے اوقات میں وہ پھر سے باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد جا سکے گا۔

مطیع اللہ یاسیت کے بجائے زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھنے کا قائل تھا۔

دنیا بھر میں زمین سے نکلنے والے تیل کی قیمت کم ہونے اور اپنی مملکتِ خداداد میں پیٹرول کی قیمت میں اضافے پر بھی اس نے بطور تفنن کہا۔ ''شکر ہے میں نے پیٹرول کی قیمت میں اضافے سے پہلے ہی گاڑی کی ٹنکی پرانی قیمت پر پیٹرول سے بھروالی تھی۔''

''کتنے دن چلے گا؟'' ریحانہ مسکرائی۔

''ارے بی بی! اس زمانے میں تھوڑی بچت بھی بہت۔''

''پتا نہیں کیا کر رہی ہے حکومت عوام کے ساتھ۔'' ریحانہ کو غصہ تھا۔

''کہیں ہے؟'' مطیع اللہ بولا۔

''کیا؟'' ریحانہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''جانے دو، ریحانہ۔'' مطیع اللہ مسکرایا، پھر قدرے توقف سے گویا ہوا۔ ''حکومتیں چاہتی ہیں پہیا رواں دواں رہے۔ ہمارے ہاں پہیا روکنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔''

مومنہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی اور اس نے ریحانہ سے کہا۔ ''اماں! کل میری فرینڈ سارا کا برتھ ڈے ہے۔ اس نے بلایا ہے۔''

''نہیں بیٹا!'' ریحانہ نے بلا تاخیر کہا۔ ''ساری دنیا کے لوگ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں ..... شادی بیاہ ملتوی ہو گئے یا سادگی سے ہو رہے ہیں اور تمہاری دوست کو برتھ ڈے کا چونچلا سوجھ رہا ہے۔''

''امی!'' مومنہ ٹھنک کر بولی۔ ''سال میں ایک ہی دفعہ تو منایا جاتا ہے، برتھ ڈے۔''

''شادی بھی زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے.....'' ریحانہ بولی۔

''بعض لوگوں کی ایک سے زیادہ بار بھی ہوتی ہے، اماں۔'' عبدالمعز کان کھڑے کیے مسکراتا ہوا لاؤنج میں آ گیا۔

ریحانہ نے عبدالمعز کی بات ان سنی کی اور مومنہ سے بولی۔ ''جب لوگ شادی بیاہ جیسی اہم تقریبات میں محتاط ہو گئے تو ان حالات میں برتھ ڈے منانے کا کیا تک بنتا ہے..... دیکھا نہیں افتخار ماموں نے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی شادی کتنی سادگی سے کی۔''

''بابا!'' مومنہ نے مطیع اللہ سے سفارش چاہی۔

''بیٹی! تمہاری امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ..... احتیاط ضروری ہے۔'' مطیع اللہ نے مومنہ کو سمجھایا۔

''اتنے دن سے احتیاط ہی تو کر رہے ہیں، بابا..... بس دو گھنٹے کی بات ہوگی..... پانچ بجے جاؤں گی۔ سات تک واپس آ جاؤں گی..... اس نے ہم تین چار فرینڈز ہی کو انوائٹ کیا ہے۔ باقی اس کے گھر والے ہوں گے..... پلیز بابا..... امی

سے کہیں نا اجازت دے دیں۔'' مومنہ گڑگڑائی۔

''ہرگز نہیں۔'' ریحانہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''بالکل ٹھیک امی۔'' عبدالمعز نے زور سے تائید میں گردن ہلائی۔

''تم چپ رہو..... امی کو بھڑکاؤ مت۔'' مومنہ نے عبدالمعز کو آنکھیں دکھائیں۔

''میرا دل نہیں مانتا۔''

''پلیز!'' مومنہ نے ماں کے گلے میں بہت پیار سے بانہیں ڈال دیں۔

''ارے! ارے! پرے ہٹو..... کیا کر رہی ہو۔''

''آپ مجھ سے بھی ڈر رہی ہیں کہ کہیں میں کورونا کی کیریئر نہ ہوں اور خدانخواستہ آپ کو کورونا نہ لگا دوں۔'' مومنہ مسکرائی۔

''نہیں..... میں اپنے آپ سے ڈر رہی ہوں کہ..... اللہ نہ کرے کہیں مجھ سے تم کو.....'' ریحانہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پلیز امی..... جانے دیں نا..... وعدہ، بس دو تین گھنٹے اس سے زیادہ نہیں۔'' مومنہ نے منت سماجت کی۔

''دو سے تین گھنٹے ہو گئے!'' ریحانہ نے مومنہ کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''کوشش کروں گی کہ زیادہ دیر نہ ہو..... اماں میری بیسٹ فرینڈ ہے وہ..... میں نے کب سے اس کے لیے گفٹ بھی لے کر رکھا ہوا ہے۔''

''کوریئر کمپنی سے گفٹ بھجوا دو، کیک اور گلدستے کے ساتھ۔'' عبدالمعز شرارتاً بولا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' ریحانہ بولی۔

''امی! دوستوں کو یوں تو نہیں ٹرخایا جاتا..... اس نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔''

''جانے دو ریحانہ۔'' مومنہ کو اتنی خوشامد کرتے دیکھ کر مطیع اللہ سفارش پر مجبور ہو گیا۔

''اور.....'' ریحانہ نے مطیع اللہ کو دیکھا اور فقط ایک ہی لفظ بول پائی مگر تین حرفی اس لفظ میں اندیشوں اور خدشات کی دنیا آباد تھی۔

مطیع اللہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سفارش کی۔

''کسی دوست سے ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کی ضرورت نہیں۔'' ریحانہ کا مومنہ کو ہدایت جاری کرنا گویا اسے دوستی کی سالگرہ میں جانے کی اجازت دینا تھا۔

''تھینک یو اماں..... تھینک یو۔'' مومنہ خوش ہو گئی۔

''میں بھی چلوں..... گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا ہوں یار۔'' عبدالمعز منہ لٹکا کر بولا۔

''شرم نہیں آئے گی تمہیں لڑکیوں کی گیدرنگ میں جاتے ہوئے۔'' مومنہ بولی۔

''اچھا تو پھر کیک ضرور لے آنا میرے لیے۔''

''بہت ندیدے ہو!''

مطیع اللہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''ندیدہ نہ کہو مومنہ بیٹی..... ندیدہ تو اسے کہتے ہیں جسے کچھ میسر نہ ہو..... تمہاری ماں درست لفظ استعمال کرتی ہیں..... چٹورا، جس کا مطلب ہوتا ہے کھانے پینے کا شوقین۔''

''بابا!'' عبدالمعز نے منہ بسورا۔

مطیع اللہ ہنس دیا۔

''کل بنا دوں گی کیک میں اپنے چٹورے بچے کے لیے۔'' ریحانہ عبدالمعز سے بولی۔

''دیکھا!'' عبدالمعز کھل اٹھا۔ ''امی زندہ باد!''

''مسکا لگانے کی ضرورت نہیں۔'' ریحانہ نے کہا۔

مومنہ کھلکھلا دی۔

☆☆☆

اگلے دن سارا کے ہاں سالگرہ کی تقریب میں مومنہ سمیت سارا کی چار دوستوں کے علاوہ سارا کے والدین اور بہن بھائی بھی کورونا ایس او پیز کے تحت سالگرہ میں شریک تھے۔ سارا کے والدین سے مومنہ پہلے بھی ملتی رہی تھی۔ اس کی والدہ بڑی لطیفہ گو سی خاتون تھیں۔ والدہ کے برعکس اس کے والد گزشتہ ملاقاتوں میں خاصے اکڑے اکڑے سے آدمی دکھائی دیے تھے مگر اس بار وہ گزشتہ ملاقاتوں سے مختلف محسوس ہوئے۔ پارٹی کے دوران بھی زیادہ وقت کورونا ہی موضوعِ گفتگو رہا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے برعکس سارا کے والد اس کی دوستوں سے نہایت اپنائیت اور شفقت سے بات کرتے رہے۔ مومنہ کو کورونا کے بارے میں سارا کے ڈیڈی اور اپنے والد کے خیالات میں نہایت ہم آہنگی کا احساس ہوا۔

''کورونا اللہ کا عذاب ہے۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ بندے جب بھی اللہ کے راستے سے ہٹتے ہیں، اللہ ایک حد تک انہیں ڈھیل دیتا ہے، جب باز نہیں آتے تو کوئی وبا، کوئی زمینی یا آسمانی آفت ایسی نازل کرتا ہے جو انہیں سبق سکھا جاتی ہے مگر اس بار ہم اتنے ڈھیٹ ہو چکے ہیں کہ کورونا سے بھی عبرت نہیں پکڑ رہے، خاص طور پر ہمارے لوگ..... وہی بے حسی اور بے راہ روی لوگ بدل ہی نہیں رہے

بلکہ مجھے تو یہ لگتا ہے زیادہ بگڑ گئے ہیں..... اس بار رمضان اور عید کے دوران کاروباری طبقے نے وہ لوٹ مار مچائی کہ پچھلے برسوں کی مہنگائی کو بھی مات کر دیا..... گوداموں میں رکھا پرانا اور ناقص مال من مانی قیمت پر فروخت کیا..... ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس عذابِ خداوندی سے ڈر کر سدھر جاتے، مگر ہم پر کوئی اثر نہیں۔''

''انکل! ہم آخر کیسے سدھریں گے؟'' سارا کی ہم دوست فرح نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو بیٹا! دنیا کی تاریخ میں بعض اقوام بہت گھمنڈی اور اذیت پسند گزری ہیں۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ان کی سرکشی حد سے بڑھی، کسی نہ کسی بڑی آفت نے ان کا گھمنڈ خاک میں ملا دیا۔ انہیں ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ اس بڑی آفت اور حادثے کے بعد جو باقی رہے، وہ تائب ہو کر بہتر انسان، بہتر قوم کے طور پر سامنے آئے۔ جنگِ عظیم میں جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کے ایٹم بم سے تباہ ہونے کے بعد جاپانی قوم ایسی متحمل، متواضع اور منکسر المزاج اقوام کے طور پر سامنے آئی جس کی نظیر نہیں ملتی..... میں خود جاپان گیا ہوں۔ جاپانی سینے پر ہاتھ رکھ کر، جھک کر، عاجزی سے ملتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ کسی جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ آپ ان سے کوئی سودا کریں، چیز پسند نہ آئے، ماتھے پر تیوری ڈالے بغیر آپ کی رقم آپ کو واپس کرتے ہیں اور کبھی بھی اپنی چیز تو واپس بھی نہیں لیتے۔''

''انکل! میرے سوال کا جواب تو آپ نے دیا ہی نہیں۔'' فرح بولی۔

''کون سا سوال؟''

''ڈیڈی! فرح نے آپ سے پوچھا تھا کہ ہم کیسے سدھریں گے؟'' سارا نے کہا۔

''سوری بیٹا..... اسی سوال کا جواب دینے کے لیے میں نے اتنی لمبی بات کی۔'' سارا کے والد نے کہا۔ یکا یک ان کے چہرے پر انتہائی تشویش اور تکلیف کی کیفیت نمودار ہوئی اور انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر ہم نے اپنی غلطیوں اور گناہوں سے توبہ کر کے خدا کو راضی کرنے کی کوشش نہ کی تو پھر..... کورونا وائرس سے بھی بڑا عذاب!''

سارا اور اس کی دوستیں گھبرا کر خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ سارا کے والد نے ان کے سروں پر ڈولتی سراسیمگی دیکھ کر کہا۔ ''سوری بچو! میں خوشی کے

پشت پر

گاہک۔ ''ایک زنانہ چپل دیجیے۔''

دکاندار: کس ناپ کی جناب؟''

گاہک۔ ''ناپ تو مجھے یاد نہیں رہا خیر آپ میری پشت پر دیکھ لیں۔''

بچے ہمارے عہد کے

استاد نے کلاس سے سوال کیا۔ ''کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا میں کتنے براعظم ہیں؟''

ایک لڑکا جھٹ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''تین براعظم ہیں۔''

استاد۔ ''شاباش، اب بتاؤ کون کون سے؟''

شاگرد۔ ''فضل اعظم، قائداعظم اور میرا چھوٹا بھائی محمد اعظم۔''

ایک خط

اکیسویں صدی کے ایک عاشق نے اپنی گرل فرینڈ یا محبوبہ کے نام یہ خط لکھا۔

''ڈیئرسٹ!

میں تمہارے قرب کے لیے وسیع و عریض سمندروں کو پار کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے صحرائے گوبی کو عبور کر سکتا ہوں۔ آسمان سے تمہارے لیے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتا ہوں۔

نوٹ: اگر کل بارش نہ ہوئی تو تم سے ملنے آؤں گا۔''

الیکشن

الیکشن کے زمانے میں ایک امیدوار جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑے مغرور اور بددماغ ہیں۔ اسٹیج پر تقریر کرنے آئے تو کہنے لگے۔ ''دوستو، بزرگو اور میرے بھائیو! میں آج پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں۔ میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں بڑا مغرور اور بددماغ ہوں۔ آپ خود سوچیے اگر میں واقعی ایسا ہوتا تو آپ جیسے دو ٹکے کے لوگوں کے پاس ووٹ لینے آتا۔''

مرسلہ: غلام فرید، بنوں

اس موقع پر آپ لوگوں کو یوں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم سب اپنی اپنی جگہ پر اتنی برائیوں میں گھرے ہوئے ہیں کہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگنی چاہیے۔ اس کے راستے پر چلنے کا عہد کرنا چاہیے تب ہی شاید ہماری خلاصی ہوسکتی ہے۔''

سارا کے گھر سے واپسی پر مومنہ نے باپ سے کہا۔

''بابا! آپ کے اور سارا کے ڈیڈی کے خیالات اتنے ملتے جلتے ہیں کہ آپ کو ان سے ایک مرتبہ ضرور ملنا چاہیے۔''

''بیٹی! ایک مرتبہ کیا..... آدمی کو اپنے ہم خیال لوگوں سے بار بار ملنے کو تیار رہنا چاہیے۔'' مطیع اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بتاؤ پارٹی کیسی رہی؟'' ریحانہ نے پوچھا۔

''بہت اچھی امی..... سب نے ماسک پہنے ہوئے تھے..... سینی ٹائزر کا استعمال کیا..... ایک دوسرے سے دور دور بیٹھنے کا انتظام تھا..... سارا کے گھر والے ویسے بھی بہت احتیاط کررہے ہیں۔''

''کیک لائیں میرے لیے؟'' عبدالمعز بولا۔

''جی نہیں۔''

''یار! میں تو انتظار کررہا تھا۔''

''کسٹرڈ بنا رکھا ہے فریج میں..... کھالو۔'' ریحانہ نے کہا۔ ''کیک کل بناؤں گی۔''

''تھینک یو..... تھینک یو اماں.....'' عبدالمعز نے مومنہ کی طرف دیکھا اور جتایا۔ ''دیکھا! اس گھر میں بس امی کو میرا خیال رہتا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔'' مطیع اللہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''سوری بابا..... میں تو ذرا مومنہ کو چھیڑ رہا تھا۔'' عبدالمعز شرمندہ ہوگیا۔

''مت چھیڑا کرو..... بہنیں مہمان ہوتی ہیں..... اپنے گھر چلی جائیں تو بہت یاد آتی ہیں۔'' ریحانہ بولی۔

عبدالمعز ماں کے نزدیک ہوکر مومنہ کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے ماں سے سرگوشی میں بولا۔ ''بائی دی وے امی..... مومنہ کا گھر ہے کہاں؟''

''ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں مگر اللہ نے چاہا تو اس کی ڈگری مکمل ہوتے ہی معلوم ہوجائے گا۔'' ریحانہ نے کہا۔

''عبدالمعز! ماں سے فاصلہ بیٹے۔'' مطیع اللہ نے عبدالمعز کو ریحانہ کے نزدیک دیکھ کر مناسب فاصلے پر رہنے کی تلقین کی۔

''سوری بابا!'' عبدالمعز ماں سے پرے ہٹ گیا۔

''ستیاناس ہو کورونا کا..... اپنی جان سے پیارے رشتوں میں بھی دوری پیدا کرادی۔'' ریحانہ بولی۔

''ریحانہ! رشتوں کو جوڑ بھی تو رہا ہے۔'' مطیع اللہ نے حسب عادت تاریکی میں روشنی کی کرن پکڑنے کی کوشش کی۔

''وہ کیسے؟'' ریحانہ مجسم سوال اور استعجاب بن گئی۔

''کورونا سے پہلے رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے میری گھر واپسی ہوتی تھی بھلا..... بچے عموماً اپنے کمروں میں بند سوئے ہوئے یا اپنے موبائل پر مصروف ملتے تھے اور تم دن بھر کی تھکی ہاری، اکتائی اکتائی ہوتی تھیں۔ اب صبح کو جلدی گھر سے نکلتا ہوں اور چھ بجے کام ختم کرکے سات سے پہلے پہلے گھر آجاتا ہوں۔ تمہارے اور بچوں کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے کا موقع ملتا ہے..... مارکیٹ میں کاروباری ساتھیوں اور ان کے ملازمین سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو زیادہ تر کاروبار کے ان نئے اوقات سے خوش ہیں..... کہتے ہیں وقت پر گھر جاتے ہیں تو گھر والوں کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے..... اور ہفتہ، اتوار دو دن مکمل چھٹی کے۔ ملک میں توانائی کی بچت الگ ہے..... شام کو گھر کے مرد کی گھر میں موجودگی سے کنبے کے دیگر افراد بہت سی قباحتوں سے محفوظ رہ سکے ہیں۔''

''بابا! آپ کو تو وزیر منصوبہ بندی کی کیبنٹ میں ہونا چاہیے۔'' عبدالمعز شوخی سے بولا۔

''بیٹے جی! رب کریم با اختیاروں کو مناسب منصوبہ بندی اور درست فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔''

''آمین!'' ریحانہ نے زور سے کہا۔

☆☆☆

سارا کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے دو دن بعد مومنہ نے ریحانہ سے اپنے گلے میں سوزش کی شکایت کی۔ ریحانہ نے اسے نمک ملے نیم گرم پانی سے وقفے وقفے سے دن میں تین چار مرتبہ غرارے کرائے۔ گلا تو کیا ٹھیک ہوتا، خشک کھانسی شروع ہوگئی اور جسم میں شدید درد۔ ہنگامی ضرورت کے لیے چند دوائیں گھر میں موجود تھیں۔ ریحانہ نے اسے درد رفع کرنے والی گولیاں دیں مگر آرام نہ آیا بلکہ اگلے دن شدید سردی کے احساس اور کپکپی کے ساتھ بخار چڑھ گیا۔ جسم میں درد اتنا کہ منہ سے ہائے کے سوا دوسرا کلمہ نہ تھا۔ مطیع اللہ نے بخار کی ایک ساتھ دو گولیاں دیں، مگر بخار کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوگیا۔ گاہے بگاہے کھانسی اور وہ بھی شدید جاری رہی۔ مطیع اللہ اور ریحانہ دونوں ہی کا ماتھا

ٹھنک رہا تھا۔ علامات تو وہی تھیں جن کی بڑے پیمانے پر تشہیر جاری تھی۔ عبدالمعز بھی سمجھ رہا تھا۔ ریحانہ نے آہستہ سے مطیع اللہ سے کہا۔ ''مجھے تو وہم ہو رہا ہے میاں کہ.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

عبدالواسع کا فون آیا۔ اسے بتایا تو وہ بولا۔ ''مومنہ کو فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔''

ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کورونا ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیا۔ علامات وہی تھیں جو کورونا کی ابتدائی اور عمومی علامات سمجھی جاتی ہیں۔

ٹیسٹ کرایا تو رپورٹ مثبت آئی۔

ریحانہ جو پہلے ہی پریشان تھی اور ہراساں ہوگئی۔ پریشان مطیع اللہ بھی تھا مگر اس نے ریحانہ کو تسلی دی۔ ''تم گھبراؤ گی تو مومنہ کی ہمت کون بندھائے گا۔ بیماری میں آدمی کے قویٰ ویسے ہی کمزور ہو رہے ہوتے ہیں..... اسے یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بیماری میں انسان اپنی ول پاور..... قوتِ ارادی سے بیماری سے لڑتا اور صحت یاب ہوتا ہے۔''

''میاں! میں نے سنا ہے کسی کا کورونا ٹیسٹ پازیٹو آجائے تو کورونا ٹیم والے مریض کو آکر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اسپتال میں ڈال دیتے ہیں۔ گھر والوں کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔'' ریحانہ نے آہستہ سے کہا۔

''شروع میں ایسا ضرور ہوا مگر اب ایسا نہیں ہے..... کورونا کی ابتدائی علامات کے بعد مریض کو اس کے گھر ہی میں ایک کمرے تک محدود کر کے دوائیں تجویز کر دی جاتی ہیں۔ عموماً بخار اور درد کی دوا..... مریض اور اس کے گھر والوں کو احتیاطی تدابیر سے آگاہ کر دیا جاتا ہے..... گھر کے باقی افراد کو احتیاطاً کورونا ٹیسٹ کروا لینے کی ہدایت کی جاتی ہے..... اکثر مریض اپنے گھر پر ہی تنہائی میں رہنے، دواؤں کے استعمال اور احتیاطی تدابیر سے صحت یاب ہو جاتے ہیں۔'' مطیع اللہ نے ریحانہ کو تسلی کی خاطر تفصیل سے بتایا۔

''میں تو ڈر رہی تھی کہ بس اب کورونا ٹیم آئی اور میری بچی کو اسپتال لے جائے گی۔'' ریحانہ کی پریشانی کچھ کم ہوئی۔

''نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ریحانہ..... اب ہمیں کرنا یہ ہے کہ مومنہ کو اس کے اپنے کمرے تک محدود رکھ کر اس کے آرام، اس کے کمرے اور باتھ روم کی صفائی ستھرائی، اس کے استعمال میں رہنے کپڑوں، بستر کی چادروں وغیرہ کی اچھی طرح دھلائی، اس کے کھانے پینے کے برتنوں کو باقی برتنوں سے علیحدہ کر کے دھونے، اس کی دوا اور غذا کا خیال رکھیں..... اسے ایسی غذا دی جائے جس سے اس کے جسم کا مدافعتی نظام مضبوط ہو۔''

''کھانے کا تو وہ نام ہی نہیں لے رہی..... کہتی ہے کھانے کا سوچ کر ہی متلی ہوتی ہے۔''

''بیماری میں ایسا ہی ہوتا ہے..... مریض کو زبردستی کھانے پر آمادہ کرنا پڑتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ہینڈل کرلوں گا..... ہاں..... سب سے اہم اور ضروری بات یہ کہ تم، میں، ہم سب اس کی صحت یابی کے لیے اللہ سے دعا کرتے رہیں۔''

''آپ کو کیا پتا..... میری تو رگ رگ سے دعا نکل رہی ہے۔'' ریحانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بھئی ماں ہو اس کی..... ایسے ہی تو اللہ نے تم ماؤں کے پیروں کے نیچے جنت نہیں رکھ دی..... دیکھو اس کے سامنے رونے دھونے کی ضرورت نہیں..... وہ سمجھے گی پتا نہیں کیا ہوا ہے..... ہم اکیلے نہیں ریحانہ، اس وقت ساری دنیا میں لوگ اپنے پیاروں کے لیے کورونا سے لڑ رہے ہیں۔''

عبدالواسع کا فون آیا تو اس نے کہا۔ ''مجھے چھٹی ملنا مشکل ہے ورنہ میں گھر آجاتا اور خود مومنہ کی تیمارداری کرتا..... اس کا بخار اور بلڈ پریشر مانیٹر کرتے رہیں..... انشاء اللہ میں رابطے میں رہوں گا۔''

مطیع اللہ نے اسے تسلی دی۔ ''تم اپنی ڈیوٹی انجام دو..... مومنہ ایک ہے..... تمہاری ضرورت بہت سے مریضوں کو ہوسکتی ہے..... ہمیں کچھ پوچھنا ہوا مومنہ کے لیے تو تم سے رابطہ کرلیں گے۔''

مومنہ کو قے اور دست شروع ہوگئے۔ بار بار ابکائیاں لینے، قے کرنے اور اسہال سے ایک ہی دن میں ایسی نڈھال ہوگئی کہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم جانا مشکل ہوگیا۔ ریحانہ اسے سہارا دے کر باتھ روم تک پہنچاتی۔ ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا۔ جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی دور کرنے کے لیے اس نے ڈرپ لگانا ضروری سمجھا۔ مطیع اللہ، ریحانہ اور عبدالمعز نے ٹیسٹ کرایا تو تینوں کی رپورٹ منفی آئی۔

اہلِ محلہ کو کچھ سن گن مل گئی تھی۔ گھر سے جو باہر نکلتا، اسے اچھوت کی طرح دیکھا جاتا۔ ایک دو نے تو معنی خیز لہجے میں مطیع اللہ اور عبدالمعز سے پوچھ بھی لیا۔ ''گھر میں تو سب خیریت ہے؟''

''شکر ہے۔'' مطیع اللہ دل ہی دل میں سوچتا۔ میں دروغ گوئی کا مرتکب تو نہیں ہوا..... بندے کو ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

تین چار دن مومنہ کو بخار، کھانسی اور جسم میں درد کے

ساتھ متلی، ایک دو بار قے اور اسہال کی کیفیات رہیں۔ دو دن ڈرپ بھی لگی۔ حالت غیر ہوگئی۔ شاداب چہرہ لیمو کی طرح نچڑ گیا۔ نقاہت ایسی کہ بستر سے اٹھ نہ پاتی۔ کچھ کھلانے پلانے کے لیے ٹیک دے کر بٹھانا پڑتا۔ باتھ روم لے جانے کے لیے ریحانہ کو اپنا سہارا اسے دینا پڑتا۔ اس کی ہمت بندھانے کے لیے مطیع اللہ اسے پیار سے سمجھاتا۔

''بیٹی! تم اکیلی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہو..... دنیا میں لاکھوں افراد کورونا کا بہادری سے مقابلہ کررہے ہیں..... صحت یابی کی شرح بہت زیادہ ہے..... بوڑھے، دل، سانس اور ذیابیطس کے مریضوں کو کورونا سے پیچیدگیاں ہوتی ہیں..... تم تو ماشاء اللہ جوان ہو..... عمر کے اس دور میں انسانی جسم کا مدافعتی نظام بہت مضبوط ہوتا ہے..... بڑی بڑی بیماریوں سے لڑ لیتے ہیں تمہاری عمر کے بچے..... انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہوجاؤ گی..... جب یاد آئے اور ہمت ہو تو لیٹے لیٹے حضرت ابراہیمؑ کی دعا پڑھتی رہا کرو..... وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ..... اس دعا کا مطلب ہے..... جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

تکلیف کی شدت سے مومنہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ مطیع اللہ اسے چمکار کر کبھی جوس، کبھی دودھ پلانے کی کوشش کرتا..... کبھی کوئی ڈرائی فروٹ زبردستی منہ میں ڈالتا، کبھی کیلا چھیل کر اس کے منہ سے لگا دیتا، کبھی آم کا شیک بنوا کر پیار سے، اصرار سے دو گھونٹ ہی بھر لینے پر مجبور کردیتا۔

''کھاؤ گی نہیں تو کورونا سے لڑنے کی طاقت کہاں سے لاؤ گی۔'' مطیع اللہ پیار سے کہتا۔

عبدالمعز دروازے اور کھڑکیوں سے مومنہ کے کمرے میں جھانکے جاتا۔ مطیع اللہ اور ریحانہ دونوں نے اسے مومنہ کے کمرے میں جانے سے سختی سے منع کررکھا تھا۔ پھر بھی وہ ایک دو بار موقع پاکر مومنہ کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں چلا ہی گیا تھا۔ اسے بے سدھ، نڈھال اور بے حد کمزور دیکھ کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ ایک ہی تو بہن تھی ان تین بھائیوں کی جس سے وہ سبھی کسی گڑیا... کی طرح پیار کرتے تھے..... یوں تو تینوں ہی مگر عبدالمعز کی تو جیسے اس گڑیا میں جان ہی تھی..... ''یہ بتاؤ بہن اتنی ہی پیاری ہے تمہیں تو اس سے لڑتے کیوں ہو؟''

''چھیڑتا ہوں اسے..... مذاق کرتا ہوں..... اور اپنا دل خوش کرتا ہوں۔''

''بڑی ہے تم سے..... ادب کیا کرو اس کا۔''

''بڑی!'' وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ خود ہی تو کہتی ہیں، بھائی کتنا ہی چھوٹا ہو اس کا رتبہ بڑا ہوتا ہے۔ مومنہ رتبے میں چھوٹی ہے مجھ سے۔''

''اچھا بابا۔''

مومنہ کو خاموش اور بے سدھ پڑے دیکھ کر عبدالمعز کا دل بہت دکھا۔ اپنی آنکھیں پونچھتا وہ دبے پاؤں اس کے کمرے سے نکل آیا۔

پانچویں دن مومنہ کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ صلاح کار ڈاکٹر کی رائے یہی ٹھہری کہ اسے اسپتال منتقل کردیا جائے۔ ریحانہ کو خفقان ہونے لگا۔ ''نہیں..... میں اپنی بچی کو اسپتال میں داخل نہیں ہونے دوں گی..... وہ پتا نہیں کیا کریں گے۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو، ریحانہ..... آدمی بیمار ہوتا ہے تو علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال ہی جاتا ہے..... مومنہ کو اب اسپتال جانے کی ضرورت ہے تبھی ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا ہے۔''

''نہیں..... مجھے وہم آتا ہے۔'' ریحانہ روہانسی ہوگئی۔

عبدالواسع نے فون پر ماں سے بات کی۔ ''امی! اسے ہاسپٹلائز کرنے دیں۔ کورونا پیشنٹ کو سانس لینے میں دشواری کا مطلب ہے..... پھیپھڑے متاثر ہورہے ہیں..... ایسے مریضوں کو وینٹی لیٹر کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے..... خدانخواستہ اسے وینٹی لیٹر پر رکھنے کی ضرورت پڑی تو گھر میں آپ کہاں سے لائیں گی وینٹی لیٹر؟''

''نہیں عبدالواسع! مجھے ڈر لگتا ہے..... کہتے ہیں اسپتال والے تو ایسے مریض کے رشتے داروں کو اسے دیکھنے تک نہیں دیتے۔''

''یہ احتیاط ہے امی! تاکہ دوسروں کو یہ بیماری نہ لگے..... گورنمنٹ اسپتال ایس او پیز پر سختی سے عمل کررہے ہیں..... بابا کو فون دیں۔''

ریحانہ نے فون مطیع اللہ کو تھما دیا۔

''ہاں بیٹے!''

''ایسا کریں بابا..... مومنہ کو کسی پرائیویٹ اسپتال لے جائیں جہاں کورونا کا علاج بھی کیا جارہا ہو..... وہاں شاید..... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا..... شاید مومنہ کو علاج کے دوران... ایٹینڈ کرنا ممکن ہو..... بہرحال ایس او پیز تو وہ بھی فالو کررہے ہوں گے۔''

''بیٹے! تم معلوم کرکے بتاؤ کہاں لے جائیں؟''

''میں دیکھتا ہوں، بلکہ چھٹی لے کر آنے کی کوشش

کرتا ہوں۔''

عبدالواسع کی معلومات پر مومنہ کو ایک نجی اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ ریحانہ نے اسپتال کی لابی کے ایک گوشے میں کرسی سنبھال لی اور مطیع اللہ سے کہہ دیا جب تک مومنہ صحت یاب نہیں ہوجاتی، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔

کورونا وارڈ اسپتال کے دیگر وارڈوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ مریضوں کے متعلقین کو وہاں عام رسائی نہ تھی البتہ طبی اور غیر طبی عملے کے ذریعے مریض کے متعلقین کو اس کی طبیعت کا احوال کسی حد تک مل سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا۔

سانس لینے میں دشواری کے باعث مومنہ کو فوری آکسیجن لگادی گئی۔ عبدالمعز کو مطیع اللہ نے گھر ہی میں رہنے کی تلقین کی۔ ریحانہ کو بہت سمجھایا کہ یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، بہتر ہے گھر جائے۔ عبدالمعز بھی اکیلا تھا اور مومنہ کے بیمار ہوجانے سے نہایت ڈپریسڈ۔ مطیع اللہ کا سمجھانا بجھانا تو کام نہ آیا البتہ اسپتال کی انتظامیہ نے وبائی صورتِ حال میں احتیاطی اقدامات کے پیشِ نظر اسے گھر جانے پر مجبور کردیا۔

اگلے دن عبدالواسع بھی آگیا۔ ''صرف دو دن کی چھٹی ملی ہے۔'' اس نے بتایا۔

مطیع اللہ رسماً بھی اس سے یہ نہ کہہ پایا کہ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مومنہ کی بیماری اسے اندر سے کمزور کیے دے رہی تھی۔ جوان بیٹے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور بیٹے اگر باادب اور سمجھ دار ہوں تو کیا کہنے۔ مطیع اللہ اور ریحانہ دونوں ہی کو عبدالواسع کے آنے سے بہت ڈھارس بندھی۔

☆☆☆

وہ چار ہفتے!

ایسے بلاخیز روز وشب مطیع اللہ اور اس کے گھر والوں کی زندگی میں پہلے کبھی نہ آئے تھے بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ایسے اداس دنوں کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ کورونا وبا مہینوں سے عفریت بنی ہوئی تھی۔ کتنے اس عفریت سے متاثر ہوئے، کتنوں کو صحت یابی ملی اور کتنے موت کی آغوش میں گئے..... یہ معمول کی خبریں بنی ہوئی تھیں لیکن جب خود پر پڑی تب مطیع اللہ کے گھرانے کو اس عفریت کی ہولناکی کا صحیح اندازہ ہوا۔ انسان جب تک خود اس تکلیف سے نہ گزرے، اسے دوسرے کی تکلیف کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہوتا..... ساحل پر کھڑے آدمی کو سمندر کی گہرائیوں کا کیا اندازہ۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد مومنہ کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ تیسرے دن سانس لینے میں زیادہ دشواری کے باعث اسے آئی سی یو میں وینٹی لیٹر پر لانا پڑا۔ کمزور مدافعتی نظام کے باعث پیچیدگیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس کی حالت تشویشناک ہوتی جارہی تھی۔ ٹیسٹ پر ٹیسٹ..... دوائیں..... انجکشن..... کورونا سے صحت یاب مریض کا پلازما..... علاج معالجے پر خطیر اخراجات ہورہے تھے..... مطیع اللہ کو اخراجات کی پروا نہ تھی..... الحمدللہ رب نے اسے وسائل عطا کررکھے تھے..... خدانخواستہ اس کی اپنی جیب خالی ہوتی تو مومنہ کی زندگی کی خاطر وہ قرض، ادھار لینے سے بھی دریغ نہ کرتا..... قرض ادا ہوجاتا ہے، گئی زندگی واپس نہیں لوٹتی۔

اسپتال کے مالک اور کرتا دھرتا کو عبدالواسع نے اپنے ایک سینئر پروفیسر سے فون کروادیا تھا۔ مومنہ کو خصوصی توجہ مل رہی تھی اور متعلقین میں سے کوئی دن میں ایک دو مرتبہ کورونا حفاظتی کٹ پہن کر مومنہ کو دیکھنے آئی سی یو تک جا سکتا تھا۔ اسپتال نجی نہ ہوتا تو شاید یہ سہولت نہ مل پاتی۔

مطیع اللہ نے انتہائی نگہداشت میں گردوماحول سے بے خبر..... کاروبارِ دنیا سے بے نیاز..... نیم جاں جوان بیٹی کو اسپتال کے بستر پر پڑے دیکھا تو اس کا دل ڈوبنے لگا..... کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ وقت دیکھنا پڑے گا..... وہ کھڑا ہوگا اور اس کی گوشۂ جگر بستر پر پڑی ہوگی..... مومنہ کو ڈھلکتے دیکھتے ہوئے اسے مومنہ کی کب کب کی یادیں ستانے لگیں..... اس کی پیدائش کے بعد نرس کا اسے ڈیلیوری روم سے باہر لانا اور اس کی گود میں دینا..... اس کے کان میں اذان دے کر اسے یہ نوید سنانا کہ وہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی..... شیر خوارگی میں اس کی قلقاریاں..... اس کا پہلی بار بغیر کسی سہارے کے قدم اٹھانا..... اس کی سالگرہیں..... اس کا اسکول جانا..... میٹرک پاس کرنے پر اس کی مسرت..... کالج میں داخلہ..... یونیورسٹی جانے کی خوشی..... ماں سے لاڈ..... بھائیوں سے فرمائشیں..... عبدالمعز سے ہنسی مذاق..... اس کی کھنکتی آواز..... مترنم ہنسی..... دلربا مسکان..... عید کے جوڑے میں اس کا اچھا لگنا..... اور جانے کیا کچھ..... باہر برستی بارش مطیع اللہ کی آنکھوں تک آپہنچی تھی..... غنیمت ہوا کہ ریحانہ قریب نہ تھی..... وہ گھر میں تھی لیکن مطیع اللہ جانتا تھا وہ اس سے زیادہ مضطرب اور دل شکستہ ہوگی..... اولاد کی تکلیف انسان کو کتنا دکھی کردیتی ہے۔

درد مطیع اللہ کے دل میں سمندر کی لہروں کے مانند کروٹیں بدلتا چلا گیا۔ کورونا کتنوں کو پامال کرگیا ہوگا.....

کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیے ہوں گے اس عفریت نے..... کتنے کنبے تھے جن کے کفیل کورونا کے ہاتھوں زندگی سے نکل کر اپنے لواحقین کو آلام و مصائب کے مدوجزر میں چھوڑ گئے ہوں..... کتنے ایسے جنہیں آخری وقت اپنے پیاروں کے چہرے یاد آئے ہوں گے..... کتنے ایسے جنہیں اپنوں کا کندھا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

بستر علالت پر پڑی مومنہ، مطیع اللہ کو بہت سوں کی دردآشنائی کا حوالہ بن رہی تھی۔

مومنہ کی تشویش ناک صورتِ حال نے عبدالواسع کو ڈیوٹی پر واپس جانے کے بعد پھر سے چھٹی لے کر آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موجودگی والدین اور چھوٹے بھائی کو حوصلہ دینے کے لیے بھی ضروری تھی اور مومنہ کی صورتِ حال سے بہتر طور پر باخبر رہنے کے لیے بھی..... ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ مومنہ کے معالجین سے بہتر طور پر رابطہ رکھ سکتا تھا۔

مومنہ خطرے میں تھی..... زندگی اور موت کے درمیان معلق..... اس کے خون میں سفید جسیموں کی تعداد کم ہو چکی تھی..... جسمانی اعضا کی کارکردگی روبہ زوال..... بلڈ پریشر کم..... سانس کی لے تیز اور بے ترتیب..... دل کی دھڑکن عمومی رفتار سے زیادہ..... طبی نکتۂ نظر سے وہ زندگی سے دور اور موت کے نزدیک ہو رہی تھی..... معالجین خطرے سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کی زندگی بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

مطیع اللہ، ریحانہ اور عبدالمعز اسپتال کی استقبالیہ لابی میں موجود تھے۔ عبدالواسع ان کے اور آئی سی یو میں زندگی اور موت کے درمیان معلق مومنہ کی حالت کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ ریحانہ کو چپ لگی تھی..... اس کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی..... اس کے دل کی ہر دھڑکن تسبیح کا دانہ بنی ایک ہی وظیفہ پڑھ رہی تھی..... مومنہ کے لیے زندگی کی دعا۔

عبدالمعز اپنی شوخیاں بھولے اداس بیٹھا صرف مومنہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ خوف اس کے جسم سے حرارت چوسے جا رہا تھا کہ..... خدانخواستہ مومنہ کو کچھ ہو گیا تو وہ اس صدمے کو کیونکر برداشت کر پائے گا۔

مطیع اللہ سر جھکائے زیرلب کچھ پڑھ رہا تھا..... شاید کوئی قرآنی آیت، سورۃ یا پھر کوئی دعا۔

عبدالواسع آئی سی یو میں مومنہ کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں مومنہ کے بیڈ کے سرہانے بلندی پر لگے مانیٹر پر تھیں۔ مومنہ کے بیڈ کے نزدیک کھڑے ڈاکٹروں اور نرسوں کی نظریں کبھی مانیٹر کی طرف اٹھتیں، کبھی مومنہ کے رنگ بدلتے چہرے پر جاتیں..... وہ اپنی پوری کوشش کر چکے تھے۔ ان کے چہروں پر مایوسی اور دکھ تھا۔ ایک نرس نے عبدالواسع کی جانب بے بسی سے دیکھا اور گھبرا کر یوں نظریں چرالیں جیسے اس ساری صورتِ حال کی ذمے دار وہی تو تھی۔

زندگی کی علامت سے متحرک خطوط آہستہ آہستہ سپاٹ ہو رہے تھے۔ عبدالواسع اس منظر میں ٹھہرے رہنے کی ہمت نہ کر پایا۔ وہ تیزی سے دروازے کی سمت لپکا۔

'امی تو مر جائیں گی۔' اس نے سوچا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا لفٹ کی آمد کا انتظار کیے بغیر زینے سے نیچے اترا۔

لابی میں بیٹھی ریحانہ اور عبدالمعز دونوں عبدالواسع کو آتا دیکھ کر چوکنا ہوئے اور مجسم سوال بن گئے۔ مطیع اللہ لابی کے ایک گوشے میں مصلی بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔

''بھائی! کیسی ہے مومنہ؟'' عبدالمعز نے پوچھا۔

عبدالواسع نے اس کے سوال کا جواب آنکھوں ہی آنکھوں میں دیا..... اور عبدالمعز گم صم رہ گیا۔

عبدالواسع ماں کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''امی! پلیز حوصلہ رکھیے گا۔'' اس نے ماں کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی۔

عبدالمعز دوسری طرف منہ پھیر کر آنکھیں پونچھنے لگا۔

عبدالواسع سیمابی کیفیت میں دوبارہ اوپر جانے کو اٹھا۔ ''آتا ہوں امی!'' اس نے ریحانہ سے کہا۔

مطیع اللہ سلام پھیر کر اٹھ چکا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے عبدالواسع کو دیکھا۔ عبدالواسع جاتے جاتے اس کی طرف آیا۔ ''بابا! وہ جا رہی ہے..... میں اس کی وائٹل سائنز ڈوبتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' عبدالواسع نے آہستگی سے کہا، پھر عجلت میں بولا۔ ''آپ امی کو سنبھالیے گا۔''

عبدالواسع تیزی سے چلا گیا۔

مطیع اللہ کو یوں لگا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان جاتی رہی تھی..... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..... وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوا کہ ریحانہ کو مومنہ کی موت کے لیے تیار کرنے کو وہ اس کی طرف جائے یا.....!

اللہ اکبر کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بلند کیے اور سجدہ ریز ہو گیا..... آنسوؤں کی جھڑی مصلے کی سجدہ گاہ کو نم کرنے لگی..... ''جو آپ کی رضا میرے رب..... امانت تو آپ ہی کی تھی..... مجھ بندۂ گناہ گار کو کیا اختیار..... مہربانی میرے رب کہ آپ نے مجھ ناتواں اور کمزور بندے کو اتنا عرصہ امانت داری کے لائق سمجھا..... ہم حریصوں کے لیے صبر

مشکل، صبر اور استقامت کا سوال کرتا ہوں...... اپنے لیے ...... مومنہ کی ماں اور بھائیوں کے لیے...... آپ سے مانگ کر کبھی مایوس نہیں رہا...... صبر اور استقامت کا پھر سوال کرتا ہوں...... کرم میرے مولا...... رحم میرے آقا...... مطیع ہوں ...... انشاء اللہ مطیع اللہ ہی رہوں گا......''

مطیع اللہ زبان کی قید و بند سے آزاد اپنی ہی زبان میں عرضی گزار رہا۔

دو رکعت نماز پڑھی، پھر اٹھ کر ریحانہ کی طرف آیا ...... وہ نیم جان سی چپ بیٹھی تھی۔ مروجہ ایس او پی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ ریحانہ کے بہت نزدیک بیٹھ گیا...... ریحانہ جو بصورتِ سنگ چپ تھی، اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ مطیع اللہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کے بیچ لے لیا۔ ریحانہ کے ہاتھ سے حرارت مفقود تھی۔

''جو اللہ کی مرضی، ریحانہ۔'' مطیع اللہ نے ریحانہ کو رب کی رضا میں راضی رہنے کی تلقین کی پھر آہستہ سے سمجھایا۔ ''رب کے سامنے سر جھکا دینا ہی اچھا ہے...... گلہ، شکوہ مخلوق کو زیب نہیں...... اس کی رضا میں راضی رہنا ہے۔'' مطیع اللہ نے گردن موڑ کر عبدالمعز کو دیکھا اور مخاطب کیا۔ ''عبدالمعز!''

''جی بابا!'' عبدالمعز اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر پایا۔

''بیٹے! دور کیوں بیٹھے ہو...... ہمارے نزدیک آ جاؤ...... یار! تمہاری قربت کی ضرورت محسوس کر رہا ہے تمہارا بوڑھا باپ۔'' مطیع اللہ کی آواز میں لرزش تھی۔

عبدالمعز اپنی جگہ سے اٹھ کر مطیع اللہ کے نزدیک آ بیٹھا۔

''ہیلو...... ہیلو......'' استقبالیہ پر بیٹھا شخص چلّایا۔

''آپ لوگ ایس او پی کی خلاف ورزی نہ کریں پلیز!'' اس نے مطیع اللہ، ریحانہ اور عبدالمعز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! کورونا لگتا ہے تو لگ جائے۔'' مطیع اللہ نے اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی سے کہا۔ ''احتیاط کے باوجود بھی لگ جاتا ہے...... کب تک ڈریں گے...... اب اللہ کی مدد کے ساتھ اس سے لڑنا ہے...... اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِین۔'' مطیع اللہ کی بلند آہنگی نے لابی میں موجود افراد کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ مطیع اللہ کی اونچی آواز اور لہجے کی جھلاہٹ کورونا کے خلاف مزاحمت سے زیادہ اس المناک خبر پر اس کے کرب کا اظہار تھا جو عبدالواسع ابھی کچھ دیر پہلے اسے سنا کر گیا تھا۔ اس کرب کے اظہار کے بعد مطیع اللہ بیوی اور بیٹے کے درمیان فاصلہ پیدا کرتا ان دونوں کے درمیان سے اٹھ گیا۔ استقبالیہ پر بیٹھا شخص اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، تاہم چپ تھا۔

نہ جانے کتنے پل، کتنی ساعتیں، کتنی صدیاں، کتنا وقت دبے پاؤں گہرے سکوت میں گزرا...... لابی میں بیٹھے لوگ چلے گئے تھے...... اب سناٹا تھا...... ساری دنیا ہی اس مہیب سناٹے میں تھی...... مطیع اللہ، ریحانہ اور عبدالمعز لٹے پٹے کارواں کے بچے کھچے اور بے سروسامان مسافروں کی طرح دل شکستہ بیٹھے تھے۔ دفعتاً لابی کے سناٹے میں دیوار گیر گھڑیال کی دھیمی دھیمی ٹک ٹک نے انہیں اپنے ہونے کا احساس دیا۔ صبر آزما انتظار کے بعد عبدالواسع لمبے لمبے ڈگ بھرتا انہیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا...... تینوں چوکنا ہو گئے ...... مطیع اللہ کی زیرک نگاہوں کو عبدالواسع کی چال اور چہرے سے کچھ اور ہی پیغام ملا۔

''مریکل بابا! رئیلی مریکل!'' اس نے مطیع اللہ سے کہا۔

تینوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''یقین کریں بابا...... وہ جاتے جاتے پلٹ آئی ہے ...... ڈاکٹرز، نرسز سب حیران ہیں...... ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ...... اس کی وائٹل سائنز ڈوبتے ڈوبتے بحال ہو جانا معجزہ ہے۔'' عبدالواسع غیر معمولی ایکسائٹڈ تھا۔ ریحانہ کے نزدیک بیٹھ کر اس نے کہا۔ ''اماں! وہ جاتے جاتے واپس آ سکتی ہے تو ریکور کیوں نہیں کرے گی...... انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

ریحانہ رونے لگی۔

''اب کیوں رو رہی ہیں!'' عبدالمعز معترض ہوا۔

''یہ شکر کے آنسو ہیں بیٹے!'' مطیع اللہ نے کہا۔

''آپ نے دعا کی ہوگی بابا...... میں دیکھ رہا تھا...... آپ بہت دیر تک سجدے میں رہے تھے۔'' عبدالمعز بولا۔

''آپ لوگ پھر قریب ہو گئے۔'' استقبالیے پر بیٹھا شخص جو غالباً کسی ضرورت کے تحت یا محض ٹہلنے کو اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا، دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھنے کے بعد انہیں ٹوک روک رہا تھا۔

مطیع اللہ نے ریحانہ اور دونوں بیٹوں کو فاصلہ اختیار کرنے کا اشارہ دیا اور خود بھی ان سے مناسب فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''تھینک یو سر!'' استقبالیہ کلرک نے مطیع اللہ کو تشکر سے دیکھا۔

''جیتے رہیں۔'' مطیع اللہ نے خوش دلی سے کہا۔

استقبالیے پر بیٹھا شخص دل ہی دل میں حیران ہوا کہ کچھ دیر پہلے نہایت جھلاہٹ اور تلخی کا مظاہرہ کرنے والا شخص اتنا بااخلاق کیسے ہو گیا تھا۔

سچ ہے سارے موسم انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔

مطیع اللہ تا حال اپنے اسی موقف پر قائم تھا کہ کورونا انسانی اعمال کے بیجوں سے پھوٹا تھا۔

مومنہ کو مزید تین ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ کورونا کے بے رحم حملے سے اپنے نازک وجود کو پہنچنے والے نقصان کی ممکنہ مرمت اور کورونا ٹیسٹ منفی ہوجانے کے بعد وہ گھر آگئی۔ معالجین نے اسے طویل آرام اور عمدہ غذا لینے کی ہدایت کی۔

گھر کی رونق بحال ہوگئی تھی۔ ریحانہ بہت خوش تھی۔

''کچھ خاص کھانے کو دل ہے میرے بچے کا؟'' اس نے مومنہ سے بہت پیار سے پوچھا۔

''بریانی!'' مومنہ کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی عبدالمعز نے بڑی مرغن سی فرمائش داغی۔

''تم چپ رہو!'' ریحانہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''کیا مجھے بھی اپنے لاڈ اٹھوانے کے لیے خود کو کورونا لگانا پڑے گا؟'' عبدالمعز بولا۔

''توبہ کرو..... بری بات زبان سے بھی نہیں نکالنی چاہیے۔''

''تو پھر پکالیں نا بریانی۔''

''پکادوں گی..... اور مومنہ بچے، تمہارے لیے؟''

''میں بھی بریانی کھاؤں گی امی..... ڈاکٹر نے کہا ہے..... جو دل چاہے کھاسکتی ہو اب۔''

''بیٹا! بہت مشکل وقت تھا۔'' ریحانہ کی آواز بھرا گئی۔

''امی جی! کورونا سچ مچ بہت ظالم ہے..... اتنا درد، اتنی تکلیف کہ میں بتا نہیں سکتی..... بہت ظالم تھا کورونا۔'' مومنہ نے کہا۔

''بیٹی! کورونا تھا نہیں..... ہے..... ہمیں اس بے رحم کے ساتھ ہی جینا سیکھنا ہوگا..... آخر ہم اس سے پہلے بھی تو وباؤں کے ساتھ جینا سیکھے ہی ہیں..... والدہ مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے زمانے میں طاعون کی وبا آئی تھی..... آنکھوں دیکھی بیان کرتی تھیں کہ کسی عورت کے دس بیٹے تھے، طاعون کی وبا میں دسوں کے دس وقفے وقفے سے اللہ کو پیارے ہوگئے۔''

''اللہ معاف کرے۔'' ریحانہ نے جھرجھری لی اور مزید کہا۔ ''اللہ نا گہانی سے بچائے۔''

''ہاں..... اللہ سے معافی ہی مانگتے رہنا چاہیے۔'' مطیع اللہ نے تائید کی، پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی بندے اللہ کے راستے سے بھٹکے اور اس کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے عذاب آیا ہے..... کبھی طوفان کی صورت..... کبھی سیلاب بن کر..... کبھی زلزلوں کی شکل..... کبھی چنگھاڑ بن کر..... تو کبھی وبا کے روپ میں۔''

''آپ ابھی تک کورونا کو اللہ کا عذاب سمجھنے والی تھیوری پر قائم ہیں، بابا؟'' عبدالمعز مسکرایا۔

''رہوں گا۔'' مطیع اللہ نے کہا۔ ''اللہ کیا نہیں کرسکتا بیٹے..... اللہ کی شان، عظمت اور قدرت کو سمجھنے کے لیے کیا یہ بات کافی نہیں کہ مومنہ کو اللہ نے دوسری زندگی دی ہے۔''

''بابا! ڈاکٹرز اور نرسز مجھے مذاق میں مریکل بے بی کہنے لگے تھے۔'' مومنہ بولی۔

''مانتا ہوں بابا..... مومنہ کو اللہ ہی نے بچایا ہے۔'' عبدا! عزنے کہا۔

''بیٹے جی! بندہ کتنا ہی دائیں بائیں ہو، آخر کار اسے ماننا پڑتا ہے۔''

عبدالمعز بے ساختہ ہنسا۔ ''امی اکثر کہتی ہیں کوئی غلطی ہو..... بابا کو بتاؤں گی..... آپ کا مطلب ہے مختلف وبائیں بھی دنیا سے اس لیے نہیں جاتیں کہ بندے اللہ سے ڈرتے رہیں۔''

''لیکن اللہ رب العزت غفور الرحیم ہیں۔ ان سب وباؤں کا علاج بھی انہوں نے بندوں ہی سے دریافت کروالیا..... انشاء اللہ کورونا کا علاج اور اس کی روک تھام کے لیے ویکسین بنانے میں بھی اللہ پاک انسانوں کی راہنمائی فرمائیں گے مگر بندوں کو یہ عہد کرنا ہوگا کہ کورونا سے گزرنے کے بعد بہتر انسان بن کر اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں گے۔''

''عبدالواسع اپنے ہاسٹل پہنچ گیا ہے میاں اور اس نے عبداللہ کو بھی مومنہ کی بیماری اور صحت یابی دونوں کا بتادیا..... عبدالواسع کا فون آیا تھا، کہہ رہا تھا عبداللہ بھائی شام کو فون کریں گے۔'' ریحانہ نے بتایا۔

''جیتے رہیں..... خیریت سے رہیں..... ریحانہ کل ہمارے بچے اپنے بچوں کو بتایا کریں گے کہ ان کے زمانے میں کورونا نامی وبا نے بہت تباہی مچائی تھی۔'' مطیع اللہ نے اپنا روئے سخن عبدالمعز اور بستر پر لیٹی مومنہ کی طرف کیا اور بولا۔ ''لیکن اپنے بچوں کو تم لوگ یہ ضرور بتانا کہ کورونا اس لیے آیا کہ بندے اللہ کے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ انہوں نے اس کی ایس او پی کی نافرمانی شروع کردی تھی۔''

''بابا! میں تو اب اللہ کے راستے پر ہی چلنے کی کوشش کروں گی۔'' مومنہ بولی۔

''خدا تمہیں توفیق دے، میری بیٹی۔''

''مجھے بھی دعا دیں بابا..... میں نے دیکھ لیا ہے آپ کی دعا میں کتنا اثر ہے۔''

''گناہ گار رہوں بیٹا..... بہر حال تمہارے لیے دعا کرتا ہوں..... بچو! دنیا کے حالات بدلتے رہتے ہیں..... جیسے گزری کل تھے، آج نہیں ہیں اور جیسے آج ہیں، ویسے آنے والی کل نہیں رہیں گے..... تم لوگوں کو خود کو آنے والی کل کے لیے تیار کرنا ہے..... کچھ پتا نہیں کل اپنے ساتھ تمہارے لیے کیا لے کر آئے گی..... کل کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے آج تیاری کرلو..... سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

''جی بابا!''

''کیا بھلا؟'' مطیع اللہ نے عبدالمعز سے سوال کیا۔

''کل کی تیاری آج۔''

''اور کل کی تیاری آج کیسے ہوگی؟''

''کیسے بابا؟''

''اللہ کی ایس او پی کو مضبوطی سے تھام لو..... یہاں بھی مزے کرو گے اور وہاں بھی مزے میں رہو گے۔''

''وہاں کہاں بابا؟''

''آخرت میں نتیجۂ اعمال سننے کے بعد۔''

''کورونا..... کورونا..... کورونا..... اتنے دن ہو گئے، کورونا کا نام سنتے..... ارے بھئی کیا کورونا؟ آج تک کورونا کا مطلب ہی نہ پتا چلا۔'' ریحانہ بولی۔

''اماں کورونا لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تاج یا ہالہ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ کورونا کی شکل تاج یا سورج کے ہالے سے ملتی جلتی ہوتی ہے اس لیے اس وائرس کو کورونا کہا جاتا ہے۔'' عبدالمعز نے کہا۔

''ستیاناسی نے بہت تباہی مچائی ہے۔''

''مسلسل مچا رہا ہے اماں..... جب تک اس کی ویکسین نہیں بن جاتی، یہ نہیں جائے گا..... دوسری بڑی لہر بھی آسکتی ہے اس کی۔''

''اللہ کرے اس سے پہلے ہی ویکسین بن جائے۔'' ریحانہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

''انشاء اللہ! امید رکھنی چاہیے کہ اللہ رب العزت ہماری غلطیوں، خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں کو معاف فرما کر ہم بندوں پر رحم فرمائیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' ریحانہ کا لہجہ یقین سے معمور تھا۔

☆☆☆

''مومنہ! بابا کو اب بتانا ہے یار۔'' عبدالمعز نے مومنہ سے کہا۔

مطیع اللہ جو کام سے واپس آنے کے بعد چائے پی رہا تھا، چونکا اور اس نے عبدالمعز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بیٹے؟''

''بتا دوں؟'' عبدالمعز نے اجازت طلب نظروں سے مومنہ کی جانب دیکھا۔

''بتانا کیا ہے..... دکھا دو۔'' مومنہ بولی۔

مطیع اللہ حیران تھا کہ اس کے دونوں بچے کیسی مبہم باتیں کر رہے تھے۔

عبدالمعز اٹھا، اپنے کمرے میں گیا اور لیپ ٹاپ اٹھا لایا۔ لیپ ٹاپ مطیع اللہ کے سامنے رکھی میز پر رکھتے ہوئے اس نے ماں کو بہ آواز بلند پکارا۔

''کیا ہے؟'' کچن سے ریحانہ کا جواب آیا۔

''آئیں، آپ کو کچھ دکھانا ہے۔''

''کیا دکھانا ہے؟'' ریحانہ ہاتھ جھٹکتی لاؤنج میں آگئی۔

''بیٹھیں۔'' عبدالمعز نے کرسی سرکائی۔ لیپ ٹاپ چل پڑا تھا۔ ریحانہ متذبذب سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ عبدالمعز نے لیپ ٹاپ کو ایسے رخ پر کیا کہ مطیع اللہ اور ریحانہ دونوں لیپ ٹاپ اسکرین پر نظر رکھ سکتے۔

چند لمحوں بعد لیپ ٹاپ اسکرین پر ٹائٹلز نمودار ہوئے جیسے کوئی فلم یا ڈراما شروع ہونے جا رہا ہو۔

مومنہ اینڈ عبدالمعز پروڈکشنز کی فخریہ پیشکش

علم کی پرواز

کہانی: مومنہ مطیع اللہ + عبدالمعز

پس پردہ آواز: مومنہ مطیع اللہ

آواز آنی شروع ہوئی۔ ''یہ کہانی ایک ایسے بچے کی جدوجہد کی داستان ہے جو اپنے گھر کے نامساعد حالات کے باوجود علم حاصل کر کے زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرتا ہے۔''

''مومنہ! یہ تو بالکل تمہاری آواز لگ رہی ہے۔'' ریحانہ جس نے اوپننگ ٹائٹلز پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی، بولی۔

''لگ کیا رہی ہے ریحانہ، ہماری بیٹی ہی کی آواز ہے..... تم نے ٹائٹل نہیں دیکھا تھا..... پس پردہ آواز، مومنہ مطیع اللہ۔''

''میں نے غور نہیں کیا تھا۔'' ریحانہ نے کہا۔

''اب غور کرو۔'' مطیع اللہ قدرے آگے سرک کر میز کے نزدیک ہو گیا۔

لیپ ٹاپ اسکرین پر رنگین تصویر اور پس پردہ آواز کے ساتھ کہانی شروع ہوئی۔ پانچ پانچ منٹ دورانیہ کی سولہ اقساط پر مبنی رنگین باتصویر کہانی مطیع اللہ اور ریحانہ شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں نہایت دلچسپی اور انہماک

سے دیکھتے رہے۔ عبدالمعز اور مومنہ کی نگاہیں ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے پر اپنی مسرت کا اظہار کرنے میں مصروف تھیں۔

کہانی ختم ہوئی تو مطیع اللہ نے بے ساختہ کہا۔

''زبردست! بہت عمدہ!'' پھر مسکراتے ہوئے ریحانہ کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے بولا۔ ''کچھ سمجھیں؟''

''گھر داری کے چکر میں اپنا پڑھا لکھا بھول ضرور گئی ہوں مگر اتنی جاہل بھی نہ سمجھیں۔'' ریحانہ بولی۔

''استغفراللہ! میری یہ مجال!'' مطیع اللہ نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''لیکن یہ کام تم دونوں نے کیا کب؟'' ریحانہ نے عبدالمعز اور مومنہ کو قدرے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لاک ڈاؤن کے دوران..... رات کو..... آپ اور بابا تو سوجاتے تھے، ہم دونوں رات کو جاگ کر یہ کام کرتے تھے۔''

''اسی لیے صبح فجر کی نماز پڑھ کر سوتے تھے تو ظہر کی خبر لیتے تھے۔''

''نیند بھی تو پوری کرنی ہوتی تھی امی..... رات کو دوبارہ کام کرنے کے لیے۔'' مومنہ مسکرائی۔

''یہ کام کرتے ہوئے بہت مزہ آیا..... کیوں مومنہ؟'' عبدالمعز نے مومنہ سے اپنے موقف کی تائید چاہی۔

''ہاں۔'' مومنہ نے تائید کی۔ ''میں تو دوبارہ کام شروع کرنے کے لیے رات کے انتظار میں رہتی تھی۔''

''تخلیقی کام کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ آپ کو تھکا تا نہیں، سرشار رکھتا ہے۔'' مطیع اللہ بولا۔

''مگر تم دونوں نے بھنک تک نہیں ملنے دی، مجھے یا اپنے بابا کو۔'' ریحانہ نے گلہ کیا۔

''امی! ہم سرپرائز دینا چاہتے تھے آپ کو اور بابا کو..... جیسے ہی ہمارا پروجیکٹ مکمل ہوا، مومنہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور ہم سب کچھ بھول گئے۔''

''ویل ڈن! ویل ڈن بچو! اب کیا پروگرام ہے تم لوگوں کا؟'' مطیع اللہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔

''بابا! ہم اسے سوشل میڈیا پر وائرل کرنا چاہتے ہیں۔'' عبدالمعز نے کہا۔

''ضرور کرو..... سوشل میڈیا کی رسائی بہت دور تک اور عوام وخواص سب تک ہے..... سوشل میڈیا کا درست استعمال بہت فائدہ بخش ہوسکتا ہے۔ تمہاری یہ کاوش بچوں کو علم کی اہمیت سے آگاہ کرے گی اور زندگی میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد پر ابھارے گی..... والدین بھی تمہاری اس کوشش کو بہت سراہیں گے۔''

''بابا! آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا کہ ہم نے آپ کو پہلے کیوں نہیں بتایا..... دراصل ہم اپنا پروجیکٹ مکمل کرنے کے بعد آپ کو بتانا چاہتے تھے۔'' مومنہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ وہ ریحانہ کے گلہ کرنے پر کچھ شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

''قطعاً نہیں بیٹی..... میں نوجوان نسل کو سمت بتا کر..... راستہ دکھا کر..... عمل کی آزادی دینے کا قائل ہوں۔''

''ہمیں راستہ تو آپ ہی نے دکھایا تھا، بابا۔'' مومنہ کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

''آپ نے کہا تھا..... جو لاک ڈاؤن میں کام کرلے گا، مزے میں رہے گا۔'' عبدالمعز نے وضاحت کی۔

''اپنے بچوں کو مشکل سے نکلنے کے لیے راستہ دکھانا میرا فرض تھا..... لاک ڈاؤن کے دوران میں ہی اگر مایوس، پریشان اور بے عمل ہوکر بیٹھ جاتا تو تم نے لازماً اس کا اثر لینا تھا..... بحرانوں میں بڑوں ہی کو ہمت کرنا پڑتی ہے، چھوٹے خود بخود پیچھے چل پڑتے ہیں..... میں خوش ہوں کہ تم نے مشکل حالات میں رہتے ہوئے ایک اچھا کام کیا۔''

''تھینک یو بابا..... اب ہم اسے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کرکے پبلک رسپانس کا انتظار کریں گے۔''

''انشاءاللہ! مایوسی نہیں ہوگی..... ہاں! یہ تو تم دونوں بہن بھائی ہی بہتر جانتے ہو کہ اسے سوشل میڈیا پر کیسے اپ لوڈ کرو گے..... میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو ضرور بتانا۔''

''تھینک یو بابا..... تھینک یو ویری مچ..... یو آر گریٹ..... آپ نے ہمیں کبھی بھی نہ تو اکیلا چھوڑا نہ ہی پریشان ہونے دیا..... لاک ڈاؤن میں جب ہر طرف سے پریشانی کی خبریں تھیں، آپ نے ہمیں فل مورل سپورٹ دی..... مومنہ کی بیماری میں آپ ہی ہم سب کو تسلی دیتے رہے..... مشکل وقت میں آپ ہی نے ہمیں امید کا راستہ دکھایا۔'' عبدالمعز تشکر آمیز لہجے میں بولتا چلا گیا۔ اس کی سنجیدگی بھی ریحانہ کو اس کی شوخی کی طرح دل آویز لگی۔

''مجھے یقین ہے بیٹا کہ اللہ رب العزت ہم بندوں سے اپنی ناراضگی ختم کرلیں گے..... خدا سے ہماری پختہ امید کورونا کو بالآخر شکست دے دے گی۔'' مطیع اللہ کا لہجہ پُریقین تھا۔

''گاڈ از گریٹ!'' مومنہ نے کہا۔

''بے شک! خدا امید ہے۔'' مطیع اللہ جذب کی کیفیت میں تھا۔

(ختم شد)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کا تختِ شاہی پلک جھپکتے اپنے دربار میں منگوا لیا تھا اور بعد میں ملکہ سبا بھی حاضرِ دربار ہوگئی تھی۔ یہ واقعہ اور اس کی مکمل تفصیل تاریخ کے جھروکوں سے اب بھی جھانک رہی ہے لہٰذا یہ تفصیل جاننے کی ضرورت ضروری ہو جاتی ہے کہ ''سبا'' کون لوگ تھے جن کی یہ ملکہ تھی۔ لوگوں کو اس میں دلچسپی نہ ہو لیکن تاریخ نے ان چھپے ہوئے گوشوں پر بھی نظر ڈالی ہے جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔

قومِ سبا

رضوانہ ساجد

تاریخ گواہ ہے جب جب انسان اپنی سیدھی راہ سے بھٹکا... اللہ تعالیٰ نے پہلے تو اپنے انبیا کے ذریعے انہیں راہ راست دکھائی اور جب وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو اللہ کے عذاب نے انہیں آن گھیرا... قومِ سبا کا بھی یہی حال تھا جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس قوم کی ملکہ کو اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے اور بلا شرکت غیرے اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا تو کیسے اس نے یقین کیا اور کیسے اس کی قوم نے اس کی پیروی کی...

اللہ کا پیغام پہنچانے والے انبیا اور قوموں کا احوال

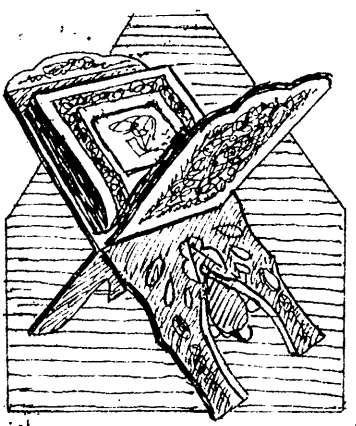

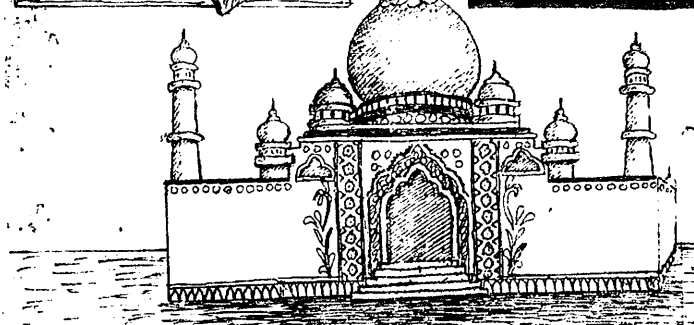

مؤرخین عرب کے نزدیک سبا، قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے۔ یہ اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔ اس کے، برعکس توریت میں یہ کہا گیا ہے کہ سبا، قحطان کا بیٹا ہے۔ مؤرخین جدید توریت کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات توریت نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال سے مطابقت رکھتی ہیں۔ یوں بھی ایسے معاملات میں توریت کا بیان دوسری تاریخی روایات کے مقابلے میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

عرب روایات اور توریت کے درمیان فرق یہ سامنے آتا ہے کہ سبا بہ روایت توریت قحطان کا بیٹا تھا اور عرب کہتے ہیں قحطان کا پوتا تھا۔ توریت کے مطابق یعرب، سبا کا بھائی تھا جبکہ بہ روایت عرب قحطان کا بیٹا تھا۔

تاریخ تو یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی لیکن اہلِ نسب کے سامنے ایک نئی بحث سامنے آ گئی اور یہ کہ قحطانی بنی اسمٰعیل ہیں یا نہیں؟ محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے کسبی سلسلے کے منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان۔ عدنان بنی اسمٰعیل ہیں یعنی عرب مستعربہ اور قحطان بنی اسمٰعیل میں سے نہیں، قحطانی ہیں۔

یہ اختلاف کیوں ہے؟ قحطانی بھی بنی اسمٰعیل کیوں کہلانے لگے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یمنی حکومت کے زوال کے بعد قحطانی قبائل حجاز میں آ کر بس گئے تھے۔ ان کے اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بہ کثرت ہونے لگے تھے لہٰذا پدری سلسلے کے بجائے مادری سلسلے سے ان کو بنی اسمٰعیل کہا جانے لگا۔

یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتے نے ہی یہ صورت پیدا کر دی کہ بعض اہلِ نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اور عدنانی کو قحطانی کہتے نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک نظریہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ حضرت اسمٰعیل کا حجاز کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے، اس کی عظمت اور اکثر قبائل عرب کے ابوالقبائل ہونے کا جو علاقہ اس کی اہمیت۔ یہ دو باتیں اہم ہیں کہ جن کی وجہ سے بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو اس پردے میں نہیں چھپا سکتے تھے انہوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطانی بھی اسمٰعیلی ہیں تاکہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی نہ رہے جو ایک کے اسمٰعیلی اور دوسرے کے غیر اسمٰعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا۔

ایک اختلاف اور بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ سبا نام ہے یا لقب۔ توریت کہتی ہے یہ نام ہے اور مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ سبا لقب ہے اور نام عمرو یا عبدشمس ہے۔ اگر سبا لقب ہے تو اس لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لفظ ''سبا'' بمعنی قید سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا۔ کچھ کا خیال یہ ہے کہ سبا اور سبا قوم چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لیے ''سبا'' کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی لغت عرب میں یہ لفظ شراب کی تجارت کے لیے بولا جاتا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں۔ ان کا اصلی وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن) ہے۔

قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سبا ہے۔ یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا اور پھر حکومت اس کی اولاد میں جاری رہی اور چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر حارث الراکش بادشاہ ہوا۔ یہ وہ بادشاہ ہے جس کے دور میں تمام یمنی ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ یہ پہلا بادشاہ ہے جس کی بادشاہی پر سب جمع ہو گئے تھے۔

سبا کے دورِ اول کے حکمران تاریخ میں مکارب سبا کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ سبا کا ابتدائی دورِ حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مارب اور صنعا کے درمیان واقع تھا۔ اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوک سبا کا دارالحکومت ''مارب'' تھا۔

حکومت سبا کی ابتدا جنوبی عرب ''یمن'' کے مشرقی حصے سے ہوئی ہے۔ اس کا دارالحکومت اول ''صرواح'' تھا اور پھر ''مارب'' ہوا۔ آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اس کا رقبہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقا تک اس کی حدود نظر آنے لگی۔ آٹھویں صدی قبل مسیح تک سبا کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی۔

اس زمانے کے محدود رسل و رسائل کے پیشِ نظر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دارالحکومت سے فاصلے پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت قائم تھی، اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح تھی کہ آس پاس کے

گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ تھا جس پر ایک قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم ہوتا تھا جسے ''ذو'' کہتے تھے۔ یمنی زبان میں ''ذو'' کے معنی آقا کے ہیں۔ ایک حاکم کے تحت جو آبادی ہوتی تھی اس کو ''مخلاف'' کہتے تھے۔ پھر چند مخلاف مل کر ''مخلاف'' بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو قیل (صوبہ دار) کہتے تھے۔ قیل کی جمع ''اقیال'' بادشاہ کے تابع ہوتے تھے۔ انہی بادشاہوں کو مکارب سبا اور ملوک سبا کہا جاتا تھا اور بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ ہوتا تھا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی یہ نظامِ حکومت باقی رکھا گیا۔ یہی وہ اقبال تھے جن کو نبی اکرم ﷺ نے دعوت اسلام کے لیے نامہ ہائے مبارک تحریر فرمائے تھے اور انہوں نے بہ رضا و رغبت دعوتِ اسلام کو قبول کیا۔

اس قوم نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ عجیب و غریب عمارات تعمیر کی تھیں۔ حکومت سبا کے سلسلے میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور شاندار عمارات ہی کے کتبے ہیں۔ یورپین سیاح ان کھنڈرات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں قصر غمدان بے مثل صناعی کا نمونہ تھا۔ یہ قصر بیس منزلوں پر مشتمل تھا۔ سب سے اوپری منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں سو وسیع و عریض کمرے تھے۔ ایسی ... سیکڑوں عمارات تھیں جو اس قوم کے رفیع تمدن کی گواہی دیتی تھیں۔

اہلِ سبا چونکہ ایک تاجر قوم تھی لہٰذا یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا اس لیے حکومت کی ترقی کے لیے وہ اسی کو اہم وسیلہ سمجھتے تھے۔ دوسرا اہم وسیلہ وہ سونے اور جواہرات کی کانیں تھیں جن کا بیشتر حصہ ان ہی کے رقبۂ حکومت میں موجود تھا۔ سونے اور جواہرات کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی تھیں۔ یمن کا علاقہ خوشبودار اشیا کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ خود یمن کے ساحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کے لیے منڈی تھے۔ شام، مصر، یورپ اور ہندوستان کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی اس کے واحد اجارہ دار تھے اور براہِ حجاز ان ملکوں تک سامانِ تجارت پہنچاتے تھے۔ کتاب توریت میں کئی جگہوں پر اس کی شہادتیں ثبت ہیں۔

''اے یروشلم! اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی۔ مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔''

یرمیا نبی کا جو باب ہے اس میں یہ الفاظ تحریر ہیں۔

خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ''کس مقصد کے لیے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو۔''

حزقیل نبی کی کتاب میں تحریر ہے۔

''اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوبصورت تاج ان کے سروں پر ہیں۔''

ایک اور جگہ ہے۔

''سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے۔ وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مسالے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا یمن کے شہروں کے اور سوداگرانِ سبا تیرے سوداگر ہیں۔''

اہلِ سبا کے لیے ایک مسئلہ اور درپیش تھا جو ان کی خوش حالی میں مانع آ رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ عرب میں مستقل دریا ناپید تھے۔ بارش کا پانی تھا یا پہاڑی چشمے۔ یہ دونوں طرح کا پانی بہہ کر ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔ قوم سبا نے اس پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یمن کے اقطاع و احصار میں ایک سو سے زیادہ بند باندھے۔ ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز بنا ہوا تھا۔ ان بندوں میں سے سب سے بڑا بند ''سدِ مارب'' کہلاتا تھا۔

سدِ مارب کی تعمیر سے متعلق قدیم مؤرخوں نے جو حالات لکھے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فنِ انجینئری اور ہندسہ میں کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں دائیں بائیں دو پہاڑ تھے جو کوہِ اہلق کے نام سے مشہور تھے۔ جب پانی پہاڑی چشموں سے بہہ نکلتا تو دونوں پہاڑوں کے درمیان کی وادی دریا بن جاتی۔ اہلِ سبا نے یہ دیکھ کر 800 ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصے تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

تاریخ ابن کثیر کے مطابق یہ بند دو میل مربع تھا۔ یورپین سیاحوں کے مطابق اس بند کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے، ایک تہائی اب بھی باقی ہے۔

مؤرخینِ عرب کہتے ہیں کہ سبا نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیشِ نظر

آبیاری کے لیے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کردیے تھے اور ہر درجے میں کھڑکیاں بنائی گئی تھیں جن کے ذریعے پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا۔ اس حوض کے دائیں بائیں دو بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعے حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں کے ذریعے حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔

اس عظیم الشان بند کی وجہ سے ..... کئی میل تک میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، دار چینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ فردوس کا منظر پیش کرتا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر سے گزر جاتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔ یہ مبالغہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ صداقت تو پھر بھی ہوگی۔

سونے جواہرات کی کانوں اور پھلوں کی کثرت نے قوم سبا میں اس درجہ خوش عیشی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ شب و روز طمانیت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ بہار ستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا کہ اہل سبا ایذا رساں کیڑوں سے محفوظ تھے۔

ایک یونانی مورخ 145 ق م لکھتا ہے۔

''سبا عرب آباد ان میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین جو سمندر کے متصل ہے، اس میں بلسان اور نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے ہوتے ہیں۔ اندرونِ ملک بخورات، دار چینی اور چھوہارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے۔ درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے۔ جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے، وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گزرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل ناقص ہے۔''

اسی مؤرخ نے آگے چل کر لکھا۔

''سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بہ کثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے۔ دوری کے سبب کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے۔ اسی لیے خصوصاً ان کے دار الحکومت میں سونے چاندی کے برتن میں تخت اور پیش گاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ ایوان اور دروازے زر و جواہر سے منقش ہیں۔''

یہ تو تھی 145 ق م کے مؤرخ کی گواہی۔ 100 ق م کا ایک باشندہ یہ نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

''سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پُر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوش حالی میں واقع ہے۔ میووں کی کثرت کے سبب لوگ ناکارہ ہو چکے ہیں۔ خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لپٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بدلے دار چینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی و غیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ مسالے مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں (حبشہ بھی سبا کے مقبوضات میں تھا) اس ساحل سے سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ قرب و جوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام تک پہنچتے ہیں۔

☆☆☆

اہل سبا ایک عرصے تک تو اس جنت ارضی کو اللہ کی نشانیاں سمجھ کر شکر نعمت ادا کرتے رہے، حلقہ بگوش اسلام ہو کر احکام الٰہی کی تعمیل کرتے رہے لیکن پھر عیش و نعمت کی فراوانی نے ان میں بھی دیگر مغرور قوموں کی طرح اخلاقی جرائم پیدا کر دیے۔ یہاں تک ہوا کہ انہوں نے دین حق کو بھی خیر باد کہہ دیا اور کفر و شرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنا لیا۔ قانونِ فطرت نے اپنا کام دکھایا۔ فوراً گرفت نہیں کی بلکہ مہلت دینے کے قانون کو اپنایا۔ انبیاء علیہم السلام نے ان کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں۔

علمائے کرام کے مطابق اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حق رسالت ادا کرنے کے لیے آئے مگر ان کی بے حسی برقرار رہی اور شرک و کفر کی راہ پر چلتے رہے۔

جب اتمامِ حجت ہو چکی تو ان کا بھی وہی حال ہوا جو ماضی میں نافرمان قوموں کا ہو چکا تھا۔ خدائے تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کے جواب میں ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا۔ ان عذابوں کی بدولت ان کے بے مثال باغات برباد ہو گئے۔ ہر طرف خاردار درخت اگ آئے۔ ان کے سرسبز میدان عبرت گاہ بن گئے۔

پہلا عذاب یہ ہوا کہ وہ ''بند'' جس کی تعمیر پر ان کو بے حد ناز تھا..... جس کی موجودگی سے یمن گلزار بنا ہوا تھا۔ بند ٹوٹتے ہی اس کا پانی زبردست سیلاب کی صورت میں پوری وادی میں پھیل گیا۔ فرحت بخش باغات کو غرق کر کے برباد کر ڈالا اور جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو باغوں کی جگہ جھاؤ کے خاردار درختوں، جنگلی بیروں کے جھنڈوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ تھا۔ نہ کھانے کے کام آسکتے تھے، نہ پکانے کے۔

یہ تباہی اتنی اچانک آئی تھی کہ قومِ سبا کی کوئی طاقت اسے نہ روک سکی۔ ان کے انجینئر اور علمِ ہندسہ کے ماہرین سب بے بس ہو گئے۔ یہ تک نہ جان سکے کہ بند ٹوٹا کیسے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے وطن مالوف، مارب اور نواحِ مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

یہ محض قصہ کہانی نہیں بلکہ قرآن عزیز نے بھی اس عبرت ناک واقعے کو بیان کیا ہے۔

''پھر انہوں نے ان پیغمبروں کی نصیحتوں سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر بند توڑ نے کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دو باغوں کے بدلے، دو ایسے باغ اگا دیے جو بدمزہ پھلوں جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ یہ ہم نے ان کی ناشکر گزاری کی سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔''

یہ عذابِ الٰہی تھا یا اسبابِ ظاہری تھے کہ بند ٹوٹ گیا۔ قرآن کی گواہی کے بعد یہ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ ''بند'' کہنہ ہو گیا تھا اور اس میں کوئی خرابی ہو گئی تھی کیونکہ اس وقت ایسے انجینئروں کی کمی نہیں تھی جو اس خرابی کو دور نہ کر سکتے ہوں۔ پانی کے اخراج میں کمی نہ لا سکتے ہوں۔ حالات و شواہد بتاتے ہیں کہ یہ لوگ بند کے استحکام سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اس سے پہلے کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ انہوں نے اس کی مرمت کا کوئی کام کیا ہو۔ جب اچانک یہ سیلاب آیا تو وہ خود سراسیمہ اور حیران رہ گئے۔ تمام شواہد یہی ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غیبی ہاتھوں سے ہوا۔ انہوں نے جب خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفرانِ نعمت کیا..... نبیوں اور پیغمبروں کو جھٹلایا تو اچانک عذابِ الٰہی نے آ کر ان کو تباہ کر دیا۔

☆☆☆

مارب کے رہنے والے جب سرسبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے۔ کچھ یمن کے دوسرے علاقوں کی طرف چلے گئے کیونکہ تمام علاقے اس تباہی کا شکار نہیں ہوئے تھے مگر عذابِ الٰہی کی سزا ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس قوم کو اب بھی نصیحت نہیں ہوئی ہے لہٰذا یہی ہوا۔ یمن سے شام تک راحت رساں آبادیاں اور کارواں سرائے موجود تھے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف کسے کہتے ہیں۔ میلوں تک پھیلے ہوئے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے سروں میں غرور و تکبر کا سودا سما گیا۔ وہ اکڑ اکڑ کر چلنے لگے۔ شکر ادا کرنے کے بجائے یہ کہتے سنائی دینے لگے کہ یہ سفر تو ہمارے گھروں سے بھی زیادہ آرام دہ ہے جو ہمیں میسر ہے۔ وہ بھی کیا بدنصیب مسافر ہوتے ہیں جو سفر کی تکالیف اٹھاتے ہیں اور خورد و نوش کے لیے آزار سہتے ہیں۔ ہمیں دیکھو، یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وطن سے کہیں دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں۔ کاش ہمیں بھی وہ سفر میسر ہو جس میں تکالیف ہوتی ہیں۔

یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کی تکمیل کر دی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے دوسری ہی سزا مقرر کر دی۔ یمن سے شام تک ان آبادیوں کو ویران کر دیا جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبے، گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد تھیں، وہاں خاک اڑنے لگی۔

قرآن عزیز کی یہ آیات اس حقیقت کا اعلان کرتی ہیں۔

''ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں مقرر کی تھیں اور کہہ دیا تھا چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات بے خوف و خطر مگر انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں کے درمیان دوری کر دے اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ بس ہم نے ان کو کہانی بنا دیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس میں عبرت کی نشانیاں ہیں، صابر اور شکر گزار بندوں کے لیے۔''

یمن سے شام تک ویرانی کا یہ واقعہ کیونکر پیش آیا۔ اس کا پس منظر یہ بنا کہ عرصہ دراز سے رومیوں کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندوستان اور افریقا کے ساتھ عربوں کی طرح براہِ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ حاصل کریں مگر عرب تجارتی سواحل پر قابض تھے لہٰذا ان کو موقع نہیں ملتا تھا۔ عذابِ الٰہی تلاش میں تھا۔ اسباب بن رہے تھے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں

رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کرلیا اور موقع مل گیا کہ وہ اپنے منصوبے کو پورا کریں۔ تجارتی مراکز کے لیے جو شاہراہ امام مبین عربوں نے بنا رکھی تھی، وہ خشکی کی راہ تھی۔ اس راہ سے تجارت کرتے ہوئے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا۔ انہوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لیے یہ کیا کہ بری راستے کو بحری راستے میں تبدیل کردیا اور بحر احمر میں کشتیوں کے ذریعے تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہ پر اتارنے لگے۔ اس طریقۂ تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام نوآبادیوں کو برباد کردیا۔ سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گیا۔

بند ٹوٹنے کا واقعہ اور طریق سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی نوآبادیاں برباد ہوگئیں۔ یہ قریب قریب زمانے کی باتیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن عزیز نے جب اہل عرب کو سبا اور ''سیل عرم'' کا واقعہ سنایا، اس وقت یمن کا ہر باشندہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور جو خاندان حجاز، شام، بحرین، نجد وغیرہ میں اس حادثے کے سبب پناہ گزیں ہوگئے تھے، اپنے آباؤ اجداد کے اس مرکز کی حالت کو سنا رہے تھے اور کف افسوس مل رہے تھے۔

واقعات کچھ بھی رہے ہوں، مختصر یہ کہ سبا کا یہ خاندان جو وسعتِ حکومت میں یمن، اطراف شام و حجاز کی نوآبادیوں اور حبشہ پر حکمران تھے کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہوگیا اور اس کا شیرازہ بکھر گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا) خاندان نیاور سملا می، عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں (ابن کثیر)

سیلاب کا سانحہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سیکڑوں میل تک اس کا تباہی خیز اثر پڑا۔ اس وقت صرف وہی قبائل ترکِ وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے۔ باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے۔ سبا کے باقی قبائل اس وقت منتشر ہوئے جب دوسرے عذاب کا سامنا ہوا۔

ابن کثیر اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔

''جب سیل عرم آیا تو تمام قبائل سبا یمن سے منتشر نہیں ہوگئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دارالحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور مارب کا بند تھا اور عبداللہ بن عباس کی روایات سے جو حدیث سابق میں ذکر ہوچکی ہے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل ہیں جو شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے۔''

ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں۔

''عرب میں سبا کا یہ انتشار اس درجہ مشہور اور عبرت ناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہل عرب کسی قوم یا خاندان کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''ان کا حال سبا کا سا ہوگیا۔''

☆☆☆

قرآن حکیم نے سورۃ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقۂ اولیٰ کا ہر دو شاخوں کا مذہب آفتاب پرستی رہا ہے یا مجوسیت یہودیت۔

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکام الٰہی کے مطیع و فرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انہوں نے اور کفر اختیار کرلیا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دو زمانے ان پر کب طاری ہوئے۔ کب وہ کفر کا شکار ہوکر عذاب الٰہی کے حقدار بنے۔

قرآن عزیز نے ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکۂ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت و ارشاد پر اس نے اسلام قبول کرلیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع و فرماں بردار تھی۔ اس کی قوم بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئی تھی کیونکہ اس زمانے کا دستور ہی یہ تھا کہ جو مذہب بادشاہ کا ہوتا وہی اس کی رعایا کا ہوتا۔

اس کا ثبوت ان نامہ ہائے مبارک سے بھی ملتا ہے جو آپ ﷺ نے شاہانِ عالم کے نام دعوت اسلام کے سلسلے میں بھیجے۔ آپ ﷺ نے ان مکتوبات میں لکھا تھا۔

''اے شاہانِ روم و ایران و مصر اگر تم نے خدا کی دعوتِ حق کا انکار کردیا تو تمہاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہاری گردن پر رہے گا۔''

یہ آپ ﷺ نے کیوں ارشاد فرمایا۔ صرف اس لیے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو

مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا، وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ ''خدا کا مظہر'' سمجھا جاتا تھا۔

ملکۂ سبا بھی آفتاب پرست تھی۔ اس کی خبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کے ایک درباری پرندے نے پہنچائی تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے۔

''میں نے ایک عورت کو ملکہ دیکھا جو اہلِ سبا پر حکومت کرتی ہے۔ میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے سوا آفتاب کی پرستش کرتی ہے اور اس کے سامنے سربسجدہ رہتی ہے اور شیطان نے ان کے ان کاموں کو بھلا اور اچھا دکھا رکھا ہے اور راہِ مستقیم سے ہٹا رکھا ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے جواب میں جو خط ملکۂ سبا کے پاس پہنچایا تھا، اس کے الفاظ بھی یہی تھے کہ وہ اسلام نہیں لائی تھی۔

''اس اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ تم کو چاہیے کہ مجھ پر برتری کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلے میں قوت کا مظاہرہ نہ کرو اور چلی آؤ میرے پاس مسلمان ہو کر۔''

زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مذکور ہے۔

''اے خدا! بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے، وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا۔ سلاطین نذریں گزاریں گے اور وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا۔ اس کے حق میں سدا دعا ہوگی۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی۔ 950 ق م میں سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انہوں نے اس امانتِ الٰہی کو سینے سے لگائے رکھا لیکن جب انہوں نے اس سے روگردانی کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے زمانے میں آ کر ان کو ہدایت کی لیکن انہوں نے پروا نہیں کی، تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیلِ عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور سبا کے خاندان پارہ پارہ ہو گئے۔

☆☆☆

عربوں کے تجارتی حالات کسی قدر توریت کے صفحوں سے اور زیادہ تر یونانی تاریخوں سے واضح ہوتے ہیں۔ ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب تاجر دو ہزار قبل مسیح سے برابر ان خدمات کو ادا کر رہے تھے۔ افریقا اور ہندوستان سے سامانِ تجارت بحری راستوں سے آ کر یمن اور حضرموت کے سواحل پر اترتا اور یہاں سے خشکی کے راستے سے بحر احمر کے کنارے کنارے شام پہنچتا اور وہاں سے بحر روم ہو کر یورپ کو چلا جاتا یا شام کی سرحد سے مصر پہنچتا اور وہاں سے اسکندریہ کی بندرگاہ سے یورپ کو روانہ ہو جاتا۔

یہ تجارتی شاہراہ جو حجاز ہو کر یمن سے شام کو جاتی تھی، قرآن مجید نے اسی راستے کو امام مبین کہا ہے اور عرب کی تمام بڑی بڑی آبادیاں اسی کے دائیں بائیں واقع تھیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کا گاؤں بھی اسی راستے پر تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں ایک قافلۂ تجارت کے جس راہ سے گزرنے کا ذکر ہے، وہ بھی یہی راستہ ہے۔

یونانیوں کی تاریخ میں بھی اسی راستے کا ذکر ہے۔ ایک یونانی مؤرخ لکھتا ہے۔

''یہیں سے ایک سیدھی سڑک اس شہر کو جاتی ہے جس کا نام ''پٹرا'' ہے اور فلسطین (شام) کو جاتی ہے جہاں اہلِ قریہ اور تمام عرب قریب میں رہتے ہیں۔''

یونان کے اکثر مؤرخوں نے اس راستے کا ذکر کیا ہے۔ مصر پر جب یونانی بطلیموسیوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے تجارت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ یمن سے مصر تک خشکی کا راستہ ان کے لیے پُرامن نہ تھا۔ اس لیے ہندوستان سے مصر تک انہوں نے براہِ راست بحری سفر اختیار کیا۔ اس طریقِ سفر نے عربوں کی بحری تجارت کو بالکل ڈبو دیا۔

جنوبی مغربی عرب کی خیر و برکت کا سب سے بڑا سبب اس زمانے میں یہ تھا کہ مصر اور ہندوستان کے درمیان کا تجارتی سامان پہلے سمندر کی راہ سے یہاں آتا تھا اور پھر خشکی کے راستے سے مغربی ساحل پر جاتا تھا۔ یہ تجارت اب اس عہد میں مسدود ہو گئی کیونکہ مصر کے بطلیموس بادشاہوں نے ہندوستان سے اسکندریہ تک براہِ راست ایک راستہ بنا لیا۔

خشکی کی تجارت جب زوال پذیر ہو گئی اور ساحلی آبادیوں کے درمیان جو تجارتی سفر ہوتے تھے جب وہ جاتے رہے اور ان کی جگہ بحری راستہ اختیار کیا گیا تو یہ آبادیاں نیست و نابود ہو گئیں۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عرب کا ملک ایک بنجر اور بے آب و گیاہ زمین ہے، وہاں تجارت کا کیا سامان ہاتھ آتا ہوگا۔ وہ کیا چیزیں تھیں جو عرب سوداگروں کا سرمایہ تجارت تھیں۔ یونانی مؤرخین کے مطابق عربوں کے سامانِ تجارت میں

خوشبودار مسالا جلانے کی خوشبودار لکڑیاں، لوہا، جواہرات، سونا اور موتی وغیرہ شامل ہوتا تھا۔ یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں کہاں سے آتی تھیں۔ کیا یہ خود عرب کی پیداواریں تھیں یا یہ سب باہر سے لایا جاتا تھا۔ اس کا جواب بھی یونانیوں نے یہ دیا ہے کہ اکثر خوشبودار چیزیں خود یمن میں کاشت کی جاتی تھیں۔ ان کے باغ موجود تھے۔

ایک یونانی مؤرخ نے لکھا ہے۔

''سمندر سے متصل زمین میں بلسان اور نہایت خوبصورت درخت ہیں۔ اندرونِ ملک میں بخورات یعنی جلانے کی خوشبوئیں، دارچینی، چھوہارے وغیرہ کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں..... سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بہ کثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے۔''

موتی تو خاص سواحلِ عرب کی چیز ہے۔ بحرین وعمان کے دریاؤں میں موتی کے خزانے تھے قرآن مجید اس کا گواہ ہے۔ سورۃ رحمٰن میں ہے۔

''خدا نے ان دو دریاؤں کو ملایا کہ وہ مل گئے اور پھر ان کے بیچ میں پردہ ہے کہ وہ حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کا انکار کرو گے۔ ان دونوں سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔'' (رحمٰن)

عرب کے جس سونے کی یروشلم اور اسکندریہ کے بازاروں میں شہرت تھی، وہ خاص عرب کی کانوں سے نکلتا تھا۔ ایک مؤرخ نے ایک ایک کان کا نام لکھا ہے۔ صرف یمامہ اور نجد میں سونے کی چھ کانوں کا پتا دیا ہے۔ سونے کے علاوہ چاندی، تانبا اور عقیق کی کانیں بھی بتائی ہیں۔

عرب کی کھالیں بھی سامانِ تجارت میں نظر آتی ہیں۔ یمن کی کھالیں بہت مشہور تھیں۔ مسلمانوں نے مکہ سے بھاگ کر جب حبش میں پناہ لی تھی اور قریش نے ایک شخص کو تحفہ دے کر نجاشی کے پاس بھیجا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دے، اس وقت بھی قریش کا شاہانہ تحفہ یہی کھال تھی۔

عرب تاجر یہ چیزیں ملک سے باہر لے جا کر فروخت کرتے تھے اور اس کے بدلے کپڑا، غلہ، شراب، ہتھیار اور آئینہ وغیرہ آرائش کی چیزیں لاتے تھے۔

☆☆☆

اب ہم بہ آسانی قوم سبا کی حکمرانی کے اس دور تک پہنچ سکتے ہیں جب ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئی۔ یہ اس قوم کا زمانۂ عروج تھا۔ یہی وہ وقت ہے جب دربار سلیمان علیہ السلام پوری آب وتاب کے ساتھ منعقد تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جائزہ لیا تو ہدہد کو اپنی جگہ پر غیر حاضر پایا۔

''میں ہدہد کو موجود نہیں پاتا۔'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''اگر وہ واقعی غیر حاضر ہے تو اس کی بے وجہ غیر حاضری سخت قابلِ سزا ہے۔ اس لیے میں اس کو یا تو سخت عذاب دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا ورنہ وہ اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائے۔''

ابھی کچھ زیادہ وقفہ نہیں گزرا تھا کہ ہدہد حاضر ہو گیا اور اپنی غیر حاضری کی وجہ بھی بتا دی۔

''میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں۔ وہ یہ کہ یمن کے علاقے میں سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے۔ خدا نے اسے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اس کا تخت سلطنت اپنی خاص خوبیوں کی وجہ سے عظیم الشان ہے مگر وہ آفتاب پرست ہے۔ اس کی قوم بھی گمراہ ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس ہدہد کے ذریعے اس کے پاس بذریعہ خط پیغام بھیجا۔

''تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ تم میرے پاس خدا کی فرماں بردار بن کر آؤ۔''

ملکہ اور اس کے درباریوں نے جب یہ مکتوب پڑھا تو پہلے تو یہی سمجھا کہ قاہر بادشاہوں کی طرح سلیمان علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ میں اس کی فرماں برداری کروں اور اس کے ماتحت ہو جاؤں۔ وہ اس کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکی کہ خط میں مسلمین کا لفظ ہے یعنی مسلم ہو کر آؤ۔

درباریوں نے مشورہ دیا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی زبردست جنگی طاقت رکھتے ہیں۔ ویسے آپ جو حکم کریں۔

ملکہ سمجھ دار تھی، اس نے حکم جاری کیا۔

''ہمیں سلیمانؑ کے بارے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم پہلے اس کی طاقت وقوت کا اندازہ کر لیں۔'' اس قوت کا اندازہ کرنے کے لیے اس نے کچھ تحائف دے کر اپنا ایک قاصد حضرت سلیمانؑ کے دربار میں بھیجا۔ جب یہ قاصد حضرت

سلیمانؑ کے دربار میں پہنچا اور تحائف نذر کیے تو آپؑ نے فرمایا۔

''تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا غلط مفہوم اخذ کیا۔ کیا میں نے ان معمولی ہدیہ کے لیے خط لکھا تھا۔ اپنی ملکہ سے کہنا اگر تم نے میرے پیغام کی تکمیل نہ کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ پہنچوں گا کہ سبا والے میرے مقابلے سے عاجز رہیں گے۔''

جب قاصد کی زبانی یہ پیغام ملکہ تک پہنچا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کی حکمرانی صرف انسانوں پر نہیں، جنات تک اس کی رعایا میں ہیں تو وہ کانپ اٹھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ مقابلہ بے کار ہے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اس کی ماتحتی قبول کرلوں لہٰذا اس نے سفر شروع کر دیا۔

حضرت سلیمانؑ کو بذریعہ ''وحی'' معلوم ہو چکا تھا کہ ملکۂ سبا حاضرِ خدمت ہو رہی ہے۔ اب آپ کو اسے حیران کرنے کے لیے ایک اور ترکیب سوجھی۔ آپؑ نے فرمایا۔

''تم میں سے کوئی ہے جو اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت اٹھا کر یہاں لے آئے۔'' حضرت سلیمانؑ کے ایک وزیر نے کہا (جو یقیناً جن ہوگا) میں پلک جھپکتے اسے آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں۔ حضرت سلیمانؑ نے رخ پھیر کر دیکھا تو تخت کو موجود پایا۔

کچھ عرصے بعد ملکۂ سبا حاضرِ خدمت ہوگئی۔

''کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟'' آپ نے تخت دکھا کر دریافت کیا۔

''ہاں، یہ میرا ہی تخت ہے۔ اس معجزے سے پہلے ہی میں آپ کی طاقت کی قائل ہو چکی ہوں۔ اس لیے میں مطیع اور فرماں بردار ہو کر حاضر ہوئی ہوں۔'' ساتھ ہی اس نے کہا۔ ''پروردگار! آج تک اللہ کے سوا غیر کی پرستش کر کے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا مگر اب سلیمانؑ کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدا پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا مالک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین اختیار کرلیا۔

صرف قرآن ہی میں نہیں توریت میں بھی ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر موجود ہے۔

''اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اسے آزمانے آئی اور بڑے جلو کے ساتھ، اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیں لدی ہوئی تھیں اور بہت سونا اور انمول جواہرات ساتھ لے کر یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان کے پاس آ کے جو کچھ اس کے دل میں تھا، سب کی بابت اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اس کے سب سوالوں کے جواب دیے۔ بادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی جو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا اور جبکہ سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری دانش مندی کا حال اور اس گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں کو اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی خاطر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو کہ جس سے وہ خداوند کے مسکن کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے حواس نہ رہے۔ اس نے بادشاہ سے کہا یہ تحقیق خبر تھی جو میں نے تیری کرامتوں اور تیری دانش کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ نیک بخت ہیں تیرے لوگ اور نیک بخت ہیں تیرے خواص جو تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا اس لیے کہ خداوند نے اسرائیلیوں کو سدا پیار کیا۔''

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین قبول کرلینے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا سے نکاح کرلیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دے دی۔ گاہے بگاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے لیکن قرآن واحادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ پس ثابت ہوتا ہے یہ خیالات اسرائیلیات اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس کی خوب وضاحت کردی ہے۔

''اس سلسلے میں ابن عباسؓ سے ایک عجیب روایت منقول ہے جس کو ابن السائب کی سند سے ابوبکر بن ابی شیبہ نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ کیسا دل خوش کن واقعہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ابن شیبہ کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا بلکہ یہ روایت قابلِ انکار ہے اور بے شبہ اس کے بیان کرنے میں عطا بن سائب کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ اس روایت کو ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اس قسم کا طرزِ روایت دراصل اہلِ کتاب کے صحیفوں سے ماخوذ ہے اور واقعے کی یہ تفصیلات اسی طرح کی ہیں جیسا کہ کعب احبار اور وہب بن منبہ بنی اسرائیل کے قصے ان کتابوں سے نقل کر کے اس امت کو سنایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے کہ وہ ان قصوں میں عجیب وغریب اور قابلِ انکار باتیں اور

واقعی وغیر واقعی اور تحریف شدہ مسخ شدہ ہر قسم کے واقعات نقل کر دیا کرتے تھے حالانکہ اللہ سبحانہ نے ان فضول اور لغو باتوں سے قطعی بے پروا کر دیا ہے اور ہم کو ایسا علم (قرآن) عطا کیا ہے جو واقعات کی صحت، نیک مقصد کی افادیت، مطالب کی وضاحت اور کلام کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت برتر اور بلند ہے۔''

اسرائیلی روایات سے مراد کیا ہے؟ اسرائیلی روایات کا مدار بیشتر توریت پر ہے۔ عبرانی زبان میں توریت کے معنی شریعت کے ہیں۔ توریت کے علاوہ دوسرا سلسلہ ''تلمود'' ہے۔ یہ عبرانی قاعدہ لغت کے اعتبار سے ''نبی'' کی جمع ہے۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواعظ، بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ تیسرا حصہ ترکوم ہے۔ عربی زبان میں ترجمے کو کہتے ہیں۔ یہودی علماء نے توریت اور ''تلمود'' کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر انبیاء علیہ السلام سے سنی ہے۔ چوتھا حصہ ''مدراش'' ہے۔ اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے۔ پانچواں حصہ ''تالمود'' ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض قصص و حکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آتے ہیں۔

یہود کے سلسلۂ روایات کی یہ تمام اقسام وہ ہیں جو اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور ان میں سے بعض روایات ان علمائے یہود کے ذریعے جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئیں۔

انہی اسرائیلیات میں یہ قصہ بھی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا سے نکاح کر لیا تھا۔ قرآن اس کی تائید نہیں کرتا۔

☆☆☆

سبا کے تین جغرافی مرکز یا آبادیاں تھیں۔ یمن، حبشہ اور شمالی عرب۔ یمن میں سبا کا وجود و قیام تو محتاج اثبات نہیں۔ روایات عرب، تاریخ اقوام، آثارِ قدیمہ ان سب کی شہادتِ قاطعہ موجود ہے، دیگر اطراف ملک میں بھی ان کا وجود مخفی نہیں۔ شمالی عرب میں بطرفِ شام و عراق توریت کے متعدد فقروں میں ان کا وجود عارضی نہایت قدیم زمانے سے مذکور ہے۔ یونانی مؤرخین نے بھی ان اطراف میں ان کا ہونا بیان کیا ہے۔

حبشہ میں اہل سبا کا وجود عہدِ قدیم سے تھا۔ حبشہ یمن کے بالمقابل سواحل پر واقع ہے۔ یہ سواحل تاریخ کی ابتدا سے اس وقت یمنی و حضر موتی عرب کے جولاں گاہ ہیں۔ بعض کتبات سے معلوم ہوا ہے کہ سبا کا ایک گورنر ''معافر'' کے لقب سے مشہور تھا حبشہ میں رہتا تھا۔ خود حبش بھی خود کو سبا کی اولاد کہتے ہیں۔ اہل حبش ملکۂ سبا کو حبشہ کا بتاتے ہیں اور اب تک حبشہ کا شاہی خاندان فخریہ خود کو ملکۂ سبا کی اولاد یقین کرتا ہے۔ اس کا نام ان کی زبان میں ماکدہ تھا۔ یمن کے عرب یہود میں اس کا نام بلقیس مشہور تھا اور اسرائیلیات کے ذریعے یہی نام مسلمان مؤرخین اور اہلِ تفسیر میں مقبول ہے لیکن لفظی دلالت کے اعتبار سے یہ عربی نہیں بلکہ یونانی الاصل نام معلوم ہوتا ہے۔

سبا کی یہ دولت مندی، عیش و عشرت اس وقت تک تھی اور قائم رہی جب تک وہ اللہ کی وحدانیت پر قائم رہے اور ملکہ کے اثر سے آفتاب پرستی سے دور رہے۔ آفتاب پرستی کے باوجود وہ دولت میں کھیلتے رہے تھے لیکن ملکہ نہ رہی۔ ایک مدت گزر گئی تو وہ اپنے پرانے دین کی طرف پلٹ گئے۔ اب گویا وہ اللہ کے مجرم بن گئے۔ اسرائیلی پیغمبر آتے رہے لیکن انہوں نے سب کو جھٹلا دیا۔ اب انہیں اپنے جرم کی سزا ملنی تھی۔

''انہوں نے سرتابی کی تو ہم نے ان پر بند توڑ کر سیلاب بھیجا اور ان کے دونوں باغوں کے بجائے بدمزہ پھلوں اور کچھ بیری کے جھاڑ پیدا کر دیے۔ یہ ان کی ناشکری کی جزا تھی اور ہم تو صرف ناشکر گزاروں کو ہی سزا دیتے ہیں۔'' (قرآن عزیز، سورۂ سبا)

پھر ایک وقت وہ آیا کہ ان کے شیرازے بکھر گئے۔ حبش پر اکسومی خاندان اصحاب فیل قبضہ کر بیٹھا۔ شمالی عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے خروج کیا۔ یمن میں حمیر نے ظہور کیا اور بقیہ تمام قبائل ملک میں تتر بتر ہو گئے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب یمن سے ہونے والی تجارت بری سے بحری راستے کی طرف منتقل ہو گئی اور تمام مال کشتیوں کے ذریعے بحرِ احمر کی راہ مصر و شام کے سواحل پر اترنے لگا۔ یمن سے شام تک دھول اڑنے لگی۔ یہ بھی گویا عذاب الٰہی کی دوسری شکل تھی جس نے سبا کو مفلس بنا دیا۔

بحری تجارتوں نے سبا کو مٹا کر حمیر کا ستارہ چمکا دیا۔ یمن کی حکومت مشرق سے منتقل ہو کر مغرب کو چلی آئی۔ حمیر جو مغربی قبیلہ تھا اس نے مزید قوت حاصل کر لی۔ ناچار مشرقی قبائل رزق و معاش کی تلاش میں کچھ مدینہ کو اٹھ آئے، کچھ یمامہ، بحرین، حجاز، عراق اور شام کو چلے گئے۔ حمیر بھی سبا ہی تھے کوئی اور نہیں۔ صرف موقع حکومت کا فرق ہے۔ انہیں سبائے حمیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ عرب مؤرخین لکھتے ہیں۔

''فرزندانِ قحطان میں جو پہلا بادشاہ ہوا، وہ حمیر ابن سبا ہے۔''

حمیر سبا سے کوئی الگ شے نہیں، صرف خاندان اور موقع حکومت کا فرق ہے۔ زبان، مذہب اور طریق تمدن تمام چیزیں ایک ہیں۔

سبا کی تباہی وتفریق کے بعد حمیر نے مارب تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔ ایک مدت کے بعد ان کے القاب میں شاہ حضرموت کا بھی اضافہ ہوجاتا ہے پھر تمام یمن، نجد ..... کی بادشاہی، القاب میں نظر آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ ان کی حکومت کا رقبہ وسیع ہوتا گیا۔

☆☆☆

یمن کے مقابل افریقی سواحل پر قدیم زمانے سے سبا کی تجارتی آبادیاں تھیں۔ ان آبادیوں کی بدولت یمن کی طرح تمدن کی روشنی پھیلنی شروع ہوگئی تھی۔ جب سبائے حمیر یمن میں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو سبا کی افریقی نوآبادیوں میں خودسری کا خیال آیا۔ باہم معرکہ آرائیاں ہوتیں۔ یہ غالب ہوتے تو اپنے آپ کو بادشاہِ یمن لکھتے اگر وہ غالب ہوتے تو اپنے آپ کو فاتح حبش کہتے۔

بہرحال ان سبائی عربوں نے اصلی افریقی قبائل کے اختلاط وامتزاج سے جو نئی قومیت پیدا کی، ان ہی کا نام عربی میں حبش پڑ گیا۔

حبش کے سبائی الاصل ہونے پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حبشی زبان میں ''سبا'' کے معنی انسان کے ہیں جس طرح آدم کے بیٹے آدمی اور انسان کو ایک سمجھتے ہیں۔ حبش کے ایک ابتدائی بادشاہ کا نام ذوشکال تھا جو بالکل یمنی طرز کا نام ہے۔

ان مخلوط سبائی عربوں کا پایہ تخت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ ..... میں بہ طرف مشرق واقع تھا اور یہاں اب تک اس کے کھنڈر باقی ہیں۔ اہلِ حبش اس کو نہایت مقدس شہر سمجھتے ہیں۔

تقریباً اسی زمانے میں جبکہ سبائے حمیر نے ریدان میں اپنی مستقل حکومت قائم کی۔ سبائے حبش نے اکسوم میں ایک خاندانِ شاہی کی بنیاد ڈالی۔

یہ خاندان اولاً اہلِ یمن کی طرح بت پرست تھا۔ شاہانِ روم کے تعلقات نے مصر کے ذریعے سے یہاں عیسائیت کو فروغ دیا۔

حبش ویمن کے درمیان معرکہ آرائیاں نئی بات نہیں تھیں۔ صلح کی کوششیں بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن تعصب کی آگ سرد نہ ہوتی تھی۔ رومی سوداگر یمن کے سواحل تک پہنچتے تھے لیکن جہاں جہاں گزرتے تھے، اسباب سوداگری کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائی راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دورہ کرتے تھے۔ نجران یمن میں عیسائیت کا مرکز قرار پا گیا تھا۔ حمیری یہودی اس کو دیکھتے تھے اور وفورِ جوش سے بپھرتے تھے۔ انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ چنگاری شعلہ بن گئی۔ نجران میں ایک راہب کا مقام تھا۔ وہ آنے جانے والوں کو مذہبی تعلیم کا کوئی نہ کوئی سبق دیا کرتا تھا۔ جب یہ بات پھیلی تو لوگوں میں غم وغصہ پھیلا۔ شاہِ یمن ذونواس کو خبر ہوئی تو آگ بگولا بن کر نجران پہنچا۔ لوگ قلعہ بند ہوگئے۔ شہر کا محاصرہ کرلیا۔ جب شہر فتح ہوا تو گڑھوں میں آگ دہکائی۔ ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا جس نے یہودیت سے انکار کیا اس کو آگ سے بھرے گڑھوں کے سپرد کردیا۔

اطراف کے تمام عیسائی اس حادثہ عظیم کو سن کر غصے کی آگ میں جلنے لگے۔ یمن کے ایک عیسائی نے امیر نجاشی کے یہاں فریاد کی۔ نجاشی نے قیصر روم کے اشارے سے یمن پر فوج کشی کردی۔ ذونواس کو شکست ہوئی۔ ذونواس نے بھاگ کر گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا لیکن ساحل تک سلامت نہ پہنچا۔

اہلِ حبش اب تنہا یمن کے مالک بن گئے۔

یمن کے فاتح اور پہلے حبشی گورنر کا نام عربوں میں ارباط مشہور ہے۔ بقول عرب ارباط نے یمن پر بیس برس حکمرانی کی۔ اس اثناء میں فوج نے بغاوت کی۔ ابرہہ ایک حبشی سردار اس باغی جماعت کا سرِعسکر بن گیا۔ ارباط اس فتنے میں مارا گیا اور ابرہہ تنہا یمن کا بادشاہ بن بیٹھا۔

ابرہہ کے بارے میں ایک عیسائی مصنف لکھتا تھا۔

ابرہہ ایک رومی غلام تھا۔ شاہِ حبش کے خلاف جس فوج نے بغاوت کی تھی، اس کا سردار بن گیا۔ اس کے مقابل جو فوج بھیجی گئی اس کو شکست دی۔ بادشاہ کی طرف سے جو یمن کا نائب تھا، اس کو قید کرلیا۔ اس اثناء میں بادشاہ مرگیا۔ اس کے جانشین اور نائب نے ابرہہ سے صلح کرلی اور اپنی طرف سے یمن کا نائب بنایا۔

عیسائی مصنف کہتا ہے ابرہہ ایک رومی غلام تھا جبکہ عرب اس کو حبش کے شاہی خاندان سے سمجھتے ہیں اور چونکہ نک کٹا تھا اس لیے ''اشرم'' کہلاتا تھا۔ غرضیکہ ارباط اس فتنے میں مارا گیا اور ابرہہ تنہا یمن کا بادشاہ بن بیٹھا۔

ابرہہ کے زمانے کا سب سے بڑا عظیم الشان واقعہ مکہ پر فوج کشی ہے۔ اس مہم میں چونکہ حبشی، ہاتھی لے کر آئے تھے اس لیے عرب اس مہم کو واقعۃ الفیل اور اس سال کو عام الفیل کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ولادتِ مبارک اسی سال اس واقعے کے چالیس روز بعد ہوئی تھی۔

عرب مؤرخین کی روایت کے مطابق اس مہم کا مقصد صرف تخریب کعبہ تھی۔ یورپین مصنفین کہتے ہیں یہ واقعہ ضمنی پیدا ہوگیا ہوگا ورنہ اصل غرض روم و فارس کی باہمی جنگ میں صحرائے حجاز کو عبور کر کے باہم مذہب رومیوں کی اعانت تھی۔

یورپین کی یہ رائے درست نہیں کیونکہ وہ یمن کے علاوہ تہامہ کا بھی جہاں کعبہ واقع ہے، خود کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ ابرہہ نے عیسایت کے لیے کئی کام کیے تھے۔ صنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کیا تھا اور اس کا نام کعبہ رکھا تھا۔ غرض یہ تھی کہ لوگ اصلی کعبہ چھوڑ کر ادھر جھکیں۔ عربوں میں کعبہ کی چونکہ بڑی عظمت تھی اور عرب کے ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگ اس کی برابر عزت کرتے تھے کیونکہ کعبہ میں .... مریم اور مسیح کی تصویریں اور قبائل کے بت تھے۔ ایک عرب نے رات کو چھپ کر ابرہہ کے بنائے ہوئے کلیسا کو جس کا نام اس نے کعبہ رکھا تھا نجس کر دیا۔

ابرہہ اپنے مقدس معبد کی بے حرمتی دیکھ کر غصے سے بے تاب ہوگیا۔ فوج جرار اور چند ہاتھی لے کر کعبہ ابراہیم کو ڈھانے کے لیے نکلا۔ راہ میں عرب کے متعدد قبائل بڑھ بڑھ کر ابرہہ پر حملہ آور ہوئے لیکن ہزیمت اٹھا کر پسپا ہوگئے۔ جب یہ ہاتھیوں کا غول اور آدمیوں کا جنگل وادیِ مکہ کے قریب پہنچا تو دفعتاً کسی سمت سے پرندے (ابابیل) نمودار ہوئے۔ ان کے منہ اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر گریں، اس کا بدن پھوڑ کر نکل آتیں۔ اعضا سڑنے گلنے لگے۔ ہاتھی چنگھاڑ مار مار کر پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ ہی دیر میں تمام لشکر زیر و زبر تھا۔

مؤرخین یورپ نے اس معجزے کو جھٹلانے کے لیے اسے کسی بیماری سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا عرب میں چیچک کی بیماری اسی سال پیدا ہوئی۔

''ابرہہ فوج لے کر نکلا۔ راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوئی۔''

یہ ایک غیر اسلامی روایت ہے جبکہ قرآن مجید کہتا ہے۔

''تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا اس نے ان کی مخفی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا۔ اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔ وہ پرندے پتھر مارتے تھے پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا۔''

☆☆☆

بعض غیر ملکی اور بعض ملکی مفسرین نے اس واقعے کی تردید بھی کی ہے اور ان آیات کی غلط تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور لفظوں کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی ہے جبکہ اس واقعے کا ثبوت یہی ہے کہ یہ سورۃ اس واقعے کے تقریباً پچاس برس بعد نازل ہوئی۔ اس وقت بہت سے اشخاص حملہ حبش کے چشم دید گواہ موجود ہوں گے۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس واقعے کو سنا ہوگا۔ تاہم کسی نے اس وحیِ الٰہی کی تکذیب نہیں کی۔

روایاتِ عرب اور عرب مؤرخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ جب نبی اکرمؐ کی زندگی مبارک میں سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ کی ذاتِ مبارک سے ان کو تھی، کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعے کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں بلکہ دوسری ہے۔

ہجرت کے بعد جب آپؐ کی خدمتِ اقدس میں نجران کا وفد آیا تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمدؐ اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دے سکتا تھا، وہ سب اس نے پیش کیے لیکن اس واقعے کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام اعتراضات تاریخ میں محفوظ ہوتے۔ لہٰذا تعصب سے پاک نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح عرب روایات اور مؤرخین عرب کے یہاں محفوظ ہے، وہ قطعاً صحیح ہے پھر یورپی مؤرخین یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا۔ راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوگئی۔ لطف یہ ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی تاریخی دلیل ہے نہ معاصرانہ شہادت۔

یہ واضح رہے کہ اہلِ حبش قومِ سبا ہی کی ایک شاخ سے تھے۔

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ ارض القرآن، علامہ سید سلیمان ندوی

وہ اپنی بیوی کی موت کے بعد پہلی بار یہاں آیا تھا۔ بار میں معمول کے مطابق گہما گہمی تھی۔ وہاں چھ عدد فلیٹ اسکرین لگے ہوئے تھے جن پر کوئی گیم چل رہا تھا۔ جب مقامی ٹیم اچھا کھیل دکھاتی تو وہاں موجود لوگ تالیاں بجا کر داد دیتے۔ وہ سب زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی باتوں کے شور میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

وہ ایک بار اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف موسیقی کا شور اور قہقہوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

یہاں آنے کے بعد اس کے ذہن سے میری کی یادیں مدھم ہوگئی تھیں جن سے وہ کوشش کے باوجود پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ میری کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے ایک فلم کی طرح اس کے دماغ کی اسکرین پر چلتے رہتے۔ اس نے میری کی تمام تصویریں ہٹا دی تھیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انہیں بار بار دیکھ سکے۔ اس کے کانوں میں اکثر وکیل کا کہا ہوا جملہ گونجتا رہتا۔ ''اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔''

نہیں، وہ میری اور وکیل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے گا، اسی لیے وہ بار میں آیا تھا تاکہ اس کا دھیان بٹ سکے۔ اس نے سینڈوچ کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بیئر کا بڑا گھونٹ لیا۔ وہ صبح سے بھوکا تھا اور اس نے ایک بسکٹ کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے دفتر سے بار بار فون آرہا تھا

جب معاشروں میں ناانصافی اور دلوں میں بے سکونی رائج ہو جائے تو انسان اس سے نجات کے راستے ضرور تلاش کرتا ہے... وہ بھی ایسی ہی بے کلی کا شکار تھا مگر پھر اچانک اسے اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آگئی لیکن... یہ نہیں جانتا تھا کہ اس روشنی کا اصل منبع تو اس کے بہت قریب تھا یہ اور بات کہ وہ اندھیروں میں گم رہنا چاہتا تھا...

انتقامی کارروائیوں کا کاروبار کرنے والی ایک دلکش دوشیزہ کا عزم

کاروبار

شاذیہ رضوان

لیکن اس نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ اس نے کئی دن صوفے پر ہی گزار دیے اور وہاں سے کہیں نہیں گیا۔ گھر کی لائٹس بھی بند تھیں۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور نہ ہی شاور لیا۔ سوتے میں اس کی آنکھ بار بار کھل جاتی اور وہ خواب میں بھی میری کو ہی دیکھتا رہتا۔

اس کی مہربان کرایہ دار بھی جو اس کے گھر کے پیچھے ایک چھوٹے سے کاٹیج میں رہتی تھی، کئی بار اس کی خیریت پوچھنے کے لیے دروازے پر آئی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا اور نوعمری کے زمانے سے ہی اس کا مداح تھا لیکن وہ اس سے بھی بات نہ کرسکا۔

پھر چار یا پانچ دن بعد ایمی اس کے دروازے پر آئی اور بولی۔ ''تمہیں باہر آنا چاہیے، ہینک۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے یہ ایک مشکل وقت ہے لیکن اس طرح تم اپنے آپ کو قیدی بنا رہے ہو۔''

ایمی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ اسکول ٹیچر رہ چکی تھی اور ہمیشہ عقل کی بات کرتی تھی۔ اسے واقعی گھر سے باہر نکلنا چاہیے اور اس لیے وہ اس وقت بار میں نظر آرہا تھا۔

سینڈوچ ختم کرنے کے بعد وہ ڈرنک کرنے لگا۔ عام طور پر وہ اس معاملے میں اعتدال سے کام لیتا تھا لیکن یہ عام وقت نہیں تھا۔ اس نے ٹی وی پر دکھائے جانے والے گیم میں دلچسپی لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے برابر میں ایک سنہرے بالوں والی لڑکی آکر بیٹھ گئی اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے اپنے لیے مشروب کا آرڈر دیا۔ وہ دیکھنے میں میری کی طرح لگ رہی تھی، البتہ میری کے بال سرخی مائل بھورے رنگ کے تھے۔ وہ اپنا مشروب اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

ایک لمحے کے لیے ان کی نظریں ملیں لیکن ہینک نے فوراً ہی اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ اس وقت وہ فلرٹ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا حالانکہ وہ لڑکی خاصی پُرکشش تھی۔ ہینک نے اپنی توجہ گلاس پر مبذول کرلی اور اس کا منہ بن گیا۔ اس کی بے رخی کو محسوس کرتے ہوئے لڑکی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ اچانک ہی اٹھ کر چل دی۔

وہ اسٹول پر بیٹھا مشروب کا دوسرا گلاس پی رہا تھا لیکن اس کے جذبات سرد ہوچکے تھے اور وہ اپنے آپ کو ڈسٹ بن میں پڑی ہوئی خالی بوتل کی طرح محسوس کررہا تھا۔ اس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا لیکن وہ ابھی تک کسی سے بات نہیں کرسکا تھا۔ وہ چکنے فرش پر رقص کررہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے روشن چمکتے ہوئے چہروں کو دیکھنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بادل گرج رہے تھے اور وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ موسم کے تیور دیکھ کر اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ تب ہی کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ اس کا اسکول کلاس فیلو اور پرانا دوست بروس اوپسن تھا۔ اس کی عمر بھی ہینک جتنی یعنی 35 برس تھی۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' اس نے بار میں ہونے والے شور کی وجہ سے چلاتے ہوئے کہا۔

''اب کافی بہتر ہوں۔'' ہینک نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار پھر بجلی کڑکنے کی آواز سنی اور سوچنے لگا کہ طوفان آنے سے پہلے اسے چلے جانا چاہیے۔

''تمہاری بیوی کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔'' بروس نے کہا۔

پچھلے چند برسوں کے دوران وہ بہت کم رابطے میں رہے تھے۔ ہینک جانتا تھا کہ بروس کو بھی کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اب وہ سینٹ پیٹرزبرگ میں رہ رہا تھا۔ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ شراب کا عادی ہونے کے باوجود وہ ایک کامیاب سیلز مین تھا لیکن اب وہ ایک بار پھر غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

ہینک نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کا غم ایک ہی ہے۔ میرا وکیل بھی یہی کہتا ہے کہ اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

بروس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم اب بھی بہت کچھ کرسکتے ہو۔''

''میری بیوی قبر میں ہے۔'' ہینک نے رکھائی سے کہا۔ ''اور اب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔''

بروس پر اس کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ ایک مسکراہٹ آگئی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ جس شخص نے میرے بیوی بچوں کو مجھ سے جدا کیا، وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔''

''کیا؟'' ہینک نے پوچھا۔

''مجھے ایک اور ڈرنک کی طلب ہورہی ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

''نہیں، مجھے مزید خواہش نہیں ہے۔'' ہینک نے کہا، لیکن بروس اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکا اور بن بلائے مہمان کی طرح اس کے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ہینک کو ڈر تھا کہ وہ نشے میں دھت ہوکر سڑک پر دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے ٹیکسی پر گھر

جانے کا مشورہ دے گا۔

''تم جانتے ہو کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟'' بروس نے بارٹینڈر کو ایک اور ڈرنک کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ہی بیوی سے محروم ہوگئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہاری بیوی مرگئی اور میری ابھی زندہ ہے، لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

''ہاں! میں جانتا ہوں، مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔'' ہینک نے کہا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کتنا بے وقوف ہے کہ اس نے میری کی موت اور اپنی بیوی کی طلاق کو ایک ہی پلڑے میں رکھ دیا۔

بروس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے زیادہ برا کیا ہوگا کہ میری بیوی نے اس بدمعاش کی خاطر مجھے چھوڑ دیا اور میرے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔''

وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر فریاد کررہا تھا۔ ہینک کسی حد تک اس کا دکھ سمجھ سکتا تھا۔ جس شخص نے بروس کی بیوی کو ورغلایا وہ بااثر اور پیسے والا تھا، بالکل اسی خبیث کی طرح جس کی گاڑی کی ٹکر سے میری ہلاک ہوئی تھی۔

''یہ واقعی بہت افسوسناک ہے۔'' ہینک نے کہا۔ اب وہ اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

''لیکن آج رات میں جشن منا رہا ہوں۔'' بروس نے کہا۔ ''وہ بدمعاش آج مرگیا جس نے میری بیوی اور بچوں کو مجھ سے چھینا تھا۔ اسے کالف کلب میں دل کا دورہ پڑا اور اب وہ جہنم میں ہے۔'' بروس نے اپنا گلاس سر سے اوپر اٹھایا جیسے اوپر والے کو خراجِ تحسین پیش کررہا ہو۔

''جشن؟'' بروس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ بارٹینڈر نے اس کے خالی گلاس کی طرف اشارہ کیا لیکن اس نے منع کردیا۔ اب وہ گھر جانا چاہ رہا تھا۔

''تو تمہارا بندہ کون ہے؟''

''میرا بندہ؟''

''ارے وہی جس نے میری کو گاڑی کی ٹکر مار کر ہلاک کیا؟''

''جیسن سویگ۔''

آسمان پر ایک بار پھر بجلی کی کڑک سنائی دی۔ ''ممکن ہے کہ تمہارا جیسن بھی کسی مشکل میں آجائے۔'' بروس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً اچانک آسمانی بجلی گرے۔''

ہینک نے اسٹول سے اٹھتے ہوئے مغموم صورت بنائی اور بولا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' بروس کی احمقانہ باتیں سننے سے بارش میں بھیگنا زیادہ بہتر تھا۔

''کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گے کہ کیسے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''کہ یہ بجلی کس طرح گرتی ہے؟''

بروس نے بتانا شروع کیا کہ اس کی سابقہ بیوی کے نئے شوہر کے ساتھ کیا ہوا لیکن اچانک ہی رک کر ارد گرد کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے اصرار کیا کہ باہر چل کر بات کی جائے کیونکہ یہاں کوئی سن سکتا ہے۔

باہر تیز بارش شروع ہوچکی تھی۔ وہ دونوں ہینک کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہینک نے کہا۔ ''تم نے اسے قتل کرنے کے لیے کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کیں جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟''

''وہ اپنے کام میں ماہر ہے۔ مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ اس نے یہ کیسے کیا لیکن وہ تمہاری طرف سے انتقام لیتا ہے۔ اگر کوئی تمہاری زندگی تباہ کرتا ہے اور تم اس سے نہیں لڑ سکتے تو وہ تمہارا بدلہ لے سکتا ہے۔''

''واؤ۔'' ہینک نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ اعتراف تمہیں.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا تم جیسن سویگ سے بدلہ لینا نہیں چاہو گے؟'' بروس نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ وہ کتنا دولت مند اور بااثر شخص ہے۔'' ہینک نے کہا۔ اسے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ بروس اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جس نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی، جبکہ ہینک کو مختلف لوگوں اور انٹرنیٹ سے معلومات حاصل کرنے کے بعد سویگ کے بارے میں بہت کچھ آگاہی ہوچکی تھی۔ اس کے باپ کا بہت بڑا پراپرٹی کا کاروبار تھا لیکن وہ وہاں کام کرنے کے بجائے اپنا سارا وقت آوارہ گردی میں گزارتا۔ شراب پی کر رات بھر بدمستی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس روز بھی وہ نشے کی حالت میں بے شور بلیوارڈ سے گزر رہا تھا کہ اس کی کار کی ٹکر سے میری ہلاک ہوگئی۔

''وہ جو کوئی بھی ہے لیکن یہ تمہیں انصاف نہیں چاہیے؟''

جب مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو سویگ مجرموں کے کٹہرے میں بہت پُراعتماد نظر آرہا تھا۔

''میرے وکیل نے کہا تھا.....''

''اسے بھول جاؤ کہ تمہارے وکیل نے کیا کہا تھا؟'' بروس بولا۔ ''کیا تمہیں انصاف نہیں چاہیے؟''

''دو عینی شاہدوں نے یہ حادثہ ہوتے دیکھا تھا۔ فٹ پاتھ پر جوگنگ کرنے والے ایک نوجوان جوڑے نے پولیس کو بتایا کہ ایک اسپورٹس کار اچانک ہی بلیوارڈ پر آئی اور اس نے میری کی بائیک کو ٹکر ماردی۔ وہ کار ایک لمحے کے لیے رکی۔ جب ڈرائیور کار سے اترا تو وہ ڈگمگا رہا تھا اور اس کی چال بے ربط تھی۔ اس نے عورت کی لاش پر ایک نظر ڈالی اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔''

''کیونکہ وہ دولت مند تھا، اس لیے وہاں سے بھاگ گیا۔'' بروس نے کہا۔

''تیسرا گواہ ایک نوعمر لڑکا ہے جو بے شور کے ساتھ ہی رہتا ہے۔'' ہینک نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ اس کی گواہی سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملی۔''

ہینک کو بتایا گیا کہ کار کے حادثے میں کسی انسان کی موت اس وقت تک قابلِ تعزیر جرم نہیں تاوقتیکہ ڈرائیور مقررہ حدِ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلا رہا ہو، نشے میں ہو یا جائے حادثہ سے فرار ہوگیا ہو۔ گو کہ سویگ نے ان تمام جرائم کا ارتکاب کیا تھا لیکن اس مقدمے کی سماعت کے دوران ہینک پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ ایک اچھا وکیل اپنی مہارت سے حقائق کی پردہ پوشی کرسکتا ہے۔

عدالت میں سچ کی اہمیت نہیں، وہاں دلائل اور ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سویگ اپنی دولت کے بل بوتے پر فلوریڈا کے بہترین وکیل کی خدمات حاصل کرسکتا تھا۔ اس چرب زبان وکیل نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ استغاثہ کو اس کے موکل پر لگائے گئے الزامات واپس لینے چاہئیں۔

ہینک کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب دونوں گواہ اپنے بیان سے منحرف ہوگئے، جیسے ان پر کسی نے جادو کردیا ہو۔ یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ جوڑا جائے وقوعہ سے کافی دور تھا اس لیے وہ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میامی سے درآمد شدہ ایک معروف ڈاکٹر نے تصدیق کی کہ میری کا قاتل نفسیاتی دباؤ کا شکار تھا، اس لیے وہ جائے حادثہ پر خون دیکھ کر گھبرا گیا اور یہی اس کے بھاگنے کی وجہ بنی۔ دوسرے روز ملزم نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردیا۔ اس وقت وہ نشے میں نہیں تھا۔

ان سب سے بڑھ کر سویگ نے اپنے بیان میں حادثے کی جو منظر کشی کی اس کے مطابق اس کی رفتار تیز نہیں تھی۔ جب وہ میری کے پاس سے گزرنے والا تھا تو اچانک وہ کار کے سامنے آگئی، جو وہ کبھی نہیں کرتی۔ ہینک اس کے ساتھ کئی مرتبہ سواری کرچکا تھا، اس لیے اس نے یہی بات عدالت کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔

استغاثہ کو سویگ کے خلاف الزامات واپس لینا پڑے کیونکہ تمام شہادتیں اس کے حق میں تھیں۔ سویگ فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا عدالت سے باہر آیا۔ اس کے ساتھی پالتو کتوں کی طرح اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

ہینک مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ ''تم نے میری بیوی کو مار ڈالا۔'' وہ چلایا، تاہم اسے سویگ پر حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ سویگ کے رشتے داروں اور دوستوں نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

''کیا ہم دیوانی مقدمہ دائر نہیں کرسکتے؟'' ہینک نے بعد میں اپنے وکیل سے پوچھا۔ ''جس طرح مقتولین کے رشتے داروں نے سمپسن کیس میں کیا تھا؟''

وکیل نے نفی میں سر ہلایا اور سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تمہیں سویگ کے اثر رسوخ کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے کاروبار پر توجہ دو۔''

''میرا کاروبار؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ ایک چھوٹی سی مالیاتی مشاورتی فرم کا مالک تھا اور اس سے اس کی بہت اچھی گزر اوقات ہورہی تھی۔

''وہ مقدمہ جیت چکا ہے۔ اگر تم اس کے پیچھے لگے رہے تو وہ تمہارا کاروبار تباہ کردے گا اور تمہارے نصف درجن ملازمین بے روزگار ہوجائیں گے۔''

''کیا؟''

''ہاں، یہی حقیقت ہے۔ اب تم کچھ نہیں کرسکتے۔''

☆☆☆

''تم نے اس کرائے کے قاتل کو کیسے تلاش کیا؟'' ہینک نے بروس سے پوچھا۔

''وہ اپنے آپ کو ریوینج کہتا ہے۔''

''یہ فرانسیسی لفظ ہے اور اس کے معنی انتقام کے ہیں۔'' ہینک نے کہا۔ وہ جب میری کے والدین سے ملنے پیرس گیا تو اس نے تھوڑی بہت فرانسیسی سیکھ لی تھی۔

''اوہ ہاں، انتقام۔ تمہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ کیا تم اس کا انتقام نہیں لوگے؟''

ہینک کی نظروں کے سامنے بیوی کی موت کا منظر گھوم گیا۔ پولیس نے اسے صرف یہ بتایا تھا کہ میری کو حادثہ پیش آیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ ہینک آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا۔ ایمرجنسی روم کے باہر ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی وہ سب سمجھ گیا اور ڈاکٹر کو کچھ کہنے کی

ضرورت نہ رہی۔

وہ ایک اسٹریچر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا پورا جسم چادر میں چھپا ہوا تھا جیسے گہری نیند میں ہو۔ ہینک نے قریب جا کر اس کے چہرے کو دیکھا جو زرد اور بے جان ہو چکا تھا۔

بروس نے خالی گلاس میں پڑی ہوئی برف کو ہلایا تو ہینک کی آنکھوں کے سامنے سے وہ منظر ہٹ گیا۔ ''بہرحال تمہارے سوال کا جواب یہ ہے۔'' بروس نے کہا۔ ''ایک دوست کو میرے ساتھ ہونے والے واقعے کا علم تھا۔ اس نے مجھے ریوینج کے بارے میں بتایا۔ اس پر کمپنی نے غبن کا الزام لگایا اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے مختصر مدت کے لیے سزا سنا دی گئی۔ اس کا کیریئر تباہ ہو گیا۔ وہ کوئی دوسری ملازمت تلاش نہیں کر سکتا تھا جبکہ اصل مجرم اس کا باس تھا، وہ صاف بچ نکلا۔ جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوا؟ اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔''

''کیا وہ کسی کے حوالہ دینے پر کام کرتا ہے؟'' ہینک نے پوچھا۔

''ہاں، یہی اس کا طریقہ کار ہے۔ پہلے وہ یہ اطمینان کرتا ہے کہ تمہارا تعلق پولیس سے تو نہیں، پھر وہ تمہارے ماضی کے بارے میں مکمل چھان بین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ تم اس کا معاوضہ ادا کر سکتے ہو۔''

ہینک نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ کتنا معاوضہ لیتا ہے؟''

''پچیس ہزار ڈالرز پیشگی اور کام ہونے کے بعد مزید پچیس ہزار ڈالرز۔ اس کے علاوہ تمہیں اس کے لیے ایک نئے گاہک کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ جس طرح میرے دوست نے مجھے اس سے متعارف کروایا۔ میں اسے پیشگی معاوضہ دے چکا ہوں۔ اب مجھے اس کے لیے ایک نئے گاہک کا انتظام کرنا ہے جو تم ہو سکتے ہو۔ اس کے بعد میں بقیہ معاوضہ ادا کر دوں گا۔''

ہینک نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس پر کافی سوچ بچار کرنا ہوگا۔'' کسی انسان کی جان لینے کا خیال ہی اس کے لیے ہولناک تھا، لیکن جیسن سوگ انسان نہیں تھا۔

''وہ تمہیں ایک لمبا چوڑا کنٹریکٹ دے گا جس میں کئی قانونی دفعات ہیں۔ تمہیں اس کے ہر صفحے کو غور سے پڑھنا ہوگا۔ اگر میں نے اس معاہدے پر پوری طرح عمل نہیں کیا تو وہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ مجھ پر مقدمہ یا پولیس کو بلائے گا؟'' بروس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اس نے وہ کنٹریکٹ نہیں پڑھا ہوگا۔ اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

''وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟'' ہینک نے پوچھا۔

''مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ تم اس سے صرف فون پر بات کر سکتے ہو۔''

''کیا اس کی آواز ڈراؤنی ہے؟''

''وہ..... ایک منٹ۔ کیا تم تیار ہو؟''

☆☆☆

ہینک کو توقع نہیں تھی کہ یہ اتنا طویل پروسس ہوگا۔ بروس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ہینک نے اس کے بتائے ہوئے پتے پر اپنا سوشل سیکیورٹی نمبر، بینک اکاؤنٹ اور دیگر سرمایہ کاری کی تفصیلات ای میل کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیسن سوگ کے بارے میں تفصیلات اور اس کے جرم کی نوعیت بھی بتا دی۔

ہینک خود مالیاتی مشیر تھا اور اسے اپنے گاہکوں سے حساس معلومات ملتی رہتی تھیں اور یہ اس کی قانونی ذمے داری تھی کہ وہ ان معلومات کی حفاظت کرے لیکن یہاں وہ خود اپنا اہم ڈیٹا ہوا میں اچھال رہا تھا اور اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کون یہ معلومات وصول کر رہا ہے، لیکن بروس کا کہنا تھا کہ اسے کرائے کے قاتل پر بھروسا کرنا چاہیے۔

بروس کے تجربے کو دیکھتے ہوئے ہینک کو بھروسا کرنا ہی پڑا۔ ویسے بھی خبروں سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی سابقہ بیوی کا نیا شوہر کسی اولمپک کے کھلاڑی کی طرح صحت مند تھا اور اسے بھی دل کی تکلیف نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس کی موت پر کسی کو معمولی سا شبہ بھی نہیں ہوا۔

ایک خفیہ کوڈ میں لنک موصول ہوا جبکہ ایک دوسری ای میل میں اس کا پاس ورڈ بھی آ گیا۔ بروس نے اسے بتایا۔ ''لنک موصول ہونے کا مطلب ہے کہ تم تقریباً اس معاہدے میں شامل ہو گئے ہو۔ تمہاری مالی پوزیشن کی جانچ ہو گئی ہے اور وہ جان گیا ہے کہ تم معاوضہ ادا کر سکتے ہو۔ اب تمہیں ایک معاہدے پر دستخط کرنا ہوں گے اس کے بعد یہ دستاویز تمہارے کمپیوٹر سے غائب ہو جائے گی، جیسے کسی نے جادو کر دیا۔ تم اس کا پرنٹ نہیں نکال سکتے اور نہ ہی اسکرین شاٹ لے سکتے ہو۔''

اس سات صفحات پر مشتمل معاہدے کے شروع میں

ایک اہم ہدایت درج تھی۔ ''اس پر دستخط کرنے سے پہلے اس پوری دستاویز کو غور سے پڑھو۔ یہ ایک قانونی معاہدہ ہے اور کسی بھی فریق کی جانب سے اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں عدالتی کارروائی ہوسکتی ہے۔'' اس دستاویز میں بار بار سویگ کا نام آیا تھا اور سب سے آخر میں ریوپنچ کے دستخط تھے۔

''تمہارا کام شروع ہوگیا۔'' بروس نے کہا، جب ہینک نے اسے بتایا کہ اسے معاہدہ مل گیا ہے۔

قانونی دستاویزات سے واقفیت کی بنا پر ہینک نے اس معاہدے کو غور سے پڑھا۔ وہ کسی ماہر وکیل کی لکھی ہوئی تحریر تھی جس میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ اسے کیا خدمت فراہم کی جائے گی اور اس کے عوض اسے کیا کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہینک کو پچیس ہزار ڈالرز ایک غیر ملکی اکاؤنٹ میں جمع کرانے ہوں گے جبکہ بقیہ رقم کام مکمل ہونے کے بعد بھیجنا ہوگی۔

اس کے علاوہ ایک اور عجیب شرط تھی۔ ''کلائنٹ کو آئندہ بھی کسی کام کے لیے طلب کیا جاسکتا ہے اور اسے اس کی تعمیل کرنا ہوگی۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اسے شبہ ہوا کہ شاید اس کی خدمات مالی مشاورت کے لیے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ایک اور عجیب دفعہ یہ تھی کہ اگر ہینک نے بقیہ رقم ادا نہیں کی تو اسے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے جبکہ اس کا بالکل بھی امکان نہیں تھا کہ سویگ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہینک بقیہ رقم کی ادائیگی نہ کرتا۔

جیسے ہی ہینک نے پیشگی رقم ادا کی، اس کے دروازے پر ایک برزفون رکھا ہوا نظر آیا۔ وہ کسی ڈبے میں نہیں بلکہ براؤن کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے اندر کاغذ پر ایک نمبر 800 لکھا ہوا تھا اور فوراً رابطہ کرنے کی ٹائپ شدہ ہدایت درج تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ملایا۔ ''میں ہینک گڈمین بول رہا ہوں۔ کیا میں مسٹر ریوپنچ سے مخاطب ہوں۔''

''ہاں۔ مطلب کی بات کرو۔'' ایک کھردری آواز سنائی دی۔

''تمہارے کہنے پر میں فون کر رہا ہوں۔''

''اس گفتگو کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے، جیسے ہمارے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے سنا ہے کہ تم کسی شخص کو دوسری دنیا میں بھیجنا چاہتے ہو؟''

غیر سنجیدہ رویّے کے باوجود وہ یہ کام کرنے پر آمادہ تھا جو کہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس کا لہجہ امریکی تھا لیکن وہ آواز بدل کر بول رہا تھا تاکہ ہینک اسے ریکارڈ نہ کرے۔

''ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔'' ہینک نے کہا۔

''ہاں۔ اس شخص کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ وہ ایک عورت کو قتل کرکے یوں فرار ہوگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایسے شخص کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

''ہاں! مجھے انصاف چاہیے۔'' ہینک نے کہا۔

''تمہیں ضرور انصاف ملے گا لیکن پہلے مجھے ایک سوال کا جواب چاہیے۔''

''کیسا سوال؟''

''کیا تمہیں بعد میں پچھتاوا تو نہیں ہوگا اور تم پولیس والوں کے سامنے اس کا اعتراف تو نہیں کروگے؟ بظاہر یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اس سے میرے کاروبار کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''بالکل نہیں، بلکہ مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' ہینک نے کہا۔

''کنٹریکٹ کے مطابق تم صرف بروس سے بات کروگے اور اس کے بعد تمہیں ایک گاہک تلاش کرنا ہوگا۔''

''میں نے پورا معاہدہ پڑھ لیا ہے اور میں تمہارے لیے ایک گاہک تلاش کرلوں گا۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔ میں زبان پر اعتبار کرتا ہوں۔''

☆☆☆

برزفون پر ایک ٹیکسٹ میسیج کے ذریعے اطلاع آئی۔ ہینک نے اس کی تصدیق مقامی اخبار کی ویب سائٹ پر کی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور چند سیکنڈ بعد وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے میز پر ہاتھ مارا اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی جو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ یہ غم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے۔

اس نے بروس کو فون کیا۔ گیارہ بج چکے تھے لیکن وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ''ہاں، میں سن چکا ہوں۔''

''آجاؤ۔ ہم مل کر اس کا جشن منائیں گے۔''

''ہمیں اس بارے میں مزید بات نہیں کرنی چاہیے۔'' بروس نے کہا۔

ہینک کی مسکراہٹ رخصت ہوگئی۔ ''یقیناً۔ ہمیں اس پر بات کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن ہم.....''

''اسے بھول جاؤ۔'' بروس نے کہا۔ ''میں شیلا اور بچوں سے ملنے گیا تھا لیکن.....''

وہ اچانک خاموش ہوگیا۔ ہینک کو لگا جیسے وہ لائن پر

نہیں ہے۔ اس نے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''اس بدمعاش کی موت گالف کلب میں ہوئی، جہاں میرے بچے اپنی کلاس ختم ہونے کے بعد اس کا انتظار کررہے تھے۔ انہوں نے اسے مرتے ہوئے دیکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس کے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسے مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

''کتنا دردناک ہے۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔''

''ٹی بالکل بے حس ہوگیا ہے اور این ہر وقت روتی رہتی ہے۔ شیلا ان کی دلجوئی کررہی ہے۔ وہ بچے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ شیلا بھی گم صم ہے۔ میں نے اس سے واپس آنے کے لیے کہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ ایک شرابی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں نے اسے شراب چھوڑنے کا یقین دلایا۔ اس نے کہا کہ اگر میں کسی عبادت گزار شخص کی طرح پاکباز ہوجاؤں تب بھی اسے میری پروا نہیں۔ اس کے الفاظ تھے..... میں تم سے تنگ آچکی ہوں۔ میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ کبھی نہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ بیوی بچوں کو واپس لانا بھی تمہارے پلان کا حصہ تھا۔'' ہینک نے کہا۔

''بالکل، میرے منصوبے میں یہ بھی شامل تھا۔'' بروس نے کہا۔ ''اب میں اس شخص کو ایک دمڑی بھی نہیں دوں گا۔ مجھے وہ نتیجہ نہیں ملا جو میں چاہتا تھا۔''

''لیکن یہ اس کا کام نہیں تھا کہ وہ تمہارے بیوی بچوں کو واپس لائے۔''

''میری رقم ضائع ہوگئی۔ اب میں مزید پیسے نہیں پھینک سکتا۔''

''کیا تم نے معاہدہ پڑھا تھا؟'' ہینک نے اسے یاد دلایا۔ ''تمہیں پوری رقم ادا کرنا ہوگی۔''

''میں اسے نہیں مانتا۔'' بروس نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

ہینک کو بروس سے ہمدردی ہونے لگی لیکن وہ بروس کی عادتوں سے دلبرداشتہ نہیں ہوگا، اس نے صرف سوگ سے انتقام لینے کے لیے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ اس کا مقصد پورا ہوگیا لہٰذا وہ بقیہ رقم بھی ادا کردے گا۔

☆☆☆

جب ہینک اور میری نے یہ مکان خریدا تو ان کا خیال تھا کہ عقبی حصے میں واقع کاٹیج کو میری کی فری لانسنگ رائٹنگ کے لیے ہوم آفس بنائیں گے۔ اس کے پاس کارپوریٹ کمپنیوں کا کافی کام تھا۔ پھر ایک پارٹی میں ان دونوں کی ملاقات ایمی سے ہوئی جو ہینک کی ہائی اسکول ٹیچر رہ چکی تھی تو انہیں اس کے حالات کا علم ہوا۔ میری نے اصرار کیا کہ وہ ان کے کاٹیج میں آجائے اور اس نے اپنا دفتر ایک فالتو بیڈروم میں بنالیا۔

جب میری کی موت کے بعد ہینک اپنے تاریک بیڈ روم میں افسردہ بیٹھا ہوتا اور ایمی کے بہت سے ملنے والے اس کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے تو ان کی نظریں بے اختیار اٹھ جاتیں اور ان میں ہمدردی جھلکنے لگتی۔ وہ جانتے تھے کہ ہینک کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ سب اس کے پرانے شاگرد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ڈراما کلب میں بھی رہے جس کی انچارج ایمی تھی۔ وہ سب ایمی پر فدا تھے اور جب بھی اس سے ملنے آتے تو اس کے لیے آئس کریم اور دوسرا کھانے پینے کا سامان لاتے۔ ایمی کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ انہی کو اپنا سمجھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔

اسے بھی پڑھیے

مایوسی

اسے محسوس کرو تو پہاڑ بن جاتی ہے اور اس کی پروا نہ کرو تو یہ گویا بے حقیقت ہے۔

حوصلہ

یہ اس چڑیا کے مانند ہے جو اڑتی ہے تو پہاڑ عبور کرجاتی ہے۔

شیر

یہ جب تک جنگل میں ہوتا ہے تو خطرناک ہوتا ہے اور لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ جب یہ شہر میں آجاتا ہے تو تماشا بن جاتا ہے۔

دعائیں

پُرخلوص دعائیں کبھی رائگاں نہیں جاتیں۔ یہ بہاروں کی رت میں خوشبو بن کر ابر بہاراں میں بوندوں کی صورت میں وقت کے ساگر میں سیپ کے اندر موتیوں کی طرح بالآخر ان تک جا پہنچتی ہیں جن کے لیے یہ ہمارے ذہن میں جنم لیتی ہیں اور یہ تحفہ سب سے پیارا اور انمول ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

''میرے پیارے بچے میرے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔''

ایمی کی وجہ سے ہینک ان میں سے کئی ایک سے واقف ہوگیا تھا، جیسے وہ کالج بوائے جو کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کررہا تھا یا وہ فوج کا سپاہی جو قریب ہی ائربیس پر تعینات تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کسی نہ کسی شعبے میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔

اب حالات مختلف تھے۔ ہینک کی افسردگی، خوشی میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس نے ایمی کے پورچ پر قدم رکھا۔ وہ اسے اسکرین ڈور کے پیچھے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس نے وہیں سے کہا۔ ''مبارک ہو۔''

یہ حیران کن بات تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے سویگ کی موت کے بارے میں بتائے گا کیونکہ بروس کے علاوہ صرف ایمی ہی جانتی تھی کہ اسے جیسن سویگ پر کتنا غصہ ہے اور یہ صرف بروس ہی جانتا تھا کہ ہینک نے اس بارے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

''تمہیں سویگ کے بارے میں معلوم ہے؟'' ہینک نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! میں نے گوگل پر دیکھا تھا۔'' ایمی کو کمپیوٹر سے بھی دلچسپی تھی۔ گو کہ وہ انگلش ٹیچر تھی لیکن ٹیکنالوجی کے جدید رجحانات سے بھی پوری طرح باخبر تھی۔

''میں نے ایک ویب سائٹ کی خبروں میں پڑھا تھا کہ ایک پارٹی کے دوران وہ چکرا کر گر پڑا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔'' ایمی نے کہا۔ ''جبکہ اس کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔'' یہ وہی زبان تھی جو بروس نے اپنے رقیب کے لیے استعمال کی۔

''مجھے اعتراف ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ وہ اسی کا مستحق تھا۔''

''وہ اکیلا نہیں بلکہ اور بھی لوگ ایسی سزا کے مستحق ہیں۔'' ایمی نے کہا۔ وہ..... ریٹائرڈ ہائی اسکول انگلش ٹیچر ایک قدیم طرز کی کرسی میں بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

''تمہارا اشارہ فوبی کی جانب ہے؟''

''ہاں، میں اسی کتیا کی بات کررہی ہوں۔'' وہ اپنی بھابی کے لیے یہی لفظ استعمال کرتی تھی۔

''دنیا میں بہت سے بُرے لوگ ہیں۔'' ہینک نے کہا۔

''وہ ان میں سے ایک ہے۔'' ایمی بولی۔

وہ فوبی کی کہانی کئی مرتبہ سنا چکی تھی۔ ایمی اپنی جوانی میں ایک معمولی براڈوے ایکٹریس رہ چکی تھی لیکن نیویارک میں کئی برس جدوجہد کرنے کے بعد وہ کوئی مقام نہ بنا سکی تو اس نے اداکاری ترک کردی اور اپنے آبائی شہر واپس آکر اسکول ٹیچر کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس کا شوہر جوئے اور ریس کا عادی تھا۔ اس نے ایمی کی ساری جمع پونجی اس شوق کی نذر کردی۔

فوبی کی عمر چالیس سال تھی جب اس کی دوسری شادی ایمی کے جڑواں بھائی ڈون سے ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور اسکول کے زمانے میں ڈانس مقابلوں میں حصہ لیتی تھی۔ ڈون نے ایمی سے وعدہ کیا کہ وہ کیپ کوڈ میں واقع خاندانی مکان اس کے نام کردے گا تاکہ وہ اسے فروخت کرکے اپنی گزراوقات کا بندوبست کرسکے، لیکن ایک رات اس پر فالج کا حملہ ہوا اور فوبی نے دو گھنٹے بعد اس کی اطلاع نو گیارہ کو دی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پریشانی کی وجہ سے ایسا نہ کرسکی۔ ایک ڈاکٹر نے بعد میں بتایا کہ اگر اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا جاتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔

ڈون کی وصیت یا کسی اور دستاویز میں کیپ کوڈ کا مکان ایمی کو دینے کا ذکر نہیں تھا لہٰذا قانونی طور پر فوبی اس کے تمام اثاثوں کی مالک بن گئی۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' فوبی نے وصیت پڑھنے کے بعد کہا۔ ''مجھے اس کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس نے کیپ کوڈ کا مکان مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ والدین کی چھوڑی ہوئی جائداد میں میرا بھی حصہ ہے اور یہ وصیت تمہیں اس پر عمل کرنے سے نہیں روکتی۔'' ایمی نے کہا۔ ''ویسے بھی اب تم لاکھوں کی مالک ہو۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم اس رقم سے محروم ہوگئیں جو اس مکان کی فروخت سے تمہیں ملتی۔'' فوبی نے مصنوعی ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری غلطی نہیں ہے لیکن میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔''

''تمہاری کہانی سن کر وہ مجھے بہت حقیر لگنے لگی ہے۔'' ہینک نے کہا۔

''میں اس کے بارے میں اسی طرح محسوس کررہی ہوں جیسے تم جیسن سویگ کے لیے کرتے تھے۔ گو کہ میری کی موت کا موازنہ میرے نقصان سے کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں فوبی کو مردہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے وہ مکان نہیں مل سکتا لیکن وہ ایک ظالم عورت ہے جس کی وجہ سے اس رات میرے بھائی کی موت ہوئی۔''

کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے ہینک نے اپنا ذہن بنالیا۔ ''ایمی! بعض اوقات خواہشیں حقیقت کا روپ

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یارخان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

دھار لیتی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

اس نے ایمی کو کرائے کے قاتل کے بارے میں بتایا۔ وہ اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ ناراض نظر آرہی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ کسی دوسرے آدمی کی جان لینا غلط ہے۔'' ہینک نے کہا۔ ''لیکن سوئیگ نے میرا مذاق اڑایا تھا، جب سرکاری وکیل نے اس پر لگا ہوا الزام واپس لیا۔''

''دل کا دورہ!'' ایمی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ یہ کیسے ہوا اور ریوپچ نے کس طرح اس قتل کو طبعی موت کی شکل دی کیونکہ میں وہاں موجود نہیں تھا۔''

''اسے خفیہ قتل یا چھپ کر وار کرنا کہتے ہیں۔'' ایمی نے کہا۔

ہینک کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے ایمی کو کرائے کے قاتل کا اگلا کلائنٹ بنانے کی کوشش کیوں کی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کیا وہ پولیس کو بتا دے گی؟

وہ قانون پر عمل کرنے والی عورت تھی اور اس معاملے میں اس نے کبھی کسی سے رعایت نہیں کی پھر ہینک نے اسے سمجھنے میں کیوں غلطی کی۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

بالآخر ایمی نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے۔

''میں نے تمہارے دوست بروس اوپسن کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس کے ساتھ بھی تمہارے جیسا معاملہ ہوا۔ ایک امیر شخص نے اس کی بیوی کو ورغلایا اور دل کے دورے نے اس کی جان لے لی۔ یہی کچھ جیسن سوئیگ کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں کیسوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا کہ متاثرین کو کبھی دل کی تکلیف ہوئی تھی۔''

''نہیں۔ انہیں ایسی کوئی شکایت نہیں تھی۔'' ہینک نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ''ایمی! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا.....''

''بروس ہمیشہ سے ہی ایک مصیبت تھا۔ میں نے اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اسے معطل کر دیا تھا۔ وہ غیر محتاط زندگی گزارنے کا عادی ہے اور اسی وجہ سے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ کیا اسی نے تمہارے لیے کرائے کے قاتل کا بندوبست کیا تھا؟''

''معذرت۔ میں کسی دوسرے کے بارے میں تفصیلات نہیں بتا سکتا۔'' ہینک نے کہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بروس نے اسے اپنے اس دوست کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا جس پر غبن کا الزام لگایا گیا جبکہ اس کا باس خود چور تھا۔ اسی نے بروس کو بھی کرائے کے قاتل کے بارے میں بتایا تھا۔ معاہدے کی رو سے بروس پر پابندی تھی کہ وہ کسی تیسرے آدمی کا حوالہ دے۔ شاید اس نے معاہدے کی وہ شق نہیں پڑھی تھی۔

''مجھے یہ سب تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا ایمی۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

ایمی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے بتا دیا۔ تم مجھے بھی اس میں شامل کر سکتے ہو۔''

''کیا؟'' ہینک کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ ''تمہیں بھی شامل کرلوں؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم.....''

''مجھے ڈون کی جائداد سے ایک سینٹ بھی نہیں ملے گا۔'' ایمی نے کہا۔ ''لیکن یہ اتنا اہم نہیں ہے۔''

''ایمی! یہ بہت مہنگا سودا ہے۔ وہ تم سے بھی پچاس ہزار ڈالرز معاوضہ طلب کرے گا۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میں اس کا انتظام کرلوں گی۔ فوبی کو ہر صورت میں ٹھکانے لگانا ہے۔''

ہینک نے اٹھتے ہوئے کہا کہ وہ کرائے کے قاتل سے رابطہ کر کے اسے ایمی کے مسئلے کے بارے میں بتا دے گا۔ ''اگر وہ تمہاری مالی پوزیشن سے مطمئن ہو گیا تو تمہیں اس سے فون پر بات کرنا ہوگی۔ میں یہ بتا دوں کہ وہ کوئی مہذب شخص نہیں ہے۔''

''میں اسکول ٹیچر رہ چکی ہوں اور ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتی ہوں۔''

گھر آنے کے بعد ہینک نے اپنے برنر فون سے کرائے کے قاتل کو فون کیا۔ جواب میں اسے ایک ریکارڈنگ سنائی دی جس میں اسے پیغام چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ کسی عورت کی آواز تھی۔ ہینک نے اسے ایمی کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے پاس کچھ رقم ہے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ کافی نہیں تو بقیہ رقم میں پوری کر دوں گا۔ میں اپنے حصے کی بقیہ رقم بھی بھیج رہا ہوں۔''

اگلے روز صبح وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بے شور بلیوارڈ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا اور دفتر فون کر کے کہہ دیا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گا۔ اس کے بعد وہ پیدل ہی اس جانب چل پڑا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی اس کا سامنا ایمی کے پرانے شاگردوں فوجی سپاہی اور ٹیکنیکل کالج کے طالب علم سے ہوا جو ایمی سے ملنے آرہے تھے۔ صبح کے وقت اس علاقے میں خاموشی تھی۔ وہ ٹہلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گیا جہاں میری کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اچانک اس کی نظر سڑک کے پار ایک بنگلے کے لان پر گئی۔ وہاں پر ایک نوعمر لڑکا کھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ ہینک نے اسے

پہچان لیا۔ یہ میری کی موت کا تیسرا گواہ تھا جس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں تھی۔

ایک درمیانی عمر کی عورت گھر سے باہر آئی۔ اس نے ایک بار ہینک کو دیکھا اور اس پر نظریں جما دیں۔ ہینک وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ وہ عورت سڑک پار کر کے سیدھی اس کی طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں ویڈیو کیمرا تھا جو اس کے بیٹے نے پکڑا ہوا تھا۔

''تم وہی ہونا جس کی بیوی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟''

''ہاں۔'' ہینک نے جواب دیا۔

''ہم نے ہی یہ کیمرا مائیکل کو دیا تھا۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اسے ساحل پر آنے والی خوبصورت لڑکیوں کی ویڈیو بنانے کا شوق ہے لیکن آج ہی میں نے دیکھا کہ اس نے ......'' وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ یہ ویڈیو تمہارے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔''

''تمہارے بیٹے نے میری کی موت کی ویڈیو بنائی تھی۔'' ہینک نے نرم لہجے میں کہا۔

اس عورت نے کیمرا سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا۔ مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا۔''

''میں یہ ویڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ہینک نے کہا۔

☆☆☆

اس ویڈیو کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ الٹے قدموں گھر واپس آیا اور اس نے بروس کا نمبر ملایا۔ اس کے علاوہ اور کس سے بات کرتا۔ تیسری گھنٹی پر بروس کی بڑبڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' ہینک نے کہا۔ ''میں نے میری کی موت کی ایک ویڈیو دیکھی ہے۔ میری کی بائیک اچانک ہی سویگ کی کار کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی لین میں چلتی تھی۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہاں کوئی گڑھا ہے۔ سنو بروس! لگتا ہے کہ سویگ کے معاملے میں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نہیں جانتا کہ......''

دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز سن کر اسے رکنا پڑا۔ ''میں بروس کی بہن بول رہی ہوں۔ وہ مر گیا ہے۔''

''کیا؟'' ہینک کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وہ مرے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا ایمی کے کاٹیج تک آیا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور برابر میں اس کا پرانا شاگرد فوجی سپاہی براجمان تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ جانے وہ کیوں اتنا خوش نظر آ رہا تھا۔ ایمی بھی مسکرا رہی تھی۔

''تم نے کچھ سنا؟'' وہ بولی۔ ''فوبی مر گئی۔ جانتے ہو اس کی موت کیسے ہوئی؟''

''دل کا دورہ پڑنے سے۔'' ہینک نے کہا۔ ''لیکن......''

...... وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی تو کرائے کے قاتل نے ایمی کی مالی پوزیشن بھی چیک نہیں کی تھی۔ اس میں پورا ایک ہفتہ لگ جاتا جبکہ اس نے صرف ایک دن پہلے ہی کرائے کے قاتل کو یہ ٹاسک دیا تھا۔

''اس بار اس نے تیزی دکھائی۔'' ایمی بولی۔ ''وہ اپنے گاہکوں کو خوش رکھنا چاہتا ہے اور انہیں مطمئن کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ بات معاہدے میں شامل ہے۔''

ایمی اپنے شاگرد کے سامنے کھل کر کیوں بات کر رہی تھی، حالانکہ اسے ایک دن پہلے ہی معاہدے کا مسودہ ملا تھا۔

''ریوینج وقت ضائع نہیں کرتا۔'' سپاہی نے اتنے اعتماد سے کہا جیسے کوئی کسی کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔

بالآخر ہینک کو خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ''بروس بھی مر گیا۔''

''اس نے پوری طرح معاہدہ نہیں پڑھا تھا۔'' ایمی نے کہا۔ ''اور بقیہ رقم دینے سے انکار کر دیا جبکہ معاہدے میں سب کچھ صاف صاف لکھا ہوا تھا۔''

''اگر وہ پورا معاہدہ پڑھتا تو اس سے یہ غلطی نہ ہوتی۔'' سپاہی نے کہا۔ ''لیکن تم ایک اچھے انسان ہو۔ تم نے بقیہ رقم ادا کر دی بلکہ ایک نئے گاہک کا بندوبست بھی کر دیا۔ یہ ایک طرح کا ٹیسٹ تھا جس میں تم پاس ہو گئے۔''

ہینک ایک قدم پیچھے ہٹا تو ایمی بولی۔ ''سنو! ہمارا کاروبار پھیل رہا ہے۔ مجھے اور میرے نوجوان ساتھیوں کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ہمارے مالی معاملات دیکھ سکے۔ معاہدے کی رو سے تمہیں مستقبل میں کوئی بھی ذمے داری دی جا سکتی ہے اور تمہیں اس کی تعمیل کرنا ہو گی۔''

''تمہارا کاروبار؟'' ہینک حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے تمہیں ہی تمہارے کلائنٹ کے طور پر بھرتی کیا؟''

ایمی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک تفریح تھی۔ یوں سمجھ لو کہ تم نے مجھے متاثر کیا۔''

پھر اس نے ایک ایسے شخص کی آواز نکالی جس سے وہ کبھی نہیں ملا لیکن اسے 800 نمبر پر سنا تھا۔ ''کیا تم اس سے متفق ہو ہینک؟''

⌘⌘⌘

فیصلے دل کے

نشور ہادی

ایک طرف تو اللہ پاک نے یہ کائنات عجیب بنائی، دوسرے دل کا بھی ایک الگ نظام بنا ڈالا... جس طرح دنیا میں مختلف مزاج کے لوگ ہیں اور کچھ سرکشی بھی اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح دل کے کچھ جذبات بھی سرکش گھوڑے کے مانند اتنے منہ زور ہو جاتے ہیں کہ ان کے آگے دل کو ہار مان لینا پڑتی ہے... انسان کے باہر ہر چیز کو اللہ نے وجود بخشا مگر... انسان کے اندر بسنے والے جذبات، شعور، دانش، غصہ، محبت اور نفرت کو بے وجود ہی رکھا اس کے باوجود ان کی طاقت کے آگے انسان خود کو بے بس محسوس کرتا ہے... وہ بھی اپنے اندر کی جنگ سے مات کھا گیا تھا اس کے لیے محبت سے محبت کا حصول ہی اب حاصلِ زندگی ٹھہر گیا تھا جس پر وہ آخری سانس تک قائم رہا اور بالآخر ایک دن جیت اس پر مہربان ہو گئی...

تصورات سے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے والے
ایک عاشق کی تلخ حقائق سے دلچسپ معرکہ آرائی

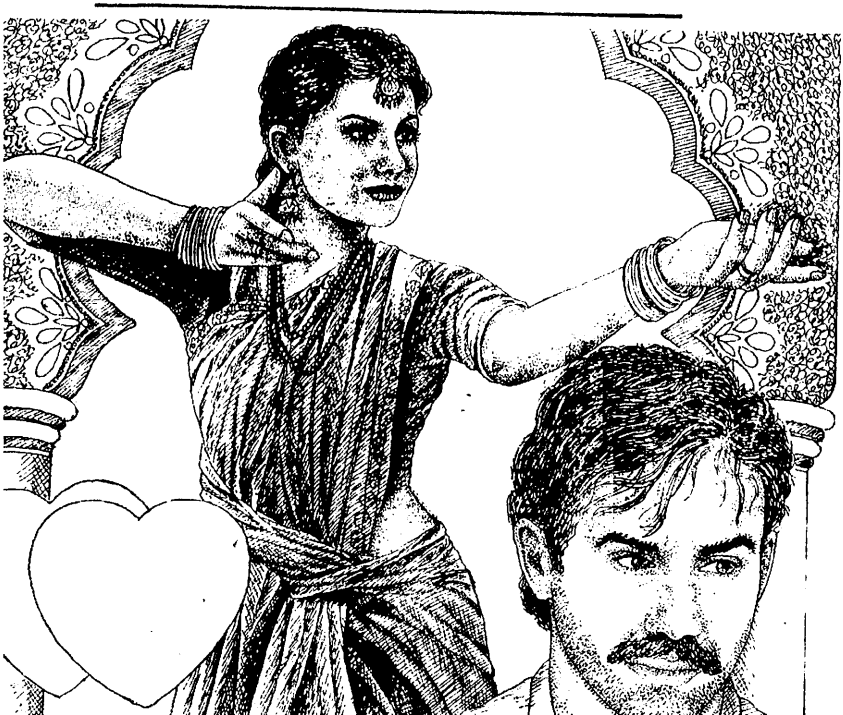

جمال نے جو بزنس شروع کیا تھا، اس کے لیے لاہور کی فضا سازگار نہیں تھی۔ جمال کو اس کا احساس ابتدا ہی میں ہوگیا تھا۔ اس کے ایک دوست نے جو کراچی میں رہتا تھا، اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنا کاروبار کراچی شفٹ کرلے۔ کاروبار شروع کرنے کے بعد اسے کسی دور دراز شہر میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا، تاہم جمال اس امتحان کی مشکلات سے گزر رہی گیا۔ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ کچھ اعزاء لاہور ہی میں تھے جن کی جمال نے پروا نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ عزیزوں سے دور رہنے ہی میں تعلقات بہتر رہتے ہیں۔ قربت تو بعض اوقات ''سمِ قاتل'' بن جاتی ہے۔

کراچی میں وہ ہوٹل میں قیام کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے دوست عدنان نے اسے بصد اصرار اپنے گھر میں قیام کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے اپنے بنگلے کے دو کمرے اس کے لیے وقف کردیے۔

''جب تم اپنا گھر بنوالو تو چلے جانا میرے پاس سے۔'' عدنان نے کہا تھا۔

''اس میں تو مہینوں لگیں گے۔''

''سالوں تو نہیں لگیں گے.....! اور اگر سالوں بھی لگیں تو تمہارا میرے گھر میں رہنا میرے لیے تکلیف دہ نہیں، خوشی کا باعث ہوگا۔ ہاں ایسا گھر بنوانا کہ شادی کے بعد کوئی پریشانی نہ ہو۔''

''شادی!'' جمال نے ٹھنڈی سانس لی پھر ہنسا۔ ''وہ تو نہ جانے کب ہو۔''

''ابھی تک مرغ کی وہی ایک ٹانگ چل رہی ہے۔ آئیڈیل کی تلاش میں ہو اب تک؟''

جمال مسکرایا۔ ''میرے اس معاملے کو ایک نفسیاتی کیس سمجھا جاسکتا ہے۔''

''جب تمہیں خود یہ احساس ہے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔''

''کرچکا ہوں۔ حاصل کچھ نہیں ہوا۔ ماہر نفسیات اس ہیولے کو مٹانا تو کیا، اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکا لہٰذا طے ہے کہ جب تک کوئی لڑکی اس ہیولے کے مطابق یا اس سے قریب تر نہیں ہوگی، میں شادی نہیں کروں گا۔''

''اور اس انتظار میں بوڑھے ہوجاؤ گے!''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' جمال ہنسا۔ ''بہت سے لوگ شادی کیے بغیر دنیا سے جاچکے ہیں۔''

اسی قسم کی باتوں میں یہ موضوع ٹل جاتا تھا۔

''بزنس تو چل پڑا۔'' ایک دن جمال نے کہا۔ ''اب تمہارے ہی علاقے میں کوئی پلاٹ ڈھونڈوں گا۔ خاصی بھاگ دوڑ کرنا ہوگی۔ اسٹیٹ ایجنٹس سے ملنا ہوگا۔ اس میں مجھے تھوڑی سی دشواری یہ ہوگی کہ یہ شہر میرے لیے نیا ہے۔ یہ گلی کوچے میرے لیے اجنبی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اتوار کو تم مجھے شہر کا بیشتر حصہ گھما دو۔ سارا شہر تو ایک دن میں گھومانہیں جاسکتا۔ ایک دن تو میں دفتر سے آتے ہوئے تمہارا گھر ہی بھول گیا تھا۔''

''میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ ڈرائیور رکھ لو کچھ عرصے کے لیے۔''

''یار! یہ کار مجھے بہت پیاری ہے۔ اسی لیے تو میں لاہور سے ساتھ لایا ہوں ورنہ یہاں آکر کوئی اور کار خرید سکتا تھا، یہ وہیں بیچ دیتا۔ ڈرائیوروں کے کار چلانے کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔''

''یہاں بھی کسی حد تک آئیڈیل پسندی ہی کا کیڑا ہے۔''

جمال ہنس کر چپ ہوگیا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ عدنان نے اسے خاصا شہر گھما دیا۔ ہر علاقے کی خاص خاص باتیں بھی بتادیں۔ شہر کا ایک نقشہ بھی خرید دیا۔ ان سب باتوں سے جمال کو خاصی آسانی ہوگئی۔

آٹھ دس دن بعد جمال کو اپنے دفتر کے ایک عہدے دار سے دعوت ملی۔ اُس کے گھر میں کوئی تقریب تھی جس کے لیے اس نے دو ایک سنگرز کا بھی بندوبست کیا تھا۔ موسیقی سے جمال کی دلچسپی اس کے علم میں تھی ورنہ وہ اسے دعوت نہ دیتا۔

اس کا گھر ڈیفنس میں تھا۔ جمال دس بجے اس کے گھر پہنچ گیا۔ موسیقی کی محفل جم چکی تھی۔ جمال کو شدید مایوسی ہوئی۔ موسیقی کے نام پر ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ جمال کا خیال تو یہ تھا کہ دو ایک غزل گانے والوں کو بلایا ہوگا۔ اخلاقاً اس نے ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزارا، پھر طبیعت کی اچانک ناسازی کا بہانہ کرکے وہاں سے رخصت ہوا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ ''خوب علاقہ ہے یہ بھی.....! ہر سڑک خیابان ہے۔''

ان سڑکوں پر سناٹا بھی تھا جو کشادہ نہیں تھیں۔ وہاں ٹریفک بھی برائے نام تھا۔ اِکّا دکّا گاڑی آتی جاتی نظر آجاتی تھی۔ راہ گیر بھی کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔

یکایک جمال کا پیر بے اختیار بریک پر چلا گیا۔ یہ بے اختیاری اس لڑکی کی وجہ سے تھی جسے اس نے ایک الیکٹرک پول کے نیچے کھڑا دیکھا تھا۔ شلوار قمیص میں ملبوس

اس لڑکی کی عمر چھبیس اٹھائیس سال کے درمیان ہوسکتی تھی۔ رنگت گوری اور نقوش تیکھے تھے لیکن جمال کی بے اختیاری کا سبب یہ باتیں نہیں تھیں بلکہ وہ لڑکی جمال کے دماغ میں برسوں سے ڈیرا جمائے ہیولے سے بے حد قریب تھی۔ جمال نے اپنی بیوی کے لیے ایسی ہی لڑکی کے خواب بھی دیکھے تھے۔

بریک لگنے کے باوجود ابھی اس کی کار لڑکی کے قریب نہیں پہنچی تھی لیکن اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ لڑکی اس طرح ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی، جیسے کسی سے لفٹ لینا چاہتی ہو۔

جمال کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

پھر اس وقت اسے ایک ذہنی جھٹکا لگا جب ایک کار نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اس کے برابر سے گزری۔ اس کے بریکوں کی آواز دور تک پھیلی ہوگی۔ وہ ایک جھٹکے سے اس لڑکی کے بالکل قریب رکی تھی۔ لڑکی نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر اس کار کا اگلا دروازہ کھولا اور بیٹھ کر بند کر ہی رہی تھی کہ وہ کار تیزی سے حرکت میں آگئی۔

اس وقت جمال کی ذہنی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ لڑکی کو دیکھنے کے بعد اسے اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کار جو اس لڑکی کو لے گئی تھی، اسے جمال نے اپنے عقب میں آتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی نظر میں اس وقت آئی تھی جب تیز رفتاری کے ساتھ اس کے برابر سے گزری تھی اور لڑکی کے قریب جارکی تھی۔

جمال اندازہ نہیں لگا سکا کہ لڑکی اس سے لفٹ لینا چاہتی تھی یا اس نے اس کار والے کو اشارہ کیا تھا جو اس کے پیچھے آرہا تھا۔

یقیناً اس کا اشارہ اسی کار والے کے لیے تھا، جمال کے دماغ میں خیال آیا، اسی لیے وہ بلاتکلف اس کار میں بیٹھ گئی تھی۔

لیکن یہ ہے کون؟ معلوم تو ہونا چاہیے۔ اس نے وہ اشارہ اپنے بھائی کو کیا ہوشاید اور اسی کی منتظر ہو یا کسی اور عزیز کا انتظار ہو اسے یا..... ایک جھٹکے سے وہ لفظ رک گیا جو اس کے دماغ میں آنے کو تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ وہ لفظ ''شوہر'' جوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔

ان سب خیالات کے ساتھ اس نے لاشعوری طور پر کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ وہ اس کار کا تعاقب کر کے جاننا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کہاں رہتی تھی۔

تقریباً ایک میل آگے جا کر وہ کار دائیں جانب گھومی اور جب جمال کی کار اس طرف مڑی تو اس نے دیکھا کہ وہ کار ایک بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔

اب جمال نے اپنی کار کی رفتار سست کی۔ پھاٹک کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے بنگلے کا نمبر تو پڑھ لیا لیکن نیم پلیٹ نہ پڑھ سکا۔ دس پندرہ فٹ آگے جا کر اس نے کار روکی اور آس پاس کے دوسرے بنگلوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ جب دوبارہ یہاں آئے تو اس بنگلے کی شناخت میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔

واپس عدنان کے گھر پہنچنے تک وہ لڑکی جمال کے اعصاب پر چھائی رہی۔ اب وہ خوش تھا کہ اسے اس کا آئیڈیل مل جائے گا۔

جب وہ گھر پہنچا تو ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ عدنان سو چکا ہے۔ اگرچہ جمال اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور دیر تک جاگتا رہا۔ کسی وقت آنکھ لگی بھی تو اس لڑکی کو خواب میں دیکھ کر کھل بھی گئی۔ سوتے جاگتے کا یہ قصہ آٹھ بجے تک جاری رہا۔ اٹھ کر وہ غسل کے لیے باتھ روم میں گیا اور خیالوں میں ایسا ڈوبا رہا کہ دیر تک نہاتا رہا، تاہم تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گیا۔ عدنان کا وتیرہ تھا کہ جب کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی تھی تو وہ نو بجے ناشتا کر کے ہی دفتر جاتا تھا۔

ان دنوں اس کی بیوی اور دونوں بچے تفریح کرنے سوات وغیرہ گئے ہوئے تھے۔ بیوی کے والدین ان کے ساتھ تھے۔

عدنان ان کے ساتھ بہت کم ہی کہیں تفریحاً جاتا تھا بلکہ انہیں وقت بھی کم ہی دے پاتا تھا کیونکہ اس کی ملازمت ہی ایسی تھی۔ وہ ایک انٹیلی جنس ادارے میں ایک اہم منصب پر فائز تھا۔

''کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہو آج!'' عدنان نے ناشتے کے دوران میں کہا۔

''ہاں۔'' جمال مسکرایا۔ ''اسی کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا، آخر وہ کل نظر آ ہی گیا۔''

''کیا نظر آ گیا؟''

''وہ ہیولا جو طویل عرصے سے میرے اعصاب پر چھایا ہوا تھا۔''

''اوہ، خوب!'' عدنان مسکرایا۔ ''مبارک ہو۔ کہاں نظر آ گیا وہ؟''

''ڈیفنس میں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میں نے اس بنگلے کا نمبر یاد کر لیا ہے۔ اب تم میری تھوڑی سی مدد کرو۔ تمہارے لیے تو یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس بنگلے کے

مکینوں کے نام معلوم کرو۔ اس میں اس قتالہ کا نام بھی ہوگا۔''

''یہ تو خیر گھنٹے آدھ گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔''

عدنان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے کائی بات سن کر جلدی سے بولا۔ ''میں فوراً آرہا ہوں۔ تم لوگ فوراً حرکت میں آؤ۔'' پھر وہ رابطہ منقطع کر کے کھڑا ہو گیا۔ ''ایک اہم شخصیت کا قتل ہو گیا ہے۔ مجھے وہیں جانا ہے، فوراً۔ قتل بھی ڈیفنس ہی میں ہوا ہے جہاں کی تم ابھی بات کر رہے تھے۔''

جمال کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''میرے کام کا کیا ہوگا؟''

''میں ابھی یہ کام کسی کو سونپ دوں گا۔ ایک گھنٹے بعد فون کر کے تمہیں اس گھر کی ساری تفصیل بتا دوں گا۔''

عدنان کے جانے کے بعد جمال اپنے کمرے میں ٹہلتا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ عام حالات میں وہ بہت کم سگریٹ پیتا تھا لیکن اس وقت ''چین اسموکر'' بنا ہوا تھا۔ اس نے دفتر فون کر کے اپنے منیجر کو بتا دیا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔

ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا۔ عدنان کا فون نہیں آیا۔ جمال کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ خود عدنان کو فون کر بیٹھا۔

''میں جانتا تھا اتنی دیر ہو جانے کے باعث تم سے رہا نہ جائے گا، تم مجھے فون ضرور کرو گے۔ میری مصروفیت کچھ ایسی ہے کہ تمہارے کام میں کچھ تاخیر ہو جائے گی۔ میں ایک بجے لنچ کرنے گھر آؤں گا تو تمہیں بتاؤں گا۔''

''اور ڈھائی گھنٹے کا انتظار؟'' جمال کے لہجے سے بے چینی مترشح تھی۔

''ضروری ہے۔'' عدنان نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ان ڈھائی گھنٹوں میں جمال کی بے چینی اتنی بڑھی کہ اپنی کار لے کر وہ خود نکل کھڑا ہوا۔ ڈیفنس تک پہنچنے میں اسے آدھا گھنٹا لگا تھا۔ اس بنگلے کے سامنے پہنچ کر اسے ایسا لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بنگلے کے باہر پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ اِکا دُکا کانسٹیبل بھی تھے۔ زیادہ پولیس اندر سرگرم کار ہوگی۔ وہیں جمال نے عدنان کی کار بھی کھڑی دیکھ لی۔ وہ پولیس کی کاروں کے پیچھے تھی۔ جمال نے اپنی کار اس کے پیچھے کھڑی کر دی اور انجن بند کر کے کار سے اترا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہاں پولیس کے جو تھوڑے سے افراد تھے، وہ اسے گھورنے لگے تھے۔

''ایک اہم شخصیت کا قتل ہو گیا ہے۔'' عدنان کی آواز جمال کے دماغ میں مسلسل گونج رہی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں گے۔ اس نے اپنے آئیڈیل کو جس گھر میں جاتے دیکھا تھا، اسی گھر میں ایک قتل ہو گیا تھا۔ جمال کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

قتل کس کا ہوا تھا؟ اس لڑکی کا یا کسی اور کا؟ یہ سوالات بھی اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ عدنان نے کسی اہم شخصیت کی بات کی تھی۔ جمال کی دانست میں وہ اہم شخصیت اس لڑکی کی بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت وہاں پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا کے بھی خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان کی بڑی بڑی گاڑیاں اِدھر اُدھر کھڑی ہوئی تھیں اور کیمرے پھانک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس سے جمال نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پولیس ابھی وہاں سے کسی کی لاش لے کر نہیں گئی تھی۔ کیمروں کا مطلب یہی تھا کہ وہ لاش جانے کا منظر فلم بند کرتے۔ ایک ایمبولینس دروازے کے قریب کھڑی تھی۔

اسی دوران میں جمال نے بنگلے کی نیم پلیٹ بھی پڑھ لی تھی۔

''ابراہیم جان۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا تھا۔

دو کانسٹیبل ٹہلتے ہوئے جمال کے پاس آئے۔

''آپ یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟'' لہجہ خاصا سخت تھا۔

''عدنان صاحب کے باہر آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اوہ!'' لہجہ ڈھیلا پڑ گیا۔

''آپ کا نام؟ مطلب یہ کہ ہم انہیں اطلاع دے دیں۔'' دوسرا کانسٹیبل بولا۔

''میں خود فون کر سکتا تھا لیکن اب اس کی بھی ضرورت نہیں۔''

جمال نے عدنان کو پھاٹک سے باہر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظریں عدنان پر ہی تھیں اس لیے کانسٹیبلوں نے بھی ادھر دیکھا اور پھر وہاں سے کھسک لیے۔

''چین نہیں پڑا تمہیں؟'' عدنان نے قریب آ کر کہا۔

''کب آئے تھے؟''

''فوراً ہی آ گیا تھا۔''

''چلو اب گھر ہی چل رہے ہیں۔ میں اپنا کام ختم کر چکا۔ باقی یہ لوگ سنبھال لیں گے۔''

''قتل کس کا ہوا ہے؟'' جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

کچھ رپورٹرز اور دو کیمرے تیزی سے قریب آئے۔ یقیناً عدنان پر سوالات کی برسات ہوتی لیکن عدنان پھرتی

سے اپنی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

جمال نے بھی فوراً اپنی کار سنبھالی۔ جمال تفصیل جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن اب مناسب یہی تھا کہ وہ اسے فون کرنے کے بجائے گھر تک انتظار کرے۔

گھر کے پورچ میں دونوں کاریں آگے پیچھے رکیں۔

کار سے اترتے ہوئے عدنان نے جمال سے کہا۔ ''میں نے وہیں سے فون پر ہدایت کر دی تھی۔ کھانا لگ چکا ہوگا۔''

''یار! مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ۔'' جمال نے بے چینی سے کہا۔

وہ عدنان کے ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

''اس لڑکی کے بارے میں تو تم مجھے بتاؤ۔'' عدنان نے کہا۔ ''گھر کے ملازمین سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ تم نے اس لڑکی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا لیکن کوئی بھی لڑکی اس گھر میں نہیں رہتی۔''

''کیا!'' جمال نے حیرت سے کہا۔ ''میں نے خود اسے اس بنگلے میں جاتے دیکھا تھا۔''

''تم نے ٹھیک دیکھا تھا۔'' عدنان نے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملازمین نے بھی بتایا ہے کہ ابراہیم جان کے ساتھ ایک لڑکی آئی تھی لیکن دو گھنٹے بعد چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی اس نے کھانا کھایا تھا۔''

''دو ڈھائی بجے کھانا کھایا تھا!'' جمال نے تعجب سے کہا۔

''ہاں۔ اس سے پہلے وہ پیتا رہا ہوگا۔''

''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ قتل کس کا ہوا ہے؟''

''ابراہیم جان کا!''

''اوہ!..... اور قتل کا پتا کیسے چلا تھا؟''

''جب وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گیا تھا، اس کے پانچ منٹ بعد ہی ملازمین نے اس کی دو چیخیں سنی تھیں۔ وہ دوڑے دوڑے اس کے بیڈ روم میں گئے تھے۔ وہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے پر چھری سے دو وار کیے گئے تھے۔ پھر ملازمین ہی نے پولیس کو فون کیا تھا۔ بات کیونکہ ابراہیم جان کی تھی اس لیے میرے محکمے کو بھی حرکت میں آنا پڑا۔'' عدنان نے جواب دیتے ہوئے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس جیسے لوگوں کے لیے قتل کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن جمال کو اب تک کھانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

''ہاں! بتاؤ اس لڑکی کے بارے میں۔ وہ تمہیں ابراہیم جان کی کار میں کہاں دکھائی دی تھی۔ اوہ! کھانا تو شروع کرو۔''

''میری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے۔''

''اسے واپس بلا لو اور کھانا کھاؤ۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں بھی بتاؤ۔''

جمال نے کچھ سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے اس کی کار میں نہیں، ایک سڑک پر دیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ابراہیم جان کی کار رکوائی تھی جبکہ میں سمجھا تھا کہ وہ میری کار.....''

عدنان نے تیزی سے جمال کی بات کاٹی۔ ''یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا تھا؟''

جمال نے اس خیابان کا نام بتا دیا جہاں اس نے لڑکی کو دیکھا تھا۔

''اوہ!'' عدنان نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر جمال کی طرف دیکھا۔ ''وہ اس ویران جگہ پر کھڑی ابراہیم جان کی منتظر تھی؟''

''ہاں۔''

''ملازموں کا بیان ہے کہ انہوں نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ نہ تو اس گھر میں رہتی تھی اور نہ ابراہیم جان کی کوئی عزیز تھی۔''

''پھر وہ.....''

''ذرا صبر کرو۔'' عدنان نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''اب کھانے کے بعد بات کریں گے اور جو باتیں ہوں گی، وہ تمہارے لیے شاید افسوس ناک ہوں۔''

''کیوں؟''

''میں نے کہا نا کہ پہلے کھانا کھا لو۔''

''تم نے تو ایک اعتبار سے دل دہلا دیا ہے میرا۔''

''اگر میرا شبہ غلط نہیں تو بات شاید ایسی ہی ہے۔ پہلے کھانا کھا لو۔ چائے پیتے ہوئے بات کریں گے۔''

''تم سسپنس پیدا کیے جا رہے ہو.....!''

''میں تو چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے شبہات سے آگاہ ہی نہ کروں۔''

''کیوں؟''

''ہے ایک وجہ!''

''پلیز! مجھے بتاؤ۔''

''وہ لڑکی تمہارا آئیڈیل ہے؟''

''یقیناً۔''

''تم چاہو گے کہ اسے اپنا لو۔''

''یقیناً۔'' جمال نے دہرایا۔

عدنان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

''یس!'' عدنان نے کال ریسیو کی پھر دوسری طرف

سے کچھ سننے کے بعد ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''یہی خیال مجھے بھی ہے، لیکن اس معاملے میں اس کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہوگا، یا شاید ہو۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی نگرانی کا بندوبست کردو۔ چوبیس گھنٹے کوئی اس کا نگران ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے گھریلو حالات بھی معلوم کرو۔'' جواب سن کر عدنان نے رابطہ منقطع کردیا۔

''کس کی نگرانی کا بندوبست کروا رہے ہو؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس کا نہیں جو تمہارا آئیڈیل ہے۔ تم خود ہی اسے تلاش کرو۔''

''میں تلاش کروں؟ میں کہاں تلاش کروں؟''

''اسی علاقے میں! میرا مطلب ہے ڈیفنس کی انہی سڑکوں پر جہاں زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا۔''

''تم مجھے الجھا رہے ہو۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہ اب بھی مجھے وہیں ملے؟''

''ملے گی۔'' عدنان نے بڑے یقین سے کہا۔ ''کسی نہ کسی سڑک پر!''

جمال حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے یقین کی وجہ یہ ہے کہ اس قتل سے اس لڑکی کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔'' عدنان نے کہا۔

''یقین کی وجہ؟''

''وہ بھی تمہارے سامنے آجائے گی۔ تم اسے تلاش تو کرو!''

جمال سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا خیال تھا کہ عدنان اس سے کوئی بات چھپا رہا تھا۔ کھانے کے بعد عدنان پھر کہیں چلا گیا۔ جمال کے خیال کے مطابق اسی قتل کے سلسلے میں۔

عدنان رات تک واپس نہیں آیا لیکن اس کا فون آیا تھا۔

''تم کھانا کھالو۔'' اس نے جمال سے کہا تھا۔ ''میں کچھ دیر سے ہی آپاؤں گا۔''

جمال کا دماغ اس لڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے جیسے تیسے کچھ کھایا، پھر اپنی کار میں ڈیفنس کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس رات اس نے جو کچھ مشاہدہ کیا، وہ اس کے لیے ناقابل فہم ہی تھا۔ اس نے تین خیابانوں کی چھوٹی سڑکوں پر تین مختلف لڑکیوں کو دیکھا جو ہاتھ اٹھا کر ایسے اشارے کررہی تھیں جیسے کسی سے لفٹ لینا چاہتی ہوں۔ ہاتھ اٹھانے کے انداز مختلف تھے۔ ایک نے کھلے ہوئے ہاتھوں کی چار انگلیاں نمایاں کی تھیں، دوسری نے تین انگلیاں نمایاں کی تھیں، تیسری پورا ہاتھ کھولے ہوئے تھی، بالکل اسی طرح جیسے اس لڑکی نے ہاتھ اٹھا رکھا تھا جو جمال کا آئیڈیل تھی۔

تینوں لڑکیوں میں ایک بات مشترک تھی۔ تینوں ہی نہایت ماڈرن طرز کے لباس میں تھیں۔ انہوں نے میک اپ بھی گہرے کیے تھے جبکہ جمال کی آئیڈیل کے انداز میں بہت سادگی تھی۔ وہ کسی قسم کے ماڈرن لباس کے بجائے قمیص شلوار میں ملبوس تھی اور میک اپ بھی بہت ہلکا سا کیا تھا۔

جمال نے ان میں سے کسی بھی لڑکی کو لفٹ دینے کے بارے میں سوچا تک نہیں اور آگے نکلتا چلا گیا تھا۔ اسے تو کسی اور کی ہی تلاش تھی جو اسے دکھائی نہیں دی۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے تک کار اِدھر اُدھر دوڑانے کے بعد مایوسی کے عالم میں انہی راستوں سے لوٹا، جن سے گزر چکا تھا۔ اس مرتبہ وہ تینوں لڑکیاں اسے دکھائی نہیں دیں۔

جب وہ گھر پہنچا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ اسے ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ عدنان بارہ بجے کے قریب واپس آیا تھا اور اس وقت اپنی خواب گاہ میں تھا۔

'یقیناً سو بھی چکا ہوگا'۔ جمال سوچتا ہوا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

صبح عدنان سے اس کی ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی۔

عدنان بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم خاصی رات کو لوٹے تھے؟''

''ہاں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم سو چکے ہوگے اس لیے میں بھی جا کے سو گیا تھا۔''

''وہ لڑکی ملی؟''

''نہیں۔'' جمال نے منہ بنایا۔ ''تم نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ وہ ملے گی لیکن.....''

''چکر لگاتے رہو۔'' عدنان نے اس کی بات کاٹی۔ ''کسی رات وہ تمہیں ضرور ملے گی۔''

''تم کہہ رہے ہو تو کوشش کروں گا۔ ایک بات بتاؤ! کیا یہ ڈیفنس کی لڑکیوں کا شوق ہے کہ وہ رات کو کسی کنوینس کے بغیر کہیں چلی جاتی ہیں اور پھر اپنے گھر لوٹنے کے لیے کسی سے لفٹ ملنے کا انتظار کرتی ہیں؟''

''تم معاملہ سمجھ نہیں سکے۔'' عدنان نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری تربیت بہت سادہ ماحول میں ہوئی ہے۔ تمہیں تو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ تمہیں اپنی مطلوب لڑکی نے ابراہیم جان سے لفٹ کیوں لی تھی.....؟ وہ ابراہیم جان جو بعد میں قتل بھی ہوگیا۔''

''وہ بات میرے لیے یقیناً الجھن کی ہے۔ میں نے قیاس کیا ہے کہ اس بے چاری نے مجبوراً ابراہیم جان سے

لفٹ لی ہوگی۔ اسے جس کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا۔ ابراہیم جان نے اس سے کہا ہوگا کہ وہ اسے اس کے گھر تک چھوڑ دے گا لیکن راہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے گھر پر رکنا ہوگا، اپنا کام کرنے کے بعد وہ لڑکی کو اس کی منزل پر پہنچا دے گا۔''

''میرا یہ خیال درست ہی ہے کہ تم اتنے بڑے ہو جانے تک بہت سادہ ماحول میں رہے ہو۔''

''تمہاری یہ بات میری سمجھ میں قطعی نہیں آئی۔''

''آجائے گی۔'' عدنان نے سر ہلا کر کہا۔ ''تم اپنی مہم جاری رکھو۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ لڑکی تمہیں اسی علاقے میں ملے گی۔''

''ابراہیم جان کا قتل کیوں ہوا؟'' جمال نے پوچھا۔

''معلوم ہوا کہ اس کا قاتل کون ہے؟ تم نے اپنے ماتحت کو کس کی نگرانی پر مامور کیا تھا؟''

''ہاں۔ وہ شبے کی بنا پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابراہیم جان کے قتل میں جس شخص کا ہاتھ ہو سکتا ہے، میں اسے جانتا ہوں۔ اسی لیے اس کی نگرانی کروا رہا ہوں۔''

اس موضوع پر ان دونوں میں مزید بات نہیں ہو سکی۔ ناشتے کے بعد عدنان فوراً ہی اپنے دفتر روانہ ہو گیا تھا۔

اس روز جمال بھی اپنے دفتر گیا لیکن کام میں اس کا دل نہیں لگا۔ اس کے دماغ پر وہی لڑکی چھائی رہی تھی جسے اس نے اپنا آئیڈیل قرار دیا تھا۔ تاہم وہ دفتر کا وقت ختم ہونے تک دفتر ہی میں رہا۔

گھر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ عدنان تین بجے کے قریب آیا تو تھا لیکن چار بجے پھر کہیں چلا گیا تھا۔ اس سے جمال کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوئی۔

''تم اچانک ہی بہت مصروف ہو گئے ہو!'' جمال نے کہا۔

''اس قتل کا ایک پہلو ایسا ہے کہ مجھے جلد از جلد قاتل تک پہنچنا ہے۔ اسی وجہ سے زیادہ مصروف ہو گیا ہوں۔''

''ایسا کیا پہلو ہے؟''

''امید ہے کہ میں دو ایک دن میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد بتاؤں گا تمہیں۔''

جمال نے اس جواب کے بعد بھی عدنان کو کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

وہ گزشتہ رات کی طرح اس رات بھی نو بجے کے قریب ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک خیابان کی سڑک پر اسے ایک لڑکی دکھائی دی جو لفٹ لینے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی۔ جمال اسے نظر انداز کرتا ہوا کار آگے نکال لے گیا اور پھر دس منٹ بعد ہی اسے ایک سڑک کے کنارے اسے وہ دکھائی دے گئی جس کے لیے وہ گزشتہ رات بھی سرگرداں رہ چکا تھا۔

وہ اپنا ہاتھ اسی طرح اٹھائے ہوئے تھی جیسا ایک بار جمال دیکھ چکا تھا۔ اس نے فوراً عقب نما آئینے میں دیکھا کہ کوئی کار اس کے پیچھے تو نہیں آ رہی ہے جسے وہ لڑکی روکنا چاہتی ہو۔

اسے کوئی کار... دکھائی نہیں دی۔ اس نے فوراً رفتار کم کرتے ہوئے اس لڑکی کے قریب پہنچ کر روک دی۔

''کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟'' جمال نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

لڑکی نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ بڑی بے تکلفی سے کار کا دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' جمال نے اپنا سوال دہرایا اور جواب ملنے سے پہلے جلدی سے بول پڑا۔ ''میرا نام جمال ہے۔''

''میرا نام سائرہ ہے۔'' اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

اس نے جواب دیتے ہوئے جمال کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا، سامنے سڑک پر نظر جمائے رہی تھی۔

''اچھا نام ہے۔'' جمال نے کہا اور اپنا سوال پھر دہرایا۔ ''کہاں جائیں گی آپ؟''

''جہاں آپ لے جانا چاہیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا!'' جمال حیران رہ گیا۔

''اسی لیے تو میں نے آپ سے لفٹ مانگی تھی۔''

''کیا آپ کو اپنے گھر نہیں جانا؟'' جمال نے کار کی رفتار کم رکھی۔

''اپنے گھر تو میں جاتی ہی ہوں لیکن ابھی تو آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اس کے بعد اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر بعد میں آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں یا میرے لیے کرائے کی کوئی کار منگوا دیں۔''

''میں..... میں تو.....'' جمال کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

''آپ کا گھر کہاں ہے؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''میرا ابھی کوئی گھر نہیں ہے۔'' جمال نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''اپنا ٹھکانا ابھی بنوا رہا ہوں۔ فی الحال ایک دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''اگر آپ میرے گھر چلنا چاہتے ہیں تو اپنا پتا بتائیے

دیتی ہوں۔'' سائرہ نے کہا اور پھر ایک پتا بتا بھی دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''میں نے وہ علاقہ دیکھا ہے۔ میرا دوست مجھے کراچی کی کافی سیر کرا چکا ہے۔'' اس نے کار کی رفتار بڑھائی۔

سائرہ بولی۔ ''ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ کسی نے میرے ہی گھر جانا چاہا ہو۔''

''آپ کی باتیں میرے لیے الجھی ہوئی ہیں۔''

''کیوں! کیا الجھن ہے؟'' جمال اس کا جواب نہیں دے سکا۔

''آپ خاصے امیر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔'' سائرہ پھر بولی۔ ''جس دوست کے گھر آپ ٹھہرے ہیں، وہ بھی آپ ہی جیسا ہوگا۔ وہاں کے کمرے بھی خاصے آرام دہ ہوتے ہوں گے لیکن میں نے بھی اپنے غریب خانے کے ایک کمرے کو خاصا بہتر بنالیا ہے۔ ابھی بتا چکی ہوں آپ کو۔ بعض افراد میرے ہی گھر جانا چاہتے ہیں اس لیے میں نے ایک کمرا ٹھیک ٹھاک کروالیا ہے۔ وہاں آپ کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔''

جمال کے لیے خوشی کی بات تھی کہ وہ اسے اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی۔

''کوئی اعتراض نہیں ہوگا آپ کے گھر والوں کو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں!'' سائرہ نے جواب دیا۔ ''میرے والد ایک تو بیمار ہیں، دوسرے ان کی سماعت بھی انتہائی کمزور ہے۔ میں نے انہیں بہت اچھا آلۂ سماعت دلوادیا ہے لیکن وہ اسے استعمال نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ انہیں الجھن ہوتی ہے۔''

''میں آپ کے والد کی بیماری کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''خاصی خراب حالت ہے ان کی۔ میں اتنا پیسا جمع کرنے کی کوشش کررہی ہوں کہ انہیں کسی اچھے اسپتال میں داخل کراسکوں۔ ان کا علاج تو اب بھی ہورہا ہے لیکن میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''اگر میں آپ کے والد کے لیے کچھ کرسکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو!''

اب سائرہ نے پہلی مرتبہ جمال کی طرف براہِ راست دیکھا۔

''اتنی پسند آگئی ہوں میں آپ کو؟'' وہ خفیف سا مسکرائی۔

اس وقت جمال نے بھی اس کی طرف غور سے دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہیں سکا۔ وہ ڈرائیونگ سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔

''اس طرف موڑ لیجیے گا۔'' سائرہ نے اشارہ کیا۔

''اب گھر بہت قریب ہے۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ فرلانگ چلنا ہوگا۔''

وہ متوسط درجے کے لوگوں کا علاقہ تھا۔ سائرہ نے کار جس طرف مڑوائی تھی، وہ وہاں کے مکانوں کی عقبی گلی معلوم ہوتی تھی۔

''میں اپنے کسی بھی مہمان کو سامنے کے دروازے سے نہیں لے جاتی۔'' سائرہ نے کہا۔ ''اس طرف سے پہلے بابا کے کمرے سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''تو..... تو کیا..... چھپ کر!'' جمال کے لہجے میں لکنت آگئی۔ اب اس کے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہونے لگے تھے۔

عدنان کی یہ بات درست ہی تھی کہ جمال کی تربیت کچھ خاص اور سادہ انداز میں ہوئی تھی۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھا۔

''بس! اس دروازے کے پاس گاڑی روک دیجیے۔'' سائرہ بولی۔ ''وہ جو کتا بیٹھا ہوا ہے وہاں۔''

جمال اب ذہنی انتشار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس نے کار وہیں روکی جہاں سائرہ رکوانا چاہتی تھی۔ کتا کار سے گھبرا کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

''کار مقفل کرنا نہ بھول جایئے گا۔'' سائرہ نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

جمال کا دماغ اس وقت ہوا میں اڑا جارہا تھا۔ اب متعدد خیالات اس کے دماغ میں جنم لے چکے تھے اور اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیلا رہے تھے۔ جو کچھ سوچنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، وہ اب کسی اژدہے کی طرح اس کے سارے وجود کو لپیٹتے چلے جارہے تھے۔

مکان کے عقبی دروازے میں قفل لگا ہوا تھا جو سائرہ ہی نے کھولا اور پلٹ کر جمال سے بولی۔ ''آیئے!''

جمال کو اس وقت اپنے پیر من من بھر کے محسوس ہورہے تھے۔ وہ کسی طرح سائرہ کے ساتھ مکان کے ایک کمرے میں پہنچا جسے پُرآسائش بنانے کی کوشش تو کی گئی تھی لیکن وہ کسی متمول گھر کا کمرا بہرحال معلوم نہیں ہورہا تھا۔

''بیٹھیے!'' سائرہ بولی۔

جمال نے ایک طرف لگے ہوئے صوفہ سیٹ میں سے ایک صوفے پر بیٹھنا چاہا لیکن سائرہ جلدی سے بولی۔ ''بستر پر، جمال صاحب!''

''نن..... نہیں..... میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' جمال صوفے پر ہی بیٹھ گیا۔

''آپ نے کھلاڑی کی حیثیت سے اس میدان میں شاید پہلی بار قدم رکھا ہے؟'' سائرہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''خیر.....! پہلے تو رقم نکالیے!''

''کیسی رقم؟'' جمال کی آواز بھرا گئی۔

''واقعی، یہ آپ کا پہلا موقع معلوم ہوتا ہے۔'' سائرہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے جب آپ کو رکنے کا اشارہ کیا تھا، اس وقت میرا پورا ہاتھ کھلا ہوا تھا، یعنی پانچوں انگلیاں.....! اس کا مطلب ہے پانچ ہزار.....! میں دو گھنٹے کا معاوضہ پانچ ہزار لیتی ہوں۔''

اب جمال کے لیے کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے پرس نکالا۔

سائرہ بولی۔ ''جو لڑکی تین انگلیوں سے رکنے کا اشارہ کرتی ہے، وہ تین ہزار لیتی ہے اور جو لڑکی چار انگلیوں سے.....''

''میں سمجھ گیا۔'' جمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر سائرہ کی طرف بڑھا دیے۔

''اب آجائیں بستر پر!'' وہ کھڑی ہوئی۔ ''اور اگر پہلے کچھ پینا چاہیں تو اس کا بندوبست بھی ہے لیکن وہ آپ کا اضافی خرچ ہوگا۔''

''میں کچھ نہیں پیوں گا۔''

''تو پھر آیئے بستر پر۔'' سائرہ نے کہا۔ ''آپ دو گھنٹے میں سے پانچ دس منٹ پہلے ہی ضائع کر چکے ہیں۔''

''نہیں۔'' جمال اب پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ ''یہ پانچ ہزار میں نے تمہیں اس لیے دیے ہیں کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی باتیں؟'' سائرہ سنجیدگی سے بولی، پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ساری رات کے لیے کیا لیتی ہو؟''

''آپ نئے ہیں اس لیے آپ سے رعایت کروں گی۔ بیس ہزار دے دیجیے گا۔''

''اور مہینے بھر کے؟''

''کیا مطلب؟'' سائرہ نے کچھ حیرت ظاہر کی۔

''میں کل ہی کسی چھوٹے موٹے مکان، فلیٹ یا اپارٹمنٹ کا بندوبست کرلوں گا۔ تمہیں ایک مہینے وہیں رہنا ہوگا۔''

''نہیں۔'' سائرہ کے لہجے میں سختی تھی۔ ''یہاں مجھے اپنے بیمار باپ کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتی۔''

''تمہارے والد کو میں اسپتال میں بھی داخل کروادوں گا۔''

''اس قسم کی باتیں پہلے بھی دو ایک نے کی ہیں۔'' سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن میں اس قسم کی باتوں میں نہیں آنا چاہتی۔ آپ نئے ہیں اس لیے آپ نے جو وقت ضائع کیا ہے، میں اسے بھول جاؤں گی۔ آپ بستر پر دو گھنٹے ہی گزار لیجیے گا۔''

''میں بستر پر ایک منٹ بھی نہیں گزارنا چاہتا۔''

''تو پھر آپ جاسکتے ہیں۔'' سائرہ نے کہا اور تین ہزار روپے جمال کی گود میں پھینک دیے۔ ''میں دو ہزار اس لیے اپنے پاس رکھ رہی ہوں کہ آپ نے میرا خاصا وقت ضائع کیا ہے۔ اب مجھے پھر کسی کی تلاش میں جانا ہوگا۔''

''دیکھو سائرہ.....! اگر میں صرف باتیں کرنے کے لیے تمہیں پانچ ہزار دے رہا ہوں تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟''

''میں ناجائز کام کا بھی ناجائز پیسا لینا پسند نہیں کرتی۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اور.....''

جمال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سائرہ نے قدرے بلند آواز میں کسی کو ''ولی خان'' کے نام سے پکارا۔

کمرے کے دو دروازے تھے۔ فوراً ہی اندرونی دروازہ کھلا۔ ایک لمبا تڑنگا شخص اندر آگیا جو حلیے ہی سے غنڈا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا فوری طور پر اندر آنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوگا۔ اس نے جمال پر ایک نظر ڈالی اور پھر سوالیہ انداز میں سائرہ کی طرف دیکھا۔

''ان صاحب کی کار باہر کھڑی ہے۔'' سائرہ نے جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں عزت سے ان کی کار تک پہنچا دو۔''

پھر اس نے نہ تو ولی خان کی کسی بات کا انتظار کیا، نہ جمال کی طرف دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

''سائرہ پلیز!'' جمال جلدی سے بولا۔

سائرہ نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں اور کمرے سے چلی گئی۔

قریب ہی ایک کمرے میں جاکر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جلد ہی ولی خان اس کمرے میں آیا۔

''بھگا دیا اسے!'' وہ بولا پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا بائیک نکالوں؟''

''کیوں؟''

''اس بے وقوف نے تو وقت خراب کیا۔ اب دوبارہ نہیں جاؤ گی کیا؟''

''نہیں۔'' سائرہ نے جواب دیا۔ ''طبیعت عجیب سی ہوگئی ہے۔''

ولی خان چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر چلا گیا۔

سائرہ خالی خالی آنکھوں سے چھت تکتی رہی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ اس کے تصور میں ایک کمرا ابھر آتا تھا جہاں کچھ لوگ بیٹھے کسی لڑکی کی شادی کے بارے میں بات کررہے تھے۔

''اب ہم دوسری بار آئے ہیں شیخ صاحب!'' ایک شخص بولا۔ ''اتنے دن میں آپ نے کچھ سوچ تو لیا ہوگا، فیصلہ تو کرلیا ہوگا۔ پھر بات تو ایسی ہے کہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈپٹی صاحب حکومت کے اہم آدمیوں میں سے ہیں۔ آپ کی بیٹی سے ان کی عمر زیادہ ہے لیکن ایسی شادیاں ہوتی تو ہیں۔ دولت مند آدمی ہیں۔ پہلے سے کوئی اور بیوی اور بچے بھی نہیں ہیں۔ آپ کی بیٹی عیش کرے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے غلام بیگ!'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''پھر بھی عمر کا فرق تو کھٹکے گا۔ ہماری بیٹی پندرہ سال کی ہے اور وہ چالیس سے بھی شاید زیادہ کے ہیں۔''

''تو پھر آپ کی طرف سے انکار سمجھا جائے؟'' غلام بیگ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اب میں زیادہ وقت خراب نہیں کرسکتا۔''

شیخ صاحب نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

غلام بیگ پھر بولا۔ ''شیخانی جی کو تو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ماں یہی چاہے گی کہ اس کی بیٹی شادی کرکے عیش کرے۔''

شیخ صاحب اپنی بیوی کی طرف دیکھتے رہے۔

''اب کچھ بولو تو! بعد میں کوئی اونچ نیچ ہوئی تو مجھ پر ہی ڈال دوگی سب۔''

''اونچ نیچ کیا ہوسکتی ہے شیخ صاحب!'' غلام بیگ بولا۔

''بھائی غلام بیگ! یہ زمانہ ایسا ہے کہ ذرا سی دیر میں کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔'' پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''زیبو سے تو پوچھ لو۔''

''زیب النساء کہیے شیخ صاحب!'' غلام بیگ بولا۔

''اچھا خاصا نام بگاڑ دیا ہے آپ لوگوں نے اس کا۔''

''بڑا نام ہو تو عام طور سے ایسا ہوتا ہے۔'' شیخ صاحب نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو اسے زیبا کہہ لیا کیجیے۔'' غلام بیگ نے تجویز پیش کی۔ ''ڈپٹی صاحب تو شادی ہوجانے کے بعد اسے زیبا ہی کہیں گے۔''

''کیا کہتی ہو؟'' شیخ صاحب پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''ٹھیک ہے۔'' شیخانی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہے تو میں کیا بولوں!''

''تو پھر ہاں ہوئی، شیخ صاحب!'' غلام بیگ چہکا اور اپنا ہاتھ شیخ صاحب کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

دونوں میں مصافحہ ہوا اور آڑ میں کھڑی سب باتیں سنتی ہوئی زیب النسا کے مضطرب چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''بس چٹ منگنی، پٹ بیاہ ہوگا شیخ صاحب!'' غلام بیگ کے لہجے میں چہکار قائم رہی۔ ''ڈپٹی صاحب کی تو باچھیں کھل جائیں گی سن کر۔ انہوں نے جب سے زیبا کو اسکول جاتے دیکھا ہے، تڑپ رہے ہیں اس کے لیے۔ ایک تیر لگا ہے جیسے ان کے سینے پر۔''

سائرہ کے تصور کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب برابر کے کمرے سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آئی۔ کھانسی بھی ایسی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سائرہ جیسے تڑپ کر اٹھی اور دوسرے کمرے کی طرف لپکی۔

☆☆☆

''میں تو سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔'' دوسری صبح عدنان اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ ''لیکن میں چاہتا تھا کہ تم خود ہی حقیقت جانو کہ تمہارا آئیڈیل ایک طوائف ہے۔ اس علاقے میں جہاں جہاں رات کو ایسی لڑکیاں نظر آئیں، سمجھ لو کہ وہ طوائف ہیں۔ سال بھر پہلے جب بازارِ حسن حکومت نے بند کرایا تو طوائفوں نے نئے نئے ڈھنگ اختیار کرلیے ہیں۔''

''کیا اس علاقے کی پولیس نہیں جانتی کہ ان سڑکوں پر کھڑی یہ لڑکیاں کیا ہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''ممکن ہی نہیں کہ پولیس بے خبر ہو۔ بھتّا ملتا ہے اس علاقے کے تھانوں کو ان طوائفوں سے۔''

''تم کوئی ایکشن کیوں نہیں لیتے؟''

''پولیس کے ہر محکمے کو اپنے دائرے میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ میرا تعلق اینٹی کرپشن سے نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اس تھانے سے بھتے کا کچھ حصہ اوپر بھی جاتا ہے۔''

''یعنی آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

''وہ تو ہے اور پولیس میں ہی کیا، ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ جدھر نظر دوڑاؤ گے، آوے کا آوا بگڑا نظر آئے گا۔'' عدنان نے خاموش ہو کر ٹھنڈی سانس لی۔ ''سارے معاشرے کے سامنے میں اکیلا تو ڈٹ نہیں سکتا۔ وہی ایک چنے اور بھاڑ کا معاملہ ہے۔''

جمال کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر اداسی نظر آ رہی تھی۔

عدنان پھر بولا۔ ''اب تم نے جان لیا ہے کہ وہ طوائف ہے لہٰذا اب اپنا موڈ تو ٹھیک کرو۔''

''وہ طوئف ہوتے ہوئے بھی مجھے طوائف نہیں معلوم ہوتی۔''

''تو کیا جنت کی اپسرا ہوگی وہ!'' عدنان نے منہ بنایا۔

''کوئی مجبوری بھی کسی کو برائیوں کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ میں جاننا چاہوں گا کی اسے کیا مجبوری لاحق ہوئی کہ وہ.....''

عدنان نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجبوری جان بھی لوگے تو کیا کرو گے؟''

''اسے اس دھندے سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔''

''ناولوں کے ہیرو بننا چاہتے ہو؟'' عدنان نے منہ بنایا۔

''ناولوں میں بھی کچھ حقیقت ہوتی ہے۔ مصنف ایسے معاشروں کی تڑپ میں ہی قلم اٹھاتا ہے۔''

''تو تم یہ کیسے کرو گے؟''

''پہلے تو اس کے طوائف بننے کا سبب معلوم ہونا چاہیے۔''

''تم بتا چکے ہو کہ وہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ وہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں؟''

''اس کا رویہ تو ایسا ہی تھا۔''

''وہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔''

''گویا تمہارے دماغ کے کیڑے کی کلبلاہٹ یہ جان کر بھی ختم نہیں ہوئی کہ وہ ایک طوائف ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔''

''گئے پھر تم کام سے۔'' جمال چپ رہا۔

اسی رات وہ ایک بار پھر اپنی کار میں ڈیفنس کی چھوٹی سڑکیں کھنگال رہا تھا۔ اس نے سائرہ کو دیکھا لیکن نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ آخر وہ ایک ایسی لڑکی کے پاس رکا جس نے چار انگلیوں کا اشارہ دیا تھا، یعنی اس کا ریٹ چار ہزار تھا۔

کار رکتے ہی لڑکی بڑی بے تکلفی سے کار میں آ بیٹھی۔ جمال کار حرکت میں لاتے ہوئے بولا۔ ''کہاں چلنا ہوگا؟''

لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تمہارا گھر نہیں ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔''

لڑکی ہنسی۔ ''ماں باپ سے ڈرتے ہو یا بیوی سے؟''

''کچھ بھی سمجھ لو۔ کیا تمہارے پاس کوئی بندوبست نہیں ہے؟''

''ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کے پیسے الگ ہوں گے۔''

یہ بات سائرہ نے نہیں کہی تھی لیکن جمال نے اس کا حوالہ نہیں دیا اور بولا۔ ''تم جو کہو گی، دے دوں گا۔''

''تو پھر..... ابھی تو سیدھے چلتے رہو۔ میں تمہیں راستہ بتاتی جاؤں گی۔''

جمال نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''یہاں آنے والوں کو میں خوب پہچانتی ہوں۔'' لڑکی بولی۔ ''تم کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نئے آئے ہو؟''

جمال نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا اور بولا۔ ''تمہارا نام؟''

''غزالہ.....اور تمہارا؟''

''جمال۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''تمہیں اس سے کوئی غرض کیوں ہے؟''

''گاہک کو اس کا اسٹیٹس دیکھ کر لوٹا جاتا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''اسٹیٹس!'' جمال زیر لب بولا۔ ''کچھ پڑھی ہوئی ہو؟''

''ایک ٹیچر مجھ پر کچھ دن تک عاشق رہے ہیں، انہی سے انگریزی سیکھی تھوڑی سی۔''

''تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گی لیکن اس کے عوض مجھے بھی وہ سب کچھ ملنا چاہیے جو میں چاہوں۔''

''سر سے پیر تک جو چاہو لے لو۔'' غزالہ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھنا چاہا۔

''نہیں۔'' جمال نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''ابھی نہیں۔ پہلے تمہارا ٹھکانا تو آ جائے۔''

''اندھیرے میں ہر جگہ ٹھکانا ہوتا ہے۔'' وہ بے باکی سے مسکرائی۔ ''قریب میں بکنگ کا کوئی کھمبا نہیں ہے۔''

''سنو!'' جمال نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ان سڑکوں پر یہ کام کرنے والیاں جو ہیں، وہ سبھی ایک دوسرے کو جانتی ہوں گی یا نہیں؟''

''سب جانتی ہیں...... کیوں؟''
''بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا'' جمال نے ٹالا۔
''ایسے ہی تو نہیں پوچھا ہوگا'' غزالہ نے سنجیدگی سے سر ہلایا ''کوئی بات ضرور ہوگی۔''
''جو بات ہوگی، وہ سامنے آجائے گی، تمہارے ٹھکانے پر تو پہنچیں۔''
''لو آگیا ٹھکانا'' غزالہ نے کہا۔
وہ راستہ بتاتی رہی تھی۔ متوسط طبقے کی ایک آبادی کے قریب اس نے کار ایک جگہ روکنے کو کہا۔
''لاک کر دینا۔ تھوڑی دور پیدل چلنا ہوگا۔''
''کیوں؟ تمہارے ٹھکانے تک نہیں جا سکتی کار؟''
''جا سکتی ہے، لیکن محلے والوں کی وجہ سے تھوڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''
جمال نے اس کی بات مان لی اور اس کے ساتھ پیدل چلنے لگا۔
بہت سے متوسط درجے کے علاقوں میں رات گئے بھی کچھ رونق نظر آتی ہے لیکن اس علاقے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اور کہیں سے آنے والی کسی کتے کی آواز ہی اس سکوت کو توڑ رہی تھی۔
ایک ڈیڑھ فرلانگ چلنے کے بعد غزالہ ایک مکان کے دروازے پر رکی اور وہاں نظر آنے والا کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی بجی۔ کچھ وقفے سے بٹن دوبارہ دباتے ہوئے غزالہ بولی۔ ''اماں ذرا کم سنتی ہے۔''
کچھ وقفے کے بعد دوسری طرف سے قدموں کی آواز قریب آتی سنائی دی۔
''تم صرف اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہو؟'' جمال نے پوچھا۔
''ہاں۔'' غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
اسی وقت اندر سے ایک کرخت نسوانی آواز آئی۔
''کون ہے؟''
''
ہوں اماں!'' غزالہ نے جواب دیا۔
ماگیا۔ پس منظر کی روشنی میں عورت کا

''وہی کرخت آواز
میں داخل ہوکر
نہیں سمجھا

''اچھا خاصا نام بگاڑ دیا
''بڑا نام ہو تو عام طور سے

اوسط درجے کے فرنیچر سے آراستہ کمرا دیکھا جو سونے کے لیے استعمال ہوتا ہوگا لیکن وہاں دو کرسیاں اور ایک تپائی بھی تھی۔ ایک گوشے میں بڑی سی الماری تھی۔
غزالہ نے جمال کو بستر پر دھکیلا اور ایک انگڑائی لے کر بولی۔ ''کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ بڑی بے باک تھی۔
''کچھ پینے کو ملے گا؟''
''سب کچھ ہے۔ انگلش چلے گی یا دیسی......؟''
جمال نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس موسم میں انگلش ہی چل سکتی ہے۔'' جمال نے بستر سے اٹھ کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''اس کے چارجز الگ ہوں گے۔''
''ہر بات پر چارجز کی بات کرنا عادت ہے تمہاری؟''
''مفت میں تو کچھ نہیں ہوتا نا'' وہ الماری کی طرف بڑھ گئی۔
جمال کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا اور اس وقت پینا اس لیے ضروری تھا کہ باتیں کرنے میں کچھ وقت گزارا جائے ورنہ طوائف تو اولیت بستر ہی کو دیتی ہے۔
وہ الماری سے مشروب کی نئی بوتل اور دو گلاس نکال لائی۔
''تمہارے ہی خرچ پر میں بھی پیوں گی'' وہ ہنس کر بولی۔ ''دو تین پیگ لوگے یا زیادہ؟''
''دو ہی پیوں گا۔''
''قیمت پوری بوتل کی دینی ہوگی۔''
جمال نے کچھ بوریت محسوس کی اور پرس نکال کر تپائی پر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اپنے سارے چارجز خود نکال لو۔''
''بڑے دیالو ہو پیارے میاں!'' غزالہ مسکراتی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوتل اور گلاس میز پر رکھ دیے تھے۔ پھر یکایک وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''پانی لانا تو بھول ہی گئی، یا سوڈا چاہیے؟ اماں کے کمرے کے فریج میں سوڈا بھی رہتا ہے۔ وہ پانی سے نہیں پیتیں۔''
''ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔'' جمال نے اپنے دل میں کہا۔ پھر غزالہ سے بولا۔ ''پانی ہی لے آؤ۔ سوڈا لاؤ گی تو چارجز اور بڑھ جائیں گے۔''
''وہ تو بڑھیں گے ہی۔'' غزالہ ہنستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جمال اس دوران میں برابر سوچتا رہا تھا کہ اس طوائف سے سائرہ کے بارے میں معلومات ہو سکے گی یا نہیں۔
غزالہ پانی کا جگ اور برف کے کیوب لے آئی۔
''مجھے خیال آیا تھا کہ شاید تم ٹھنڈا پانی پیو۔''

''ٹھنڈے پانی کے چارجز کیا ہیں؟'' جمال نے ماحول کو بے تکلف اور خوش گوار بنانے کے لیے کہا۔

''وہ فری میں ہوگا۔'' غزالہ کو بات بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔ وہ بوتل کھولنے لگی۔ دونوں گلاس میں مشروب انڈیلنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''پانی کتنا لو گے؟''

''گلاس بھر دو۔ میں ہلکی پیتا ہوں۔''

''نئے ہو کیا؟''

''یہی سمجھو۔''

''برف ڈالوں؟''

''بس دو کیوب۔''

گلاس بنانے کے بعد غزالہ نے تپائی پر پڑا ہوا جمال کا پرس اٹھا کر کھولا۔ ''اوہو!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''بہت مالدار معلوم ہوتے ہو۔''

جمال نے کچھ کہے بغیر گلاس اٹھا کر چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

غزالہ نے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر پرس بند کیا اور نوٹ جمال کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''گن لو، چار جز سے زیادہ نہیں نکالے ہیں۔''

''بس ٹھیک ہے۔'' جمال نے پرس لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

غزالہ نے پرس ایک طرف ڈال دیا اور بولی۔ ''تم جس رفتار سے پی رہے ہو، اس میں تو ڈیڑھ گھنٹا بھی گزر سکتا ہے۔ بستر کے لیے بس آدھا گھنٹا بچے گا۔''

''اس کی پروا نہ کرو۔ میں اسی طرح انجوائے کرتا ہوں۔ زیادہ وقت لگ جائے تو پرس میں سے اور نوٹ نکال لینا۔''

''بڑے دیالو ہو جی!'' غزالہ نے ہنس کر کہا اور گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ لے کر بولی۔ ''دو پیگ میں مجھے نشہ نہیں ہوتا، بس سرور ہو جاتا ہے۔''

جمال اس دوران میں برابر سوچتا رہا تھا کہ سائرہ کا ذکر کیسے چھیڑے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے غزالہ سے اسی کی بات کرے اور پھر باتوں باتوں میں سائرہ کا موضوع چھیڑے۔

''گھر میں تمہاری والدہ کے علاوہ کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔ بس میں اور اماں رہتے ہیں۔''

''والد نہیں ہیں؟''

غزالہ ہنسی۔ ''ہم جیسوں کا کوئی باپ بھی ہوتا ہے کیا؟''

''باپ کے بغیر تو اولاد پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' غزالہ کچھ سنجیدہ ہوئی۔ ''لیکن ہم جیسوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا باپ کون ہے؟ جب میں چھوٹی تھی تو بہت سے لوگ اماں سے ملتے تھے۔ انہی میں سے کوئی ہوگا میرا باپ۔ لیکن یہ بس اماں ہی بتا سکتی ہیں کہ میرا باپ کون ہے؟''

''کبھی ان سے پوچھا نہیں؟''

''اب وہ پتا نہیں کہاں ہوگا۔ دوبارہ آیا بھی ہوگا یا نہیں..... بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو دوبارہ نہیں آتے۔''

''یہ تمہارا آبائی پیشہ ہے؟''

''ہاں! میری ماں کی ماں اور اس کی ماں، سبھی اس دھندے میں رہیں۔''

''میں نے سنا ہے بعض لڑکیاں طوائفوں کی اولاد نہیں ہوتیں۔ انہیں بچپن میں ہی اغوا کر کے دھندے میں لے آیا جاتا ہے۔''

''بچیوں ہی کو نہیں، بڑی عمر کی بھی کسی چکر میں پھنس کر آجاتی ہیں۔'' غزالہ نے ایک اور بڑا گھونٹ لیا۔ ''بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی مجبوری سے خود ہی اس دھندے میں آجاتی ہیں۔''

غزالہ نے کہا تو یہی تھا کہ اسے دو پیگ میں نشہ نہیں ہوتا لیکن جمال دیکھ رہا تھا کہ دوسرا بڑا گھونٹ لینے کے بعد ہی اس کی آنکھوں میں سرخی آگئی تھی۔ جمال چاہتا بھی تھا کہ غزالہ کو نشہ ہو جائے اور وہ اس بات پر دھیان ہی نہ دے کہ اس سے یہ باتیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ عام طور پر لوگ اس قسم کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ جمال نے ادھر اُدھر کی دو ایک باتیں اور کیں تاکہ غزالہ کو مزید پینے کا موقع ملے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ غزالہ نے ایک گلاس ختم کر لیا۔ جمال نے اس وقت ایک تہائی بھی نہیں پیا تھا۔

''اور وقت برباد کرو۔'' غزالہ ہنس کر اپنا دوسرا گلاس بنانے لگی۔ ''دو گھنٹے باتوں ہی میں گزار دو۔ مجھے موقع مل جائے کہ تمہارے پرس سے کچھ اور نوٹ نکال لوں۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ میں اسی طرح انجوائے کرتا ہوں۔''

''رات بھر کرتے رہو۔ میری ایک رات کی دہاڑی ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھ رعایت کروں گی۔ بیس ہزار لے لوں گی۔ ویسے پچیس ہزار لیتی ہوں۔ یہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے پاس بہت نوٹ ہیں۔''

''نوٹوں پر گہری نظر رکھتی ہو!''

''دھندا ہی ایسا ہے۔'' وہ پھر ہنسی اور گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لیا۔

''گانا سناؤ کوئی! گانا تو آتا ہوگا تمہیں؟''

''جوانی میں اماں بہت اچھا گاتی تھیں۔ مجھے بھی سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن میرا دل نہیں لگا۔''

''جتنا سیکھا ہے، وہی سناؤ۔ یہ موسیقی کیا ہوتی ہے؟ میرا مطلب ہے، کیسے سیکھائی جاتی ہے؟''

غزالہ موسیقی پر لیکچر دینے لگی۔ اس کا دوسرا گلاس بھی ختم ہوگیا۔ وہ تیسرا گلاس بناتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا تو ایک آدھ گھونٹ ابھی پہلے ہی گلاس میں بچا ہوا ہے۔''

جمال نے محسوس کیا کہ اب غزالہ کو تھوڑا سا نشہ ہوگیا تھا۔

''ایک بات بتاؤ!'' جمال نے اب موقع غنیمت جانا۔ ''کسی ایسی لڑکی کو جانتی ہو جو مجبوراً اس پیشے میں آئی ہو یا اسے جوانی میں اغوا کر کے لایا گیا ہو؟''

''کئی ہیں لیکن.....!'' وہ چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی، پھر تیسرے گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔ گھونٹ لے کر بھی چپ ہی رہی جیسے کسی خیال میں کھو گئی ہو۔

''چپ کیوں ہوگئیں؟'' جمال کو بولنا پڑا۔

''ایک کا خیال آ گیا تھا۔'' غزالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''جانے کیوں مجھے اس سے بہت ہمدردی ہوگئی تھی۔ جب حکومت نے کوٹھا اجاڑا تو میں ہی اسے اس سڑک پر لائی تھی۔''

''کیا نام ہے اس کا؟'' جمال نے پوچھا۔ اس کی خواہش تھی کہ غزالہ کی زبان پر سائرہ ہی کا نام آئے۔

''زیب النساء۔'' غزالہ نے بتایا۔

''کیا!'' جمال چونکا۔ ''زیب النساء؟''

''ہاں۔'' غزالہ اسے گھورنے لگی۔ ''تم اسے جانتے ہو؟''

جمال نے سنبھل کر کہا۔ ''اس نام کی ایک لڑکی کو جانتا تو ہوں لیکن ضروری نہیں کہ تم جس کا ذکر کر رہی ہو، وہی لڑکی ہو جسے میں جانتا ہوں۔ کیا وہ بھی ان سڑکوں پر ہوتی ہے؟''

''ہاں۔'' غزالہ نے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہتی لیکن کال بیل کی آواز سن کر چپ رہ گئی۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ بڑبڑائی۔ ''وہی ہوگا۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ بھی ذرا جلدی آ گیا۔''

''کیا بھول گئی تھیں؟'' جمال نے بے چینی سے پوچھا۔

''میرا ایک پرانا گاہک ہے۔ آج اس نے ایک بجے آنے کے لیے کہا تھا۔'' غزالہ نے گھڑی پر نظر ڈالی پھر کہا۔ ''ایک گھنٹا تو گزار لیا تم نے!''

دروازے پر دستک ہوئی اور وہی کرخت آواز سنائی دی۔ ''اری او غزالہ! وہ آ گیا ہے، تیرا پرانا عاشق۔ اب اسے چلتا کر۔ ایک گھنٹے کے لیے لائی تھی نا اسے!''

''اسے اپنے پاس بٹھاؤ اماں! میں ابھی آتی ہوں۔'' غزالہ نے کسی قدر بلند آواز میں کہا، پھر جو نوٹ اس نے جمال کے پرس سے نکالے تھے، ان میں سے دو نوٹ واپس پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ کرنا کرانا تو ہے نہیں، بس جاؤ اب! میں نے بس ایک گھنٹے کے پیسے لے لیے ہیں۔ بوتل اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے پیسے واپس نہیں کروں گی۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، بس جاؤ۔ میں اپنے مستقل گاہک کو تو نہیں چھوڑ سکتی۔ اماں نے بھی یہی سمجھا ہوگا کہ میں تمہیں ایک گھنٹے کے لیے لائی ہوں۔'' اس نے بوتل جمال کی طرف سرکا دی۔

''تم ایڈوانس بکنگ بھی کرتی ہو؟''

''سبھی کرتی ہیں۔ اب تم جاؤ بھی!'' غزالہ جھنجلا سی گئی۔

''مجھے بھی کل کے لیے بک کر لو۔ گیارہ بجے آؤں گا میں!''

''ایڈوانس بکنگ میں دو گھنٹے کے پانچ ہزار لیتی ہوں۔''

''میں چھ ہزار دوں گا۔''

''بس تو آ جانا کل گیارہ بجے۔'' غزالہ کی جھنجلاہٹ ختم ہوگئی۔

جمال اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس نے پرس اٹھا لیا تھا۔

''اپنی بوتل تو لے جاؤ۔'' غزالہ بولی۔

''کل کے لیے رکھ لو۔'' جمال نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

غزالہ اسے چھوڑنے کے لیے بیرونی دروازے تک آئی۔

''ایک بات بھول گئی۔'' وہ بولی۔ ''ایڈوانس بکنگ کے تین ہزار دیتے جاؤ۔ دیر سے مت آنا۔ میں ایک گھنٹے کے بعد نہیں ملوں گی۔ دھندے پر چلی جاؤں گی اپنے۔''

جمال نے پرس میں سے تین ہزار نکال کر اسے دیے اور باہر نکل آیا۔ اب اس کے قدم اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جسم میں ہلکی سی سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی جس کا سبب زیب النساء کا نام تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچنے تک جو خیالات جمال کے ذہن میں چکراتے رہے تھے، وہی بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ وہ اتنی رات کو گھر آنے لگا تھا کہ عدنان سو چکا ہوتا تھا۔ اس سے ملاقات صبح کے ناشتے پر ہوتی تھی یا شام کی چائے پر، اگر عدنان کوئی مصروفیت نہ ہونے کے باعث گھر پر ہوتا تھا۔

جمال کے ذہن میں جو خیالات چکرا رہے تھے، وہ زیب النساء ہی کا نام سن کر اس کے دماغ میں آئے تھے۔

یہ اس کے لڑکپن کی بات تھی جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہیں زیب النساء بھی پڑھتی تھی۔ جمال اسے پسند کرنے لگا تھا۔ زیب النساء کبھی کبھی اسے بہت غور سے دیکھا کرتی تھی لیکن اس کے تاثرات سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی جمال کو پسند کرنے لگی تھی۔ جمال نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر کوئی کسی کو پسند کرے تو ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اسے پسند کرے لیکن اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ شادی تو وہ زیب النساء ہی سے کرے گا۔ اس میں ایک رکاوٹ یہ نظر آرہی تھی کہ اس کے والدین اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ زیب النساء ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ جمال کے والدین مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے لیے تیار نہ ہوتے لیکن جمال نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ ایسی صورت میں وہ اپنے والدین سے بغاوت کردے گا بشرطیکہ زیب النساء بھی اس کے لیے تیار ہوجاتی۔

پانچ سال کی تعلیم کے دوران میں ایسا کبھی نہیں ہوسکا تھا کہ جمال زیب النساء سے اظہارِ محبت کرتا۔ اس نے بس یہ سوچ لیا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد اپنی ماں سے اس بارے میں بات کرے گا۔

وہ جب میٹرک میں تھا اس وقت زیب النساء آٹھویں جماعت میں تھی۔ اچانک جمال نے محسوس کیا کہ ایک دن زیب النساء بہت اداس نظر آئی تھی۔ دوسرے دن بھی اس کے چہرے سے اداسی نہ ہٹی۔ تیسرے دن جمال نے اسکول جاتے ہوئے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس بارے میں براہِ راست زیب النساء سے بات کرے گا لیکن اس دن زیب النساء اسکول ہی نہیں آئی۔ جمال یہ سوچ کر رہ گیا کہ اسے کوئی مصروفیت ہوگئی ہوگی یا شاید طبیعت کچھ خراب ہو۔

زیب النساء دوسرے دن بھی اسکول نہیں آئی۔ اس دن اس نے چند لڑکیوں کی سرگوشیاں سنیں تو اسے زیب النساء کی اداسی کا سبب معلوم ہوا۔ زیب النساء کی شادی اس کے گھر والوں نے طے کردی تھی اور طے بھی کی تھی ایک عمر دراز شخص سے۔ عمر دراز اس اعتبار سے کہ وہ جمال کے خیال میں چالیس سال سے کم کا نہیں تھا۔ جمال نے اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ حکومتِ وقت کا نہایت اہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسے لوگ عموماً ڈپٹی صاحب کہا کرتے تھے۔ جمال نے اس کا پورا نام بھی کہیں پڑھا تھا، جو اسے یاد نہیں رہا تھا۔

اس دن پاؤں کے نیچے سے زمین نکال دینے والی یہ بات بھی اس کے علم میں آئی کہ زیب النساء کی شادی اسی دن شام کو ہونے والی تھی۔ جمال کا دماغ شل ہوکر رہ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ زیب النساء کا تعاقب کرکے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ اسی دن شادی کی خبر سن کر وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر زیب النساء کے گھر کی طرف دوڑ لگا دیتا لیکن اس کے گھر سے ایک ملازم نے اسکول آکر اطلاع دی کہ اس کے والد کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ والدہ نے جمال کو گھر لانے کے لیے کار بھیجی تھی۔ جمال کو جانا ہی پڑا۔ والد کی طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی کہ انہیں اسپتال لے جاکر داخل کرانا پڑا تھا۔ اسی میں آدھی رات گزر گئی تھی۔ جمال دل مسوس کر رہ گیا تھا لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ شادی سے کچھ پہلے بھی زیب النساء کے گھر پہنچ جاتا تو کیا کرلیتا؟ اسے اتنا اختیار نہیں تھا کہ شادی رکوا دیتا۔

دوسرے دن اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی۔ اسپتال سے معلوم ہوچکا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ جمال ناشتا کرکے گھر سے نکل پڑا۔ کسی سوچ یا ارادے کے بغیر ہی وہ بائیک پر زیب النساء کے گھر پہنچ گیا جہاں ڈیکوریشن والے شامیانہ اور آرائش کے برقی قمقمے نکال کر ٹرک میں ڈال چکے تھے۔

ٹرک جانے کے بعد بھی جمال خالی خالی دماغ کے ساتھ وہیں کھڑا زیب النساء کے گھر کو تک ہی رہا تھا کہ ایک کار وہاں آکر رکی۔ اس میں سے ایک آدمی بڑے غصے میں باہر نکلا اور گھر کا دروازہ پیٹنے لگا۔

شور ہوا تو آس پاس رہنے والے کچھ لوگ بھی وہاں جمع ہوگئے۔ جو آدمی کار میں آیا تھا، وہ ڈپٹی کا کارندہ تھا۔ اس نے شیخ صاحب سے پوچھا تھا کہ ان کی بیٹی کہاں ہے؟

شیخ صاحب اور ان کی بیوی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب انہیں بتایا گیا کہ صبح ڈپٹی کی آنکھ کھلی تو زیب النساء گھر میں نہیں تھی۔ ملازموں نے بتایا کہ وہ پو پھٹتے ہی گھر سے نکل گئی تھی اور وہیں کھڑی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔

''بدچلن لڑکی تھی وہ۔'' ڈپٹی کے کارندے نے چلا کر کہا۔ ''موقع ملتے ہی اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ رپورٹ کرانی پڑے گی پولیس میں۔'' وہ بکتا جھکتا ہوا اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار ہوا ہوگئی۔

جمال اس وقت ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن نے قبول ہی نہیں کی تھی کہ زیب النساء جیسی سادہ مزاج لڑکی کا کوئی عاشق بھی ہوگا جس کے ساتھ وہ بھاگ گئی تھی۔

''اگر اسے بھاگنا ہی تھا تو شادی سے پہلے ہی کیوں

نہیں بھاگی؟''

یہ سوال دماغ میں بسائے جمال اپنے گھر لوٹ آیا۔ اگلے دن کے اخبارات میں بھی یہ خبر آگئی کہ ڈپٹی کی بیوی شادی کی ایک رات گزار کر ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

وقت گزرتا رہا، پھر اس سلسلے میں کوئی خبر سامنے نہیں آئی مگر لوگوں کی زبانی کوئی نہ کوئی متعلقہ بات جمال کے علم میں آتی رہی۔ لوگ ڈپٹی کو شادی کے معاملے میں بدقسمت قرار دینے لگے تھے جس نے پانچ شادیاں کی تھیں اور اس کی سبھی بیویاں گھر چھوڑ کر بھاگتی رہی تھیں۔ کوئی ہفتے بھر بعد بھاگی تھی تو کسی نے ایک مہینا بھی گزار لیا تھا۔

پھر ایک بات سن کر تو جمال سنسنا گیا۔ اس نے اس قسم کی سرگوشیاں سنی تھیں کہ بردہ فروشی تو ڈپٹی کا دھندا ہی تھا۔ وہ شادیاں کر کے یا لڑکیوں کو اغوا کروا کے بیچتا رہا تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں اس نے امارات کے بعض افراد کو فروخت کی تھیں جن سے اس کو بہت پیسا ملا تھا۔ اسی طرح ڈپٹی دولت مند بن سکا تھا۔

یہ بات جاننے کے بعد تو جمال اس کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ ڈپٹی کے خلاف محاذ کھڑا کر دے لیکن لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ڈپٹی سیاسی طور پر بہت طاقتور ہو چکا تھا۔ کئی افراد اس سے ٹکرانا چاہتے تھے لیکن ہمت نہیں کر سکے تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد جمال سیکنڈ ایئر تک پہنچ گیا۔ زیب النساء کی یاد دھیمی پڑتی چلی گئی۔ وہ قیس و فرہاد کا جانشین نہ سہی لیکن زیب النساء اسے کبھی کبھی یاد ضرور آتی تھی۔ وہ اسے تصور میں دیکھتا کہ اس عرصے میں اس کے نقوش کس حد تک تبدیل ہوئے ہوں گے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تصور پر زیب النساء کے نقوش خاصے بدل گئے اور پھر وہ ہیولا ہی اس کا آئیڈیل بن گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب شادی کرے گا تو کسی ایسی ہی لڑکی سے جو اس کے آئیڈیل جیسی نہ بھی ہو تو اس کے آئیڈیل سے قریب تر ہو۔

یہ بات اسے سائرہ میں دکھائی دی تھی اور اب وہ اس کا دیوانہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے اس کا ماضی کھوجنے کی دھن بھی اس پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ اس کے لڑکپن کی زیب النساء ہی ہے یا کوئی اور ہے۔

اگر وہ کوئی اور بھی ثابت ہوتی اور جمال کو یہ معلوم ہوتا کہ اس بدنصیب کے ساتھ بھی کوئی زیادتی ہوئی ہے تو وہ اسے اس گندے دھندے سے نکالنے کی کوشش کرتا۔

دوسرے دن صبح حسبِ معمول عدنان سے ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی۔

''تم کل رات بھی غائب رہے۔'' عدنان بولا ''ملازموں سے معلوم ہوا تھا کہ دن بھر گھر میں بھی نہیں رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دفتر بھی نہیں جا رہے ہو۔ کیوں اپنا بزنس تباہ کرنے پر تل گئے ہو؟''

''میں نے ایک بہت شریف شخص کو دفتر کی ذمہ داری سونپی ہے۔ مکمل بھروسا ہے مجھے اس پر۔''

''نقصان انہی لوگوں سے پہنچتا ہے جن پر بھروسا کیا جاتا ہے۔ جن پر بھروسا نہ ہو، ان سے تو انسان خود بچ کر رہتا ہے۔''

''میں مجبور ہوں عدنان!'' جمال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری محبت اتنی شدید ہے۔''

''تو کر کیا رہے ہو؟''

''سائرہ کا ماضی جاننے کی کوشش۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''آج میں تمہیں اپنے ماضی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔''

عدنان سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جمال نے بے کم و کاست زیب النساء سے اپنی محبت کی کہانی سنا دی۔

''تو کیا.....'' عدنان بولا۔ ''کیا سائرہ ہی زیب النساء ہے؟''

''نہیں، وہ تو زیب النساء نہیں ہے لیکن مجھے بہ تدریج یہ احساس ہوا ہے کہ وہ زیب النساء سے بہت ملتی جلتی ہے۔'' جمال نے اپنے احساسات کی وضاحت بھی کی۔

''تو پھر؟'' عدنان بولا۔ ''عجیب بات کر رہے ہو۔ ایک طرف کہہ رہے ہو کہ وہ زیب النساء سے ملتی جلتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہے ہو کہ وہ زیب النساء نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے ایک زیب النساء کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔''

''کیسے؟''

جمال نے غزالہ سے اپنی ملاقات کا حال سنا کر کہا۔ ''اس کے ایک پرانے گاہک کی وجہ سے پوری بات نہیں معلوم ہو سکی لیکن آج شاید معلوم ہو جائے۔ میں رات کو غزالہ سے ملنے جاؤں گا۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ وہ وہی زیب النساء ہو گی جس سے تم محبت کرنے لگے تھے؟''

''نہیں، ضروری نہیں ہے۔ شاید وہ کوئی اور زیب النساء ہو لیکن میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس چکر میں وقت گزار کر تم اپنے بزنس میں نقصان اٹھا سکتے ہو۔''

''اب جو بھی قسمت میں لکھا ہو۔ میں اپنی زیب النساء کو بھی ڈھونڈنا چاہتا ہوں اور اگر سائرہ کسی مجبوری کے سبب اس گھناؤنی زندگی میں آئی ہے تو اسے بھی اس گندگی سے نکالنا چاہوں گا۔''

''ایسی لڑکیاں تو بہت ہوں گی جو کسی مجبوری کے باعث اس زندگی میں آئی ہوں۔ تم کس کس کو وہاں سے نکالو گے؟''

''سب کو تو میں جان ہی نہیں سکتا لیکن سائرہ کو تو جان گیا ہوں۔ اگر میں ایک لڑکی کو بھی اس زندگی سے نکال سکوں تو کیا یہ ایک اچھا کام نہیں ہوگا؟''

''اچھا کام تو ہوگا لیکن تم اس چکر میں برباد ہو سکتے ہو۔ کہہ تو دیا تم نے کہ جو بھی قسمت میں لکھا ہو لیکن قسمت انسان اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔''

''میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا عدنان!'' جمال کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اچھا!'' عدنان ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

جب وہ دفتر چلا گیا تو جمال اپنے کمرے میں آ کر ڈائری لکھنے لگا۔ اپنی زندگی کے بارے میں لکھتے رہنے کا شوق اسے نوعمری ہی سے تھا اور لکھتے لکھتے اب اس کی تحریر میں اتنی پختگی آ گئی تھی کہ شاید وہ افسانہ نگار بھی بن سکتا تھا لیکن اس کے دماغ میں یہ خیال کبھی آیا نہیں تھا۔

ڈائری لکھ کر وہ لیٹ گیا۔ اس کے دماغ میں زیب النساء، غزالہ اور سائرہ کے خیالات چکراتے رہے۔

شام کی چائے پر عدنان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ اس وقت کہیں مصروف ہوگا۔ رات کے کھانے پر اس سے ملاقات ہوئی لیکن عدنان نے زیب النساء یا سائرہ کا ذکر چھیڑنے سے گریز کیا۔

جمال ایسے وقت پر گھر سے روانہ ہوا کہ گیارہ بجے تک غزالہ کے گھر پہنچ جائے۔ اور وہ پہنچ بھی گیا۔ غزالہ نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ دولت مند لوگوں سے اس طرح ملنا طوائفوں کا پیشہ ہوتا ہے۔

''پہلے تو تم انجوائے کرو گے؟'' اس نے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس وقت کہا جب جمال کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''ہوں۔'' جمال خفیف سا مسکرا دیا۔

غزالہ نے مشروب اور اس کے لوازمات سے تپائی سجا دی۔ اس رات اس نے ڈرائی فروٹ کا بھی بندوبست کر رکھا۔

جمال بولا۔ ''بوتل تو یہ وہی ہے جو میں کل چھوڑ گیا تھا۔''

''میں امانت میں خیانت نہیں کرتی۔'' غزالہ نے گلاسوں میں مشروب ڈالتے ہوئے کہا۔

''شاعری سے کچھ دلچسپی ہے؟'' جمال فوراً زیب النساء کی بات نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔

''بس گانے کی حد تک۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تم سیکھ نہیں سکیں!''

''ہاں، گانا تو نہیں سیکھ سکی لیکن سننے کا شوق تو ہے۔''

''کوٹھے پر بیٹھنے والیوں کو تو گانا آنا چاہیے۔''

''ضروری تھوڑی ہے۔ بعض بہت اچھا گاتی تھیں۔''

جواب دیتے ہوئے غزالہ کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ گلاس بس ہونٹوں تک لے جا سکی، گھونٹ نہیں لیا۔

''کوئی خیال آ گیا تمہیں شاید۔''

غزالہ چونکی پھر گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ''زیب النساء بہت اچھا گاتی تھی۔ اسی کا خیال آ گیا تھا۔''

جمال کو خوشی ہوئی کہ خود غزالہ ہی نے زیب النساء کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

وہ بولا۔ ''کل تم نے جس کا نام لیا تھا، وہی زیب النساء؟''

''ہاں۔''

''تم نے شاید یہ بھی بتایا تھا کہ تم اس سے کچھ محبت کرنے لگی تھیں۔''

''ہاں۔ محبت تو مجھے اس سے اب بھی ہے۔ وہ اب بھی گا سکتی ہے لیکن کبھی کبھی بس گنگناتی ہے اور وہ کبھی بڑے درد بھرے گیت۔''

''اس سے تمہاری محبت کی وجہ؟''

''محبت کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی اور اگر بہت سوچوں تو بس یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کی مجبوری ہی شاید میری محبت کی وجہ ہو۔ ویسے تو بہت سی لڑکیاں اغوا کر کے لائی جاتی ہیں، بازار میں بیچی جاتی ہیں لیکن جو حالت زیب النساء کی ہوئی تھی، ویسی حالت میں نے کسی اور کی نہیں دیکھی۔''

''کیا ہو گیا تھا اسے؟''

''شروع میں تو اتنی روئی تھی کہ بیمار پڑ گئی تھی۔ دو مہینے علاج ہوا تھا اس کا۔ پھر جب پہلی بار اسے ایک مرد کے ساتھ کمرے میں بند کیا گیا تھا تو پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی اس پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے۔ ایسی حالت میں نے کسی لڑکی کی نہیں دیکھی۔ اسی لیے مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں اسی ہمدردی کو

محبت کہتی ہوں، یا شاید محبت ہی ہوگئی ہو مجھے۔''

''اس سے باتیں کرتی تھیں تم؟''

''ہاں۔ جب بھی تنہائی میں اس سے بات کرنے کا وقت ملتا تھا، سمجھایا کرتی تھی میں اسے!''

''کیا سمجھاتی تھیں؟''

''یہی کہ اب اسے اپنی حالت سے سمجھوتا کرلینا چاہیے۔ کوٹھے پر لائی جانے والی لڑکیاں یہاں سے کبھی کہیں نہیں جاسکتیں۔''

''تو مان لی تھی اس نے تمہاری بات؟''

''مان تو لی تھی لیکن بہت دنوں بعد۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''ڈیڑھ سال تو ضرور لگ گیا ہوگا۔''

''اور اس دوران میں بکتی بھی رہی تھی؟''

''وہ تو ہوا ہی ہوگا لیکن بکتی وہ کم ہی تھی۔''

''کیوں؟''

''گانا اچھا گاتی تھی نا! نائکہ نے اس سے مجرا کروانا شروع کردیا تھا۔ اسی میں بہت پیسے آجاتے تھے۔ بس کبھی کوئی بہت ہی تنگڑی اسامی مل جاتی تھی تو نائکہ اس کی ایک رات بہت بڑی رقم میں بیچتی تھی۔''

''تو اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا؟''

''سمجھوتا بھی ایسا کہ ہر وقت گم صم اور اداس رہتی تھی۔ گانے کے لیے بھی مجبوراً تیار ہوتی تھی۔ اس کے گلے میں سوز بھی بہت بڑھ گیا تھا۔'' غزالہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بے چاری۔''

''کوٹھے پر اسے کون لایا تھا؟ کس نے بیچا تھا؟ کہاں سے لایا گیا تھا اسے؟'' جمال نے پے در پے تین سوال کرڈالے۔

''یہ تو میں نہیں بتاؤں گی۔'' غزالہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟ تمہیں بتایا تو ہوگا اس نے!''

''بتایا تھا لیکن یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ میں وہ سب کچھ کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یا اس کے گھر والوں کو معلوم ہو۔''

''مجھے بہت دلچسپی ہوگئی ہے اس سے۔''

''گلاس ختم کرو۔'' غزالہ نے منہ بنایا۔ ''ابھی تک آدھا بھی نہیں پیا۔''

جمال نے دو بڑے بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کردیا اور بولا۔ ''اب تو بتاؤ!''

غزالہ ہنسی۔ ''یہ شرط تھوڑی تھی میری کہ جلدی پیو گے تو میں بتادوں گی۔''

''کوئی اور شرط رکھ لو۔ بڑی سے بڑی شرط، لیکن مجھے اس کے بارے میں بتاؤ ضرور!''

''میں کسی قیمت پر اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔''

''پلیز غزالہ!'' جمال گڑگڑایا۔

غزالہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''کیا ہوگیا ہے تمہیں، پیارے صاب!''

جمال نے بوتل اٹھائی اور اس سے اپنا آدھا گلاس بھرلیا۔

''یہ..... یہ کیا کررہے ہو!'' غزالہ کے لہجے میں لکنت آگئی۔ ''تم عادی نہیں معلوم ہوتے اس کے! اتنی پیو گے تو ہوش کھو بیٹھو گے۔''

جمال نے اس کی بات ان سنی کردی اور باقی آدھا گلاس پانی سے بھرا۔ وہ یکایک شدید جذباتی ہوگیا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ بات اسی زیب النساء کی ہورہی ہے جس سے وہ محبت کرتا تھا۔

''رک جاؤ پیارے صاب!'' غزالہ نے جمال کو گلاس اٹھاتے دیکھ کر کہا۔

جمال نے اب بھی اس کی پروا نہیں کی اور ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ لگ گئی۔ ساتھ ہی بڑے زور کی کھانسی آئی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے گر جاتا اگر غزالہ جلدی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لے نہ لیتی۔ گلاس تپائی پر رکھ کر وہ جمال کی کرسی کے پاس فرش پر بیٹھ گئی اور جمال کی پیٹھ سہلانے لگی۔

''میں نے تمہیں روکا تھا نا!'' وہ پیٹھ سہلاتی رہی۔

کچھ کوشش سے جمال کی کھانسی رکی اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ کھانسی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ غزالہ نے اپنی قمیص سے اس کی آنکھیں خشک کیں۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ اٹھ کر اس نے اپنی کرسی جمال کی کرسی کے برابر میں کرلی اور بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ اچانک تمہیں ہوکیا گیا ہے؟''

جمال نے پھر گلاس اٹھایا۔

''ارے ارے!'' غزالہ نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے پینے سے روکنے کی کوشش کی۔

''پینے دو مجھے!'' جمال نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔ ''اب میں بڑا گھونٹ نہیں لوں گا۔''

اسی وقت دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور غزالہ کی ماں کی آواز آئی۔ ''کیا ہوگیا غزالہ! اتنی زور کی کھانسی؟''

''ہوجاتا ہے کبھی اماں!'' غزالہ نے جواب دیا۔

''تم جاؤ۔ اب ٹھیک ہے سب۔''

''کلائی چھوڑو میری۔'' جمال نے زور لگایا تو مشروب چھلک گیا۔

''چھوڑتی ہوں۔'' غزالہ نے اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اتنا بڑا گھونٹ نہیں لینا۔''

''کہا تو ہے۔'' جمال نے کسی قدر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ''اب بڑا گھونٹ نہیں لوں گا۔''

غزالہ نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ جمال نے چھوٹا ہی گھونٹ لیا تھا اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

غزالہ نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور غور سے جمال کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زیب النساء کے معاملے میں وہ اتنا جذباتی کیوں ہوگیا تھا، اور وہ یہ بات سمجھ بھی نہیں سکتی تھی۔

جمال اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بولا۔ ''تم نے یہ کیوں کہا کہ تم کسی قیمت پر اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتیں۔''

''اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ ہر معاملے میں اس کا ساتھ دیتی رہی ہوں اور دیتی رہوں گی۔''

''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گی تو میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔'' جمال نے ایک گھونٹ اور لیا۔

''تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟''

''مجھے یہ بہت برا لگتا ہے کہ شریف لڑکیوں کو زبردستی اس پیشے میں دھکیلا گیا ہو۔''

''تمہاری اس بات سے لگتا ہے کہ تم ایک اچھے آدمی ہو۔ تمہیں تو میرے پاس نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں؟'' جمال نے کہہ کر پھر ایک گھونٹ لیا۔

''اب تم تیزی سے پینے لگے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''یہ تم نے کیوں کہا کہ مجھے تمہارے پاس نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

''اس لیے کہ..... میں کہہ تو چکی ہوں کہ تم ایک اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو اور میں ایک طوائف ہوں۔''

''میں نے سوچا تھا کہ تم سے کسی کے بارے میں پوچھوں گا۔ اتفاق سے تم نے زیب النساء کا نام لے لیا۔ میں اس کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔''

''صرف اس لیے آئے ہو میرے پاس؟''

''ہاں۔'' جمال نے کہہ کر ایک گھونٹ اور لیا اور گلاس خالی ہوگیا۔

''تم باز نہیں آرہے ہو۔ اتنی تیزی سے پیو گے تو.....''

''پینے دو مجھے!'' جمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں۔'' غزالہ نے جلدی سے بوتل تپائی سے اٹھالی۔

''پلیز! پینے دو مجھے۔''

''آخر تمہیں ہوکیا گیا ہے؟'' غزالہ نے یہ سوال پھر کیا۔

جمال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظر غزالہ کے ہاتھ میں دبی ہوئی بوتل کی طرف تھی۔ جھومنے تو وہ لگا ہی تھا، اب اس کی آنکھیں بھی کھلنے بند ہونے لگیں۔ مشروب بہت تیزی سے اثر کر چکا تھا۔

''تھوڑی سی..... اور!'' جمال کی آواز ڈگمگا رہی تھی۔

''نہیں۔'' غزالہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب ایک قطرہ بھی نہیں۔ یہ میں تمہارے سامنے سے ہٹا ہی دیتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوئی۔ ''الماری میں رکھ دیتی ہوں۔''

''پی..... لیز!'' جمال نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو ایسا لگا جیسے کرسی سمیت لڑھک جائے گا۔ غزالہ نے یہ محسوس کیا تو جلدی سے بوتل رکھ کر جمال کی بغل میں ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''بستر پر چلو۔''

اس نے محسوس کیا تھا کہ جمال کو اگر بستر پر لٹا نہ دیا گیا تو وہ ضرور گر پڑے گا۔

''نہیں۔'' جمال نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے دو..... اور دو..... یا..... یا.....'' وہ پھر گرنے لگا۔

غزالہ نے اسے بہ مشکل گرنے سے روکا اور بولی۔ ''بستر پر چل کر بیٹھو گے تو ایک گلاس اور بنادوں گی۔''

''پکی..... پکی بات!'' جمال عجیب سے انداز سے ہنسا۔

''ہاں۔'' غزالہ نے کہا لیکن مزید مشروب پلانے کی بات اس نے اس لیے کہی تھی کہ جمال بستر پر جانے کے لیے آمادہ ہوجائے۔ اس کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ جمال نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ غزالہ صرف اپنی طاقت سے تو اسے بستر تک نہیں لے جاسکتی تھی۔

جمال بستر پر جا کر بیٹھا اور لڑھک گیا۔ غزالہ کو بھی یہی خیال تھا کہ وہ اب خود کو سنبھال نہیں سکتا۔

''لاؤ..... دو..... ایک گلاس۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بڑبڑایا۔ ''یا..... یا پھر..... اسے بلاؤ..... وہ مجھے..... ضرور پلائے گی۔''

''کون؟'' غزالہ نے فرش پر بیٹھ کر جمال کی لٹکی ہوئی ٹانگیں بھی بستر پر کردیں۔

''کون.....؟ تم..... نہیں جانتیں.....؟ وہ.....

وہ..... کیا نام.....'' اور پھر اس کا منہ بند ہوگیا۔ آنکھیں پہلے ہی بند تھیں۔

☆☆☆

غزالہ نے ایک کرسی بستر کے قریب کرلی اور اس پر بیٹھ کر جمال کی طرف ہمدردی سے دیکھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ بات صرف اتنی نہیں تھی جو جمال نے زیب النساء کے بارے میں کہی تھی۔ معاملہ کچھ اور تھا۔ کسی قسم کے جذبات شامل تھے اس کی باتوں میں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شاید وہی ہو جس سے زیب النساء محبت کرتی تھی اور یہ شخص بھی زیب النساء کی محبت میں گرفتار ہو۔

ایک منٹ بعد غزالہ کرسی سے اٹھی اور جمال کے جوتے اتارنے لگی۔ جوتوں کے بعد موزے بھی اتارے تاکہ جمال اطمینان سے سوتا رہے۔ جمال سے اس کی ہمدردی صرف اسی خیال سے جاگی تھی کہ وہ زیب النساء کا محبوب ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ شاید ایک سبب یہ بھی ہو کہ طوائف ہونے کے باوجود اس کے جسم میں دوڑنے والا خون کسی ایسے عیاش شخص کا ہو جو نسبی طور پر کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔

جمال سو چکا تھا۔ غزالہ کرسی پر بیٹھ کر پھر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب اسے وہ واقعات بھی یاد آرہے تھے جو زیب النساء نے اسے اپنے بارے میں بتائے تھے۔ وہ ایک غریب لیکن شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد کو سب شیخ صاحب کہا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کی شادی ایک بڑے سیاسی آدمی سے طے کردی تھی جو ''ڈپٹی'' کے نام سے مشہور تھا۔ زیب النساء کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس کے رونے کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ اس کی شادی ایک ایسے آدمی سے طے کی گئی تھی جو عمر میں اس سے بڑا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اسکول کے ایک لڑکے رضوان کو چاہتی تھی۔ رضوان بھی اسے پسند کرتا تھا۔ دونوں میں عہد و پیماں بھی ہوچکے تھے لیکن سب کچھ اتنی احتیاط سے ہوا تھا کہ اسکول میں کسی کو بھی ان کی محبت کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

یہ باتیں یاد کرتے ہوئے غزالہ کو یہ خیال بھی آیا کہ جمال نے کیا اسے اپنا نام غلط بتایا تھا؟ دراصل کیا یہ رضوان ہے؟

جب جمال جاگتا یا اسے ہوش آتا تو غزالہ اس سلسلے میں اسے کرید سکتی تھی۔

زیب النساء نے بتایا کہ ڈپٹی نے ایک رات تو اس کے ساتھ گزاری تھی لیکن اس کے بعد زیب النساء نہ جانے کیسے بے ہوش ہوگئی تھی۔ پھر ہوش میں آنے پر اس نے خود کو بالاخانے پر پایا تھا۔

اس کی بالاخانے کی زندگی کا احوال وہ غزالہ کو سنا ہی چکی تھی۔ یہ راز بعد میں کھلا تھا کہ اسے فروخت کرنے والا خود ڈپٹی تھا۔ اس نے زیب النساء کے بعد بھی ایک لڑکی وہاں بھجوائی تھی۔ یہ کام اس کے ملازم ہی کرتے تھے، لیکن پس پردہ کون تھا؟ نائکہ اس بات سے واقف تھی۔ غزالہ نے ایک مرتبہ اس کی اور ڈپٹی کے کارندوں کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ پھر اپنے کچھ گاہکوں ہی کی زبان سے کچھ ایسی باتیں بھی سنی تھیں کہ ڈپٹی بنیادی طور پر ایک بردہ فروش ہی تھا۔ اس نے دولت ہی اس طرح جمع کی تھی اور سیاست میں پڑ کر ایک سیاسی جماعت کی آشیر باد بھی حاصل کرلی تھی تاکہ اگر کبھی پولیس کو اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہو تو وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

غزالہ کا خیال تھا کہ جب عام لوگ ڈپٹی کے بارے میں یہ سرگوشیاں کرنے لگے تھے تو ناممکن تھا کہ پولیس کو اس کا علم نہ ہوسکا ہو لیکن اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی کہ پولیس نے اس سلسلے میں کوئی چھوٹا موٹا ہی اقدام کیا ہو۔

غزالہ نے یہ بات زیب النساء کو نہیں بتائی تھی کیونکہ زیب النساء کئی مرتبہ اس کے سامنے قسم کھا چکی تھی کہ اگر اسے کبھی معلوم ہوگیا کہ اسے بالاخانے تک پہنچانے والا کون ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی خواہ اس کے بعد اس کی باقی زندگی جیل ہی میں گزرے۔

زیب النساء سے یہ بات چھپانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ غزالہ کو ڈپٹی سے کوئی ہمدردی تھی۔ دراصل اسے صرف یہ ڈر تھا کہ زیب النساء ڈپٹی تک پہنچنے کی کوشش میں خود کو ہی کسی قسم کا نقصان پہنچالے گی۔ ڈپٹی تک پہنچنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں، قریب قریب ناممکن تھا۔ اس کے ساتھ ہر وقت سرکاری گارڈز بھی رہتے تھے اور اس کے اپنے ملازم بھی تھے جو جرائم پیشہ تھے۔ وہ سب بھی اس لیے ڈپٹی کے ساتھ تھے کہ اس کی وجہ سے ان کی گردن بھی پولیس سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

جب حکومت نے بازارِ حسن بند کرایا تھا، اس وقت نائکہ کسی جرم میں گرفتار ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس کی گرفت میں جو طوائفیں تھیں، آزاد ہوگئی تھیں کہ جہاں چاہیں، وہاں جاکر دھندا کریں۔

غزالہ تو اس وقت پیشہ کر ہی رہی تھی لیکن اس کی ماں بھی جوانی ہی سے کوٹھے پر تھی۔ اس نے خاصا پیسا جمع کرلیا تھا اس لیے ایک مکان خرید لیا گیا۔ زیب النساء کو بھی غزالہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ زیب النساء اس شرط پر اس کے ساتھ آئی تھی کہ وہ اب اس پیشے میں رہنے کے بجائے کہیں ملازمت کرے گی۔

''تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت کیا ہے؟'' غزالہ نے اس سے کہا۔ ''میں جو ہوں۔''

''میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ البتہ ملازمت سے پہلے میں ایک مرتبہ اپنے گھر کے دو ایک چکر لگانا چاہتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کو دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن ڈر یہ بھی لگ رہا ہے کہ کہیں وہ مجھے نہ دیکھ لیں۔''

''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو جا کر ان کے گلے لگ جانا چاہیے۔''

''نہیں۔'' زیب النساء جلدی سے بولی تھی۔ ''میں اب ان کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتی۔ وہ بھی شاید اپنی بیٹی کے بجائے ایک طوائف کو سینے سے لگانا پسند نہ کریں۔''

''ماں باپ ایسے نہیں ہوتے زیب النساء ..... ! پھر یہ کہ تم خود تو طوائف نہیں بنی ہو۔ اس پیشے میں کسی اور نے تمہیں دھکیلا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں طوائف تو بن چکی ہوں نا!''

''یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اچھا ایک کام اور کرتے ہیں۔ تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔ میں جا کر کسی بہانے ان سے ملتی ہوں۔ میں ان کی باتوں سے اندازہ لگاؤں گی کہ وہ تمہیں اپنے گلے لگانا چاہیں گے یا نہیں۔''

''یہ اندازہ تم کیسے لگا سکتی ہو؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

پھر زیب النساء نے کچھ سوچ کر، کسی قدر تذبذب کے ساتھ اسے اجازت دے دی تھی اور اپنے گھر کا پتا بتا دیا تھا۔

یہ سب کچھ یاد کرتے کرتے یکایک غزالہ کے سر میں درد اٹھا۔ اسے خیال آگیا کہ اس نے تھوڑی ہی سی پی تھی جب جمال کی وحشت کے باعث اسے گلاس رکھ دینا پڑا تھا۔ یہ بات اس کے مزاج میں تھی کہ وہ کسی باعث آدھے پیگ سے زیادہ نہ پی سکے تو اس کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔ اسے ختم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ فوری طور پر کم سے کم ڈھائی تین پیگ پیے۔ اس طرح نشہ اتنا گہرا ہو جاتا تھا کہ نیند آنے لگتی تھی۔ اسی لیے اس نے فوراً بوتل اٹھائی اور ایک ڈبل پیگ بنایا۔ پیتے ہوئے وہ کبھی جمال کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی زیب النساء کی زندگی کے واقعات سوچنے لگتی تھی۔ ڈبل پیگ پی کر اس کے سر کا درد ختم ہو گیا اور پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس وقت اس کا جی چاہا کہ گہری نیند سو جائے اس لیے اس نے ایک پیگ اور پی لیا۔ پھر وہ کرسی سے اٹھی تو اس کے قدموں میں ڈگمگاہٹ تھی۔ وہ بستر پر جمال کے پہلو میں ہی گری اور پھر اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں تھی۔

پھر اسے جھنجوڑ کر جگانے والا جمال ہی تھا۔

''اٹھو غزالہ!'' جمال نے کہا۔

غزالہ اٹھ گئی۔ اس وقت دن نکل آیا تھا۔ اس کا اندازہ اس روشنی سے لگایا جا سکتا تھا جو کھڑکی کے پردوں پر پڑ رہی تھی۔

''کیا بج گیا؟'' غزالہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔'' جمال نے جواب دیا اور پریشان سے لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ سو گیا تھا؟''

''میں تمہارے ساتھ سو گئی تھی۔'' غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم تو مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے دو تین پیگ پیے تھے۔ میں بھی تمہارے برابر میں ڈھیر ہو گئی۔''

''شاید مجھے بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا۔'' جمال بڑبڑایا۔

''شاید نہیں، یقیناً۔'' غزالہ نے کہا۔ ''میں تمہیں روکتی رہی تھی لیکن تم پر تو جانے کیوں جنون سا طاری ہو گیا تھا۔''

جمال کرسی پر بیٹھ کر اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ موبائل کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ کال عدنان کی تھی۔

''ہیلو عدنان!'' جمال کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''کہاں ہو؟'' عدنان بھی پریشان معلوم ہوا۔ ''ابھی ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ رات کو لوٹے ہی نہیں۔''

''ہاں عدنان۔'' جمال نے کہا۔ ''ایک جگہ رکنا پڑ گیا تھا۔ اب نکلتا ہوں یہاں سے۔''

''ابھی نہیں جاؤ گے تم!'' غزالہ بول پڑی۔ ''ناشتا کر کے جانا۔''

''اوہ!'' عدنان کی آواز آئی۔ ''یہ تو کوئی عورت بولی تھی۔''

''ہاں۔'' جمال نے کہا۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرو۔'' پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر غزالہ سے کہا۔ ''مجھے اب

جانا ہی ہوگا۔ اس نے تمہاری آواز سن کر نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔''

''کون تھا؟'' غزالہ نے پوچھا پھر بولی۔ ''خیر کوئی بھی ہو۔ تمہیں میں فوراً نہیں جانے دوں گی۔ ایک بات بھی پوچھنا ہے تم سے۔''

''کیا بات؟''

''تم فون تو بند کرو۔''

جمال نے ایک طویل سانس لے کر ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔ ''شاید کوئی اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ میں کچھ دیر بعد نکل سکوں گا یہاں سے۔''

''ابھی تو کہا تھا کہ..... اچھا خیر! تم جانو۔ مجھ سے ملاقات تو اب شام کو ہوگی۔ میں ناشتا کر کے دفتر چلا جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

''کیا بات کرنی ہے؟'' جمال نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات ہے بھی یا مجھے روکنے کے لیے بہانہ بنایا ہے؟''

''بات تو ہے اور مختصر سی ہے لیکن میں چاہوں گی کہ تم پہلے غسل کر لو۔ ابھی تو چہرے ہی سے بوجھل نظر آ رہے ہو۔ تمہارے سوٹ پر شکنیں بھی پڑ گئی ہیں۔ تم جتنی دیر میں نہاؤ گے، میں جلدی سے ان پر استری کر دوں گی۔ اتنی دیر میں اماں ناشتا بھی بنا لیں گی۔''

جمال خود بھی اپنے آپ کو اتنا بوجھل محسوس کر رہا تھا کہ اسے غسل کی ضرورت تھی۔ دوسرے اسے یہ خیال بھی تھا کہ ممکن ہے غزالہ کوئی کام کی بات کرے جس کا تعلق زیب النساء سے ہو۔

''یہ ہے باتھ روم۔'' غزالہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''تم اپنے کپڑے اتار کر بستر پر ڈال دو۔''

''اچھا!''

جب وہ نہا چکا تو اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دے کر غزالہ کو پکارا۔

''ہاں۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''استری کر دی ہے۔ یہ ڈال رہی ہوں بستر پر اور جا رہی ہوں کمرے سے۔ آ کر پہن لو اپنے کپڑے۔''

بیس منٹ بعد جمال اسی کمرے میں غزالہ کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ صرف وہی رات ایسی گزری تھی کہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے ان دونوں میں پرانی شناسائی ہو۔

''اب بولو تمہیں کیا کہنا ہے؟'' جمال نے غور سے غزالہ کی طرف دیکھا جس نے شاید صرف منہ دھو کر کپڑے بدل لیے تھے۔

''صرف ایک بات جاننا چاہتی ہوں۔'' غزالہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا تم نے مجھے اپنا صحیح نام بتایا ہے؟''

''غلط کیوں بتاؤں گا؟'' اس نے جوابی سوال کیا۔

''کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔''

''یہ خیال تمہیں آیا کیوں؟''

''بس آ گیا یوں ہی۔''

''اب تم ٹالنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''رات کو کب آؤ گے؟'' غزالہ نے پوچھا پھر خود ہی بولی۔ ''تم نے زیب النساء کے بارے میں اتنی دلچسپی لی ہے کہ میں آج زیب النساء سے بات کروں گی۔ اگر اس نے اجازت دے دی تو تمہیں اس کے بارے میں بتا دوں گی۔''

''اچانک اس پر آمادہ کیوں ہونے لگیں؟ رات تو تم نے مجھے اتنا بے حواس کر دیا تھا کہ میں شراب پر ٹوٹ پڑا۔''

''اسی بے حواسی کی وجہ سے مجھے خیال آیا ہے کہ زیب النساء کے معاملے میں بات صرف اتنی نہیں جتنی تم نے مجھ سے کہی ہے۔ کچھ چھپایا ہے تم نے مجھ سے۔ کوئی خاص تعلق معلوم ہو رہا ہے تمہارا اس نام سے۔''

''اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو۔''

جمال نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔

''خیر!'' غزالہ بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ اسی لیے میں زیب النساء سے تمہارے بارے میں بات کروں گی۔ اگر اس نے اجازت دی تو میں تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔''

''میں کس وقت آ جاؤں؟''

''نو بجے تک آ جاؤ۔ ساڑھے دس بجے میں اپنے دھندے کے لیے نکل جاتی ہوں۔''

''آ جاؤں گا۔''

پھر جب ناشتے کے بعد جمال جانے لگا تو غزالہ اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک گئی اور اچانک پھر بولی۔

''کیا میں یقین کر لوں کہ تمہارا نام جمال نہیں، رضوان ہے؟''

جمال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں بار بار یہ خیال کیوں آ رہا ہے کہ میں نے تمہیں غلط بتایا ہے؟''

''کوئی وجہ ہے۔ رات کو آؤ گے تو بتاؤں گی۔''

جمال کو خیال آیا کہ وہ اپنا نام اگر رضوان ہی ظاہر کردے تو شاید اسی وقت غزالہ کچھ اور بتا سکے۔ اس نے کہا۔ ''چلو، فرض کرلو کہ میرا نام رضوان ہی ہے۔''

''فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔'' غزالہ مسکرائی۔ ''مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ تمہارا نام رضوان ہی ہوگا۔''

''تو اب اس سے فرق کیا پڑنا چاہیے؟''

''رات کو آؤ گے تو بتاؤں گی۔''

جمال نے طویل سانس لی۔ ''اس وقت کچھ نہیں بتاؤ گی؟''

''میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے زیب النساء سے اجازت لینی ہوگی۔''

''یعنی میرے صبر کا امتحان بڑھتا ہی رہے گا۔''

''بس دس بارہ گھنٹے کی بات ہے۔''

جمال نے سر جھٹکا اور باہر نکل آیا۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ غزالہ آخر اس کا نام رضوان کیوں سمجھ رہی ہے؟ اپنے دماغ میں آنے والے اس سوال کا جواب وہ سوچ ہی نہیں سکا۔

عدنان گھر پر نہیں تھا۔ وہ فون پر بتا بھی چکا تھا کہ ناشتا کرکے دفتر چلا جائے گا۔

جمال کا وقت بڑی بے چینی سے گزرتا رہا۔ دماغ میں یہ بچکانہ خیال بھی آتا رہا کہ کاش وقت کے پر لگ جائیں اور وہ نو بجے غزالہ کے گھر پہنچ جائے۔

شام کی چائے پر بھی عدنان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس کا فون آگیا تھا۔ ''میں کچھ مصروف ہوگیا ہوں اور آج خاصا مطمئن بھی ہوں۔''

''مطمئن کس سلسلے میں؟'' جمال نے پوچھا۔

''ابراہیم جان کا قتل تم بھولے تو نہیں ہوگے؟''

''ظاہر ہے۔''

''میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ مجھے ایک شخص پر شبہ ہے کہ وہ ابراہیم جان کا قاتل ہوسکتا ہے۔ میں نے اس کی نگرانی شروع کرائی تھی حالانکہ اس کی نگرانی کرنا آسان نہیں تھا۔ بہرحال! اب میرا شبہ یقین میں بدل گیا ہے، لیکن اب آخری مرحلہ بہت سخت ہے۔ بڑے مضبوط ثبوت کے بغیر اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا۔''

''خوشی کی بات ہوگی یہ۔'' جمال نے کہا۔ ''تمہاری ہر کامیابی میرے لیے خوشی ہی کی بات ہوتی ہے۔''

عدنان نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم سے رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔''

''مجھے ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلنا ہے۔ نو بجے کسی جگہ پہنچنا ہے۔''

''نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو تم! میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ رات تم نے کس عورت کے ساتھ گزاری ہے لیکن یہ باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں۔ کیا آج بھی تم رات بھر غائب رہو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ آج اس کا امکان نہیں ہے۔ دس بجے تک بھی واپس آسکتا ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو میں تمہارے انتظار میں دس بجے تک کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

''زیادہ امکان یہی ہے کہ میں دس بجے تک آجاؤں گا۔''

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کردیا گیا۔

اس وقت پانچ بجنے والے تھے۔ نو بجنے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ جمال نے وہ وقت بھی بڑے اضطراب میں گزارا اور نو بجے غزالہ کے گھر پہنچ گیا۔

''تمہارے لیے خوش خبری ہے میرے پاس۔'' غزالہ نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

جمال فوراً بولا۔ ''کیا زیب النساء سے اجازت مل گئی؟''

''ہاں!'' غزالہ نے کہا۔ ''دراصل اس نے میرے اس یقین پر یقین کرلیا کہ تمہارا نام رضوان ہے۔ اس یقین کے بغیر وہ مجھے اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتی۔''

نہ جانے کیوں جمال کا دل دھڑک اٹھا کیونکہ اس کا نام رضوان نہیں تھا اور دن میں سوچتے سوچتے اسے یاد آگیا تھا کہ اسکول میں ایک لڑکے کا نام رضوان تھا۔

''بیٹھو!'' غزالہ نے اسے کمرے میں لے جاکر کہا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر بولی۔ ''کیا پینے کے لیے کچھ نکالوں؟''

''نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے جلدی سے وہ سب کچھ بتاؤ جو میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''لیکن میں تو پیوں گی۔'' غزالہ نے الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں دھندے پر جانے سے پہلے ڈیڑھ دو پیگ ضرور لیتی ہوں۔''

جمال بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

غزالہ اپنے لیے ایک بوتل اور ایک گلاس نکال لائی۔ اپنے لیے ایک پیگ بنانے کے بعد اس نے شوخی سے کہا۔ ''مجھے کیا انعام دو گے؟''

''اب جلدی سے کچھ بتاؤ بھی۔'' جمال نے کہا۔ ''تم

جوانعام مانگو گی، وہ دوں گا۔''

''زیب النساء کے بارے میں تمہیں میں یہ تو بتا ہی چکی ہوں کہ وہ کوٹھے پر کس طرح آئی تھی اور مجھے اس سے ہمدردی کیوں ہوئی تھی جو بعد میں محبت میں بدل گئی تھی۔''

جمال نے پہلو بدلا۔ وہ چاہتا تھا کہ غزالہ تمہید نہ باندھے لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

غزالہ ایک علاقے کے ایک مکان کا پتا بتا کر بولی۔

''وہاں زیب النساء صرف ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کس سے بیاہی جارہی ہے تو اس خیال سے رو پڑی کہ اب وہ اپنے محبوب رضوان سے کبھی نہیں مل سکے گی، کبھی اس کی نہ ہو سکے گی اور نہ وہ اس کا ہو سکے گا۔''

جمال اس کے آخری دو جملوں سے پہلے ہی چونک گیا تھا۔

''ابھی چونکے کیوں تھے؟'' غزالہ بولی۔ ''کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہیں بہت چاہنے لگی تھی۔ اس نے تو مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں میں عہد و پیماں بھی ہو چکے تھے!''

اس خیال سے جمال کا دل بیٹھنے لگا تھا کہ زیب النساء رضوان کو چاہتی تھی۔ غزالہ نے اسے یہی بتایا ہوگا کہ رضوان ہی اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔

''کچھ اور خیال آگیا تھا مجھے۔'' جمال نے غزالہ کو ٹالا۔ ابھی وہ واقعی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ رضوان نہیں ہے۔ اگر ظاہر کر دیتا اور غزالہ کو اس کی بات پر یقین بھی آجاتا تو پھر وہ جمال کو کچھ اور نہیں بتاتی۔

غزالہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا، پھر مشروب کا دوسرا گھونٹ لے کر بولی۔ ''جب کوٹھا ختم ہوا تو اماں نے ایک مکان خرید لیا تھا۔ یہی مکان جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔ میں زیب النساء کو یہیں لے آئی تھی۔ اپنے ساتھ رکھا تھا میں نے اسے۔''

''رکھا تھا؟'' جمال نے دہرایا۔ ''تو اب وہ یہاں نہیں رہتی؟''

''ہاں۔ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔ تم اب سنتے رہو۔ بیچ میں نہ بولو۔'' جمال نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

غزالہ بولی۔ ''میں نے اسے بھی نہیں بتایا کہ اسے کوٹھے پر پہنچانے والا ڈپٹی ہی تھا جس سے اس کی شادی کی گئی تھی۔''

''کیوں نہیں بتایا تھا؟''

غزالہ نے جمال کے اس سوال کا جواب بھی دیا۔ کچھ اور وضاحتیں بھی کیں پھر کہا۔ ''زیب النساء سے اجازت ملنے کے بعد میں نے کسی طرح پتا لگایا کہ زیب النساء کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے ماں باپ پر کیا گزری تھی۔ دونوں ہی صدمے سے بے حال ہو گئے تھے۔ اسی صدمے کی حالت میں زیب النساء کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور باپ اس دوسرے صدمے کے بعد بیمار رہنے لگا تھا۔ محلے کے دو ایک ہمدردوں نے اسے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہاں سے وہ بہ ظاہر ٹھیک ہو کر لوٹا لیکن کچھ دن بعد پھر بیمار پڑ گیا۔ محلے والے اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ سرکاری اسپتال میں داخل ہونے کے لیے وہ اب تیار نہیں تھا اور محلے والوں کے پاس اتنا نہیں تھا کہ اس کا پرائیویٹ علاج کروا سکتے۔ اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی تھی۔ میں چاہتی تو یہ تھی کہ زیب النساء کو اس بارے میں نہ بتاؤں لیکن بتانا ضروری تھا۔ میں نہ بتاتی تو وہ خود جاتی اپنے گھر کی طرف اور جس طرح میں نے حالات جان لیے تھے، وہ بھی جان لیتی۔ مجبوراً میں نے اسے بتا دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے باپ کے پاس جانے کے لیے بے چین تھی۔ اسے یہ پروا نہیں رہی تھی کہ باپ پر اس کا کیا ردعمل ہوگا کہ وہ طوائف بن چکی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں اسے اپنے ساتھ ہی اس کے گھر لے گئی جہاں بستر پر پڑے باپ نے اسے پہچان بھی لیا۔ زیب النساء نے اس سے اپنے بارے میں کوئی بات چھپائی بھی نہیں۔ وہ سب کچھ جان کر باپ پر کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگا لو۔''

جمال جو دیر سے خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا تھا، یکا یک بول پڑا۔ ''اب زیب النساء کیا اپنے باپ کے ساتھ ہے؟''

''ہاں۔''

''اور شیخ صاحب کی حالت کیا ہے؟''

جمال کے منہ سے شیخ صاحب کا نام سن کر غزالہ بالکل نہیں چونکی۔ اسے تو یقین تھا کہ وہ رضوان ہی کو سب کچھ بتا رہی ہے اور رضوان کو شیخ صاحب کے بارے میں معلوم ہی ہوگا کہ وہ زیب النساء کا باپ تھا۔

''میں نے اور زیب النساء نے شیخ صاحب کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ بہت سے ٹیسٹ ہوئے۔ وہ خرچ کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا لیکن نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ شیخ صاحب کئی امراض میں گرفتار ہو چکے تھے۔''

''اوہ!''

''پھر شیخ صاحب کو گھر واپس لے آیا گیا۔'' غزالہ نے بتایا۔ ''زیب النساء سخت پریشان تھی۔ وہ ملازمت کر کے اتنا پیسا جمع نہیں کر سکتی تھی کہ باپ کو علاج کے لیے لندن یا امریکا لے جا سکتی۔ میری ماں کے پاس کچھ پیسا جمع تو ہے لیکن وہ یہ سب کچھ شیخ صاحب کی بیماری پر لگانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پیسا بھی اتنا نہیں ہے کہ اس سے شیخ صاحب کا علاج پوری طرح ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ لندن یا امریکا میں بھی مکمل علاج کم سے کم ڈیڑھ دو مہینے میں ہو سکے گا۔ میں نے زیب النساء کو سمجھایا کہ وہ طوائف بن ہی چکی تھی لہٰذا اب دوبارہ یہ پیشہ اپنانے سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ وہ چھے ماہ میں اتنا کما لے گی اور میں بھی اتنا پیسا جمع کر لوں گی کہ شیخ صاحب کو لندن لے جایا جا سکے۔''

غزالہ وقفے وقفے سے مشروب کے گھونٹ بھی لیتی رہی تھی۔ اس موقع پر وہ ایک گھونٹ لینے کے بعد کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

جمال نے چند لمحے تو انتظار کیا، پھر اس سے خاموش نہ رہا گیا۔ ''یہ تم کس سوچ میں پڑ گئیں؟''

''زیب النساء ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' غزالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''شریف گھرانوں کی لڑکیاں ہم طوائفوں سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔''

''کیا اس نے تمہارا مشورہ نہیں مانا؟''

''ماننے پر تو وہ مجبور تھی۔'' غزالہ نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ''باپ کی خاطر وہ پھر اس زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے لیکن ابھی ہم دونوں ہی اتنا نہیں جمع کر سکے کہ شیخ صاحب کو علاج کے لیے لندن لے جا سکیں۔ میں نے بس پاسپورٹ بنوا دیے ہیں ان دونوں کے۔ بیماری کی وجہ سے ویزا تو جلدی مل جائے گا لیکن اتنے پیسے تو جمع ہوں۔''

''اب اس نے یہ پیشہ کس طرح اپنایا ہے؟'' جمال نے جلدی سے پوچھا۔

''وہی سڑیں جہاں سے تم مجھے لائے ہو۔ اتفاق ہے کہ وہ اب تک تمہاری نظر میں نہیں آئی۔ تم تو ادھر آتے ہی اس لیے ہو کہ اسے ڈھونڈو۔ ہم طوائفوں کے لیے تم یہاں نہیں آتے۔ اتنا تو سمجھ گئی ہوں میں۔ تم ضرور اس سے ملنا چاہو گے۔ وہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہے لیکن اس نے یہ ضرور سوچا ہے کہ تم اسے اپنانے کے لیے تیار ہو گے یا نہیں۔''

''میں تو تیار ہوں۔ شاید وہی تیار نہ ہو کیونکہ.....''

''کیونکہ.....؟ بولو..... رک کیوں گئے؟''

جمال نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''تم مجھے اسی وقت اس کے پاس لے چلو۔ آج اپنے دھندے پر نہ جاؤ۔ تمہارا نقصان میں پورا کر دوں گا۔''

''نقصان کی پروا نہیں ہے مجھے زیب النساء کی وجہ سے۔'' غزالہ نے آخری گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔

''تو چلو!'' جمال نے بے چینی سے کہا۔

''آدھا پیگ اور لوں گی ورنہ میرے سر میں درد ہو سکتا ہے۔ میں ڈیڑھ یا دو پیگ پینے کی عادی ہوں۔''

''تو جلدی سے پی لو۔'' جمال کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

غزالہ نے گلاس میں مشروب انڈیلا۔

''ارے ارے!'' جمال کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو تم نے زیادہ نکال لی۔ یہ تو ایک پیگ کے برابر ہے۔''

''بے خیالی میں نکال لی۔ پروا نہ کرو۔ میں یہ اتنی ہی جلدی ختم کر لوں گی جتنا وقت آدھے پیگ میں لگتا ہے۔'' اس نے مشروب میں پانی ملایا اور ایک بڑا گھونٹ لیا۔

''دیر نہ ہو جائے۔'' جمال نے پہلو بدلا۔

''دیر نہیں ہو گی۔ میں آج کی رات تم دونوں کے لیے ہوں۔''

جمال اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زیب النساء رضوان کے بجائے اسے دیکھ کر چونک جائے گی۔ نہ جانے کیا ردعمل ہو اس پر.....! ایک بار اسے خیال آیا کہ غزالہ کو تو حقیقت بتا ہی دے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اندیشہ تھا کہ غزالہ پھر اسے زیب النساء کے پاس نہیں لے جائے گی۔

''ارے ہاں!'' جمال کو خیال آیا۔ ''زیب النساء کا گھر تو لاہور میں تھا۔''

''بازار بند ہونے کے بعد ہم یہاں آ گئے تھے۔ اس دھندے کے لیے کراچی، لاہور سے زیادہ اچھی مارکیٹ ہے۔ وہاں کا مکان اماں نے بیچ دیا تھا۔ اس میں کچھ اور پیسے ملا کر یہاں مکان خرید لیا تھا۔''

''ہوں۔'' جمال نے سر ہلایا۔ ''اچانک ہی یہ خیال آیا مجھے حالانکہ پہلے ہی آ جانا چاہیے تھا۔''

''تم بس زیب النساء ہی کے بارے میں سوچتے رہے ہو گے۔'' جمال نے پھر سر ہلا دیا۔

غزالہ نے اپنے کہنے کے مطابق ایک پیگ جلد ہی ختم کر لیا اور کھڑی ہو گئی۔

''چلو۔''

جمال اس کے ساتھ بیرونی دروازے تک پہنچا۔

''اماں!'' غزالہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''دروازہ بند کرلو۔''

پھر وہ جمال کے ساتھ باہر نکل آئی۔ جمال نے اپنی کار حسب معمول کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔

''تمہاری چال میں خفیف سی ڈگمگاہٹ تو آگئی ہے۔'' جمال بولا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دماغ پوری طرح قابو میں ہے۔''

جمال نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ غزالہ اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جمال کار حرکت میں لے آیا۔

''راستہ بتاتی رہنا۔'' جمال نے کہا۔

''وہ تو بتاتی رہوں گی۔ ایک اور بات تمہیں بتادوں، بھول گئی تھی بتانا۔ کوئی ایسی ضروری بات بھی نہیں ہے۔''

''جو بات بھی ہے، بتا تو دو۔''

''زیب النساء چاہتی تھی کہ اس طرح سڑکوں پر دھندا کرتے ہوئے وہ اپنا اصل نام کسی کو نہیں بتائے گی۔ اس نے اپنا نیا نام خود ہی سوچا تھا۔''

''وہ کیا؟''

''سائرہ!''

جمال اتنی شدت سے چونکا کہ اسٹیئرنگ بھی بہک گیا۔

''کار سنبھالیں!'' غزالہ جلدی سے بولی۔ ''کار سنبھالیں۔''

غزالہ کے دوسرے جملے سے پہلے ہی جمال نے اسٹیئرنگ پر قابو پالیا تھا۔ اس نے رفتار کم کردی۔ اس کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ سائرہ سے ملاقات کی ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

''سائرہ کا نام سن کر کیا ہوا تھا آپ کو؟'' غزالہ بولی۔

''کیا اس علاقے میں سائرہ نام کی کوئی اور بھی ہے؟''

''نہیں۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''کیوں؟'' سوال بھی کردیا۔

''میں ایک بار اس سے مل چکا ہوں۔'' جمال کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''تو شاید تم نے اسے اس لیے نہیں پہچانا کہ ایک تو خاصا بڑا وقت گزر چکا ہے۔ اب وہ نوخیز لڑکی نہیں رہی۔ بالوں کا اسٹائل بھی بدل دیا ہے اس نے اور میک اپ بھی گہرا کرتی ہے لیکن.....'' غزالہ کے لہجے میں الجھن آگئی۔ ''اس نے بھی تمہیں نہیں پہچانا؟''

''میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہے۔ میں اب لڑکا نہیں رہا۔ دوسرے میں نے اسے اپنا نام بھی جمال بتایا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ رضوان کی بس کچھ شباہت ہے مجھ میں۔''

''کیا باتیں ہوئی تھیں اس سے؟''

''میں نے اس کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔ اس پر وہ بگڑ گئی۔ میرے پیسے بھی واپس کردیے اور ایک آدمی سے کہا کہ وہ مجھے باہر کا راستہ دکھائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے مجھے گھر سے نکلوادیا۔ اس شخص کا نام شاید ولی ہے، ولی خان۔''

''ہاں۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''اس کا تعلق بھی کوٹھے سے تھا۔ وہ بھی کسی طوائف ہی کی اولاد ہے۔ دل کا اچھا ہے۔ اسے بھی زیب النساء سے کچھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس کے روپے کی وجہ سے زیب النساء بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ کوٹھا ختم کرنے کے بعد وہ پریشان پھر رہا تھا۔ اسے میں نے ہی بلایا۔ زیب النساء سے میں نے کہا کہ وہ اکیلی نہ رہے۔ اس کے والد کی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی ہر وقت گھر میں رہنا چاہیے۔ زیب النساء پہلے ہی سے ولی خان کو جانتی تھی۔ اس نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔''

''وہ مجھے دیکھ کر جھنجلائے گی۔''

''تم بتادینا کہ تم رضوان ہو۔ اس سے جو باتیں کی تھیں نوجوانی میں، وہ سب دہرادینا۔ یقین آجائے گا اسے۔''

جمال نے سر ہلادیا۔

''اوہ!'' غزالہ یکا یک چونکی۔ ''تم مجھ سے پوچھے بغیر صحیح راستے پر چلا رہے ہو۔ اچھا ہاں! ابھی تم نے بتایا تو تھا ایک بار اس کے گھر جاچکے ہو۔''

جمال نے پھر سر ہلادیا۔

غزالہ بولی۔ ''یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ میں دو بچھڑے ہوؤں کو ملانے جارہی ہوں۔''

لیکن جمال صدمے سے دوچار تھا۔ زیب النساء اسے نہیں چاہتی تھی۔ اس کا محبوب رضوان تھا۔ اس صورتِ حال کے باوجود وہ زیب النساء سے ملنا تو بہرحال چاہتا تھا۔

آخر وہ وقت آیا جب غزالہ زیب النساء کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور جمال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

قدرے وقفے سے بھاری قدموں کی آواز آئی۔

''کون ہے؟'' اندر سے پوچھا گیا۔ وہ ولی خان ہی ہوسکتا تھا۔

''میں ہوں ولی خان!'' غزالہ نے کہا۔

ولی خان اس کی آواز پہچانتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا پھر غزالہ کے ساتھ جمال کو دیکھ کر چونکا۔

''اندر تو آنے دو۔'' غزالہ منہ بنا کر بولی۔

ولی خان جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی تھی۔ جس شخص کو وہ اس گھر سے نکال چکا تھا، وہی اس وقت غزالہ کے ساتھ تھا۔

غزالہ کے ساتھ جمال بھی اندر داخل ہوا۔ غزالہ بے تکلفی سے آگے بڑھ کر ایک کرسی نما صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کمرے کو ایک معمولی قسم کا ڈرائنگ روم کہا جاسکتا تھا۔

جمال ایسی جگہ بیٹھا کہ اس کی پشت اندرونی دروازے کی طرف تھی۔ ولی خان اس دروازے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ اندر آنے والے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''رضوان!'' زیب النساء کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''دیکھو!'' غزالہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ملا دیا نا میں نے تمہیں رضوان سے۔''

جمال کی دھڑکنیں کچھ اور بڑھ چکی تھیں۔

زیب النساء قریب آئی اور پھر جمال کو دیکھ کر چونکی۔

''تم!'' اس کے منہ سے نکلا۔

غزالہ بولی۔ ''مجھے بتا دیا ہے رضوان نے۔ یہ حضرت ایک بار تم سے مل چکے ہیں لیکن اپنا نام غلط بتایا تھا۔''

''ہرگز نہیں۔'' زیب النساء ایک جھٹکے سے بیٹھتے ہوئے غصے سے بولی۔ ''کیا میں رضوان کو نہیں پہچانوں گی؟''

اس نے دوسرا جملہ کہتے وقت غزالہ کی طرف دیکھا تھا۔

''اتنا وقت گزر جانے کے بعد تبدیلی تو آئے گی نا، زیبا!'' غزالہ نے کہا پھر جمال سے بولی۔ ''تم ماضی کی باتیں یاد دلاؤ۔''

جمال کے فرشتے بھی رضوان اور زیب النساء کی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ بے بسی سے زیب النساء کی طرف دیکھنے لگا جو غصے میں سوالیہ نظروں سے جمال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔'' جمال نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ ''لیکن چونکہ میں زیب النساء کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اس لیے جب تم نے مجھے رضوان سمجھا تو میں نے بہتر جانا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے تمہاری بات مان لوں۔ میں از خود اپنے آپ کو رضوان بتانا نہیں چاہتا تھا۔''

''آخر کیوں جاننا چاہتے تھے تم میرے بارے میں؟'' زیب النساء تڑخ کر بولی۔

''اس لیے کہ میں تمہیں اسکول کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میرے نام کے ساتھ اپنا ماضی یاد کرو۔ ہوسکتا ہے میں تمہیں یاد آجاؤں۔''

زیب النساء غور سے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

غزالہ بولی۔ ''اگر تم زیبا کے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے تو بھی یہ سوال باقی ہے کہ تم اس کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے تھے؟''

''میں زیب النساء کا جواب سننے کے بعد کچھ کہوں گا۔''

''ہاں۔'' زیب النساء بولی۔ ''اب مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کہ تم اسی اسکول میں تھے جہاں میں پڑھتی تھی لیکن غزالہ کی اور میری بات اپنی جگہ کہ تم میرے بارے میں کیوں جاننا چاہتے تھے؟''

''اب وہ وجہ بتانا فضول ہے کیونکہ تم رضوان سے محبت کرتی ہو۔''

غزالہ بول پڑی۔ ''کیا تم بھی زیبا سے محبت کرنے لگے تھے؟''

''محبت کی نہیں جاتی۔'' جمال نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''محبت ہوجاتی ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''تو تمہیں زیب النساء سے محبت ہوگئی تھی؟''

جمال نے جواب نہیں دیا۔ نظریں جھکائے رہا۔

''خیر!'' زیب النساء بولی۔ ''اب تم جان چکے ہو کہ میں رضوان سے محبت کرتی ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک اسے بھلانا میرے لیے ممکن نہیں۔''

''جس سے محبت ہوجائے، اسے بھلانا واقعی ممکن نہیں ہوتا۔ میں بھی تمہیں نہیں بھلا سکوں گا زیبا! تمہارے لیے غزالہ کا دیا ہوا نام زیبا مجھے اچھا لگا ہے۔ میں تمہیں اسی نام سے مخاطب کیا کروں گا۔''

''مخاطب کرنے کی ضرورت کیا ہے۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''تمہیں مجھ سے محبت ہے تو ہوا کرے۔ میں رضوان سے کیا ہوا عہد پورا کروں گی۔ میں اپنی آخری سانس تک صرف اسی کی ہوں۔ اب تم جاسکتے ہو۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔'' زیب النساء نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم خود یہاں سے جاؤ گے یا.....''

''اچھا۔'' جمال ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔ ''اگر تم میری ایک بات بھی نہیں سننا چاہتیں تو میں جارہا

ہوں لیکن جاتے جاتے اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنی محبت کی خاطر میں تمہیں رضوان سے ملانے کی کوشش کروں گا۔'' پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

غزالہ بول پڑی۔ ''تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟''

جمال جواب دیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

یہ جان کر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا کہ زیب النساء کسی قیمت پر بھی رضوان کو بھلانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ میں بھی تو اب اسے زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ اب بس زیبا، یا کوئی نہیں!

☆☆☆

جمال کے جاتے ہی غزالہ بول پڑی۔ ''یہ کیا کہہ گیا جاتے جاتے؟ یہ تمہیں رضوان سے کیسے ملا سکتا ہے؟''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے۔''

''مجھے معاف کر دینا زیبا کہ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔''

''تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ دھوکا کھا جاتا۔''

غزالہ چند لمحے کچھ سوچ کر بولی۔ ''اب تم جاؤ گی اسٹریٹ پر؟''

''جانا ہی پڑے گا، حالانکہ ان باتوں سے میرا موڈ خراب ہوگیا ہے لیکن بابا کے علاج کی خاطر میں اپنی کوئی رات ضائع نہیں کرنا چاہتی۔''

''میں آج نہ جانے کیوں زیادہ پی گئی ہوں۔'' غزالہ نے کہا۔ ''میں اب نہیں جاتی لیکن تمہاری بات سے مجھے بھی خیال آگیا کہ کوئی رات بے کار نہیں جانا چاہیے۔''

''میں تیار ہو جاؤں! رضوان کے خیال کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بھول ہی گئی تھی اپنے فرض کو۔'' اس نے تلخی سے دہرایا۔ ''فرض.....! یہ بھی خوب ہے۔ جسم بیچنا بھی فرض بن گیا ہے۔''

''بابا کو تو شبہ نہیں ہوا؟''

''نہیں۔ ان کو تو یہی بتایا ہے کہ ایک فیکٹری میں رات کی ملازمت کرتی ہوں۔''

''میں نے بھی ولی خان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ بابا کو ذرا بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''انہیں اب کیا شبہ ہوگا۔'' زیب النساء نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ اب ایسے نہیں رہے کہ کچھ سوچ سمجھ سکیں۔ گم صم پڑے رہتے ہیں۔ چلنا پھرنا بھی اب ان سے نہیں ہوتا۔ میں دعا کرتی رہتی ہوں کہ رقم جمع ہونے تک انہیں زیادہ کچھ نہ ہو جائے۔'' زیب النساء کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ ''ولی خان کا دم غنیمت ہے۔ وہی سنبھالتا ہے انہیں۔''

''روؤ نہیں زیبا!'' غزالہ نے اسے گلے لگا لیا۔ ''ہماری دعائیں ضرور رنگ لائیں گی۔ مولا ہماری ضرور سنیں گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا..... ایک ویلفیئر ٹرسٹ والوں سے بھی بات کر چکی ہوں۔ شاید وہ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔''

''مجھے تو امید نہیں۔ پندرہ دن ہوگئے اس بات کو۔ خبر بھی نہیں لی انہوں نے۔''

''انہیں کوئی ایک کام تو ہوتا نہیں ہے۔ کل میں پھر جاؤں گی انہیں یاد دلانے۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ساتھ ہی نکلتے ہیں۔''

زیب النساء اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دو دن گزرنے کے بعد زیب النساء نے غزالہ سے پوچھا۔ ''تم گئی تو ہوگی ٹرسٹ والوں کے پاس! بتایا نہیں کچھ؟''

''کیا بتاتی!'' غزالہ نے کچھ فکرمندی سے کہا۔ ''فنڈ کی کمی کی بات کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا ہے کہ وہ کوشش کر رہے ہیں۔ مالی طور پر یہ ٹرسٹ کچھ کمزور معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کسی پرانے اور مضبوط ادارے سے ملنا چاہیے تھا۔ مشورے کر رہی ہوں۔ جلد ہی کسی اور سے ملوں گی۔''

زیب النساء افسردگی سے سر ہلا کر رہ گئی لیکن پھر ایک ہی دن گزرا تھا کہ صورتِ حال نے ایک خوشگوار کروٹ لی۔ دوپہر کا وقت تھا کہ ولی خان نے اسے جگایا۔ وہ جھنجلا گئی۔

''بی بی! بات ہی ایسی ہے کہ آپ کو جگانا پڑا۔ ایک آدمی آیا ہے کار میں۔ کسی ٹرسٹ نے بھیجا ہے۔''

''ٹرسٹ نے؟'' زیب النساء جلدی سے اٹھ گئی۔ ''اندر بٹھایا ہے یا نہیں.....؟''

''ابھی تو نہیں بٹھایا۔''

''بٹھاؤ انہیں!'' زیب النساء کھڑی ہوگئی۔ ''ان سے پوچھ کر شربت یا چائے بناؤ ان کے لیے، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

ولی خان چلا گیا۔

زیب النساء جلدی سے تیار ہو کر اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں مہمان کو اس کا منتظر ہونا چاہیے تھا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ غزالہ کو تو فون پر بتا دے۔ کمرے میں جانے سے پہلے اس نے غزالہ سے رابطہ کیا۔ غزالہ ہی کی

وجہ سے تو یہ صورت پیدا ہوئی تھی۔

اس نے مختصر طور پر غزالہ کو بتایا اور اس سے جلد از جلد آنے کے لیے کہہ کر اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک شخص چائے پی رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں سو رہی تھی۔''

''بتایا تھا آپ کے ملازم نے۔ میرا نام جاوید ہے۔''

اس نے کہہ کر ایک کارڈ زیب النساء کی طرف بڑھایا۔

ٹرسٹ کا نام پڑھ کر زیب النساء الجھی۔ غزالہ نے ٹرسٹ کا نام کچھ اور بتایا تھا۔

''آپ کے چہرے سے الجھن ظاہر ہو رہی ہے۔'' جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور ہونی بھی چاہیے۔ آپ کی ساتھی نے جس ٹرسٹ سے بات کی تھی، انہی لوگوں نے ہم سے رابطہ کیا تھا۔ ہمارا ٹرسٹ ابھی بالکل نیا ہے۔ پبلسٹی نہیں ہوئی ہے اس کی، لیکن ہمارے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہے۔ ہم آپ کا معاملہ سنبھال سکتے ہیں۔ آپ کے والد کی اب کیا حالت ہے؟ ان کی میڈیکل رپورٹس؟''

''وہ میری ساتھی غزالہ کے پاس ہیں۔ ساری فائل ہی اس کے پاس ہے۔ بات ہی وہ کر رہی تھی اس لیے میں نے سب کچھ اسے دے دیا تھا۔ میں نے ابھی بلایا ہے اسے۔ وہ سب کچھ لے کر آئے گی۔''

''میں انتظار کرلوں گا۔ کتنی دیر میں آجائیں گی؟''

''زیادہ سے زیادہ پون گھنٹا لگے گا۔''

''اوہ!'' جاوید نے گھڑی دیکھی۔ ''تو میں اتنی دیر میں ایک جگہ ہو کر آتا ہوں۔ وہ ٹرسٹ ہی کے ڈاکٹر ہیں۔ میں انہیں لے کر ہی آتا لیکن وہ فوری طور پر میرے ساتھ نہیں آسکے۔ میں انہیں بعد میں لاتا لیکن اب وقت مل رہا ہے تو میں انہیں لے ہی آؤں۔ ایک گھنٹے کے اندر آجاؤں گا۔ یہ ضروری ہے کہ آپ کے والد کی موجودہ صورت حال کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ وہی آپ کے والد کی رپورٹس اپنے نوٹ کے ساتھ لندن کے کسی اسپتال کو بھیجیں گے۔''

''ضرور۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''آپ چائے تو پی لیں۔''

''پی چکا۔'' جاوید نے آخری گھونٹ لے کر پیالی رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔

زیبا اسے چھوڑنے کے لیے اس کی کار تک گئی، پھر واپس آکر ایک مرتبہ اپنے والد کو دیکھنے گئی جو سو رہے تھے۔ بیرونی کمرے میں آکر وہ بے چینی سے غزالہ کا انتظار کرنے لگی۔

غزالہ نے تقریباً اتنا ہی وقت لگایا جس کا اندازہ زیب النساء کو تھا۔ اس نے آتے ہی دو فائلیں ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں ہیں وہ صاحب؟''

زیب النساء نے آگاہ کر دیا۔

''آخر میری محنت رنگ لائی!'' غزالہ بہت خوش تھی۔

''فون پر میں نے تمہیں مختصر طور پر بتایا تھا۔ یہ اب بتاؤں کہ یہ صاحب اس ٹرسٹ کے نہیں ہیں جس سے تم نے بات کی تھی۔''

''پھر؟'' غزالہ نے چونک کر پوچھا۔

زیب النساء نے وہ باتیں دہرا دیں جو اسے جاوید نے بتائی تھیں۔

غزالہ نے فوراً تبصرہ کیا۔ ''یہ تو اور اچھا ہوا۔ نیا ٹرسٹ زیادہ سے زیادہ دلچسپی سے کام کرے گا۔''

''تم نے بتا دیا تھا نا کہ ہم لوگوں کا پیشہ کیا ہے؟''

''چھپانا تو مناسب ہی نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے طور پر بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ ٹرسٹ والوں کو میری صاف گوئی پسند آئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ صرف اس سے غرض رکھتے ہیں کہ جس کے لیے کام کرتے ہیں، وہ کیا ہے۔''

''یہ انہوں نے نئے ٹرسٹ والوں کو بھی بتا دیا ہوگا۔''

''نہیں بتایا ہوگا تو ہم بتا دیں گے۔ بات چھپانا تو ٹھیک نہیں۔''

ان کی باتوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک جاوید ڈاکٹر کو لے کر نہیں آگیا۔

''یہ ہیں میری ساتھی۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''غزالہ نام ہے ان کا۔''

''ہمیں وہ سب کچھ معلوم ہے جو انہوں نے اس ٹرسٹ کو بتایا تھا۔''

غزالہ نے دونوں فائلیں اٹھا کر ڈاکٹر کو دیں۔

زیب النساء نے جاوید سے کہا۔ ''ان سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارا پیشہ کیا ہے۔''

''سب کچھ بتا دیا ہے انہوں نے۔ آپ کے اور آپ کے والد کے بارے میں انہوں نے جو تحقیقات کی تھیں، اس کی کاپی بھی ہمیں دے دی ہے۔ آپ اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے اس پیشے میں ہیں اور آپ کے والد کو اس کا علم نہیں۔''

''جی۔'' زیب النساء نے اطمینان محسوس کیا۔ ''مجھے امید رکھنی چاہیے کہ آپ کی وجہ سے بھی یہ بات راز میں رہے گی۔''

''قطعی، قطعی! اس طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔''

''شکریہ!''

ڈاکٹر نے دونوں فائلیں دیکھنے میں بیس منٹ صرف کیے، پھر جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جستہ جستہ دیکھ کر اندازہ لگالیا ہے کہ لندن میں ان کا علاج تسلی بخش طور پر ہوجائے گا لیکن اس میں وقت ضرور لگے گا۔ ایک ڈیڑھ ماہ سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔''

''کتنا بھی وقت لگے۔'' زیب النساء جلدی سے بول پڑی۔ ''بس میرے بابا کا علاج ہوجائے۔ وہ چلنے پھرنے لگیں۔''

''چلنے پھرنے تو وہ لگیں گے لیکن ان پر کسی قسم کا جسمانی بوجھ نہیں پڑنا چاہیے۔''

''میں سمجھی نہیں.....! جسمانی بوجھ؟''

''میرا مطلب ہے کہ وہ کسی قسم کا کام نہ کرنے لگیں۔ میرا اشارہ خاص طور سے ملازمت کی طرف ہے۔ کسی بھی قسم کی ملازمت۔''

''ایسا تو نہیں ہوگا۔ میرے ہوتے ہوئے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''اب میں آپ کے والد کا معائنہ بھی کرنا چاہوں گا۔''

''ضرور۔'' زیب النساء کھڑی ہوگئی۔ ''آیئے!''

غزالہ بھی کھڑی ہوئی۔

''آپ رک جائیں۔'' جاوید نے اس سے کہا۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ زیادہ تر معلومات مجھے آپ ہی سے مل سکتی ہیں۔ جب تک ڈاکٹر صاحب کو معائنے میں وقت لگے، اتنی دیر آپ سے کچھ باتیں معلوم کرلوں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''جتنا کچھ میری دوست کو معلوم ہے، اتنا شاید میں بھی نہ جانتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' غزالہ بیٹھ گئی۔ ''میں رک جاتی ہوں۔''

زیب النساء ڈاکٹر کو اپنے والد کے کمرے میں لے گئی۔ اس وقت وہ جاگ رہے تھے اور چھت کو تک رہے تھے۔ ان دونوں کی آہٹ سن کر انہوں نے آہستگی سے اپنا سر ان کی طرف گھمایا۔ پھر وہ صرف زیب النساء کی طرف دیکھنے لگے، جس نے ان کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔

''یہ ڈاکٹر ہیں بابا!''

''پھر؟'' ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ جاننا چاہتے ہوں کہ کیا پھر باقاعدگی سے علاج ہوگا؟

''ہاں بابا!'' زیبا نے کہا۔ ''ایک ٹرسٹ سے بات کی تھی میری دوست نے۔ آپ کو اب لندن لے جایا جائے گا۔ وہاں ہوگا اب آپ کا علاج۔''

باپ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نظر آئے۔

''شاید یہ زیادہ نہیں بول سکتے۔'' ڈاکٹر نے زیب النساء کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔ بہت کم بول پاتے ہیں۔''

''شاید یہ اپنے علاج کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے معائنہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ لوگوں کے جانے کے بعد انہیں سب بتادوں گی۔''

ڈاکٹر نے پندرہ منٹ سے زیادہ معائنہ نہیں کیا، پھر زیب النساء سے پوچھا۔ ''آج کل انہیں کوئی دوا دی جارہی ہے؟''

''جی۔'' زیب النساء نے دوائیں نکال کر دکھادیں۔

''ٹھیک ہے۔ یہ دوائیں بھی ٹھیک ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن اس سے بہتر دوائیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ میں نسخہ لکھ کر جاوید صاحب کو دے دوں گا۔ دوائیں آپ کو جلد ہی پہنچ جائیں گی، وہ شروع کرادیجیے۔''

''بہت اچھا۔''

ڈاکٹر کھڑا ہوا تو زیب النساء بھی کھڑی ہوگئی۔

''میں ابھی آتی ہوں بابا!'' اس نے کہا اور ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

''بس یہی دو چار باتیں معلوم کرنی تھیں۔'' جاوید غزالہ سے کہہ رہا تھا، پھر اس نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''مسئلہ اتنا ہی ہے جتنا رپورٹس سے ظاہر ہے۔''

''تو اب ہم چلتے ہیں۔'' جاوید نے کھڑے ہوتے ہوئے زیب النساء اور غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ فائلیں ہم لے جائیں گے۔ اس سے کوئی فرق تو پڑے گا نہیں۔ یہ سب فوٹو اسٹیٹ ہیں۔''

''جی۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اصل میرے پاس ہے۔''

''اطمینان رکھیں۔'' جاوید نے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لندن سے جواب آنے کے بعد آپ اپنے والد کو لے کر لندن روانہ ہوسکیں گی۔''

''کیا میں بھی ان دونوں کے ساتھ نہیں جاسکتی؟'' غزالہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں ٹرسٹ کا مالک نہیں ہوں بی بی!'' جاوید نے کہا۔ ''میں اس بارے میں ان سے بات کرکے جواب

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

دوں گا آپ کو۔''

''اگر صرف زیب النساء گئی تو یہ وہاں بہت اکیلا اکیلا محسوس کرے گی۔''

''میں نے عرض کیا نا! میں آپ کو کل بتا دوں گا۔''

ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد غزالہ نے زیب النساء سے کہا۔ ''میں ہر صورت میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔ اگر ٹرسٹ والے میرا خرچ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے تو میں خود اپنے لیے ٹکٹ خرید لوں گی۔''

''جاوید صاحب تم سے کیا پوچھتے رہے؟''

''پاسپورٹ کے بارے میں۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''یہ بھی کہ تمہارے ساتھ اور کیا کیا سامان جانا ضروری ہوگا۔''

''بابا بے چین سے ہو گئے ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انہیں سب کچھ بتانا ضروری ہے۔''

''چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں ان کے پاس۔'' وہ غزالہ کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

جاوید کا تعلق ایک آسودہ گھرانے سے تھا۔ انجینئر کی حیثیت سے کوئی اچھی ملازمت چاہتا تھا جو ابھی نہیں ملی تھی۔ کسی اور کام میں بھی مصروف نہیں تھا اس لیے جمال کے فون پر لاہور سے کراچی آنے میں اس نے ایک دن بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہتا تھا لیکن عدنان نے اصرار کیا کہ جمال کا دوست بھی اس کا دوست ہے لہٰذا اسے ہوٹل میں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جمال نے اسے اپنی محبت کے بارے میں بتایا۔ اس گفتگو میں عدنان بھی شریک تھا۔ جمال کی محبت کے بارے میں خاصی باتیں ہوئیں کیونکہ جمال کی محبوبہ طوائف بن چکی تھی لیکن عدنان کی باتوں کی طرح جمال نے جاوید کی ہر بات بھی مسترد کر دی تھی۔ آخر تھک ہار کر جاوید نے کہا۔

''اس سلسلے میں تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''دو کام کرنے ہیں تم کو۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ میں زیب النساء کے والد کا لندن میں علاج کروانا چاہتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں میرا تعاون قبول نہیں کرے گی۔ اس کے لیے تمہیں کام کرنا ہوگا۔ میں غزالہ کا تعاقب کر کے اور چھان بین کر کے جان چکا ہوں کہ وہ اپنی دوست کی خاطر اس سلسلے میں ایک ٹرسٹ سے کام لینا چاہتی تھی لیکن اس ٹرسٹ کی مالی پوزیشن اتنی اچھی نہیں ہے۔ وہ لوگ بس چھوٹے موٹے معاملات میں لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی اور نام کے ٹرسٹ کے حوالے سے اس سے ملو اور بتاؤ کہ.....''

جمال نے اسے پورا منصوبہ بتایا تھا۔

''تو پھر..... سب سے پہلے تو اس ٹرسٹ کے کارڈ وغیرہ چھپوانے ہوں گے۔'' جاوید نے کہا تھا۔

''یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''اسے رجسٹرڈ بھی ہونا چاہیے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' جمال نے کہا تھا۔ ''میں یہ ٹرسٹ مستقل طور پر تو قائم کرنا نہیں چاہتا۔ بس علاج کروانا ہے زیب النساء کے والد کا۔''

''ٹھیک ہے، تو میں اس سے کب ملوں؟'' جاوید نے سوال کیا تھا اور جواب ملنے سے پہلے ہی یہ بھی بول پڑا تھا۔ ''لندن کے اسپتال میں ایک ایسے ٹرسٹ کا نام لکھوانا تو مناسب نہیں ہوگا جو رجسٹرڈ نہ ہو۔''

''میرا نام لکھوا دینا لیکن یہ بھی کہہ دینا کہ زیب النساء کو اس کا علم نہ ہو۔ اتنی رازداری تو وہ برت سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس نیک کام کے سلسلے میں، میں اپنا شہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے لوگ بھی آخر ہوتے ہی ہیں جو خود سامنے آئے بغیر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

جاوید نے سر ہلا کر سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ''اس سلسلے میں کسی مقامی ڈاکٹر کی بھی ضرورت پڑے گی۔''

''سب کچھ..... جو کچھ بھی ضروری ہو، تم ہی کو کرنا ہے۔ میں کسی بھی مرحلے میں سامنے نہیں آنا چاہتا۔''

''چلو یہ تو ہوا ایک کام، دوسرا کام کیا ہے تمہیں مجھ سے؟''

''یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ وہ رضوان سے محبت کرتی ہے۔ رضوان کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ اسکول میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔''

''وہ رضوان!'' جاوید جلدی سے بول پڑا تھا۔

''ہاں، اور وہ تمہارا بہت قریبی دوست تھا۔''

''اب بھی ہے۔''

''میں بھی جانتا ہوں۔ اسی لیے یہ دوسرا کام بھی تم ہی کر سکتے ہو۔ اسکول میں رضوان سے میرے تعلقات بہت رسمی تھے۔ تم اگر چاہو گے تو وہ ایک دن کے لیے کراچی آ ہی جائے گا۔''

''اسے کیوں بلانا چاہتے ہو؟''

''ابھی نہیں۔ زیب النساء کے والد کے علاج کے بعد۔''

''میں نے پوچھا تھا کہ اسے کیوں بلوانا چاہتے ہو؟''

''زیب النساء سے ملوانے کے لیے۔''

''کیا!'' جاوید چونک گیا تھا۔

''ہاں! وہ رضوان سے بہت محبت کرتی ہے لیکن جانتی نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔''

''لاحول ولا۔'' جاوید نے سر جھٹکا تھا۔ ''میرے ذہن میں تو یہ بات آئی تھی کہ تم علاج کروا کے زیب النساء کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔''

''نہیں۔ اب تو خوشی مجھے اس بات سے ہوگی کہ میں نے دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ملوا دیا۔''

''بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو۔''

اس وقت عدنان بول پڑا۔ ''مادر زاد عاشق ہے یہ جاوید صاحب!''

''تم لوگ کیا جانو کہ محبت کیا ہوتی ہے؟'' جمال نے آہ بھر کر کہا تھا۔ ''جنہیں محبت ہوئی ہو کسی سے، صرف وہی میرے جذبات سمجھ سکتا ہے۔''

جاوید اپنی پیشانی رگڑنے لگا تھا۔

''اور ہاں!'' جمال کو خیال آیا تھا۔ ''رضوان کی شادی تو نہیں ہوئی؟''

''ابھی شاید دو ڈھائی سال نہ ہو۔ وہ ایک بڑے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ منصوبہ مکمل کرنے کے بعد ہی شادی کرے گا۔''

''گڈ!'' جمال نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ ''بس تو اب تم کل سے ہی کام شروع کر دو۔ اسٹیشنری چھپوانے کا کام دو تین گھنٹے میں ہو سکتا ہے اور ڈاکٹر کا بندوبست کرنے میں بھی وقت نہیں لگنا چاہیے۔ اس معاملے میں تمہیں عدنان سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ کیوں؟'' جمال نے عدنان کی طرف دیکھا تھا۔

عدنان نے اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا تھا۔

اسی گفتگو کے نتیجے میں جاوید، زیب النساء اور غزالہ سے ملا تھا۔ واپس آ کر اس نے جمال کو ساری رپورٹ دی۔

''اطمینان بخش صورتِ حال ہے؟'' جمال نے پوچھا۔ ''ان دونوں کو کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوا؟''

''زیب النساء کو شاید کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ہے۔ اس پر صرف یہ دھن سوار ہے کہ اس کے والد کا علاج ہو جائے..... اور ہاں! غزالہ بھی ان دونوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔''

''کوئی حرج نہیں۔ اس کا بندوبست بھی کر دینا۔ اچھا ہے کہ زیبا تنہائی میں پریشان نہ ہو۔''

''وہ تنہا تو نہیں رہتی۔ باپ کے کمرے ہی میں اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔''

''باپ کی بات اور ہے۔ دوست کی موجودگی بہت بڑا سہارا ہوتی ہے۔''

''ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔ باپ ہر وقت کمرے ہی میں نہیں رہیں گے۔ یہاں کے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ایک آپریشن کا بھی امکان ہے۔''

''تو وہ تینوں کب تک جا سکیں گے؟ اور ہاں! تمہیں بھی تو ان کے ساتھ جانا پڑے گا۔''

''وہ تو میں جاؤں گا ہی۔''

''کب تک روانگی ممکن ہے؟''

''لندن اسپتال سے جواب آ جائے۔'' جاوید نے جواب دیا۔ ''میں اسی دوران میں پاسپورٹ پرویزے بھی لگوا لوں گا۔''

ان باتوں کے دوران میں عدنان ان کے ساتھ نہیں تھا۔

جمال بولا۔ ''جب تک تم لوگ روانہ نہیں ہو جاتے، میں بے چین ہی رہوں گا، بلکہ ان لوگوں کی خوشگوار واپسی تک بے چین ہی رہوں گا۔''

''اگر اتنی ہی بے چینی ہے تو تم بھی چلے چلو!''

''یہ ٹھیک کہا تم نے! میں بھی چلتا ہوں۔''

''رضوان سے بھی میں آج ہی فون پر ہیلو ہائے تو کر ہی لوں گا۔ اسے کراچی بلانے کی بات لندن سے واپسی پر بھی ہو سکتی ہے۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔''

☆☆☆

دو دن بعد لندن سے مثبت جواب آ گیا اور تیسرے دن وہ چاروں لندن روانہ ہو گئے اور پھر اگلی فلائٹ سے جمال بھی لندن روانہ ہو گیا تھا۔

لندن میں وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا جہاں جاوید نے نہ صرف اپنا بندوبست کیا تھا بلکہ جمال کا بھی کیا تھا۔ پورا ایک سوئٹ لے لیا گیا تھا۔

''زیب النساء اب بہت خوش ہے۔'' جاوید نے اسپتال سے واپس آ کر کہا۔ ''اس کے والد کا ٹریٹمنٹ شروع کر دیا گیا ہے۔''

''خدا کرے میری یہ کوشش رائگاں نہ جائے۔'' جمال نے کہا۔

''رائگاں نہیں جائے گی۔ ڈاکٹروں سے میں نے خود بات چیت کی تھی، وہ لوگ بالکل مطمئن ہیں۔''

''کراچی میں، میں تم سے ایک بات پوچھنا بھول گیا۔ رضوان سے فون پر بات ہوئی تھی؟''

''اس نے پوچھا تو ہوگا کہ تم اچانک کراچی کیسے پہنچ گئے؟''

''میں نے اسے بتایا تھا کہ یہیں سے لندن جارہا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ میں واپس آؤں گا تو اسے کراچی ہی سے پھر فون کروں گا۔ ایک معاملے میں میری مدد کرنے کے لیے اسے بھی ایک آدھ دن کے لیے کراچی آنا پڑے گا۔''

''یہ بات بروقت کرتے تو بہتر ہوتا۔ وہ متجسس ہوگیا ہوگا کہ تم اسے کراچی کیوں بلانا چاہتے ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسے کریدلگ گئی تھی۔ میں بہ مشکل ہی اسے ٹالنے میں کامیاب ہوسکا۔''

''اب کھانا منگوالو۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

جاوید نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

کھانے کے دوران میں جمال نے کہا۔ ''میں بہت بے چینی سے وقت گزار سکوں گا۔ دل ہر وقت اسپتال کی طرف لگا رہے گا۔''

''میں تو صبح وشام جاتا رہوں گا۔ بیچ میں بھی کسی وقت جاسکتا ہوں۔''

''میں اپنی بات کررہا ہوں، تم خود کو لے بیٹھے۔ تم سے ہر وقت زیب النساء کی باتیں کروں گا تو تم بور ہوجاؤ گے۔''

''تو رائفل کلب چلے جایا کرو۔ کہیں دور دراز ..... میرا مطلب ہے ''سرے'' وغیرہ جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ لندن میں ہی اسٹاک ایکسچینج رائفل کلب ہے۔ ایک پاکستانی نژاد تاجر میرے دوست ہیں۔ ان سے ملا دیتا ہوں تم کو۔ اب یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ ویزے پر آئے ہوئے لوگ وہاں کے ممبر بن سکتے ہیں یا نہیں لیکن ان کے ساتھ ان کے مہمان کی حیثیت سے تو تم جاسکو گے۔''

''ہاں! اس طرح بھی کچھ وقت گزاری ہوسکتی ہے۔ میرا نشانہ برا تو نہیں ہے لیکن اس طرح کچھ اور بہتر ہوجائے گا۔ ریفریشرز کورس سمجھ لو۔''

''میں ابھی فون پر ان سے بات کرتا ہوں۔ آج ہی ملوادوں گا۔ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ تمہاری ان کے ساتھ اچھی نبھے گی۔ رومانٹک آدمی ہیں، جلد ہی بے تکلف بھی ہوجاتے ہیں۔ کسی وقت میں بھی تم دونوں کے ساتھ چلا جایا کروں گا لیکن محض تفریحاً، مجھے شوٹنگ وغیرہ کا ذرا بھی شوق نہیں۔''

جاوید نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی کیا۔ وہ صاحب واقعی رومانٹک اور دلچسپ آدمی تھے۔ جمال ان کے ساتھ کلب جانے لگا۔ جمال کی خاطر وہ روزانہ ہی جانے لگے تھے۔

اس طرح خاصا وقت گزر جاتا۔

دس دن بعد جاوید سے اطلاعات ملنے لگیں کہ زیب النساء کے والد کی صحت بہتر ہونے لگی تھی۔ یہ جمال کے لیے خوشخبری تھی۔ ڈیڑھ مہینے میں صورتِ حال بہت بہتر ہوگئی۔

''زیب النساء تو خوشی سے نہال ہوئی جارہی ہے۔ میرا تو اٹھتے بیٹھتے شکریہ ادا کرتی رہتی ہے۔ آج سے انہوں نے واکر کے سہارے چہل قدمی بھی شروع کردی ہے لیکن ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق زیب النساء اور غزالہ ان کے ساتھ رہتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم دس بارہ دن میں واپس جاسکتے ہیں؟''

''میں نے اس بارے میں ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ جواب یہ ملا کہ دو چار روز کی چہل قدمی دیکھنے کے بعد وہ اس بارے میں کچھ کہہ سکیں گے۔''

''ہمیں اچھی ہی توقع رکھنی چاہیے۔''

''یقیناً۔''

اور پھر دو دن بعد اطلاع مل گئی کہ چند روز میں زیب النساء کے والد کو ڈسچارج کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں حتمی تاریخ ملتے ہی جاوید نے دو جہازوں میں سیٹیں بک کرالیں۔ دو میں اس لیے کہ جمال اب بھی ان سے الگ ہی رہ کر سفر کرنا چاہتا تھا۔

''میری خواہش ہے کہ زیب النساء کے والد کو چلتا پھرتا ہوا دیکھوں۔'' جمال نے کہا۔

''تو کسی وقت چکر لگالو۔ سردی بڑھ جانے کی وجہ سے اب ہم دونوں ہی اوورکوٹ پہننے لگے ہیں۔ تم ایک فیلٹ ہیٹ خرید لو۔'' جاوید ہنسا۔ ''اوورکوٹ کے کالر کھڑے کرکے اور..... ہیٹ پیشانی پر زیادہ جھکا کر احتیاط سے جاؤ تو زیب النساء یا غزالہ تمہیں پہچان ہی نہیں سکیں گی۔''

''تدبیر تو اچھی بتا رہے ہو تم!''

جاوید نے پھر ہنس کر کہا۔ ''انگریزی کی کسی جاسوسی فلم کے کردار لگو گے۔''

جمال نے جاوید کی تجویز کے مطابق .... ہیٹ خرید لیا۔ ڈسچارج کی تاریخ سے ایک دن پہلے وہ اسپتال گیا۔ جاوید نے بتایا تھا کہ چہل قدمی اب لابی میں کی جارہی ہے۔ وقت سہ پہر کا تھا۔

جمال نے ایک گوشے میں کھڑے ہوکر ان تینوں کو دیکھ لیا۔ زیب النساء کو وہ بڑی حسرت سے دیکھتا رہا۔ اس کا

جی تو چاہ رہا تھا کہ زیب النساء جب تک لابی میں ہے، وہ اسے دیکھتا رہے لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔

اس کے دوسرے دن بھی وہ اسپتال اس وقت گیا جب ان لوگوں کو اسپتال سے رخصت ہونا تھا۔ جاوید بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا اور ہوٹل سے اپنا سامان ساتھ لے آیا تھا۔ پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ جس وقت فلائٹ کو لندن سے روانہ ہونا تھا، اسی وقت اسپتال سے رخصت ہوکر فوراً ائرپورٹ کا رخ کیا جائے۔

جمال باہر ٹہلتا رہا۔ جاوید کمرے میں پہنچا۔ زیب النساء نے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔

''کیا اب چلیں جاوید صاحب؟'' زیب النساء فوراً بولی۔

''بس اب چلتے ہیں۔ میں کہتا ہوا آیا ہوں کہ ہمارا بل بھیج دیا جائے۔''

''میں آپ کا.....'' زیب النساء کے والد نے کہا۔

''اور آپ کے ٹرسٹ کا بہت شکر گزار ہوں۔''

''یہ سب کچھ ہمارے ادارے کی ذمے داری تھی۔ اس میں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' غزالہ بولی۔ ''سامان تو بھجوایا جائے۔''

''اس کے لیے بھی کہہ دیا ہے میں نے.....! مجھے خود جلدی ہے۔ فلائٹ سے کافی دیر پہلے ائرپورٹ پہنچنا ہوگا۔''

''بل ادا کردیا آپ نے؟'' زیب النساء نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' جاوید نے اپنی جیب سے لفافہ نکال کر اسے دکھایا۔

زیب النساء اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر جاوید کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ذرا میں بھی تو دیکھوں، کتنا خرچ ہوا ہے آپ کے ادارے کا۔''

جاوید کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی کہ اس نے لفافہ جیب سے نکالا تھا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لفافہ زیب النساء کے ہاتھ سے جھپٹ لیتا۔

''یہ کیا!'' زیب النساء بل دیکھتے ہی بول پڑی۔ ''یہ ادائیگی تو کسی جمال اشرف نے کی ہے۔''

''جی ہاں۔'' جاوید کو کہنا پڑا۔ ''ٹرسٹ کو فنڈ انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔''

''میں ان کو جانتی ہوں۔'' زیب النساء نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ہوسکتا ہے یہ وہ نہ ہوں جن کو آپ جانتی ہیں۔''

اس وقت غزالہ، زیب النساء کے ہاتھ سے بل لے کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''یہ وہی ہیں۔ ان کا کراچی کا موبائل نمبر دیا گیا ہے جو میں جانتی ہوں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' جاوید نے جز بز ہوکر کہا۔ ''بالکل ہوسکتا ہے کہ آپ دونوں جمال صاحب کو جانتی ہوں لیکن انہوں نے.....''

دروازے پر دستک ہوئی۔

''شاید سامان لینے آیا ہے کوئی۔'' جاوید نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے کہا اور بوکھلاہٹ میں خود اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا حالانکہ صرف ''کم ان'' کہنے کی ضرورت تھی۔

''یہ جمال کون ہے بیٹی؟'' زیب النساء کے والد نے پوچھا۔

''بعد میں جان لیجیے گا بابا!'' زیب النساء نے آہستہ سے کہا۔

جاوید نے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر اور ایک نرس دکھائی دیے تھے۔ ڈاکٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہیلو مسٹر جاوید!''

''ہیلو ڈاکٹر! آیئے۔''

''میں آپ کو سمجھانے آیا ہوں کہ آئندہ آپ کو کیا کرنا ہے۔'' ڈاکٹر نے اندر آتے ہوئے کہا۔ نرس بھی اس کے ساتھ تھی جس نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ چھوٹا سا بیگ اٹھایا جو زیب النساء کے والد کے بستر کے سرہانے رکھا تھا۔

ڈاکٹر نے زیب النساء اور غزالہ سے بھی رسمی باتیں کیں اور زیب النساء کے والد سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ''میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کو اور پندرہ دن اسپتال میں رکھا جاتا لیکن مسٹر جاوید کو عجلت تھی۔ خیر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ گاڈ بلیس یو!''

نرس نے بیگ میں سے ایک کاغذ نکال کر ڈاکٹر کو دیا۔

''بیگ میں دوائیں ہیں جو انہیں پندرہ دن تک پابندی سے دینی ہیں۔'' ڈاکٹر نے جاوید سے کہا۔ ''یہ نسخہ ہے ان دواؤں کا۔ اس پر وضاحت سے لکھ دیا گیا ہے کہ دوائیں کس طرح استعمال ہوں گی۔''

''شکریہ ڈاکٹر!'' جاوید نے نسخہ لیتے ہوئے کہا۔

اس دوران دو آدمیوں نے آکر ان کا سامان اٹھا لیا تھا۔

''یہ لفافہ مجھے دیجیے بی بی!'' جاوید نے زیب النساء سے کہا۔

غزالہ نے نسخہ زیب النساء کو دے دیا۔ زیب النساء

نے دونوں چیزیں جاوید کی طرف بڑھادیں۔ اس کے چہرے سے تفکر کا اظہار ہورہا تھا۔ اگر نرس اور ڈاکٹر نہ ہوتے تو جاوید اس کے سوالات کا ہدف اسی وقت بن جاتا لیکن وہ جانتا تھا کہ ہدف تو اسے بننا ہی پڑے گا۔ وہ مسلسل سوچے جارہا تھا کہ اسے کیا کہنا ہوگا۔

ڈاکٹر نے اپنی نیک خواہشات کے ساتھ ان لوگوں کو رخصت کیا۔

جمال قریب ہی ٹہل رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زیب النساء کے والد بالکل ٹھیک نظر آرہے تھے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ غزالہ اور زیب النساء کے چہروں پر سوچ بچار کے تاثرات کیوں تھے۔ خود جاوید بھی کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔

وہ لوگ ائرپورٹ روانہ ہوگئے۔ جمال بھی باہر نکل آیا تھا۔ اس کی فلائٹ چند گھنٹے بعد تھی۔ اس نے ائرلائن بھی دوسری لی تھی۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے کافی پی۔ زیب النساء، غزالہ اور جاوید کے تاثرات نے اسے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد اس نے موبائل پر جاوید کی کال ریسیو کی اور چھوٹتے ہی بولا۔ ''تم لوگ کچھ پریشان تھے۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے کیا؟''

''ہاں جمال!'' جاوید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''زیب النساء جان گئی ہے کہ علاج تم نے کروایا ہے۔''

''ارے! کیسے؟''

''میں ابھی مختصر طور پر بات کرسکتا ہوں۔ ہم ائرپورٹ پر ہیں۔ بس اب ڈیپارچر لاؤنج میں جانے ہی والے ہیں۔ میں واش روم کے بہانے ان دونوں سے الگ ہوکر تمہیں فون کررہا ہوں۔ اب مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

جمال نے جھنجلا کر کہا۔ ''پوری بات بتاؤ گے تو مشورہ دوں گا نا...!''

''مختصر طور پر یہ جان لو کہ زیب النساء نے اسپتال کے بل پر تمہارا نام اور کراچی کا فون نمبر دیکھ لیا تھا۔''

''کیسے؟''

''اس کے بعد تم اس کے تاثرات پوچھو گے۔ اتنا وقت نہیں ہے۔''

''تو پھر تم ہی بھگتو۔'' جمال نے کہا اور رابطہ منقطع کرکے موبائل بستر پر ہی پٹخ دیا۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔

☆☆☆

کراچی تک کے سفر میں بھی زیب النساء نے جاوید سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اپنے باپ کے سامنے وہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔

جاوید نے ان لوگوں کو ائرپورٹ سے زیب النساء کے گھر تک پہنچایا۔ اس کا وہاں رکنا بھی ضروری تھا۔ زیب النساء کو سمجھانا تھا کہ دوائیں کس طرح استعمال کرائی جائیں گی۔

''آپ اب آرام کریں بابا!'' زیب النساء نے کہا۔ ''میں ذرا جاوید صاحب سے کچھ باتیں کرلوں۔''

ولی خان بہت خوش نظر آرہا تھا۔ وہ بابا کو ان کے کمرے تک چھوڑنے چلا گیا۔

جاوید جلدی سے بولا۔ ''پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ دوائیں.....''

''وہ سب کچھ آپ غزالہ کو سمجھا دیجیے.....! میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔ بابا کی وجہ سے برداشت کرتی رہی اور آپ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اب بتائیے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟''

جاوید اس دوران میں فیصلہ کرچکا تھا کہ سب کچھ سچ سچ بتادینا ہی بہتر ہوگا۔ جھوٹ بولنے کے بعد پے در پے جھوٹ بولنا پڑتے جس میں کوئی غلطی ہوسکتی تھی۔ اس نے زیب النساء کو ساری بات بتادی۔

''اچھا!'' زیب النساء نے طویل سانس لی۔ ''خیر! میں جمال صاحب کی شکر گزار تو ہوں۔ احسان مند بھی ہوں ان کی، لیکن ان سے کہہ دیجیے گا کہ اس طرح وہ میری محبت تو حاصل نہیں کرسکتے۔ میں جسے چاہتی ہوں، زندگی بھر اسی کو چاہتی رہوں گی۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''غزالہ! تم جاوید صاحب سے دواؤں کے بارے میں سمجھ لو، پھر مجھے سمجھا دینا۔ میں بابا کے پاس جارہی ہوں۔''

''ایک بات کہہ دوں آپ سے!'' جاوید بولا۔ ''جمال تو چاہتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو اس کا علم ہو۔ وہ تو آپ نے بل ہی مجھ سے جھپٹ لیا تھا۔''

زیب النساء کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد جاوید جاچکا تھا۔ زیب النساء اس کے جانے کے بعد ہی بیرونی کمرے میں آئی تھی۔

''ایک بات تو ماننا پڑے گی زیبا!'' غزالہ بولی۔ ''جمال تم سے واقعی بہت محبت کرتا ہے۔ جاوید صاحب بتا کر گئے ہیں کہ وہ تمہیں رضوان سے ملادے گا۔''

''وہ خود بھی یہ بات کہہ کر گیا تھا۔ وہ مجھے رضوان سے کیسے ملاسکتا ہے؟''

''جاوید کا کہنا ہے کہ دو ایک دن میں ہی ایسا ہو جائے گا۔ تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔''

''اگر ایسا ہو سکا تو یہ اس کا مجھ پر دوسرا احسان ہوگا۔'' زیب النساء کی آواز بھرا گئی۔

''اب اس سے تمہارا رویہ کیا ہوگا۔''

''اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں کہ میں اب اسے اپنا ایک ہمدرد دوست سمجھ لوں اور پہلے کی طرح اس کے ساتھ کوئی سخت رویہ اختیار نہ کروں۔''

''یہ تو ضروری بھی ہے زیبا.....! اچھا اب تم دواؤں کے بارے میں سمجھ لو۔ ویسے نسخے میں ہر بات وضاحت سے لکھی گئی ہے۔ پہلے تم یہ پڑھ لو۔ میں نے تو جاوید صاحب کے سمجھائے بغیر سمجھ لی تھیں۔''

زیب النساء نے بھی نسخہ پڑھ کر سب کچھ سمجھ لیا۔

''اب میں جاؤں گی۔'' غزالہ کھڑی ہو گئی۔ ''اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تمہارے سامنے ہی تو انہیں فون کیا تھا میں نے ائرپورٹ سے۔''

وہ زیب النساء سے گلے مل کر رخصت ہوئی۔

اس دن اور رات کو زیب النساء کے دماغ میں مختلف خیالات چکراتے رہے۔ جمال کے توسط سے رضوان کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کیا واقعی جمال، رضوان کو اس سے ملا سکے گا؟ اور کیا رضوان اب بھی اسے قبول کر لے گا؟ اسے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ ڈپٹی کے گھر سے ایک رات بعد ہی غائب ہو گئی تھی۔ زیب النساء نے سوچا بھی نہیں کہ وہ رضوان کو اپنے حالات سے بے خبر رکھے گی۔ اپنے محبوب کو دھوکا دینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی اس کے دماغ میں آیا کہ اب وہ اس گندے دھندے سے نکل جائے۔ وہ ملازمت کر کے بھی گھر کسی نہ کسی طرح چلا سکتی تھی۔ اتنے عرصے تک اس گندے دھندے میں پڑ کر وہ خاصا کچھ کما بھی چکی تھی۔ اس پیسے سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی کیا جا سکتا تھا۔ وہ پیسے کسی جگہ انویسٹ بھی کیے جا سکتے تھے۔ اس سلسلے میں اسے کسی کے مشورے کی ضرورت تھی۔ غزالہ تو اس معاملے میں شاید ہی کوئی مشورہ دے سکتی۔ اپنے دھندے کی دوسری لڑکیوں سے وہ اس معاملے میں بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی..... یکا یک اس کے دماغ میں جمال کا خیال آیا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اسی محبت کی وجہ سے اس نے اس کے باپ کا علاج کرایا تھا اور اسے اس کے محبوب سے ملانے کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے تو نہیں دے سکتی تھی لیکن کیا وہ اس کا صرف دوست بننا پسند کر لے گا؟

ان خیالات کے ساتھ کسی وقت اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن اس نے ولی خان سے گھر کا سودا سلف منگوایا۔ کسی چیز کی اس نے پڑیا کھولی تو چونک گئی۔ وہ پڑیا کسی اخبار کے چھوٹے سے حصے سے بنائی گئی تھی۔ اس میں چھپی ہوئی خبر کے ایک نام نے اسے چونکا دیا۔ وہ نام تھا ڈپٹی کا! زیب النساء کے سارے جسم میں خون کھولنے لگا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اس کی زندگی برباد کی تھی۔

خبر پھٹی ہوئی تھی اس لیے زیب النساء صرف اتنا جان سکی کہ ڈپٹی اب لاہور سے کراچی آ چکا تھا۔ مستقل قیام کر لیا تھا اس نے یہاں..... آنے والی سنیچر کو اس کی سالگرہ تھی۔ وہ رات کے وقت اپنے گھر میں رقص اور گانے کا اہتمام کرنا چاہتا تھا۔

کیا کسی طرح اس تقریب میں شریک ہوا جا سکتا ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔

اس سوال نے اسے اتنا الجھایا کہ دیر تک اسے کھانا پکانے کا خیال نہیں آیا۔ پھر جب آیا تو اس نے جلدی سے دلیا بنایا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کے والد کو کسی وقت خالی پیٹ نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اب کھانا پکانے میں تو کچھ دیر ہو سکتی تھی اس لیے اس کا یہ فیصلہ صحیح تھا کہ فوری طور پر اپنے والد کو دلیا کھلا دے۔

دو بجے کے قریب اس نے اپنے باپ کو کھانا بھی کھلا دیا اور خود بھی کھا کر اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ لیٹی ہی تھی کہ غزالہ کا فون آ گیا۔

''بابا کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' زیب النساء نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی پوچھو گی نا تم؟''

''ہاں، پہلے تو یہی پوچھتی۔''

''اس کے بعد؟''

''تمہارا آئندہ کا پروگرام!''

''کئی باتیں ہیں ذہن میں۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اگر اس وقت تمہیں کوئی مصروفیت نہ ہو تو میں آ جاؤں؟''

''آ جاؤ! مصروفیت کیا ہوگی!'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''ہم لوگوں کی مصروفیت رات کو ہوتی ہے۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' زیب النساء نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

آٹو رکشا کر کے وہ غزالہ کے گھر پہنچی۔ رکشا سے

اتری تو اس نے دو طوائفوں کو غزالہ کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتی ہوئی ایک کار میں جا بیٹھیں۔ اگر وہ زیب النساء کو دیکھ لیتیں تو دو چار باتوں کے لیے رک جاتیں۔ جان پہچان تو تھی ہی۔

غزالہ نے پُرجوش انداز میں اسے گلے لگایا اور بولی۔ ''تم نے جلدی سے فون بند کر دیا تھا ورنہ میں تم سے کہتی کہ مجھے بازار جانا ہے۔ وہاں سے میں ہی تمہارے پاس آجاؤں گی۔''

زیب النساء نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ ''یہ دونوں کیوں آئی تھیں؟''

''اماں نے بلوایا تھا۔''

''کیوں؟''

''ایک بڑا آدمی کچھ دھوم دھام سے اپنی سالگرہ منانا چاہتا ہے۔ اس کے کارندوں نے اماں سے رابطہ کیا تھا۔ گانے اور رقص کی محفل کا سارا کام وہ اماں ہی سے لینا چاہتا ہے۔''

''کوئی پرانا تعلق ہے کیا اس کا اماں سے؟''

''ارے جانے کتنوں سے ہے پرانا تعلق! تم اپنی بات کرو۔ کوئی خاص بات ہے جو ملنے آگئیں؟''

زیب النساء کی دانست میں یہ ناممکن تھا کہ غزالہ کو ساری بات معلوم نہ ہو لیکن اس نے ڈپٹی کا ذکر اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس شخص کے بارے میں زیب النساء کے جذبات سے واقف تھی۔

''دراصل!'' زیب النساء نے کہا۔ ''میں نے یہ دھندا چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

غزالہ چونکی۔ ''نوکری؟''

''ہاں۔ ایک کام اور بھی ہو سکتا ہے۔ جو پیسا بابا کے لیے جوڑ رہی تھی، وہ اب کسی کاروبار میں لگا دوں۔''

''اس کے لیے کسی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔''

''تم سے یہ مشورہ بھی کرنا تھا۔''

''جمال کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' غزالہ نے کہا اور غور سے زیب النساء کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے بھی اس کا خیال آیا تھا لیکن.....'' زیب النساء سوچتی ہوئی خاموش ہو گئی۔

''تم رضوان سے محبت کرتی ہو لیکن وہ تم سے محبت کرتا ہے، جس کا ایک ثبوت وہ دے بھی چکا ہے۔''

''رضوان مجھے ملے یا نہ ملے، جمال کی محبت کا جواب میں محبت سے تو نہیں دے سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ میں اسے اپنا ایک اچھا دوست سمجھ سکتی ہوں۔''

''شاید وہ اسے بھی غنیمت جانے۔ فون کر لو اسے۔ مجھے یقین ہے کہ دوڑا چلا آئے گا۔''

''یہ فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہوں۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔''

''صاف صاف بات کر لینا۔''

''اچھا اس بڑے آدمی کا نام تو بتاؤ جو اپنی سالگرہ.....''

''ارے دفع کرو، ہوگا کوئی۔'' غزالہ نے سر جھٹکا۔

زیب النساء کٹیلے سے انداز میں مسکرائی۔ ''میں جانتی ہوں تم مجھ سے اس کا نام کیوں چھپا رہی ہو۔''

''میں کیوں چھپاؤں گی؟''

''اس لیے کہ وہ ڈپٹی کے نام سے مشہور ہے۔''

غزالہ چونک گئی۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

زیب النساء نے بتایا کہ اسے کیسے معلوم ہوا پھر بولی۔ ''یہ تم مجھے بتا ہی چکی ہو کہ اس کا اماں سے تعلق رہا تھا۔ یہ بھی وہ جانتا ہوگا کہ اچھی گانے والیاں اور اچھی رقاصائیں اماں سے رابطہ رکھتی ہیں۔''

''ہاں۔'' غزالہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں تم سے اس کا نام اس لیے چھپا رہی تھی کہ تمہارے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔''

''وہ کراچی آگیا ہے؟''

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ''اب اس کے پاس کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے کہ اسلام آباد کے قریب لاہور یا کسی قریبی جگہ رہنا ضروری ہو۔''

''اماں سے بات کرو۔ میں رقص بھی سیکھ چکی ہوں اور گانا بھی۔''

''تو؟'' غزالہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اماں سے کیا بات کروں؟''

''مجھے بھی بھیجیں وہاں گانے ناچنے کے لیے!''

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم یہ دھندا چھوڑنا چاہتی ہو!''

''آخری بار اس کمینے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ تو مجھے پہچانے گا نہیں۔ بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ میک اپ سے میں خود کو بدل لوں گی۔''

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ تم اسے صرف دیکھنا چاہتی ہو.....! اور کچھ ارادہ لگتا ہے تمہارا!''

''اور کیا ارادہ ہوگا؟'' زیب النساء نے سادگی سے کہا۔

''تم اسے مارنا چاہتی ہو!''

''کیسے مار سکتی ہوں؟ تم مجھے بتا چکی ہو کہ وہ اپنے کئی

باڈی گارڈز رکھتا ہے۔''

''تم کوشش تو کر سکتی ہو۔''

''میں ایسی کوشش کیوں کروں گی جو میرے ہی لیے خطرناک ثابت ہو۔''

''تمہارے چہرے سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''محض خیال ہے تمہارا۔''

''میری مانو کہ یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ اماں بھی شاید نہ مانیں۔''

''تم منوا سکتی ہو ان سے۔''

زیب النساء کی خاصی ضد کے بعد غزالہ اپنی ماں سے بات کرنے پر آمادہ ہوئی تو زیب النساء نے کہا۔ ''ابھی بات کروان سے۔''

غزالہ کو اس کی یہ بات بھی ماننا پڑی۔ زیب النساء بھی اس کے ساتھ اس کی ماں کے کمرے میں گئی۔ غزالہ نے جب اسے زیب النساء کی خواہش سے آگاہ کیا تو وہ زیب النساء کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ارے! کیا پاگل ہوئی ہے۔''

''کچھ بھی کہہ لو اماں!'' زیب النساء کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''تم نے میری یہ آخری خواہش پوری نہ کی تو میں اپنے ساتھ جانے کیا کر بیٹھوں۔''

''کیا کر بیٹھے گی؟''

''یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا لیکن جو کچھ بھی کروں گی، اس کا غزالہ کو تو بہت ہی افسوس ہوگا۔''

غزالہ بولی۔ ''اس کی بات مان لو اماں.....! کہا تو ہے اس نے کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے۔''

غزالہ کی ماں کسی سوچ میں پڑ گئی، پھر ایک لمبی سانس لے کر زیب النساء سے بولی۔ ''چل مان لیتی ہوں تیری بات۔''

زیب النساء نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ اس کے آنسو اس کے ہاتھوں پر بھی گرے۔

''اب رو تو نہیں۔'' غزالہ کی ماں نے کہا۔ ''مان تو گئی ہوں میں تیری بات۔''

زیب النساء اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔

جب وہ وہاں سے اپنے گھر لوٹی تو گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اب جمال کو فون کرنا بے کار ہے۔

زیب النساء رات کا کھانا کھانے کے بعد بھی بستر پر پڑی دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ صبح اٹھ کر ناشتے کے بعد وہ کچھ خریداری کے لیے گھر سے نکلی۔ وہ عام طور پر یہ کام ولی خان سے لیا کرتی تھی لیکن اس دن اس نے خود ہی جانا ضروری سمجھا تھا۔

گھر واپس آ کر بھی وہ اپنا کمرا بند کر کے ایک گھنٹے تک مصروف رہی، پھر بڑبڑائی۔ ''اب وہ زندہ نہیں بچ سکتا۔''

چند منٹ بعد ہی غزالہ کا فون آیا۔

''ابھی کچھ ہی دیر میں جمال تمہارے پاس پہنچنے والا ہے۔''

''کیوں؟'' زیب النساء چونکی۔ ''کیسے؟''

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اسے فون نہیں کرو گی اس لیے ابھی میں نے ہی اسے فون کیا ہے اور اس سے کہا ہے کہ تم اس سے ملنا چاہتی ہو۔''

زیب النساء نے ایک طویل سانس لی۔ ''مجھے سوچنے تو دیا ہوتا۔''

''میں نے کل تم سے بات کر کے سمجھ لیا تھا کہ تم اسے فون نہیں کرو گی، حالانکہ تمہیں جو کام ہے، اس کے لیے جمال سے اچھا آدمی نہیں ملے گا۔''

''تم بھی آ جاؤ۔''

''تم کہتی ہو تو آ جاتی ہوں۔''

زیب النساء نے اسی وقت ولی خان کو بازار بھیج کر کچھ ایسی خریداری کروائی جس سے جمال کی خاطر مدارات کر سکے۔

غزالہ کے آنے سے پہلے جمال آ گیا۔ اس کے ساتھ جاوید بھی تھا۔

جمال نے آتے ہی کہا۔ ''میں جلدی آ جاتا لیکن جاوید کو بھی ساتھ لانا چاہتا تھا اس لیے کچھ دیر ہو گئی۔''

''میں نے بھی غزالہ کو بلایا ہے۔''

''اوہ!'' جمال چونکا۔ اب اس کی نظر تپائی پر پڑی تھی جس پر ولی خان نے خاطر مدارات کا سامان سجایا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟'' جمال نے کہا۔

''ایک ہمدرد دوست کا استقبال صحیح طور پر کیا جانا چاہیے۔''

جمال کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''دوست بنانے کا شکریہ۔''

''بس اتنا ہی کر سکتی تھی۔'' زیب النساء نے مبہم جملہ کہا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس سے زیادہ خاطر مدارات ممکن نہیں تھی اور دوسرا مطلب یہ ممکن تھا کہ وہ اسے بس دوست ہی بنا سکتی تھی۔

اس مختصر دورانیے میں جاوید خاموش ہی رہا تھا۔

''بیٹھیں آپ لوگ!'' زیب النساء نے جاوید سے کہا۔

جمال بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہاری دوست کے

ذریعے تمہارا پیغام نہ ملتا تو بھی آج میں تمہارے گھر آنے والا تھا۔''

''کیوں؟ کوئی خاص بات؟'' زیب النساء نے کہا اور ایک پلیٹ جمال کو دینے کے بعد جاوید کو بھی دی۔

''آپ بھی لیجیے نا!'' جاوید بولا۔

''میں بھی لے رہی ہوں۔'' زیب النساء نے اپنے لیے بھی پلیٹ اٹھائی، پھر جمال سے بولی۔ ''جواب نہیں دیا آپ نے؟''

''میں آپ کو ایک خوشخبری دینے کے لیے آتا۔''

زیب النساء کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔ لفظ ''خوشخبری'' سے اس کے دماغ میں ایک ہی خیال آیا تھا جو درست ثابت ہوا۔

جمال نے کہا۔ ''آج شام تمہاری ملاقات رضوان سے ہوجائے گی۔ آج میں اپنا وعدہ پورا کردوں گا۔''

''یہ..... یہ کیسے..... کیسے ہوگیا؟'' زیب النساء کچھ ہکلا گئی۔

جمال نے اس سے کچھ چھپانا غیر ضروری سمجھا، پھر کہا۔ ''آج تیسرے پہر کی فلائٹ سے وہ کراچی پہنچ جائے گا۔ پانچ بجے تیار رہنا۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

''لینے؟ کیوں؟''

''ہم جس گھر میں ٹھہرے ہیں، رضوان وہیں ہوگا۔ تم فوری طور پر اس کے سامنے نہیں آؤ گی۔ برابر کے کمرے میں دروازے سے لگ کر ہماری باتیں سننا۔ تم اچانک رضوان کے سامنے آؤ گی تو اس کا چونکنا بڑا خوشگوار ہوگا۔''

''ایسا تو میرے گھر میں بھی ہوسکتا ہے۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''آپ لوگ یہاں بیٹھ کر باتیں کیجیے گا۔ میرا کمرا برابر میں ہے، میں وہاں دروازے کے قریب رہوں گی۔''

جمال نے جاوید کی طرف دیکھا۔

''یہ تو کچھ عجیب سا ہوگا!'' جاوید بولا۔

''کیوں؟''

''یہ جگہ.....'' جاوید نے چاروں طرف دیکھا۔

''معمولی سا گھر ہے یہ۔'' زیب النساء پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''نہ جانے کیا سوچے وہ۔'' اس بار جمال بولا۔

''جو کچھ وہ سوچ سکتا ہے، میں اسے اس سے زیادہ ہی بتانا چاہوں گی۔''

''کیا مطلب!''

''میں اسے کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میری زندگی جس طرح گزری ہے، وہ سب اس کے علم میں لاؤں گی۔''

ایک بار پھر جاوید اور جمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''کیوں؟'' زیب النساء بولی۔ ''کیا میں غلط سوچ رہی ہوں؟''

''نہ جانے کیا ردعمل ہو اس کا!'' جمال نے کہا۔

''اگر اسے اب بھی مجھ سے محبت ہے تو وہ یہ سب کچھ گوارا کرلے گا۔'' زیب النساء نے کہا۔ ''اور اگر وہ اس صورت میں مجھے ٹھکرا دیتا ہے تو مجھے معلوم ہوجائے گا کہ اسے مجھ سے سچی محبت نہ تھی، نہ ہے۔ میرا دل تو گھائل ہوجائے گا لیکن میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔'' زیب النساء کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''ویسے.....'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ ''وہ مجھے ٹھکرا بھی دے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''کیوں؟''

زیب النساء نے جواب نہیں دیا تھا کہ غزالہ آگئی۔ اس کے لیے دروازہ ولی خان نے کھولا تھا۔

''رو کیوں رہی ہو تم؟'' وہ آتے ہی حیرت سے بولی۔

زیب النساء سے پہلے جاوید بول پڑا۔ ''باتیں کچھ ایسی ہی ہوگئی ہیں۔ آج ہم انہیں رضوان سے ملانا چاہتے ہیں۔''

''واہ! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔'' غزالہ، زیب النساء سے لپٹ گئی۔

''یہ بات نہیں۔'' جمال نے افسردگی سے کہا۔

''پھر؟'' غزالہ سنجیدہ ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

جمال نے اسے وہ سب باتیں بتادیں جو ہوچکی تھیں۔ اس دوران میں زیب النساء سر جھکائے افسردہ سی بیٹھی رہی۔

سب کچھ سن کر غزالہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ یہ تو زیبا نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ وہ رضوان سے اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپائے گی۔''

''کچھ لیں تو آپ لوگ!'' زیب النساء نے جاوید اور جمال کی خالی پلیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر بولی۔ ''تم بھی لو غزالہ!''

''کیا خیال ہے؟'' جمال نے جاوید سے پوچھا۔ ''رضوان کو یہاں لایا جاسکتا ہے؟''

''میں اسے ہر جگہ لے جاسکتا ہوں۔''

''کہو گے کیا؟''

''کچھ نہ کچھ کہہ دوں گا۔ تم اس بارے میں نہ سوچو۔''

تھوڑی دیر بعد جاوید نے جانے کی اجازت چاہی۔

''ولی خان دروازہ کھولے گا۔'' زیب النساء بولی۔

''یہیں بٹھایئے گا رضوان کو۔ میں دروازے کی آڑ سے باتیں سنتی رہوں گی۔ آپ لوگ جس طرح مناسب سمجھیں، رضوان کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیجیے گا۔''

''ایک بار پھر سوچ لیں آپ۔'' جاوید نے کہا۔ ''رضوان کو سب کچھ بتا دینا مناسب ہوگا؟''

''میں بہت پہلے سے سوچ چکی ہوں۔''

جمال اور جاوید کھڑے ہو گئے۔ غزالہ انہیں باہر تک چھوڑنے گئی۔

☆☆☆

زیب النساء سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ غزالہ کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

''زیبا!'' وہ بولی۔ ''اگر رضوان نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کیا تو؟''

''تو میں اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہوں کہ زندگی بھر اپنی محبت کی موت کا ماتم کرتی رہوں۔''

''کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ تم بھی اسے کھری کھری سنا دو اور جمال کا ہاتھ پکڑ لو!''

''کیسی فضول بات کر رہی ہو!'' زیب النساء نے اسے جھڑک دینے والے انداز میں کہا۔ ''میرے دل میں جو جگہ رضوان کی ہے، وہ جگہ اسی کی رہے گی۔ وہ جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔''

''اچھا!'' غزالہ کھڑی ہوئی۔ ''اماں کو نہ جانے کیا کام ہے، کہا تھا ذرا جلدی آنا۔ وہ لوگ آئیں تو مجھے فون کر دینا۔''

زیب النساء نے سر ہلا دیا۔ پھر دن بھر گھر کے کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف النوع خیالات میں ڈوبی رہی۔ ان میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ رضوان اسے مسترد کر دے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ بہتر ہوگا کہ وہ اسے مسترد ہی کر دے تاکہ بعد میں اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ رضوان سے ملے ہی نہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

پانچ بجے کے قریب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دھڑکتے دل سے جاوید کی کال ریسیو کی۔

''معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو زیادہ پہلے سے اطلاع نہیں دے سکا۔ کسی وجہ سے میں نے راہ چلتے رضوان سے کہا تھا کہ ایک دوست کا گھر قریب ہے، کیوں نہ اس سے ملتے چلیں۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم پانچ منٹ میں آپ کے گھر پہنچ رہے ہیں۔''

''اچھا!'' زیب النساء نے آہستہ سے کہا، پھر فون بند کر کے ولی خان کو بلا کر ہدایات دینے لگی کہ اس وقت بھی کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات کا بندوبست کر دے۔ پھر اس نے غزالہ کو فون کر کے بتایا کہ وہ لوگ اچانک ہی آنے والے ہیں۔

''اب تو بس دو تین منٹ رہ گئے ہیں۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''مجھے تو اب کچھ دیر ہو جائے گی۔ اماں کا ایک کام کر رہی ہوں۔ پندرہ منٹ تو اسی میں لگ جائیں گے۔''

''جب آ سکو، تب آ جانا۔'' زیب النساء نے جواب دے کر فون بند کر دیا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے ہی میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ دو منٹ بعد ہی اس نے کال بیل کی آواز سنی۔ پھر وہ دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ دروازے کو ذرا سا کھول لیا تاکہ ان لوگوں کو دیکھ بھی سکے اور ان کی آوازیں بھی صاف سن لے۔

اس نے دیکھا کہ ولی خان نے بیرونی دروازہ کھول دیا تھا۔ ''آیئے!'' اس نے کہا۔

رضوان، جاوید اور جمال اندر آئے۔ برسوں بعد رضوان کو دیکھ کر زیب النساء کو لگا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ جائے گا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''تمہارے دوست؟'' رضوان نے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے ولی خان کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں یار!'' جاوید نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ اس کا ملازم ہے۔''

''اوہ.....! میں سمجھا تھا کہ..... اچھا خیر.....! لیکن تمہارے دوست کو خود آنا چاہیے تھا استقبال کے لیے۔''

''وہ نہا رہے ہیں۔'' ولی خان نے کہا۔ وہ بہت ہوشیار تھا۔ یہاں ہونے والی بات چیت سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے ورنہ وہ ''نہا رہی ہیں'' کہتا۔

ولی خان کے جملے کے ابتدائی دو لفظ سنتے ہی زیب النساء کا دماغ گھوم گیا تھا لیکن پورا جواب سن کر اسے تسلی ہوئی۔ وہ اس وقت صرف رضوان میں کھوئی ہوئی تھی ورنہ اسے ولی خان پر پیار آ جاتا۔

وہ تینوں بیٹھ گئے تھے۔ زیب النساء کی آنکھیں جیسے رضوان پر نثار ہوئی جا رہی تھیں۔

''کیا بات ہے یارو!'' رضوان نے جمال اور جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب سے تم لوگوں نے مجھے یہاں

لانے کا ارادہ کیا ہے، کچھ الجھے ہوئے سے نظر آرہے ہو؟''

''ہاں! ایک الجھن تو ہے۔'' جاوید نے کہا۔ ''لیکن اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی دروازے پر ہی میں نے ایک بات چھیڑی تھی۔ تم اس کا جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ دروازہ کھل گیا تھا۔''

''ہاں۔'' رضوان نے کہا۔ ''تم نے یہ پوچھا تھا کہ میری زندگی میں کبھی کسی رومانس نے جنم لیا ہے؟''

''ہاں۔'' جاوید نے کہا۔

''بہت پرانی یاد دلادی تم نے.....! اسکول کے زمانے کی بات ہے۔ وہاں ایک لڑکی زیب النساء بھی پڑھتی تھی۔''

''ہاں! اس نام کی کوئی لڑکی تو تھی شاید!''

''اس بے چاری کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک تو اس کی شادی ایک عمر دراز شخص سے کردی گئی۔ پھر وہ رات گزارتے ہی شوہر کے گھر سے بھاگ بھی گئی۔ اس بارے میں دو ایک باتیں اور بھی سننے میں آئی تھیں۔ کسی نے کہا تھا کہ وہ جس کے ساتھ بھاگی تھی، اس نے اسے کہیں بیچ ڈالا تھا۔ کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ خود ڈپٹی ہی نے یہ کھیل کھیلا تھا۔''

''ڈپٹی؟ یعنی وہ سیاست دان؟''

''ہاں! اسی سے تو شادی ہوئی تھی اس کی۔ سنا ہے کہ ڈپٹی خود ایک بردہ فروش تھا یا شاید اب بھی ہو۔ اس نے دولت ہی اس طرح جمع کی ہے۔ کم از کم لوگ تو یہی کہتے ہیں۔ بس اس لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھی تھیں۔''

''اب اگر وہ آپ کو مل جائے؟'' جمال بول پڑا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں جمال صاحب.....! جب ...اسے بیچا گیا ہے تو وہ یقیناً طوائف بن چکی ہوگی۔ اب میں ایک طوائف سے مل کر کیا کروں گا۔''

اس جواب سے زیب النساء کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل پر کوئی وزنی ہتھوڑا پڑا ہو۔

رضوان نے مزید کہا۔ ''نوجوانی میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وقتی جذباتی ابال ہوتا ہے۔ اب تو میں اسے بھول بھی چکا۔''

''ہوسکتا ہے وہ اب بھی آپ سے محبت کرتی ہو!'' جمال نے کہا۔

''بے وقوف ہوگی، اگر اب بھی یہ سمجھے کہ میں اسے اپنالوں گا۔''

اس وقت زیب النساء کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو رضوان!'' وہ دل ہی دل میں رو پڑی۔ ''یہ اچھا ہی ہے کہ تم مجھے بھول چکے ہو۔ اگر تمہارے دل میں اب بھی میری محبت ہوتی تو تمہیں ایک صدمہ بھی جھیلنا پڑتا۔''

پھر وہ آہستہ سے مڑ کر اپنی ماں کی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''سنا تم نے ماں.....! رضوان نے مجھے بھلا دیا ہے.....اچھا ہی ہوا ہے ورنہ اسے یہ صدمہ جھیلنا پڑتا کہ اس کی محبوبہ زندہ ہوتے ہوئے بھی اس کی نہیں ہوسکی۔ میری زندگی تو اب جیل میں ہی گزرے گی۔ مجھے ہمت دیں ماں کہ میں کل کی محفل میں ڈپٹی کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوسکوں۔ میں نے ایک بڑا چاقو خرید کر اسے زہر میں بجھالیا ہے۔ اگر اس کے باڈی گارڈز نے اسے بچانے کی کوشش کی تب بھی اتنا تو کر گزروں گی کہ ڈپٹی کے جسم پر چاقو کی ایک گہری خراش ہی آجائے۔ زہر میں بجھے ہوئے چاقو کی وہ خراش اسے زندہ نہیں رہنے دے گی۔''

اچانک زیب النساء نے محسوس کیا کہ اس کے قریب کوئی ہے۔ وہ تیزی سے پلٹی۔ اس نے جمال کو قریب کھڑا پایا۔

''یہ تم نے کیا ارادہ کرلیا، زیبا!'' جمال کی آواز میں لرزش تھی۔

زیب النساء نے طویل سانس لی۔ ''تو سن لیا تم نے سب کچھ؟''

''میں بہانے سے اٹھ کر اندر یہ دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ رضوان کا جواب سن کر تم پر کیا گزری ہے!''

''دل پاش پاش ہوچکا ہے لیکن اگر وہ یہ جواب نہ دیتا تو اسے ایک صدمہ بھی ہوتا۔ میری زندگی تو اب جیل میں گزرے گی۔''

''یہ غلط ہے۔'' جمال نے کہا۔

''پلیز جمال صاحب!'' زیب النساء نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں آپ لوگ رضوان کو لے آئے۔ اب کوئی شبہ ہی نہیں رہا کہ آپ کو مجھ سے بے پناہ محبت ہے لیکن میرے دل میں جس کی محبت اب بھی ہے، اس کی جگہ میں کسی اور کو دے ہی نہیں سکتی۔ میں آپ کو آپ کی محبت کی قسم دے کر کہہ رہی ہوں کہ جو کچھ آپ نے سنا ہے، وہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ آپ کو میں نے دوست کہا ہے۔ اس دوستی کو بھی نظر انداز نہ کیجیے گا۔''

''لیکن زیبا! تم جو کچھ کرنا چاہ رہی ہو.....''

''ہوسکتا ہے وہ آپ کی نظر میں غلط ہو۔'' زیب النساء نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اپنے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کو پانی سے نہیں، ڈپٹی کے خون سے بجھانا چاہتی ہوں۔ آپ کو آپ کی محبت ہی کی قسم دے

کر یہ بھی کہوں گی کہ اب اس معاملے میں آپ مجھ سے کچھ نہیں کہیں گے اور کوئی ایسا طریقہ بھی اختیار نہیں کریں گے کہ میں اس محفل میں نہ جاسکوں۔''

جمال کے چہرے پر بے بسی نظر آئی۔ ''تم میری محبت کا بہت کڑا امتحان لے رہی ہو۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''تمہاری جیل کی زندگی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ اس کے خیال ہی سے میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔''

''اپنی محبت کی خاطر یہ بھی برداشت کرلیجیے گا۔''

''بہت سفاک ہوگئی ہو تم اس وقت۔'' جمال کی آواز لرز گئی۔ ''یہ قسمیں دے کر تم نے مجھے بالکل بے بس کردیا ہے۔''

''میں جیل میں بھی آپ کے لیے دعاگو رہوں گی۔''

جمال نے رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔ وہ جانے کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ زیب النساء بول پڑی۔ ''اب رضوان سے کیا کہیے گا؟''

''تم اس فکر میں نہ پڑو۔ کسی بہانے اسے ٹال ہی دیا جائے گا۔''

''یہ نہیں بتائیے گا کہ آپ اسے مجھ سے ملانے لائے تھے۔''

''نہیں، یہ نہیں بتایا جائے گا اسے۔'' جمال نے کہا اور مڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

زیب النساء اپنے بستر پر جا گری۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔

☆☆☆

رات کا کھانا جاوید اور جمال نے عدنان کے ساتھ کھایا۔ جمال کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ عدنان اور جمال اصرار کر کے اسے کھانا کھلائیں گے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' عدنان نے جمال سے پوچھا۔

جمال نے اس کی طرف دیکھا اور سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہارا ہوا جواری یا تو خود کو شراب میں غرق کرلیتا ہے یا رنگ رلیوں میں کھو کر یادوں کے دریچے بند کرلیتا ہے۔''

''شراب تو تم پیتے ہی ہو۔''

''کوئی ایسا موقع آجاتا ہے تو پیتا ہوں، عادی نہیں ہوں۔''

''اب تمہارا مکان بننے کے بعد بھی میں تم کو خود سے الگ نہیں کروں گا۔'' عدنان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تمہیں شراب میں ہرگز غرق نہیں ہونے دوں گا۔''

''کب تک؟'' جمال نے پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''جب تک زندہ ہوں یا جب تک تم کسی سے شادی نہیں کرلیتے۔''

''شادی تو میری ہوچکی ہے۔''

''کیا مطلب!'' جاوید بھی چونکا تھا۔

''زیبا کی یادوں سے۔''

عدنان نے منہ بنایا۔ ''کیا تمہارا شجرہ قیس یا فرہاد سے جاملتا ہے؟''

''اڑا لو مذاق!'' جمال کی آواز بھرا گئی۔ ''محبت کے دیوانوں کا دنیا مذاق ہی اڑاتی ہے۔''

عدنان نے ایک بار اسے غور سے دیکھا اور خاموشی اختیار کرلی۔ جاوید نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رضوان کل صبح کی فلائٹ سے واپس جارہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کے ساتھ ہی چلا جاؤں۔''

''چلے جاؤ! وہاں کچھ نہ کچھ کام تو ہوگا تمہیں۔''

جاوید نے سر ہلا دیا۔

کھانے کے بعد وہ تینوں اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

جمال بستر پر پڑا کچھ سوچتا رہا، پھر اٹھ کر کمرے سے نکلا۔ اس نے عدنان کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' عدنان کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔ شاید وہ سمجھا ہوگا، کسی ملازم نے دستک دی ہے۔

''میں ہوں عدنان!'' جمال نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

''اچھا۔''

دروازہ کھلنے میں قدرے تاخیر شاید اس لیے ہوئی کہ عدنان نے گاؤن پہنا ہوگا۔

''خیریت؟'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''ایک خیال آیا تھا۔ سوچا تم سے بات کرلوں۔''

''آؤ!''

عدنان نے اسے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔

''میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔'' جمال بولا۔ ''کل ڈپٹی اپنی سالگرہ منا رہا ہے۔''

''ہاں۔'' عدنان نے منہ بنایا۔ ''اس قسم کے لوگوں کو ہلا گلا کرنے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے ورنہ اس عمر میں سالگرہ؟ لاحول ولاقوۃ.....! لیکن اس کے بارے میں تم کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''

''وہ رات کو رقص و سرود کی محفل بھی گرم کررہا ہے۔''

''تو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ خود کو رنگ رلیوں ہی میں ڈبو دوں۔ وہاں سبھی تو نہیں جاسکیں گے۔ تم میرے لیے کوئی بندوبست کرواسکتے ہو؟''

''وہاں پولیس کی ڈیوٹی بھی ہوگی لیکن وہاں کا انچارج میں نہیں ہوں۔''

''ہو تو تم ایک اہم محکمے میں.....! کچھ بندوبست تو کر سکتے ہو؟''

عدنان سوچتے ہوئے بولا ''ہاں۔ کچھ ہو تو سکتا ہے، لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''میں کچھ جانے بغیر تم سے ہر وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم وہاں شراب نہیں پیو گے!''

''ایسی محفلوں میں شراب تو ہر ایک کے سامنے لائی جاتی ہے۔''

''ایک آدھ پیگ تم بھی لے لینا۔ محفل ختم ہونے تک بس اسی ایک پیگ کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے رہنا۔''

''میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو کل میں تمہیں اس پولیس آفیسر سے ملا دوں گا۔'' عدنان نے کہا، پھر یکا یک اسے کچھ خیال آیا۔ ''کیا رقص کے لیے زیب النساء بھی وہاں جائے گی؟''

جمال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

''تو یہ بات ہے۔'' عدنان نے طویل سانس لی۔

''دراصل تم اس کی وجہ سے وہاں جانا چاہتے ہو۔''

جمال سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

''خیر!'' عدنان نے کہا۔ ''ہو جائے گا بندوبست۔ کل صبح میرے ساتھ ہی دفتر چلنا۔ میں اس پولیس آفیسر کو بلا کر تم سے ملوا دوں گا۔ بس اب جا کر سو جاؤ اطمینان سے۔''

جمال کھڑا ہو گیا۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد عدنان اسے اپنے ساتھ دفتر لے گیا۔ اس نے فون کر کے ایک پولیس آفیسر کو بلایا اور جمال سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ مزاجاً ٹھرکی ہے۔ شام کو ڈپٹی کے گھر میں جو محفل ہے، اس میں شریک ہونا چاہتا ہے۔''

''واہ!'' انسپکٹر راحیل نے ہنس کر کہا۔ ''خوش ذوق آدمی ہیں آپ۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ پھر عدنان سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ گانا سننے کا شوق مجھے بھی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میری ڈیوٹی اس وقت تک دروازے پر رہے گی جب تک سب مہمان نہ آ جائیں۔ بہت سے لوگوں کو صرف رقص سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ تاخیر سے ہی آئیں گے۔ اس وقت تک گانے کا دور ختم ہو چکا ہوگا۔ مجھے سارا پروگرام معلوم ہے۔ گانے کی محفل آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک ہوگی۔ گیارہ بجے سے دو بجے تک رقص کا پروگرام ہے۔''

عدنان نے ہنس کر کہا۔ ''میرے دوست کو رقص سے ہی دلچسپی ہے۔''

''آپ گیارہ بجے سے کچھ پہلے آ جائیے گا۔'' انسپکٹر راحیل نے کہا۔ ''میں گیٹ پر ہی ملوں گا۔ شاید کسی وجہ سے چند منٹ کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاؤں اس لیے آپ میرا یہ کارڈ رکھ لیجیے!'' اس نے ایک کارڈ نکال کر جمال کو دیا۔ ''میں وہاں ہدایت کر دوں گا کہ جو میرا کارڈ دکھائے، اسے اندر جانے دیا جائے۔''

''وہاں ڈپٹی کے آدمی تو ہوں گے جو مہمانوں کا استقبال کریں گے!''

''لیکن وہ سبھی کو تو نہیں جانتے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو آدمیوں کو بلایا ہے ڈپٹی صاحب نے۔ پچاس تو وہ ہوں گے جو صرف کیک کاٹنے کی تقریب میں شریک ہوں گے۔ باقی مہمان آٹھ بجے سے ہی آنے شروع ہوں گے۔ آپ کو تو گیارہ بجے کے قریب آنا ہوگا۔''

جمال نے سر ہلا دیا۔

''اب تو خوش ہو؟'' عدنان نے جمال سے کہا۔

جمال نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر دن کا بقیہ حصہ گزارنا جمال کے لیے اذیت ناک بن گیا۔ چودہ گھنٹے گزارنا اس کے لیے چودہ صدیوں کے برابر بن گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ زیب النساء کو جیل جانے سے تو ہر قیمت پر بچائے گا۔

جاوید صبح کی فلائٹ سے لاہور جا چکا تھا اس لیے جمال کو سارا وقت تنہا گزارنا پڑا۔ بس سہ پہر کی چائے پر عدنان سے ملاقات ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے پر وہ اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے گھر نہیں آ سکا تھا۔

رات سوا دس بجے تھے جب جمال کار میں ڈپٹی کے گھر روانہ ہوا۔ اس کا پتا اس نے انسپکٹر راحیل سے پوچھ لیا تھا۔ گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب وہ ڈپٹی کے گھر کے صدر دروازے پر تھا۔ اسے انسپکٹر راحیل کا کارڈ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ راحیل وہاں خود موجود تھا۔

''آیئے!'' اس نے جمال سے مصافحہ کرتے ہوئے گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ ''چلیں میں خود آپ کو اندر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ جمال کو لے کر آگے بڑھا۔ کسی گانے والی کی مدھم آواز وہاں تک آ رہی تھی۔

''واہ!'' انسپکٹر راحیل کے منہ سے نکلا۔ ''کیا سریلی آواز ہے۔''

جمال نے کچھ نہیں کہا۔ راحیل نے اسے اس ہال تک پہنچا دیا جہاں اس تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خاصا بڑا ہال تھا جس میں چاروں طرف صوفے لگائے گئے تھے۔ درمیانی حصے میں ایک چوبی چبوترا بنا کر اس پر قالین بچھایا گیا تھا۔ گانے والی اور سازندے اسی پر بیٹھے تھے۔

''آپ یہاں بیٹھ جایئے۔'' راحیل نے جمال کو اشارہ کیا۔

وہاں ڈبل صوفے بھی لگائے گئے تھے اور ان کے ساتھ سنگل صوفے بھی تھے۔ اس کے برابر میں ڈبل صوفہ، بلکہ دونوں طرف ڈبل صوفے لگے ہوئے تھے۔

راحیل نے مزید کہا۔ ''تمام مہمان آجائیں تو میں بھی آجاؤں گا۔ اگر آپ کے قریب کوئی خالی صوفہ ہوا تو قربت بھی ہوجائے گی۔''

جمال نے سر ہلا دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب راحیل آئے تو اس کے قریب کا کوئی صوفہ خالی نہ ہو۔

گانا ختم ہوچکا تھا۔ گانے والی اور سازندے اس پر سے اتر رہے تھے۔

جمال نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں جوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی تھے۔ عورتیں مرد بھی تھے۔ سب کو شراب سرو کی جارہی تھی۔ شراب کی ایک ٹرالی مسلسل گردش میں تھی۔ جمال کو بھی ایک پیگ اٹھانا ہی پڑا۔

سازندوں وغیرہ کے ہٹ جانے کے بعد ملازمین وہ چبوترا وہاں سے ہٹانے لگے۔ اس میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

مائک پر ایک آواز گونجی۔ ''معزز مہمان اب رقص سے محظوظ ہوں گے۔''

جمال نے دیکھا کہ سازندے وغیرہ ایک پردہ ہٹا کر دوسری طرف جارہے تھے۔ جمال کو خیال آیا کہ رقاصائیں بھی ادھر ہی سے آئیں گی۔

اب ایک فلمی گانے کی دھن بج رہی تھی۔

پھر دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ مائک پر کسی نے کہا۔ ''حضرات! اب آپ کے سامنے ایک بہت خوب صورت رقاصہ چمپا بیگم ہوں گی۔''

اس کے ساتھ ہی پردہ ہٹا کر ایک نوجوان لڑکی رقص کرتی ہوئی ہال کے وسط تک پہنچ گئی۔ وہ گانے کے ہر بول کے ساتھ اپنے اعضا کی حرکات بدل رہی تھی۔ کوئی بہت اچھا رقص وہ بہرحال نہیں تھا۔ پروگرام اسی طرح بنایا گیا ہوگا کہ شروع میں کمزور اور پھر بتدریج اچھی رقاصائیں سامنے آتیں۔

اس وقت تک ہال مہمانوں سے تقریباً بھر چکا تھا۔ جمال نے یہ دیکھ کر اطمینان محسوس کیا کہ اس کے قریب کا کوئی صوفہ خالی نہیں بچا تھا۔

چار رقاصاؤں کے بعد اعلان ہوا۔ ''اب جگر تھام کے بیٹھیے کہ باری آگئی ہے سائرہ کی۔''

فوراً ہی جمال کے اعصاب میں تناؤ آگیا۔ سائرہ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اب زیب النساء سامنے آتی۔

پھر فوراً ہی ایک گیت کی ابتدائی دھن بجنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی جو رقاصہ ہال میں آئی، اس نے دیہی طرز کا گھاگرا اور چولی کے ساتھ ایک دوپٹا بھی اپنے سر پر اس طرح ڈال رکھا تھا جیسے گھونگٹ نکالا ہو۔

گیت شروع ہوا۔ ''گھونگٹ نہیں کھولوں گی سیّاں تورے آگے!''

'تو یہ حرکت کی ہے زیبا نے'، جمال نے سوچا۔ گیت کا انتخاب اس نے خود کیا ہوگا تاکہ گھونگٹ میں اپنا چہرہ زیادہ سے زیادہ چھپا سکے۔

ابتدا ہی میں وہ ناچتی ہوئی ایک جانب بیٹھے ہوئے مہمانوں کے بالکل سامنے آگئی اور پھر رقص جاری رکھتے ہوئے دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھنے لگی۔ جمال سمجھ گیا کہ اس طرح گھومتی ہوئی وہ اس مقام تک پہنچ جاتی جہاں ڈپٹی ایک بہت پُرشکوہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

زہریلا چاقو ضرور زیبا نے اپنے لباس میں کسی طرح چھپا رکھا ہوگا۔

جمال کا اعصابی تناؤ بڑھتا جارہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اسے کم کرے۔ زیادہ اعصابی تناؤ میں کوئی گڑبڑ ہوسکتی تھی۔

آخر وہ لمحہ آیا جب زیبا، ڈپٹی سے چند فٹ دور رہ گئی۔ اب بہ مشکل ایک منٹ بعد وہ اپنا چاقو نکال کر ڈپٹی پر جھپٹ پڑتی۔

جمال اب ذرا بھی دیر نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فوراً جیب سے ریوالور نکال کر ڈپٹی کی پیشانی کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ یک لخت ڈپٹی کی پیشانی سے خون اچھلا اور وہ گرنے لگا۔ جمال نے فوراً ہی دوسری گولی بھی چلادی۔ اس نے ڈپٹی کے سر کا ہی نشانہ لیا تھا لیکن اس کا وہ نشانہ خطا گیا کیونکہ ڈپٹی گر رہا تھا۔

ہال میں فوراً بھگدڑ مچ گئی۔
جمال نے فوراً ریوالور پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔
''خبردار!'' کسی طرف سے انسپکٹر راحیل کی زوردار آواز سنائی دی۔ ''کوئی گولی نہیں چلائے گا۔''
ڈپٹی کے کئی باڈی گارڈز نے ہتھیار نکالے تھے لیکن راحیل کی وارننگ کی وجہ سے کوئی ہتھیار استعمال نہیں کیا گیا۔
دس بارہ پولیس والے بے تحاشا ہال میں گھس آئے تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔
''ڈپٹی صاحب کو دیکھو!'' راحیل چیختا ہوا بہت تیزی سے جمال کے قریب پہنچا۔ ''یہ کیا کر ڈالا تم نے؟ کیا تم اسی لیے.....''
''ہاں! میں اسی لیے آیا تھا۔'' جمال نے بڑے سکون سے کہا۔ ''اور جو کچھ کیا ہے، اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوں۔''
اس وقت تک ہال مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا لیکن زیب النساء وہیں موجود تھی۔ دو لڑکیاں پردے کی آڑ سے آئی تھیں اور زیبا کو واپس گھسیٹ لے جانا چاہتی تھیں لیکن زیب النساء ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔
کہیں سے ہتھکڑیاں آ گئیں جو جمال کی کلائیوں میں ڈال دی گئیں۔
''یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ جمال سے بولی۔ اس کی آواز میں بہت زیادہ لرزش تھی۔
''میں نے بازی جیت لی ہے۔'' جمال نے مسکرا کر کہا۔ ''اب جیل میں میری زندگی گزرے گی یا مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔''
لیکن جمال کو کسی وجہ سے پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔ اسے عمر قید کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب اس پر مقدمہ چل رہا تھا، زیب النساء اور غزالہ برابر ہر پیشی پر آتی رہیں اور ہمیشہ آنکھوں میں آنسو بھی رہے۔
حوالات میں بھی زیب النساء اس سے ملنے جاتی رہی تھی۔
''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو!''
''اب بھی تم نے جتنا سوچا ہوگا، میری محبت اس سے زیادہ ہوگی، زیبا!''
عدنان اور جاوید بھی اس سے ملتے رہے تھے۔
عدنان نے ایک بار کہا تھا۔ ''تم نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ تمہارے اس اقدام کی وجہ سے میرا ایک مسئلہ طے ہو گیا لیکن اگر تم یہ قدم نہ بھی اٹھاتے تو میں دیر سویر کامیاب ہو ہی جاتا۔''
''کس طرف اشارہ ہے تمہارا؟''
''ابراہیم جان کا قتل۔'' عدنان نے بتایا تھا۔ ''اسے ڈپٹی ہی نے قتل کروایا تھا۔ میرا خیال فوراً ہی اس کی طرف گیا تھا۔ میں نے اس کی نگرانی بھی شروع کروا دی تھی لیکن ابھی تک اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکا تھا۔ تمہاری وجہ سے وہ اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا لیکن یہ بات تو میں پھر بھی کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''
''میں محبت کی اس منزل میں ہوں عدنان، جہاں فیصلہ دماغ نہیں، دل کرتا ہے اور میرے دل نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ زیبا کی زندگی جیل میں نہ گزرنے دوں۔''
عدنان سوچ میں ڈوبا خاموش رہ گیا تھا۔
جاوید جو اس کے ساتھ تھا، بول پڑا۔ ''کیس جس سمت میں جا رہا ہے اور جج کے جو ریمارکس سامنے آ رہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں سزائے موت نہیں ہوگی، عمر قید ہو سکتی ہے۔''
''سزائے موت زیادہ بہتر ہوتی، سسک سسک کر زندہ رہنے سے! اگر مجھے زیبا سے محبت نہ ہوتی تو میں یہی کہتا کہ اس نے میرے لیے وکیل کر کے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ عمر قید سے تو مجھے موت ہی گوارا ہوتی۔''
''اب یہ زیبا کے دل کا فیصلہ ہے کہ تم زندہ رہو۔ تم دلوں ہی کے فیصلے کے قائل ہو نا محبت میں!''
''لیکن اس کے دل میں تو رضوان کی محبت ہے۔ رضوان کا جواب سننے کے بعد بھی اس نے کہا تھا کہ اس کے دل میں اب بھی جو جگہ رضوان کی ہے، وہ جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔''
''دلوں کے فیصلے کسی دلیل یا منطق کی مناسبت سے نہیں ہوتے اس لیے کسی وقت بدل بھی جاتے ہوں گے۔''
''نہیں بدل سکتے۔'' جمال نے ٹھنڈی سانس لی۔
''وہ خود کہہ چکی ہے مجھ سے!'' جاوید نے کہا۔ ''اسے بھی یقین ہو چکا ہے کہ تم کو عمر قید ہو سکتی ہے، سزائے موت نہیں ہو سکتی اس لیے جب تک سزا کاٹ کر جیل سے رہا ہوگے تو خاصی عمر ہو جانے کے باوجود وہ تم سے شادی کر لے گی، اگر زندہ رہی۔''
''اگر اس نے یہ فیصلہ کیا ہے تو یہ اس کے دل کا فیصلہ نہیں ہے۔'' جمال نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ اس طرح صرف میرے ایثار کا بدلہ چکانا چاہے گی۔''

⌘⌘⌘

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com